علمی ادبی و تنقیدی
سالانہ ایک روپیہ
مقامِ اشاعت مکتبہ اردو ۱۵ سرکلر روڈ لاہور
چندہ سالانہ تین

رسالہ لاہور

ادب لطیف

کا

افسانہ نمبر!

ادارۂ تحریر

(چوہدری) برکت علی (بی۔اے)

میرزا ادیب (بی۔اے)

مقام اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

منیجنگ پروپرائٹر چوہدری نذیر احمد

قیمت افسانہ نمبر ۱۲/

فہرست مضامین

جلد ۹	بابت ماہ جون و جولائی	۱۹۳۷ء عیسوی	نمبر ۵

نذرِ اوّلیں

حسبِ وعدہ افسانہ نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ کیسا ہے؟ ہماری کوششوں نے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ اس کا فیصلہ اہلِ نظر کریں گے۔ البتہ ہم ضرور کہیں گے کہ رسالے کی ترتیب، تدوین، تعمیر و تہذیب کے بارے میں ہماری انتہائی کوشش یہی رہی ہے کہ افسانہ نمبر میں بہر لحاظ جامعیت پیدا ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں افسانوں کے ساتھ ساتھ منظوم افسانے اور افسانہ نگاری سے متعلق مضامین بھی شریکِ اشاعت ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ہر ایک مضمون محققانہ معلومات افزا اور باقی کے مضامین سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ افسانوں کے انتخاب کے سلسلے میں یہ امر مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ ہر ایک افسانہ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہو۔ ہمیں اعتراف ہے کہ افسانوں میں مجموعی حیثیت سے "حزینہ عنصر" غالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں حقیقتاً مزاح نگار حضرات بہت کم تعداد میں ہیں، اور انہیں بھی ذاتی مصروفیات کے ہجوم اس طرح جکڑے رکھا ہے کہ وہ رسالوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں پاتے۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ دفتر میں متعدد مزاحیہ افسانے آئے مگر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ انہیں مزاحِ لطیف سے دور کا بھی تعلق نہیں، اس لئے شریکِ اشاعت نہ ہو سکے۔

پیشتر اس کے کہ جداگانہ علیحدہ علیحدہ ہر ایک افسانے کے متعلق لکھیں ان اہلِ قلم حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہماری حقیر گذارش کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے افسانہ نمبر کے لئے گراں پایہ مضامین بھیجے۔ جو مضامین افسانہ نمبر میں شائع نہیں ہو سکے وہ "ادبِ لطیف" کی قریبی اشاعت میں نکل جائیں گے۔

مزدور کی موت۔ حضرتِ احسان کی یہ نظم اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے نہایت بلند ہے۔ مزدور کی موت کو ایسے حسرتناک، درد انگیز و دلگداز پیرائے میں بیان کرنا حضرت احسان ہی کا حصہ ہے۔

افسانہ نگاری۔ اس مضمون میں جناب سید ... مولائی (بی۔ اے علیگ) نے فنِ افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون معلوماتی ہونے کے علاوہ بہت دلچسپ بھی ہے۔

سنگدل۔ جناب ... بی۔ اے، ایل ایل بی نے گھریلو واقعات کو ایسے دلسوز پیرائے میں لکھا ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی ضبطِ اشک نہیں کر سکتا۔ جناب ... کی طبیعت کو اپنے تخلص سے بہت گہری مناسبت ہے۔

پردیسی اور ہوا کا جھونکا۔ نظم ہے جناب الطاف مشہدی کی۔ الطاف صاحب وہی لکھتے ہیں جسے وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور جذبات نگاری ان کی شاعری کا خاص امتیاز!

فنِ افسانہ نگاری۔ جناب سید عبدالرشید صاحب یزدانی مدیر معاون شاہکار نے اس مختصر سے مضمون میں فنِ افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ارادہ طویل مضمون لکھنے کا تھا مگر شاہکار کی ادارتی مصروفیات اور ہمارے پیہم اصرار نے انہیں مجبور کر دیا کہ مضمون مختصر صورت میں پیش کیا۔

اندھا مصور۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ادبِ لطیف کے ایک شمارہ میں اس عنوان سے ایک مشہور و معروف افسانہ نگار جناب صباح سنامی کا ایک دلآویز افسانہ شائع ہوا تھا۔ حضرت سرشار کسمنڈوی نے اسے نظم کا جامہ

پہنایا ہے۔ حضرت سرشار ایک خوش فکر اور جذباتی شاعر ہیں۔ آپکی یہ سعی رنگیں امید ہے بنظرِ تحسین دیکھی جائے گی۔

دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے۔ رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی کی ایک مشہور غزل کے مطلع کا مصرعِ ثانی ہے۔ اور صاحب فن افسانہ نگار نے اسے ایک دلآویز رنگ میں پیش کیا ہے ہم حضرت ایم اسلم کے لطفِ خاص کے نہایت ہی ممنون ہیں!

سیاہ پوش عورت۔ سید شریف حسین صاحب انور گیلانی بی۔اے کے بلند پایہ تراجم وقتاً فوقتاً 'ادب لطیف' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ افسانہ انگریزی کے مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس کے قلم سے ہے۔ جسے آپ نے شگفتہ اردو میں پیش کیا ہے۔ گیلانی صاحب کا یہ ترجمہ نکی قابلِ تحسین اور بہت کامیاب کوشش ہے!

عقل کا دشمن۔ اس نظم میں پروفیسر احسن صاحب قبلہ نے ایک مزاحیہ واقعہ کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مختصر افسانہ اور اسلوب بیان۔ یہ مختصر مگر محققانہ مضمون اردو کے بلند پایہ صاحب قلم سید بادشاہ حسن کے قلم سے ہے۔ سید صاحب کے مضامین کو جو مقبولیت دنیائے اردو میں حاصل ہے۔ اس سے قارئین ناواقف نہ ہونگے۔

شہر کا جادو۔ ورڈز ورتھ انگریزی کا بہت ممتاز شاعر ہے۔ یہاں کے بعض نقادوں کی رائے کے مطابق ذہانتِ شاعری میں اسکا رتبہ تیسرے درجے پر ہے (یعنی شیکسپیئر اور ملٹن کے بعد) یہ منظوم افسانہ اسکے قلم سے ہے۔ ہم جناب عبدالرحیم شبلی بی۔ کام کے ممنونِ احسان ہیں کہ انہوں نے افسانہ نمبر کے لئے اس قدر خیز افسانے کے ترجمے کو پیش کیا۔ ترجمہ نہایت شگفتہ ہے۔

پرستارہ۔ جناب عبدالرشید صاحب جعفرانی ایک کہنہ مشق مضمون نگار ہیں اور آپکا یہ افسانہ نثر میں شاعری کی بہت کامیاب کوشش

افسانے میں حقیقت طرازی و مثال نگاری۔ اس دلآویز و محققانہ مقالے کے مصنف اردو کے مشہور و معروف نقاد جناب سید اختر احمد اورینوی ایم۔اے ہیں۔ آج کل آپ بدقسمتی سے صاحبِ فراش ہیں۔ مگر اسکے باوجود آپنے ہماری درخواست کو رد نہیں کیا۔ قارئین کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ سید صاحب کی صحت کے لئے دعا کریں۔

عہدِ اعظم۔ ایک چھوٹا سا واقعہ، مگر چھوٹا سا ہونے کے باوجود بہت بڑا۔ اس میں فاروقِ اعظم کی سیرت کا وہ پہلو دکھایا گیا ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ مشکل ہی سے پیش کرسکتی ہے یعنی فاروقِ اعظم عہدِ اعظم کی حیثیت میں!

حکیم الشعرا نے اس پاکیزہ واقعہ کو نہایت پاکیزہ اشعار میں پیش کیا ہے۔

حکایت۔ یہ منظوم افسانہ سید مقبول حسین صاحب احمد پوری بی اے، ایل ایل بی کے معجز طراز قلم سے ہے سید صاحب کی نظمیں اردو کے ادبی حلقوں میں جو مقبولیت حاصل کرچکی ہیں ان سے قارئین ناواقف نہ ہونگے۔ آپکی طرزِ نگارش اتنی شیریں اور دلآویز ہوتی ہے کہ انسان بار بار پڑھنے پر بھی نہیں اکتاتا۔

تیرِ نیم کش۔ یہ دلآویز و درد انگیز افسانہ ہے اردو کے ہونہار ادیب صادق الخیری بی اے کے قلم سے ہے! افسانہ بہت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پُرسوز بھی ہے۔

ارتکابِ جرم۔ ترجمہ ہے ہمارے محترم قلمی معاون جناب ساغر جعفری کے قلم سے۔ ساغر صاحب کے ترجمے ہمیشہ بنظرِ استحسان دیکھے گئے ہیں۔ امید ہے یہ ترجمہ بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔

پیشین گوئی ۔ مولانا کوثر چاندپوری کا ایک مزاحیہ مضمون نما افسانہ ہے۔ امید ہے بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔

سماج کی بھینٹ ۔ دنیائے افسانہ نگاری میں سید علی عباس حسینی ایم اے کا مرتبہ بہت بلند ہے معاشرتی افسانے لکھنے میں آپکو ید طولے حاصل ہے آپ کا یہ افسانہ ایک خاص معاشرتی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے کاش ہندوستانی اس سے سبق حاصل کریں۔

کرشمہ ۔ جواں افکار شاعر حضرت عدمؔ نے ایک مشہور واقعے کو منظوم رنگ میں پیش کر دیا ہے گو بعض نقادوں کے نزدیک یہ واقعہ سرے سے افسانہ ہی نہیں تاہم عدم صاحب کی عدیم الفرصتی کے "خیال" نہیں۔

افسانہ اور نفسیات ۔ مولینا ماہر القادری کا مختصر مضمون بہت کارآمد و معلومات افزا ہے۔

افکارِ زنداں ۔ جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرمائینگے یہ اشتراکی ادیب باری (علیگ) کی ایک تازہ تصنیف کا ایک باب ہے۔ باری صاحب بہت تساہل کیش آدمی ہیں خط پر خط لکھو مگر انکے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ باری صاحب کا یہ مضمون حاصل کرنے پر ہم باری تعالےٰ کے شکر گزار ہیں۔

آنکھ مچولی ۔ بہت نفیس و کامیاب ترجمہ ہے۔

خوف ۔ یہ بھی ترجمہ ہے اور بہت حد تک کامیاب۔

صبی مرحوم

یہ خبر رنج و اندوہ سے سنی جائے گی کہ مشہور خوشنویس صبی بن قوی وفات پاگئے ہیں۔ "ادبِ لطیف" کے قارئین صبی مرحوم کے نام سے نا آشنا نہ ہونگے۔ مرحوم بے مثال خوشنویس تھے۔ ان کی کتابت نہایت پاکیزہ اور منفرد خوبیوں سے لبریز ہوتی تھی۔ دعا ہے خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور وابستگان کو صبر ـــــ!!

اردو کے عظیم الشان ادارہ

"مکتبہ اردو" کی تشکیل

اردو اسوقت جس ہلاکت بکنار دور میں سے گذر رہی ہے وہ جمہور کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ مخالفانِ اردو کا زہر آلود تعصب ایک طاقتور سیلاب کی صورت اختیار کر کے اسے تنکے کی مانند بہالیجانے پر تلا ہوا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی لسانِ عمومی زندگی اور موت کے درمیان ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ تشویشناک سے تشویشناک صورتِ حالات پیدا کر رہی ہے۔ ضرورت ہے۔ کہ محبانِ اردو اپنی تمام تر توجہات، اردو کی بقا کے اہم ترین مسئلے پر مرتکز کر دیں اگر اس وقت بہی خواہان اردو نے مخالفانِ اردو کے جارحانہ اقدامات کے مقابلے میں مدافعانہ رویے سے کام نہ لیا تو اردو کی زندگی زیادہ خطرے میں پڑجائیگی۔ مخالفت حقیر ترین ہونیکے باوجود بھی مخالفت ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی چیز کے متعلق حسنِ ظن انجام کار تاسف کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ملک کی وسعتوں میں اردو کے ایسے مراکزِ ادبیہ بھی ہیں، جہاں اردو کے ہر شعبے ہر شاخ کو تقویت دینے کے سلسلے میں مخلصانہ کوشش سے کام لیا جا رہا ہے، اور چند ایک مجالس علمیہ بھی اپنے متعینہ فرائض کو بطرز احسن انجام دے رہی ہیں لیکن ابھی اردو کی بقا کا مسئلہ زیادہ علم نوازانہ سرگرمیوں کا مستحق اور زیادہ مخلص اہلِ علم حضرات کی کوششوں کا محتاج ہے! اسی جذبے کے زیر اثر ہم نے چند سال پیشتر پنجاب بکڈپو کی ایک ادبی شاخ کی بنیاد ڈالی تھی جسکا مقصد حیات محض ادبی تصانیف کی نشر و اشاعت تھا دراں حالیکہ پنجاب بکڈپو کی تشکیل صرف کتب درسیہ کی اشاعت کے لئے بروئے کار آئی تھی، پنجاب بکڈپو کی ادبی شاخ نے اپنے مقررہ فرائض

تندہی و سرگرمی سے انجام دیتے۔ ملک کے مقتدر ادبی حلقوں نے ہماری کوششوں کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہوئے ہمارے ساتھ تعاون کیا اپنی قلیل مدتِ حیات میں اس ادبی شاخ نے متعدد کامیاب ادبی کتابوں کی نشر و اشاعت سے اردو میں ایک مستقل اضافہ کیا

احساسِ دقت

پنجاب بکڈپو کا مقصدِ زندگی صرف کتبِ درسیہ کی اشاعت ہے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور پنجاب بکڈپو کی ادبی شاخ بہرحال پنجاب بکڈپو ہی کا ایک جزو تھی۔ اسلئے درسی کتابوں کی اشاعت و ترتیب و تہذیب کے وقت جملہ کارپردازانِ پنجاب بکڈپو کو اپنی تمام تر توجہ صرف اس طرف مبذول کرنی پڑتی تھی اور ادبی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم نے اسوقت کو محسوس کیا اور ادبی کتابوں کی اشاعت کیلئے پنجاب بکڈپو سے بالکل علیحدہ "اشاعت خانہ" قائم کرنیکا ارادہ کر لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اپنی کوششوں کو مرکز اردو ہی سے وابستہ کر دینگے مگر اردو مرکز مستعمل ہے۔ یہ زمرہ جبکہ پور وغیرہ بھی اسی نام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسلئے آج ہم اپنا بالکل ذاتی "اشاعت خانہ" قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اس عظیم الشان ادبی ادارے کا نام جیسا کہ بعض حضرات کو معلوم ہو چکا

"مکتبۂ اردو"

ہے۔ مکتبۂ اردو، ہماری مسلسل جدو جہد اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کوششوں میں ہمارے متعدد مخلص احباب نے حصہ لیا۔ بالخصوص پنجاب بک ڈپو کے پروپرائٹر چودہری برکت علی صاحب بی۔ اے نے نہایت مخلصانہ طور پر ہماری امداد کی اور یہ دیکھکر ہمیں بہت مسرت ہوتی ہے کہ چودہری صاحب کی مکتبۂ اردو کے قیام کی دیرینہ آرزو چودہری صاحب ہی کی مستحسن اور انتھک کوششوں کے طفیل عملی صورت میں آئی ہے۔

مکتبۂ اردو کے اشاعتی لائحہ عمل کے سلسلے میں ہم آئندہ کے شمارے میں کچھ عرض کرینگے کیونکہ اس باب میں اردو کے تجربہ کار ناشرین و مالکانِ مطابع اور مقتدر اہلِ قلم حضرات سے استصوابِ رائے کیا جا رہا ہے۔ یہاں ہم صرف یہی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ادبِ لطیف کے گذشتہ سطور میں جن مکتبۂ اردو کے قیام کے باب میں ہم اپنی دیرینہ آرزو کا اظہار کیا کرتے تھے۔ وہ آرزو آج عملی صورت میں پبلک کے سامنے پیش ہو گئی ہے —

مکتبۂ اردو ایک عظیم الشان علمی ادارہ ہے جسکے انتظام و نگرانی کے ماتحت ادب کے ہر شعبے میں کامیاب تصانیف ظاہری محاسن سے آراستہ ہو کر شائع ہوا کرینگی۔ ہم مایۂ ناز اہلِ قلم حضرات سے مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔

اہلِ قلم حضرات و مراکز ادبیہ سے

ہم اہلِ قلم حضرات اور اردو کے ادبی مرکزوں کے منتظمین کی خدمتِ عالیہ میں مؤدبانہ درخواست کرینگے کہ وہ ہم سے تعاون کریں۔ مشوروں سے ہمیں مستفید فرمائیں جب ہمارا مقصد ایک ہے۔ تو پھر عدمِ تعاون کی وجہ؟

مصنفین حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تصانیف کی اشاعت کے سلسلے میں مہتمم مکتبۂ اردو سے خط و کتابت کریں۔

"آغا حشر کی یادگار اور انکے ڈرامے"

آج سے صرف تین سال پیشتر ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود تھا جس کی شاعرانہ عظمت، تمثیل نگارانہ رفعت کے سامنے بڑے صاحب فکر و نظر کا سر جھک جایا کرتا تھا۔ جسکے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرے کو بیش بہا موتیوں سے زیادہ عزیز سمجھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ

کہ وہ ہمارا ممتاز ترین — محبوب ترین ڈرامہ نگار تھا۔ آج یہ ڈراما نویس دنیا میں موجود نہیں، دستِ قضا نے اس قابلِ احترام ہستی کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہے۔ مگر یہ کتنا رنجدہ، کس قدر افسوسناک اور کس درجہ تاسف خیز امر ہے، کہ ہم اس مرحوم ہستی کی دائمی جدائی کے ساتھ ہی اسکے کارناموں کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ آغا حشر دنیا میں موجود نہیں مگر اسکی دماغی کاوشیں، اسکے ادبی کارنامے اور اسکی عمر بھر کی کمائی تو دنیا میں موجود ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں آغا مرحوم کی عزت و عظمت موجود ہے جسکا اظہار اسکی زندگی میں ہمارے قلم اور زبان نے ہزار ہا بار کیا، تو اس عزت و عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسکے ڈراموں کو تلف ہونے سے بچائیں۔ اسکے سوا مرحوم سے اپنی شیفتگی و محبت کا ثبوت اور کسی طرح نہیں دے سکتے۔ دنیا میں ہر عظیم المرتبت انسان کی وفات پر ذاتی اغراض اور حقیقی محبت و عقیدت کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ غرض پرست لوگ (جن کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہتی ہے) چاہتے ہیں کہ مرحوم کی عظمت پر اپنی شخصیت کی عمارت تعمیر کریں۔ انکے مقابلے میں عقیدتمند حضرات (جن کی ہر وقت کمی رہی ہے) کی دلی خواہش ہوتی ہے، کہ مرحوم کا نام، عزت اور کارنامے لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں۔ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے مختلف گوشوں سے آغا مرحوم کے "عقیدتمندانِ باصفا" کی مصنوعی محبت طوفانی لہروں کی صورت میں حشر کی دماغی کاوشوں کو بہائے لے جا رہی ہے اور ملک و قوم پر بدستور سکوت و جمود طاری ہے۔

اس افسوسناک صورتِ حالات میں کیا ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہندوستان نے اپنے جلیل القدر ڈراما نگار کی قدر کی؟ تمام قوم میں کوئی ایسا شخص ہے جو یہ کہے کہ آغا مرحوم کے عقیدتمند ابھی تک قوم میں موجود ہیں اسمیں کوئی شک نہیں کہ آغا مرحوم کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی چند اولوالعزم حضرات نے آغا حشر کی یادگار قائم کرنے کے مسئلے پر غور کیا۔ صرف غور ہی نہیں بلکہ اسے عملی صورت میں لانے کے لئے بڑے قابلِ تحسین انتظامات ہونے لگے مگر "برادرِ تحفظِ شخصیت" کا جذبہ کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اپنے ایک محبوب ترین مصنف کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں بھی "پارٹی بازی" کا قابلِ نفرت سوال پیدا ہو گیا، اس ملعون "پارٹی بازی" اور "تحفظِ شخصیت" ہی کا سوال تھا کہ "حشر میموریل کمیٹی" کی تمام مساعی و عزائم عملی صورت کے قریب تک بھی نہ پہنچ سکے اور "پارٹیوں" کی غوغا آرائیوں کے ہجوم میں وقت کا یہ اہم ترین سوال ڈوب گیا۔ اور ایسا ڈوبا کہ کسی کو اب اس طرف توجہ کرنے کا بھی خیال نہیں آتا۔

ہم یہاں ملک و قوم سے پوچھتے ہیں جس شخص نے نہایت ادب کی اتنی جانفشانی، محنت اور محبت سے خدمت کی آج اس کا اتنا بھی حق نہیں کہ اسکی یادگار ہی قائم کی جاسکے، یا کم از کم اسکے ڈراموں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے؟ ہم پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں کہ ذاتی اغراض کے ماتحت آغا مرحوم کے ڈرامے مسخ شدہ حالت میں ہمارے سامنے آرہے ہیں، اور اگر کچھ مدت یہی حال رہا تو مرحوم کا ایک ڈراما بھی نہ مل سکے گا۔!

آغا مرحوم کے ڈراموں کے متعلق ادبِ لطیف میں برابر لکھا جا رہا ہے۔ ہم نے معاصرین کرام کی خدمت میں التماس کی تھی کہ وہ اس طرف توجہ دیکر، وقت کے ایک اہم مسئلے کو پبلک کے سامنے لائیں، مگر افسوس کہ صرف چند جرائد نے اسطرف توجہ کی ہے، باقی ایسا معلوم ہوتا ہے اس مسئلے کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے!

ہم پھر اپنے محترم معاصرین سے درخواست کریں گے کہ وہ اسطرف فوراً متوجہ ہوں!

نیرنگِ خیال کے شمارہ تازہ میں ہمارے محترم بزرگ حکیم یوسف حسن صاحب مدیر نے بھی اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ ادب لطیف کی آئندہ اشاعت میں ہم اس پر اپنی رائے کا اظہار کرینگے

فروغِ شمع جو ہے وہ رہیگا صبح محشر تک
آہ منصور مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

اور آج صد افسوس محفل اردو سے ایک اور جانباز پروانہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ مولوی منصور احمد مدیر ادبی دنیا کی مرگ مفاجات جگر گداز غم واندوہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ مرحوم اردو کے دیرینہ مخلص خادم تھے۔ اور آخری دم تک اس سے منہ نہ موڑا۔

مولوی منصور احمد نہ صرف ایک پختہ کار ادیب تھے۔ بلکہ نہایت مخلص انسان بھی۔ ایک دفعہ ملاقات کرنے کے بعد آدمی ان کے حسن اخلاق کا مداح ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب کی وفات ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر!!

ہیڈ ماسٹر صاحبان متوجہ ہوں

جن ہیڈ ماسٹر صاحبان کے ذمے "ادب لطیف" کے بل کی ادائیگی واجب الادا ہے۔ ان کی خدمت میں مودبانہ درخواست ہے کہ وہ بل ادا کر کے ممنون فرمائیں

ان کی خدمتِ عالیہ میں متعدد بار اس سلسلے میں لکھا جا چکا ہے مگر ابھی تک ہماری درخواست انکی توجہ اس معاملے کی طرف مبذول نہیں کرا سکی۔ دفتر کی مالی مشکلات ان کی توجہ کی بہت محتاج ہیں۔

مینیجر

دی پنجاب اورینٹیل سوسائٹی لاہور

اس نام سے ایک علمی و ادبی انجمن کی تشکیل بروئے کار آئی ہے۔ جسکا مقصد حیاتِ مشرقی ثقافت اور السنہ شرقیہ کی بقا و فروغ ہے السنہ شرقیہ آج کل جس مایوس کن دورِ تنزل میں سے گذر رہے ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی کہ اہل فکر و نظر بحیثیت مجموعی اس طرف توجہ دیں۔ دی پنجاب اورینٹیل سوسائٹی کا قیام بحالاتِ موجودہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

سرپرست: بیگم شاہ نواز، ایم ایل اے، و میاں عبدالعزیز، ایم ایل سی۔

صدر۔ حافظ محمد عبداللہ۔ ایم ایل اے۔ رئیس لائلپور۔

نائب صدر۔ کے۔ ایم۔ منیر ایم اے، پروفیسر دیال سنگھ، لاہور۔

سیکرٹری۔ وحیدالدین۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر کینئرڈ کالج، لاہور۔

خازن۔ محمد عبداللہ قریشی۔

اراکین میں مورخ اسلام مولانا علم الدین صاحب سالک ایم۔ آ۔ (علیگ) قاضی ظہیرالدین ایم۔ اے، بلیغ الملک علامہ تاجور مدیر اعلٰے رسالہ شاہکار اور دیگر معتد حضرات شامل ہیں۔

اسی سلسلے میں ہم معزز اراکین انجمن کی خدمت میں درخواست کرینگے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کے اظہار کیلئے اردو ہی کو استعمال کریں لائحہ عمل کو بھی بجائے انگریزی کے اردو میں ہونا چاہئے تھا۔

ادب لطیف کے خوشنویس

جناب محمد شریف صاحب عباسی ادب لطیف کے خوشنویس ہیں۔ ان کی کتابت بہت پسند کی جا رہی ہے۔ افسانہ نمبر کے علاوہ عام نمبر بھی شریف صاحب کے مرہون منت ہیں۔ امید ہے آپ بہت ترقی کرینگے۔

لسان العصر حضرت احسان دانش

مزدور کی موت

نیم شب زلف بکھیرے ہوئے ہے دوش پہ
اب ستاروں کی نگاہیں ظلمتِ خاموش پر

کوہ سے تا کاخ دنیا سو رہی ہے بے خبر
ذرّے ذرّے پر ہے گویا سحرِ بزم کا اثر

وقت کی سنجیدگی سے نطق کا دم بند ہے
شورشوں کا قافلہ تنویم کا پابند ہے

اٹھ رہا ہے ذرّے ذرّے سے اندھیرے کا دھواں
تنگ گلیوں میں ہے ظلمت کارواں در کارواں

ہر طرف دنیا میں ہے بے نور خاموشی کا راج
آسماں پر ہے اندھیرے کی جوانی کا مزاج

تیرگی اوڑھی ہوئی ہے ہر در و دیوار نے
موند لی ہیں خوف سے آنکھیں گل و گلزار نے

لگ چکا ہے قفلِ خاموشی درِ گفتار پر
سنسناہٹ کا تسلط ہے بھرے سنسار پر

زمزموں کی دلنوازی حسرتوں میں دفن ہے
آئینوں کی رونمائی حیرتوں میں دفن ہے

کوئی ٹہنی خوف سے گردن اٹھا سکتی نہیں
طائروں کی سانس پتّوں کو ہلا سکتی نہیں

اب نہیں راہِ سماعت میں سفر آواز کا
خون ٹھنڈا ہو چکا ہے مطربوں کے ساز کا

تند جھونکے تیرہ میدانوں میں ہیں سمٹے ہوئے
سو رہے ہیں ٹہنیوں سے زمزمے چمٹے ہوئے

نیند کے سوتے ہیں آنکھوں میں لہرائے ہوئے
خواب ہیں دن کے تخیل میں نمو پائے ہوئے

اب سحر سے پیشتر ہنگامہ اٹھ سکتا نہیں
یک بیک یہ سرد آنچل اٹھ سکتا نہیں

اہلِ زر کے روشن و محفوظ ایوانوں سے دور
شہر کی سرحد پہ بازاروں کے دامانوں سے دور

ایک ٹوٹا سا مکاں ہے یاس و حرماں در کنار　　بام و در سہمے ہوئے خستہ منڈیریں سوگوار
سرمئی چھپر دھوئیں سے، صحن ناہموار سا　　ذرہ ذرہ سربسر ناشاد سا، بیزار سا،
آگ چولہے میں نہیں یہ شدتِ افلاس ہے　　گھر کا گھر اوڑھے ہوئے گویا ردائے یاس ہے
طاق ہیں کالے دھوئیں سے اور گھڑوں پر کائی ہے،　　نیمجاں ذرات کی ڈوبی ہوئی بینائی ہے
گھر کے اک کونے میں چکی مفلسی کی راز داں　　چھت میں جالوں کی جبیں جالوں کے اندر مکڑیاں
اک طرف کو زنگ آلودہ توا رکھا ہوا　　ٹمٹماتا سا، گھڑونچی پر دیا رکھا ہوا
روشنی بے رنگ دیواروں پہ تھراتی ہوئی　　پیڑیوں میں جھینگروں کو خواب دکھلاتی ہوئی
سرد دل چولھے کی کالک مضمحل دیوار پر　　ٹکٹکی تاروں کی اس خاموش ماتم زار پر

گھر ہے کیا عکسِ الم ظلمت کے آئینے میں ہے
اک سلگتا داغ آدھی رات کے سینے میں ہے

مشرقی حصے میں اک مزدور بیمار و ضعیف　　نامراد و ناتواں، معذور و مجبور و نحیف
ہیں عرق میں تر بتر الجھی ہوئی داڑھی کے بال　　ڈوبتی نبضیں ہیں، سانس اکھڑی ہوئی ہے، دل نڈھال
جانکنی سے جسم پر ٹھنڈے پسینے کی نمی　　آرزوئے دید میں پستی، بصارت میں کمی
ہلکا ہلکا ورم ہے پائے بیاباں گرد پر　　سلوٹیں پڑ پڑ کے کھلتی ہیں جبینِ سرد پر
زندگی پر موت نے تیغ و تبر تولے ہوئے　　نیم روشن انکھڑیوں کے لطف دکھ لے ہوئے
خامشی کے بوجھ سے بیٹھی ہوئی آواز ہے　　سازِ دل اترا ہوا ہے ہر صدا ناساز ہے

قبر کی تاریکیاں تابندگی کی گھات میں
موت کا خونی سپاہی زندگی کی گھات میں

پاس بیوی گود میں بچہ لئے خاموش ہے　　جس کی خاطر بیوگی کھولے ہوئے آغوش ہے

فرطِ غم سے مضطرب آہیں دلِ صد چاک میں
لب پہ لوری اور آنسو چشمِ حسرت ناک میں

دیگچی خالی ہے چولہے پر بہانے کے لئے
مضطرب بچوں کو بہلا کر سُلانے کے لئے

کہتی ہے "میں جاں بلب بچے الٰہی کیا کروں؟
یہ سیاہ بختی کی راتوں میں تباہی! کیا کروں؟

فکر میں بچوں کے لیکن رنج و غم بیکار ہے
یہ تری بخشی ہوئی نعمت ہے تو مختار ہے

روح فرسا غم ہے یہ مجھ خستہ تن کے واسطے
قرض کس سے لاؤں گی گور و کفن کے واسطے؟"

طفلِ کمسن جھکتا ہے وہ رہ کے ماں کی گود سے
باپ کے سوجے ہوئے قدموں کو چھونے کے لئے

چھوٹے چھوٹے اور دو معصوم فاقوں سے نڈھال
پائینتی پکڑے کھڑے ہیں بے حس و بے قیل و قال

ششدر و حیراں ہیں گھر پر غم کا قابو دیکھ کر
باپ کی گہری خموشی ماں کے آنسو دیکھ کر

دھجیاں کپڑوں کی اور بجھتی ہوئی سی صورتیں
جیسے نیلامی پہ دو چینی کی میلی مورتیں

کیا خبر اُن کو یتیمی گود میں لینے کو ہے
باپ کو تربت کی خاموشی صدا دینے کو ہے

جس طرح لیکر سنبھالا شمع ہوتی ہے خموش
یونہی جسد دمِ جانکنی سے کچھ اسے آتا ہے ہوش

کہتا ہے بیوی سے "خالق کا بڑا احسان ہے
تو بھی سو جا اب مجھے آرام و اطمینان ہے

صبح جب ہوگی تو لیکر پھاوڑا جاؤں گا میں
بھوکے بچوں کے لئے کچھ شام تک لاؤں گا میں"

جانبِ گردوں اٹھاتا ہے وہ پھر دستِ دعا
اور کہتا ہے خدا سے "مالکِ ہر دوسرا!"

سانس کا نازک سفینہ کرب کے دھارے پہ ہے
موت کے بادل کا ٹکڑا روح کے تارے پہ ہے

زندگانی تیرے حکمِ خاص کی تعمیل ہے
موت کیا شے ہے اُسی تعمیل کی تکمیل ہے

گرچہ کچھ ساماں نہیں ہے اہتمامِ مرگ کا
خیر مقدم دل سے کرتا ہوں پیامِ مرگ کا

جانکنی میں مجھ کو چاہے جس قدر ہلکان کر
لیکن اس بیوہ پہ ان بچوں پہ یہ احسان کر

میرے بعد ان خستہ جانوں کو پریشانی نہ ہو!
مانند اشکوں کی گھر سے شمعِ ایمانی نہ ہو!

یہ نہ ہو ان کا غرورِ مفلسی برباد ہو!
یہ نہ ہو ان کے لبوں پر نالہ و فریاد ہو!

یہ نہ ہو یہ جا کے پھیلائیں کہیں دستِ سوال
یہ نہ ہو اترے ہوئے چہروں پہ ہو گردِ ملال!

یہ نہ ہو یہ پھول ہمسایوں کی ٹھوکریں رہیں
یہ نہ ہو یہ ظالموں کی نازشیں بیجا سہیں!

یہ نہ ہو کر دے انہیں تو اپنی دنیا کے سپرد
یہ نہ ہو یہ لال ہوں بزمِ تماشا کے سپرد!

یہ نہ ہو ان ضدیوں کی کوئی ضد پوری نہ ہو!
یعنی پائے شوق میں زنجیرِ مجبوری نہ ہو!

یہ نہ ہو اس نیکدل بیوہ کو دنیا ہو وبال
یہ نہ ہو جینا اسے مرنے سے ہو جائے محال!

مفلسی بڑھکر کہیں عصمت کی دشمن ہو نہ جائے
مامتا اولاد کی ایماں کی رہزن ہو نہ جائے!

یہ نہ ہو سرمایۂ آہ و فغاں ہو زندگی
یہ نہ ہو دوشِ عناصر پر گراں ہو زندگی

میرے معصوموں کی جانِ زار کا والی ہے تو
میرے اس تاریک ویراں گھر کا رکھوالی ہے تو"

کہتے کہتے یک بیک خاموش ہو جاتا ہے وہ
موت کے دامن میں گہری نیند سو جاتا ہے وہ

کیا یہی انصافِ یزدانی ہے اے پروردگار!
کیا ترے بندے یونہی سہتے ہیں بند و نکبت شکار

کیا تری طاعت گذاری کا یہی انعام ہے؟
چاہنے والوں کا تیرے کیا یہی انجام ہے؟

کیا نہیں تجھ تک رسائی ناتواں آواز کی؟
کیا تجھے بھاتی نہیں لے آنسوؤں کے ساز کی؟

یہ تری غیرت میں جذبِ بے نیازی ہائے ہائے
یہ عنایت، یہ کرم، یہ دلنوازی ہائے ہائے
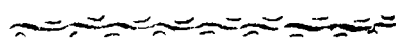
جناب سید راحت مولائی بی۔ اے (علیگ)

افسانہ نگاری

خدا سمجھے ان ایڈیٹروں کی قوم کو جس طرح خود ان لوگوں کو سوائے رسالہ کے کام کے دنیا کی کسی اور بات کی فکر نہیں ہوتی اسی طرح دوسروں کو بھی یہ لوگ "خیالی" سمجھتے ہیں۔ جب چاہا اور جس کے نام چاہا کھینچ مارا کہ "... افسانہ نمبر ہوگا۔ تمہارے مضمون کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت۔ سمجھے؟" بھلا اسے کون نہ سمجھے گا۔ اچھا اور بہت اچھا۔ انتہائی عدیم الفرصتی کے عالم میں ادیب صاحب کے حکم اور ناظرین "ادب لطیف" کی خاطر چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔

(راحت)

ادب کی دو اقسام ہو جاسکتی ہیں۔ ایک وہ ادب جو علمیت و افادیت سے متعلق ہے۔ دوسرا وہ ادب ہے جو بیک وقت مقصد ادب بھی پورا کرے اور لوگوں کے دماغوں میں آرام و سکون کا باعث بھی بن سکے۔ افسانہ مؤخر الذکر قسم کی تحت میں آتا ہے۔

اول اول ہندوستان میں افسانہ نگاری کی حد فوق الفطرت قصوں اور جن و پری کی کہانیوں تک محدود تھی متاخرین میں انشاء اللہ خاں اور جوش (سلطان حیدر) نے اس کو وہ ریڑھ لگائی کہ بیان اردو میں اسکا وجود قائم رہنا بھی ناممکن سا نظر آنے لگا۔ انہوں نے خشک پند و نصائح کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ مگر رنگینی سے محروم لطافت سے عاری دلچسپی سے خالی اور رومانیت سے ناآشنا۔ حالانکہ افسانے کو نفسیات اور اسکے جذبات سے جس قدر تعلق ہے اتنا انسانی زندگی کے کسی اور پہلو سے نہیں۔ وہ دراصل صحیح رومان انگیزی چاہتا ہے مگر نصائح کے اسباق میں یہ چیز کہاں؟ وہاں تو بجائے تائید کے اسکی

اور تضعیف ہوتی ہے۔ بہتیرے علوم!! بھی تہذیب و تمدن اور ضروریات کی وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ہزارہا تغیر رونما ہوتے رہے۔ اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہندوستان کی رومان پرست طبائع اپنے رومان انگیز ماحول میں رہ کر بہ نسبت کسی دیگر ملک کے بہت بلند افسانہ نویسی کے وہ نازک نازک منازل طے کرلیں جہاں انتہائی ترقی یافتہ ادیب بھی لغزش کھاجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے مشہور افسانہ نگار و ناول نویس ٹامس ہارڈی کو لے لیجئے۔ ابتداء سے آج تک آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ آہستہ آہستہ کسی دوسری دنیا کی طرف منتقل ہو رہے ہیں یا کئے جارہے ہیں، جہاں جذبات کی بلندی، خیالات کی رفعت، اور واقعات کا تنوع اس قدر حیرت انگیز اور رومان گیر ہوتا چلا جارہا ہے کہ بایدوشاید لیکن اسجگہ پہنچکر آپ بیان نہیں کرسکتے کہ وہ جس طرح انسان کو ان بلندیوں پر لے گیا ہے اسی طرح اسکو آہستہ آہستہ انتہا تک پہنچادے۔ وہ خود اپنے جذبات

سے مجبور ہوکر بہت جلد ہی اسی سطح پر آجانا چاہتا ہے۔ جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا اور جہاں پر وہ رہنے کے لئے مجبور ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکا ہر افسانہ اور ہر ناول اختتام پر پہونچکر اسکی ناکامی و ناقابلیت کا ثبوت بن جاتا ہے۔ یہ حال ہے وہاں کا جسکو انتہائی ترقی یافتہ ہونے پر فخر ہے۔ اسکے برخلاف ہندوستان کی ایک تہی مایہ اور غیر ترقی یافتہ زبان کو لیجئے جسمیں اور شعبہ جاتِ ادب کا حال کتنا ہی ناگفتہ بہ ہو، مگر افسانہ نویسی کے لئے اور بدنامی کا داغ بنا ہوا تھا۔ اس زبان کے اس عالم بے کسی میں بھی ترقی کرتا جاتا ہے۔ پریم چند مجتہدانہ قلم اور مفکرانہ دماغ لیکر اٹھتا ہے۔ اور افسانہ کی گری ہوئی حالت کو سنبھالتا ہی نہیں بلکہ دنیائے افسانہ میں ایک حشر بھی برپا کر دیتا ہے جو اسکی واحد علمیت و شخصیت پر دال ہے۔ اسکو اپنے جذبات پر اس بلا کا قابو ہے جیسے ایک ماہر سوار کو اپنے تیز طرار اور شریر جانور پر۔ وہ جب اور جدھر چاہتا ہے اس کی باگیں موڑتا رہتا ہے۔ اور جہاں چاہتا ہے آہستہ آہستہ اس کی رفتار کم کرتا چلا جاتا ہے کہیں کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اسکو یک لخت اس طرح ساکت کر دیتا ہے کہ انسان خواہ مخواہ چونک پڑے۔ اکثر نقادوں کے نزدیک یہ ایک قسم کی کمزوری ہے مگر ہم اسکو افسانہ نویسی اور بالعموم جاسوسی افسانوں کی جان اور ان کا حُسن سمجھتے ہیں۔ یہ چیز بڑی حد تک امریکن افسانوں میں پائی جاتی ہے اور وہ شائد اسلئے کہ وہاں کی حوصلہ مند اور متجسس طبائع ہر چیز کی تکمیل ادیب پر چھوڑ دینے کی عادی نہیں بلکہ اپنے ذہنی ارتسامات اور ذاتی تجربات کو بھی کڑیاں ملانے میں کام میں لاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ موجودہ دنیائے ادب میں امریکہ کے افسانے سب سے بلند و ارفع جگہ حاصل کئے ہوئے ہیں انگلینڈ، مصر اور فرانس جیسے رومانیت میں پلنے والے ممالک بھی ابھی نہیں پہونچ سکے ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر افسانہ نگار اپنے خیالات، اپنے جذبات، ذاتی تجربات اور حقیقی واقعات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ ترجمانی متنوع ہوتی جاتی ہے افسانہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اسکے موضوع کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ اسلئے کوئی ایسا معیار قائم کرنا جسپر افسانہ کو آزمایا جاسکے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کثرت و تعدد کے پردہ میں بھی کوئی نہ کوئی وحدت و یکتائی، اس تغیر و تجدد کے اندر بھی کوئی نہ کوئی ثبات و قیام اور اس اختلاف و تنوع کی تہ میں بھی کوئی نہ کوئی اشتراک و یگانگی ایسی ضرور ہے، جو تمام مختلف نیرنگیوں کا مبدا اور حقیقت کہی جاسکتی ہے اس لئے ماحول اور فضا بدلجانے کے باوجود بھی علاوہ موروثی احساسات و داعیاتِ انسانی کے چند چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں کسی قسم کا تغیر قطعی ناممکن ہوتا ہے۔ افسانوں میں بعض خصوصیات یکساں ہوتی ہیں اور بعض یکساں ہونی چاہئیں۔ اس لحاظ سے ذیل کی چند سطور کا مطالعہ شائد افسانہ نویسی میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

کوئی اچھا افسانہ پڑھتے وقت جب انسانی خیالات و جذبات اور فطری رجحانات ابھر کر وجدانِ صحیح سے ٹکراتے ہوئے، ساحلِ محویت سے ہم آغوش ہوجاتے ہیں تو ان میں لطیف کیفیت اور ایک دلفریب رنگینی پیدا ہوجاتی ہے جو حسیاتِ باطنی کی جان ہے اور یہی **"سرور"** مقصود و منتہائے جذبات ہے اسوقت قاری کا مادی ادراک مردہ اور اس کے دل پر ایک حدت نما باطنی ادراک مسلط ہوجاتا ہے۔ ارتفاعِ تخیلات سے لمحہ بھر کے لئے

فاسد خیالات مٹ جاتے ہیں۔ خیال کی پرواز من و تو اور بیم و رجا کی قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے جسم و اسم کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور قلب میں ایک عجیب راحت و مسرت لہرانے لگتی ہے گویا وہم کا بادل پھٹکر سرور و انبساط کا چاند نکل آتا ہے۔ اور اسی طرح ایک افسانہ پڑھتے وقت حالانکہ ہمیں اسکا احساس نہیں ہوتا مگر لکھنے والے کی قوت باطنی اس خیالی محبت کو جو مرد و عورت کے افعال کا مفہوم کلی ہے قلب کی نورانیت کے غلبہ سے متجلی کر کے ہمارے وجدان میں جلوہ گر کرتی ہے اور اس لذت کا مزہ چکھا دیتی ہے۔ اسکو ادب کی "لذت بخش" قوت کہتے ہیں۔ دوسری قوت "تعلیمی" کہلاتی ہے اس قوت کا وظیفہ یہی ہے کہ اس خصوصیات شخصی سے منزہ جذبہ کو قاری پر کسی ایسے ذریعہ سے منکشف کر دے جس سے اس کے قلب کی تجلیات مسرت محض بنکر لہرانے لگیں ہمیں یہاں اس جذبہ کی تحلیل یعنی اسکے محرکات، اثرات اور منقلبات وغیرہ میں پڑنا نہیں چاہئے (کیونکہ مضمون کی طوالت کا خوف مانع ہے) اسی منزہ جذبہ کو "افسانوی دلچسپی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو افسانہ نویس علم جذبات کی ان تنگ و نازک وادیوں پر کما حقہٗ عبور رکھتے ہیں اور اس جذبہ کو بہتر سے بہتر صورت میں پیدا کر سکتے ہیں ان کے افسانے ہمیشہ صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک اچھے افسانہ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر قاری کی فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس دلچسپی کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچکر اسکو اس حد تک ابھارے کہ نہ تو وہ ضرورت سے زیادہ ابھر کر قاری کے لئے وبال جان بنے اور نہ اس کا ابھار خود افسانہ نگار کو سنبھالنے میں مشکل ہو۔ افسانہ نویس کو سب سے پہلا خیال یہ ہونا چاہئے کہ اسکا کوئی افسانہ زیادہ سے زیادہ کن طبیعتوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی تعداد پر وہ اپنے افسانے کی دلچسپی

کی بنیاد رکھے۔ ہم نے سوسائٹی کے ہر فرد کے مزاج کی دلچسپی کا سامان اگر کسی مصنف کے یہاں با فراط پایا ہے تو وہ پروفیسر قبلہ رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ہیں یہی چیز خواجہ منظور صاحب موجودہ صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے افسانوں میں بھی نمایاں ہے لیکن وہ بعض اوقات اسقدر بلند ہو جاتے ہیں کہ ان کی ترجمانی صرف خواص کے دائرہ ہی میں مقبول ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک ان کی رفعت خیالی ہے۔

افسانہ کی جان اس کی بنیاد کی جدت اور اپچ ہے۔ یعنی افسانہ کا جو پلاٹ تیار کیا جائے وہ قطعاً طبعزاد ہو، فکر و اجتہاد اگرچہ ہر چیز میں ایک مصنوعی رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر افسانے کے پلاٹ پر جس قدر غور کیا جائیگا اور جتنی بھی اس میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش ہو گی اتنا ہی وہ افسانہ خوبصورت اور دلنشیں ہوگا چبائے ہوئے نوالے چبانا، روح کی پستی اور دماغ کے اضمحلال کی چغلی کھاتا ہے۔ تقلید حریت رائے کو فنا کر دیتی ہے۔ پلاٹ جتنا بھی نیا پرندرت مگر صاف اور دلچسپ ہوگا، اتنی ہی افسانہ کی اہمیت بڑھیگی۔ پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار کی تخلیق بھی افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے۔ بالعموم افسانہ کے کردار اپنے اندر کوئی ندرت کوئی نئی چیز نہیں رکھتے انکے فطری پہلوؤں کو اجاگر نہیں کیا جاتا، بلکہ اکثر ایک ہی بات کو افسانہ نویس طرح طرح سے دہراتا رہتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ہیرو کے لئے کون کون سے صفات ضروری ہیں اور کس ہیرو کے لئے کون سا ذیلی کردار قائم کریں۔ وہ افسانہ نویس اپنی کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جسمیں اپنی ہی مخلوق پیدا کرنے کی قوت و قدرت

نہیں۔ ہر افسانہ نئے پلاٹ اور نئے کرداروں کے ساتھ قارئین کے سامنے آتا جاتا ہے۔ اسی سے افسانہ نویس کی وسعتِ نظری، تبحرِ علمی، حقیقت بینی اور فطرت شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے ساتھ نفسیاتی یا روحانی ارتقاء کے لئے ایسی چیز پیش کی جائے جو یا تو عام نظروں سے پوشیدہ ہو یا جہاں عام نظریں پہنچ ہی نہ سکتی ہوں۔ اس سے افسانہ نگار حصولِ مقصد ہی میں ہزارہا آسانیاں ہی نہ پائیگا۔ بلکہ افسانے میں ایک عجیب اور مافوق البشری دلچسپی بھی پیدا کر سکیگا۔

پلاٹ کی تخلیق، ابتدا، عروج اور اختتام میں افسانہ نویس کو بڑے بڑے پیچیدہ مسائل سے بحث کرنی پڑتی ہے۔ تمدنی، معاشرتی، نفسیاتی، فلسفیانہ وغیرہ ایسی گتھیاں آجاتی ہیں کہ ان میں اصل راہ کا قائم رکھنا اور اس پر سے گذر جانا تو درکنار افسانہ نویس ان میں الجھ کر کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے ہر مسئلہ حیات اپنے اندر ہزارہا الجھاؤ اور پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ اور ان الجھاؤ اور پیچیدگیوں کو سلجھانا اور دور کرنا ہی افسانہ نگار کا فرض نہیں بلکہ انکو قاری کیلئے آسان کر دینا بھی اسکے ذمہ ہے۔ انسانی زندگی کا نفسیاتی حصہ جسقدر اہم اور فکر خواہ ہے کوئی اور نہیں۔ اس میدان میں بڑے بڑے ماہرین بھی ایک مرتبہ ضرور متزلزل ہو جاتے ہیں لیکن حضرت ذوقی رامپوری اس رنگ میں ایک کامیاب طرز اور واحد شخصیت کے مالک تھے۔ خدا جانے انہوں نے کیوں نوجوانوں کی بیکاری سے متاثر ہو کر اپنا رنگ معاشرتی کر لیا ہے نوجوانوں کو اس سے کچھ فائدہ پہنچے تو پہنچے مگر اردو ادب نفسیاتی افسانوں کی کمی کو مشکل ہی سے پورا کر سکیگا۔ علی عباس حسینی فلسفیانہ نقطۂ نظر کے ماتحت خوب لکھ سکتے اور لکھتے ہیں۔ قدیم طریقہ محبت کو مجنوں گورکھپوری سے بہتر کوئی بیان نہیں کر سکا۔ خواجہ منظور اور جلیس قدوائی نے مغربی تصویروں کو مشرقی چوکھٹوں میں لگا کر جدتِ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا سید احمد نے تاریخی افسانوں سے ایک نئے باب کا افتتاح کیا تھا مگر ان کی خاموشی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو مر گئے یا اب انکے پاس مواد نہیں رہا۔ منصور احمد سالک، سجاد حیدر وغیرہ نے بھی کسی نہ کسی نئے مسئلہ کو چھیڑ کر اپنایا ہے۔ اور ان لوگوں کی مساعی قابلِ شکریہ ہیں۔ اسوقت شبیر حسن بھی افسانہ خوب لکھ رہے ہیں خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ میرزا ادیب کے معاشرتی افسانوں سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ معاشرۂ انسانی پر کافی عبور رکھتے ہیں۔

ہماری نظر سے ابھی تک کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں گذرا جو ہر مسئلہ حیات پر کم از کم اتنی روشنی ڈال سکے جس سے متلاشیانِ حقیقت کی تشنگی کچھ دیر کے لئے دور ہو جائے۔ نسائیت و نسوانیت اسقدر وسیع موضوع ہے کہ صرف اس ایک مسئلہ پر کوئی یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے ہر پہلو سے اس پر بحث کر لی ہے۔ دنیائے ادب میں اسوقت تک صرف فرانسیسی افسانہ نگار **بالزاک** ایک ایسا مصنف ہے جسنے اس موضوع پر پوری واقفیت و علمیت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے مگر وہ بھی بعض بعض جگہ ضرورت سے زیادہ عریاں ہو گیا ہے۔ اور یہ مذاقِ سلیم پر ایک طرح کا بار ہوتا ہے۔ بہرحال فن کاری اسی کا نام ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو چھیڑنے کے بعد افسانہ نگار اپنا دامن بچاتا ہوا اور قاری کو کو درپردہ ہر بات سمجھاتا ہوا نکل جائے۔ مادہ اور اسکے ملحقات ہیں مختلف ذرائع سے حسین تعبیر کی آفرینش ہی دراصل فن کی تخلیق ہے۔ اگر یہ نہیں تو افسانہ بیکار ہے۔

ان مسائل کو بیان کرتے وقت اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ

افسانہ نویس غیر معروف و نامانوس فضا میں پہنچ جاتا ہے نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ کوئی کمزوری نہیں۔ کیونکہ اسکا اصلی سبب جذبات کی شدت ہے۔ مگر فنی زاویۂ نگاہ سے یہ ایک عیب ہے۔ اسلئے کہ اگر ایسا ہے تو افسانہ نویس اور ایک عام انسان میں کوئی چیز قابل امتیاز نہ رہے گی۔ جو افسانہ نویس جذبات کی شدت پر قابو نہیں پاسکتا اسکو اس وقت تک افسانہ نویسی کی مشق کرنی چاہئیے۔ جب تک وہ اس میں سکون اور صحیح روانی نہ پیدا کرلے۔ افسانہ وہی بلند ہوگا جس میں ہر ادق سے ادق مسئلہ کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار تمدنی حالات سیاسی واقعات، ملکی رسومات اور قومی روایات کو بھی ملحوظ و قائم رکھے۔ خالص مشرقی رنگ میں رنگے ہوئے افسانے سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے یہاں ملتے ہیں۔ اور نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری نے اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر موجودہ سوسائٹی اور اسکے عادات و اطوار کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

ہماری نظر سے بہت سے ایسے افسانے بھی گذرے ہیں۔ جہاں عہد عتیق کی کوئی مصری داستان تو بیان کی جارہی ہے، مگر منظر کشی کے سلسلہ میں بجائے دریائے نیل کے دریائے گنگا افسانہ نگار کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ یا کسی افسانے کا ارضیہ تو کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ مگر افسانہ صرف تمدن کے جال میں اول سے آخر تک پھنسا رہتا ہے۔ یہ بھی ایک زبردست کمی ہے۔ افسانہ جس وقت، جس جگہ، جس تمدن، جس قوم اور جس زمانہ کے متعلق لکھا جائے، اس کو اسی وقت، اسی جگہ، اسی تمدن، اسی قوم اور اسی زمانہ کا صحیح اور حقیقی آئینہ ہونا چاہئیے۔ یہ غلطی اکثر ناواقفیت کی بناء پر بھی ہوجاتی ہے۔ ایسے ناواقف افسانہ نویسوں کے لئے ہماری یہی ہمدردانہ صلاح ہوسکتی ہے کہ وہ ایسے موضوع پر قلم ہی نہ اٹھائیں، یا اسکے متعلق ہر ممکن معلومات بھی بہم پہنچائیں۔ یہ غلطیاں طبعزاد افسانوں تو درکنار، اکثر تراجم میں بھی پائی گئی ہیں۔ جو حد درجہ الم ناک ہیں۔

افسانہ کا پیرایہ افسانوی اور رومان انگیز ہونا چاہیئے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ کوئی عہدِ قدیم کی داستان آپ کی توجہ کا مرکز جس قدر تیزی سے بنجاتی ہے۔ آتنا کوئی حال کا افسانہ نہیں بنتا۔ وجہ صرف یہی ہے کہ حال واقعیت سے لبریز ہوتا ہے۔ اور ماضی افسانویت سے پُر۔ خشک سے خشک طبائع رومانیت انگیز چیز کی طرف جلد رجوع ہوجاتی ہیں۔ آدم کی اس خلقی فطرت نے اس کو حوا کے وجود میں گم کردیا تھا۔ اور ہم اور آپ اسی آدم کی اولاد میں سے ہیں۔ فطرت کی اس عریانیت سے افسانہ نویس جہاں تک ہوسکے فائدہ اٹھائے۔ اسکا طرز جتنا لطیف، اس کا اظہار جتنا رومان انگیز اور اسکا بیان جتنا افسانوی ہوگا، آتنا ہی قاری کے دل میں گھر کریگا۔ لطیف الدین احمد اکبر آبادی (ل۔ احمد) نیاز فتحپوری، امتیاز علی تاج (س) حجاب تاج کے افسانے کیوں اسقدر دلچسپ ہوتے ہیں۔ اختر شیرانی کی شاعری کیوں ہماری توجہ کو جذب کرلیتی ہے۔ اقبال کا پیامِ مشرق، اور اسکی تمام اردو تصنیفات کیوں بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، صرف اسلئے کہ ان لوگوں کا لطیف پیرایہ اور رومان خیز ماحول قاری کے دل پر ایک محویت ایک لانہایت کا عالم طاری کردیتا ہے، اور اسی محویت کے عالم میں ایک سمجھدار افسانہ نویس اگر تلخ سے تلخ حقیقت کو بے نقاب انداز سے ناگوار نصیحت پر اصرار بھی کرتا ہے تو قاری اسکو برضا و رغبت قبول کرتا چلا جاتا ہے، اس طرح افسانہ نویس پردہ ہی پردہ [illegible]

بھی کرسکتا ہے اور اس انداز سے کہ قاری کو اسکا علم بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ افسانہ نویس کو اظہار جذبات کے وقت فطرت اور آرٹ کو ایک دوسرے سے اس طرح پیوست کر دینا چاہیئے کہ ایک کا دوسرے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو۔ زبان میں زور الفاظ میں اثر جملوں میں روانی اور خیالات میں ایک بہاؤ ہونا چاہیئے جس سے نہ تو قاری ہی ٹھوکریں کھائے اور نہ مصنف ہی کسی پہلو کو تشنہ چھوڑ جائے۔ اگر افسانہ کی رنگینئی بیان علیحدہ کرکے صرف تعلیم ہی کا پہلو افسانہ میں نمایاں رکھا جائے تو اسکی افسانویت فنا ہو جائے گی۔ اور وہ ایک خشک اور بدمزہ کہانی سے زیادہ نہ رہے گا۔

ہمیں موجودہ افسانوں میں ایک اور مرض بھی عام نظر آتا ہے۔ ہر افسانہ نگار کو تمام کوششیں اس امر پر صرف کرتے پایا گیا ہے کہ وہ جذبات حزن ویاس سے افسانے میں اثر و لطافت پیدا کرے۔ اور یہ شاید اسلئے کہ حزن ویاس کے پیدا کردہ خیالات وتاثرات انسان کے دل پر زیادہ دیر تک مرتسم رہتے ہیں۔ مگر ہم اس حقیقت کی اسلئے ہم نوائی نہیں کرسکتے کہ اگر یہی جذبہ عام ہو گیا تو سارا ادب ادیب کی بیوگی کے سوگ کے سوا اور کچھ بھی نہ رہیگا۔ حزن ویاس کے خیالات جہاں دیرپا نقوش چھوڑتے ہیں وہاں دل ودماغ پر ایک قنوطیت اور ایک مردنی کا عالم بھی طاری کر دیتے ہیں۔ حوصلہ مندی کے تمام جذبات یا تو مردہ ہو جاتے ہیں۔ یا ابھرنے کے قابل نہیں رہتے۔ انسان تمام فطری خوبیوں کو کھو کر وہم وشک اور خوف وہیبت کا شکار بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی مسرت اور قہقہے سے سرتاپا محروم ہو جاتی ہے۔ زبان "غنائی ادب" سے خالی رہ جاتی ہے۔ ہاں ہمیں اس وقت کوئی اعتراض نہ ہوگا جب صرف چند افسانہ نگار اس رنگ میں طبع آزمائی کرتے رہیں لیکن ہر افسانہ نویس کا متشائم چیز پیش کرنا دراصل ادب کی بدنصیبی ہے۔ اس نوع میں نیاز کی قدرت کاملہ کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اردو ادب میں ایک نیاز کی ہستی ایسی ضرور ہے جس نے پھول اور کانٹے، آنسو اور تبسم، شیون اور قہقہہ کو واقعیت و افسانویت کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو وہ دنیائیں بسائی ہیں جو آپ کو مشکل ہی سے کسی دوسرے ادب میں مل سکتی ہیں

افسانہ کی سب سے آخری اور سب سے ضروری چیز افسانہ نگار کا نصب العین ہے۔ اگر اسکے سامنے کوئی بلند اعلیٰ نصب العین نہیں ہے تو اس کا افسانہ ایک ایسی چیز ہوگی جس کے اظہار کیلئے اردو زبان میں کوئی لفظ ہی نہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہوگا۔ اگرچہ افسانہ کا پلاٹ اسکی جان ہوتا ہے مگر نصب العین کو اسکی روح بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر ہر افسانہ نویس پلاٹ بناتا ہے۔ پلاٹ تیار کرکے کوئی نصب العین قائم کرنا یا قائم کرنے کی کوشش کرنا اُسکے اثر کو ٹھس پھسا بنا دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ افسانہ کا پلاٹ آپ کے دماغ میں اتفاقاً آجائے، چلتے پھرتے' اُٹھتے بیٹھتے' یا کھاتے پیتے' اس سے شاید آپ یہ سوچیں کہ ہمارے دل میں کوئی نصب العین تو تھا نہیں پھر یہ پلاٹ کیسے تعمیر ہو گیا، واقعہ یہ نہیں ہے۔ آپ کے دماغ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نصب العین رہتا ہے جس کی آپ کو کسی وقت بھی خبر نہیں ہوسکتی۔ اگر آپ کی رُوح پاک اعمال نیک اور خیالات بلند ہیں تو آپ کے نصب العین کی رفعت ظاہر ہوگی۔ افسانہ نگار کا دامن ذہنی کمالات کے ساتھ حسن سیرت اور حسن عمل کے موتیوں سے بھی یکساں طور پر

لبریز ہونا چاہیئے۔ خیالات و اعمال ایک دوسرے کے علت و معلول ہیں۔ خیال سے عمل اور عمل سے خیال پیدا ہوتا ہے اگر عمل اور خیال کی دنیا صحیح طور پر بسائی گئی ہے تو افسانہ بھی اسی خوبی کا مظہر ہوگا۔ ایک پست فطرت انسان کوئی نصب العین قائم ہی نہیں کر سکتا اور اگر کر سکتا ہے تو پست۔ اسلئے بھی کسی نہ کسی بلند مقصد کا ہر بلند فطرت انسان میں رہنا ضروری ہے اور یہی ہمہ دم کی موجودگی خیالات کی اتلافی تحریکات کو تحت الشعوری حالت میں اس طرح ایک دم ایک مرکز پر جمع کر دیتی ہے کہ آپ کو اسکا پتہ بھی نہیں ہوتا اور واقعات کا لامتناہی سلسلہ ایک فلم کی طرح آپ کے دماغ کی آنکھوں کے سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ افسانہ نویس ہی کو نہیں بلکہ ہر ادیب کو دل و دماغ، عمل و خیال، اور روح کی ہر بندش کو توڑ کر بالکل ایسا آزاد اور معصوم رہنا چاہیئے جیسا کہ ایک نوزائیدہ بچہ تقلید و غلامی روح کو پست و مضمحل کر دیتی ہیں۔ اور انسانی حریت و آزادی فنا۔ پھر اس پر ایک عجیب جذبہ طاری ہوتا ہے۔ بہرحال ہمارا خیال ہے کہ آپ ہمارے دونوں الفاظ "آزاد اور معصوم" کے قیمتی معانی سمجھ سکیں گے۔ آزادی بغیر معصومیت، یا معصومیت بغیر آزادی بہرنوع بیکار ہے، جب تک دونوں چیزیں یکجا نہ ہوں گی، افسانہ نویس کبھی کوئی بلند و ارفع نصب العین نہ پیش کر سکے گا۔ اور آج کل کے افسانہ نگاروں میں، سوائے چند مستثنیات کے، یہ مرض بھی عام ہے، شاید ان میں جلد ہی اپنے ادب اور اپنی قوم پر رحم کھانے کی توفیق پیدا ہو سکے۔

یاد رکھئے کہ افسانہ وہ ہی عمدہ، بلند اور مکمل ہوگا جو ایک آزاد دل کی کوشش، ایک حوصلہ مند قلم کی جنبش، ایک تجربہ کار دماغ کا نچوڑ، ایک مشاہدہ نواز نظر کا پیام اور ایک معصوم روح کی پکار ہو ٭

اوپندر ناتھ اشک بی۔اے۔ ایل ایل بی۔

سنگدِل

اس وقت اپنی مرحوم بیوی کے سرہانے کھڑے میری آنکھوں کے سامنے سروپ کی سنگدلی کے تمام واقعات پھر گئے۔

× × × × × ×

شام کا وقت تھا۔ اور چھایا کو بیمار ہوئے ایک سال ہوا ہوگا میں نیچے صحن میں بیٹھا اسکے لئے جوشاندہ تیار کر رہا تھا کہ وہ بالائی منزل سے اتری اور کچھ اداس سی تیزی کے ساتھ میرے سامنے سے گذر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے جوشاندہ وہیں چھوڑ دیا اور بھاگا بھاگا اس کے کمرے میں پہنچا۔ بستر میں منہ چھپائے وہ رو رہی تھی۔

چپ چاپ کھڑا میں کچھ لمحوں کے لئے اُسے دیکھتا رہا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اور دل میں شبہ تھا کہ ضرور کسی نے اُسے کوئی نہ کوئی ناگوار بات کہدی ہے۔ کچھ دیر پہلے تو وہ اوپر گئی تھی کہ ذرا ہوا میں بیٹھے۔ نیچے بہت گرمی تھی۔ میں نے ہی کہا تھا۔ — ذرا ہوا میں چلی جاؤ۔ اور اب وہ اتنی جلدی آ گئی تھی۔ آگے بڑھکر میں نے اسکے کندھے کو چھوا۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

— "چھایا!"

اس نے کروٹ لیکر میری طرف دیکھا۔ بخار سے اسکا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں اشک آلود تھیں۔

"— کیا بات ہے؟"

ایک لمحہ کے لئے وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر اس نے کہا — "مجھے ہسپتال میں داخل کرا دو" اور آنسو بے اختیار اسکی آنکھوں سے بہنے لگے۔

میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسکا سر اپنی گود میں لیکر میں نے رومال سے اُس کی آنکھیں پونچھیں۔

"— آخر بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟"

اُس نے سسکتے ہوئے کہا "مجھے دق ہو گیا ہے۔ گھر میں رہونگی تو دوسروں کی جان جانے کا بھی ڈر رہے گا۔ ہسپتال میں داخل کرا دوگے تو زندگی کے جو ایک دو دن باقی ہیں آرام سے کٹ جائینگے اور پھر تمہیں بھی ایک دو دن آرام ملے گا اور گھر والوں کو بھی تکلیف نہ ہوگی۔"

میرا گلا سوکھا جا رہا تھا۔ میں نے کہا — "چھایا! تم میری تکلیف کا خیال نہ کرو۔ میری جان لیکر بھی اگر تمہیں کوئی صحت بخش دے تو دینے میں تامل نہ کروں۔ یہ تو بتاؤ۔ تمہیں یہ کیا کس نے کہ تمہیں دق ہو گیا ہے۔"

"— کہے گا کون۔ نظر جو آ رہا ہے قسمت میں جو جو کچھ سہنا ہے۔ سہنا پڑے گا جو جو سننا ہے۔ سننا پڑے گا۔ میں تو یہ سوچتی ہوں کہ اگر یہ ماتما کو اٹھانا ہی تھا۔ تو یونہی اٹھا لیتا

یوں تڑپنے اور دوسروں کو تڑپانے کے لئے یہ روگ کیوں لگا دیا۔

میرا گلا بھر آیا۔ میں نے کہا ــــ "چھایا! میں نے منت کرتا ہوں تم بتاؤ تو سہی تم سے کس نے یہ بات کہی؟"

وہ بولی ــــ "بات کچھ نہیں۔ یہاں دم گھٹ رہا تھا۔ تم نے اصرار کیا تو اوپر چلی گئی۔ غلطی سے اپنے بستر کی بجائے سروپ کے بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا تمہیں آپ تو مرنا ہے۔ دوسروں کو ساتھ کیوں لئے مرتی ہو۔ اور نہ جانے اس نے کیا کیا باتیں کیں۔ تم ہی بتاؤ۔ کیا میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ مجھ سے تو جہاں تک ہوتا ہے، خود ہی اس بات کا خیال رکھتی ہوں کسی سے چھوتی تک نہیں۔ اپنے بچے تک کو گود میں نہیں لیتی۔"

وہ زور زور سے رونے لگی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہیں بیٹھا میں اپنی بے بسی پر غور کرنے لگا جی میں آتی تھی۔ جاکر اسکا اور اپنا سر پھوڑ دوں۔ اتنا شور مچاؤں کہ سب کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ یہ سب ماں باپ کی تعلیم کا ہی تو اثر تھا۔ جو مجھے اسکے پاس جانے سے روکتے تھے۔ وہ میرے بھائی کو کیوں نہ روکتے۔ اسوقت مجھے ماں کی پاٹھ پوجا نیم دھرم اپ پن کی سب باتیں فضول اور بے معنی معلوم ہوئیں۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں چھایا کو لاہور لے جاؤنگا۔ جہاں سروپ جیسے سنگدل بستے ہوں وہاں بیمار کو رکھنا۔ اُسے جیتے جی موت کے منہ جھونکنا ہے۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں جس بات سے ڈرتا تھا۔ آخر وہی ہوئی۔ چاہتا تھا کوئی اسکا حوصلہ نہ توڑے۔ اور یہ سروپ نے اس نے اُسے وہی بات کہدی۔ تمہیں تو مرنا ہے ہمیں بھی ساتھ کیوں لئے مرتی ہو۔ کتنے سخت الفاظ تھے یہ! انکا ایک ایک لفظ میرے دل میں کچوکے دے رہا تھا۔ اسوقت اپنی بے بسی پر میرے آنسو آگئے۔ اور میں نے چادر کے آنچل سے انہیں پونچھ ڈالا لیکن دوسرے لمحہ یہ بے بضاعتی کا جذبہ دور ہو گیا۔ اور اسکی جگہ استحکام نے لے لی۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں علی الصبح ہی چھایا کو لے کر لاہور چلا جاؤنگا۔

اور ابھی تین ہی بجے ہونگے کہ میں نے ماں کو جگایا۔

اور کہا ــــ "میں لاہور جا رہا ہوں!"

وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔

"ــــ اُٹھ کر کچھ تھوڑا بہت سامان تیار کرا دو۔"

اُنہوں نے میرے بکھرے ہوئے بالوں اور اُڑے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ بولیں ــــ "پاگل ہو گئے ہو۔"

"ــــ ہاں۔"

وہ چپ ہو گئیں۔

اور پھر جلدی جلدی تیاری کر کے میں تانگہ لے آیا۔ اور جب ہم چلنے لگے تو میں نے بستر سے سوئے ہوئے بچے کو اُٹھایا۔

ماں رو پڑیں ــــ "اسے بھی کیوں مجھ سے چھین رہے ہو ــــ"

میں نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔ ماں کے پاؤں چھوئے اور چھایا کو لیکر تیار ہو گیا۔ ماں نے چلتے وقت میرے ہاتھ دس دس روپے کے دو نوٹ رکھدیئے۔ لیکن سروپ جاگتے ہوئے بھی نیچے نہ اترا۔ ہاں اس نے وہیں اوپر لیٹے لیٹے اُسے ڈانٹ دیا۔ اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر سا اور بچہ سہم کر چپ ہو گیا۔

اس وقت میرے دل سے ایک لمبی آہ نکلی۔ اور میں کچھ بے ہوشی کی سی حالت میں سیڑھیاں اتر آیا۔

× × × × × ×

پھر سات مہینے بعد۔ ایک رات تھی۔ دکھ کی طرح کالی اور مصیبت کی طرح بھیانک۔ ایک بجا ہوگا۔ میں نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اور کوئی آواز نہ آنے پر میں نے ایک لمبا سانس لیکر اپنے نزدیک ہی کرسی پر لیٹی ہوئی نحیف و زار چھایا پر نظر ڈالی تھی! اُن دو قلیوں کو بھی دیکھا تھا جو سٹیشن سے اُسے اُٹھا کر لائے تھے۔ محلے کے لیمپ کی مدہم روشنی میں یہ سب کچھ خواب کا سا دکھائی دیتا تھا۔

میں نے دوبارہ آواز دی اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ مکان کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے جنگلی کبوتروں نے ڈر کر پر پھڑپھڑائے۔ اوپر کچھ آواز سی سنائی دی۔ میں پھر کنڈی کھٹکھٹانے ہی لگا تھا کہ رُک گیا۔ ان چند لمحوں میں یہ طویل اور اندوہناک سات مہینے اپنی گوناگوں مصیبتوں کے ساتھ میری نگاہ تصور کے سامنے پھر گئے ——— لاہور میں حکیموں اور ڈاکٹروں کے پیچھے مارا مارا پھرنا سب طرف سے مایوس ہوکر ہسپتال کی شرن لینا۔ خرچ چلانے کیلئے رات دن کام کرنا۔ ایکس رے۔ تپ دق کا فیصلہ۔ ہسپتال کے امید و بیم کے دن۔ کبھی امید کا سہارا دینا اور کوئی یاس کا دامن پکڑ لینا۔ گرمیوں کا تکلیف دہ موسم۔ پالم پور۔ پہاڑ کی پیچش۔ واپسی اور اب ہڈیوں کا پنجر یہ بیوی۔ ویسی ہی کالی رات اور وہی مکان جسے سات مہینے پہلے چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

ماں نے دروازہ کھولا۔ میں نے قدم چھوئے۔ انہوں نے دعا دی۔ چھایا نے بھی مری ہوئی آواز میں پرنام کیا۔ اُٹھنا چاہا۔ لیکن اُٹھ نہ سکی۔ ماں نے اسے آشیرواد دی جلدی تندرست ہو بیٹی۔ اور اپنے گھر خوش و خرم رہ۔

اور پھر چھایا کو اوپر کھلے اور ہوادار کمرے میں پہنچایا گیا قلیوں کو میں نے ایک روپیہ دیا۔ اور چھایا کے آرام کا انتظام کرکے باہر دالان میں آیا ——— ماں سے مختصراً اپنی مصیبتوں کی داستان کہی۔ بچے کو دیکھنے کے لئے میری روح تڑپ رہی تھی۔ ماں سے پوچھا۔ کہنے لگی ——— "اوپر سروپ کے ساتھ ہی سوتا ہے۔ اب تو چاچا تایا سب کچھ کہہ لیتا ہے۔ ہمارا تو ڈر مانتا ہی نہیں۔ بس سروپ سے ہی ڈرتا ہے۔"

میں جلدی جلدی سیڑھیاں ناپتا۔ اوپر سروپ کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی شائد پڑھکر سویا ہی تھا یا شائد میری آواز سے جاگ پڑا تھا۔ اس نے لیمپ کو روشن کیا۔ میرا اڑھائی سال کا بچہ ارُن بچپن کی میٹھی مدہوش کن نیند سو رہا تھا۔ اُسے کیا معلوم اسکی ماں اپنی سب حسرتوں اور ارمانوں کیساتھ موت کے عمیق اور تاریک غار کے دہانہ پر پہنچ چکی ہے اور کوئی گھڑی میں اتھاہ تاریکی میں گم ہو جائیگی۔ اُسے کیا معلوم اسکا والد مصیبتوں کے پے در پے حملوں سے تھک گیا ہے۔ ہار گیا ہے۔ وہ تو سو رہا تھا مصائب اور تکالیف سے بے خبر بچپن کی میٹھی نیند ———

ماں نے ہنس کر کہا ——— ہم تم دس آوازیں دیں۔ تو شائد نہ جاگے۔ اور سروپ اگر ایک ہی آواز دے تو فوراً جاگ جائے۔

ماں نے سروپ سے کہا ——— سروپ ذرا دینا آواز

سروپ نے اپنی خشک اور بھیانک ہنسی کے ساتھ آواز دی۔ بچے نے سوتے سوتے کہا ——— "ہاں جی" اور سروپ نے کہا ——— "اُٹھ"

بچہ اُٹھنے لگا۔

"——— لیٹ جا"

اور وہ لیٹ گیا۔

۔۔۔" گا"

اور بچہ سہمے ہوئے سوتے سوتے تان لگانے لگا۔

۔۔۔"اٹھو اور ناچ" سروپ نے جیسے اپنی اس کامیابی کی خوشی میں کہا۔

بچہ ڈر کر اُٹھنے لگا تھا کہ میں نے اُسے سینہ سے چمٹا لیا۔ اتنی سنگدلی۔ ایسے ظالم کیسا تھ رہ کر بچہ کیا شوخ اور چنچل ہو گا۔ اس جیسا ہی سنجیدہ اور متین بن جائے تو شک نہیں۔ لیکن میں تو بچے کی شرارت کو پیار کرتا ہوں۔ مجھے تو بچوں کی شوخی پسند ہے۔ جو بچہ شوخ نہیں وہ بچہ کہاں۔ وہ تو بوڑھا ہے۔ ماں نے کہا ۔۔۔

"بس ڈرتا ہے تو اسی گورو سے۔ میرے منہ پر تو تھپڑ لگا دیتا ہے ضدی ایسا ہے کہ غصّہ میں آجائے تو جو چیز ہاتھ میں آئے پھینک دیتا ہے لیکن اگر سروپ اوپر سے بھی کہدے۔ اڑن۔ تو بس وہیں چُپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے" اس کے بعد ماں ہنسیں لیکن میں بچے کو سینے سے چمٹائے۔ اپنی چارپائی پر جالیٹا۔ اور سوچنے لگا۔ ماں کے جیتے جی یہ حال ہے اسکے مرنے کے بعد کیا ہو گا۔

+ × × × × ×

پھر وہ منظر بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا جسکا ذکر ابھی ماں نے کیا تھا۔ اور ایک دفعہ میرا خون کھول اُٹھا صبح چھایا اچھی بھلی تھی۔ آج ہی اس زندگی کا ناٹک ختم ہو جائیگا۔ کم از کم اس بات کی کوئی توقع نہ تھی۔ اور میں ایک کام کی وجہ سے کیدور محلہ چلا گیا تھا۔ ماں نے مجھے بتایا کہ چار بجے کے قریب محلہ میں پھیری لگا کر کپڑا بیچنے والا آیا۔ اور چھایا نے اس سے کپڑے خریدے۔ پھر درزن کو بلا کر سینے کے لئے دیئے اسکے بعد اچانک اس کی طبیعت گھبرا گئی۔ اور اس نے کہا ۔۔۔"ماں پانی پلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے بس آخری گھڑی آپہنچی ہے"۔ ماں نے پانی پلایا۔ اسکے بعد وہ بے ہوش سی ہو گئی اور اسکا سانس چلنے لگا۔ گھر میں اس وقت ماں اور سروپ کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور چارپائی پر یا اوپر کی منزل میں مرجانا ہمارے ہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ماں نے سروپ کی منت کی کسی طرح میری امداد کر کے اسے نیچے پہنچا دو۔ لیکن اُسے اُٹھانا تو کجا۔ وہ تو بیمار کے کمرے کے پاس بھی نہ پھٹکتا تھا۔ اور ماں ٹھہری نحیف و ناتواں۔ لیکن چارپائی پر مرجانے سے اسکی روح جہنم میں جائے گی۔ اس خیال سے ماں نے اُسے اُٹھایا۔ سیڑھیوں تک بھی نہ لے جاسکیں وہیں زمین پر رکھدیا۔ سروپ نے التجا کی ۔ وہ اوپر سے اترا بھی نہیں ناچار اسی طرح گھسٹتی گھسٹاتیں اُسے نیچے لائیں۔ اور لا کر ننگے فرش پر لٹا دیا۔ انسان اور اسکا غرور! موت کے بعد تیرا جو حشر ہو اسکی تو خیر لیکن موت سے پہلے بھی تیرا یہ حشر ہو سکتا ہے۔

اس وقت چھایا کو ہوش آئی۔ اور کسی غیبی طاقت کے باعث وہ ذرا سا اُٹھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا شاید موت کی آمد سے گھبرا گئی تھی۔

"۔۔۔میں کہاں ہوں؟"

ماں نے کہا ۔۔۔"تمہاری طبیعت گھبرا گئی تھی"۔

"مجھے اوپر لے چلو"

لیکن جواب سنے بغیر وہ لیٹ گئی اور نہیں اُٹھی۔

ماں اوپر جاکر اسکا بستر لائی۔ اس نے بستر اسکے نیچے بچھایا۔ سرہانے دانے رکھے اور دیا جلا دیا۔

موت سے پہلے میری عزیز پیاری بیوی کا جو حشر ہوا۔ اسکی داستان سُنکر مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ چاہا کہ مرجاؤں۔ یا ماردوں لیکن موقع کی نزاکت اور میری بے بسی نے میری زبان

بند کر دی۔ آنکھوں نے اسکے نیچے پچکے ہوئے گالوں۔ بند آنکھوں اور سے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور رو دیں۔

صبح اسکی لاش کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ میں نے آخری دفعہ اسکی صورت دیکھی تھی جسپر اور خوبصورت چہرے پر سیاہی پھر گئی تھی بھرے ہوئے گال پچک گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ ہاں دانت وہی تھے۔ خوبصورت سفید دانت جن سے ہونٹ اسی طرح چمٹے ہوئے تھے جس طرح جسم کو موت چمٹ گئی تھی۔ اس قالب میں کتنا نازک اور بھولا بھالا دل تھا۔ اسے کتنی جلدی ٹھیس پہنچ جاتی تھی لیکن اب۔ اب ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور میں خوب جی بھر کر رویا۔ واپس آیا تو سر بھاری تھا۔ کرسی چاپ کمرے میں لیٹ گیا۔ دن بھر تعزیت کیلئے آنے والوں کا تانتا لگا رہا۔ لیکن مجھے ان سب باتوں سے نفرت تھی

بھائی کے کڑوے الفاظ نے میرے غم کو دوگنا کر دیا تھا۔

* * * * * * * * * *

جب بارہویں دن کریا کرم سے فارغ ہو کر میں لاہور جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو اسوقت اچانک سروپ نے کہا "بھائی صاحب آپ اُن کو ڈاکٹر کو دکھا جاتے تو اچھا تھا۔ اسکی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی" میں نے ایک لمحہ کے لئے اپنے بچے کو دیکھا جو سروپ کی گود سے چمٹا ہوا تھا۔ کمزور اور مغموم۔ میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ ان دنوں میں اس کی طرف سے بے پروا ہو گیا۔ دراصل اپنے غم میں میں اپنے آپکو اپنے بچے کو سب کو بھول گیا تھا۔ چھایا کی موت توقع سے بعید نہ تھی۔ سامنے نظر ہی آتی تھی۔ لیکن پھر بھی پیار اور محبت کے یگانگت اور ہم آہنگی کے چار سالوں کے بعد یہ جدائی طبیعت پر اُداسی اور وحشت طاری تھی۔ میں نے اس گاڑی جانے کا خیال چھوڑ دیا۔

اور بچے کو ڈاکٹر کے ہاں لے گیا۔ کوئی خاص بیماری تو تھی نہیں۔ اُسے ہاں کمزوری تھی۔ اور گلے پر کچھ گلٹیاں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے طاقت کی دوائی دی۔ اور گلے پر آیوڈیکس لگا دیا۔ شام کے وقت جب میں پھر جانے لگا تو سروپ نے آکر پوچھا —— بھائی صاحب ڈاکٹر نے کیا ہدایات دی ہیں۔ میں نے کہا —— طاقت کی دوائی کا ایک چمچہ صبح شام اسے پلا دیا کرنا اور آیوڈیکس میں تمھیں لاہور سے بھیج دونگا۔ اُسے ذرا گلٹیوں پر لگا دینا۔

اور ابھی مجھے لاہور میں آئے تین دن بھی نہ ہوئے تھے کہ سروپ کا خط پہنچا۔ لکھا تھا "آیوڈیکس بھیج دیجئے" میری طبیعت وہاں سے آنے کے بعد کچھ ٹھیک نہ رہی تھی۔ کچھ عجیب طرح اُس طبیعت پر چھائی رہتی تھی۔ میں آیوڈیکس نہ بھیج سکا۔ سروپ کے دو خط اور آئے لیکن مجھے کچھ حرارت ہونے لگی۔ اور دوسرے کوئی آدمی گھر کی طرف جانے والا بھی نہ تھا۔ آیوڈیکس تو مل سکتی تھی لیکن بھیجتا کس کے ہاتھ۔ پھر اسکا ایک اور خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا —" طاقت کی دوائی ختم ہو گئی ہے۔ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ اچھا ہو اگر آپ کوئی دوسری دوائی بھیجدیں"۔

اس دن میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ صبح سے کچھ حرارت بھی تھی لیکن پھر بھی میں ڈاکٹر کے ہاں گیا۔ اسکے مشورے کے مطابق میں گریپ لٹ شربت کی ایک شیشی خریدی۔ اور نصف اونس آیوڈیکس لیکر واپس لوٹا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح دونوں چیزیں بھیجوں کہ سروپ کا تار آیا —— اُن کی حالت نازک ہے جلدی پہنچیں۔

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دیکھا۔ گاڑی پندرہ منٹ تک چھوٹنے والی تھی۔ بھاگم بھاگ پہنچا۔ اور اِدھر میں نے پائدان پر پاؤں رکھا اُدھر گاڑی چلدی۔ آکر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور پھر لیٹ گیا

ایک مسافر نے پوچھا ــــ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

لیکن میں بولا نہیں۔ وقت مقررہ پر گاڑی ہمارے سٹیشن پر رکی میں جلدی جلدی ٹکٹ دیکر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ تھوڑا سا راستہ تھا لیکن ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ کچھ بخار اور کچھ تشویش میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ گھر پہنچا تو بچے کو بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔ شدت بخار سے اسپر بیہوشی طاری تھی۔ اور سانس اکھڑ رہا تھا۔ بھاگا بھاگا ڈاکٹر کو لایا معلوم ہوا نمونیا ہوگیا ہے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذراسی بے احتیاطی سے بچے کی جان جاسکتی ہے۔

مجھے اس وقت خود شدت کا بخار ہو رہا تھا میں نے بےبسی کی آنکھوں سے سروپ کی طرف دیکھا لیکن شائد ڈاکٹر کی بات سے اُسکے دلکو دھکا پہنچا تھا۔ بچے سے اُسے بہت اُنس ہوگیا تھا۔ رات دن وہ اُسکے ساتھ ہی رہتا تھا میں نے دیکھا سروپ کا رنگ فق ہے۔ اور وہ ٹکٹکی باندھے بچے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حسرت بھری آنکھوں سے اس ساہوکار کی طرح جسکے سامنے اسکا سب کچھ لٹ رہا ہو۔

میں نے اُسکے کندھے کو چھوا۔

وہ چونک پڑا ــــ "مجھے کچھ حرارت سی ہورہی ہے۔ جاؤ ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے دوائی لے آؤ" اور خاموشی سے وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ اسکے بعد جس تندہی جس احتیاط اور جس محبت سے اس نے بچے کی خبرگیری کی۔ اس طرح تو شائد میں یا اسکی مرحوم ماں بھی نہ کرسکتی۔ ساری ساری رات وہ اُسے گود میں لئے کمرے میں پھرتا رہا۔ ساری ساری رات وہ اُسکے سرہانے بیٹھا رہا۔ لیکن بچہ نہ بچ سکا۔ اس پیار۔ اس محبت۔ اس خدمت کے باوجود بھی وہ اپنی ماں کی موت کے پورے ڈیڑھ ماہ بعد اسکی گود میں چلا گیا۔

ابھی ایک زخم بھرا بھی نہ تھا کہ دوسرا لگا۔ گھر بھر میں کہرام مچگیا۔ اور میں تو اتنا مایوس ہوا کہ ہمت ہار بیٹھا لیکن چھوٹا بچہ تھا اُسے آخری منزل تک پہنچانے کا انتظام تو کرنا تھا۔ میں خود کو اتنا کمزور محسوس کرتا تھا کہ مجھے شمشان تک جانا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ عورتوں نے بچے کو نہلا دھلا کر کفن میں لپیٹ دیا۔ اچارج نے ضروری رسوم ادا کر دیں۔ باہر برادری کے کچھ لوگ بھی جمع ہوگئے۔ لیکن اُٹھا کر کون لے جائے۔ میں جب سے آیا تھا بخار سے مبتلا پڑا تھا۔ اور پھر یہ چوٹ۔ میں نے سروپ کو آواز دی۔ وہ وہاں نہ تھا۔ سب کمروں میں ڈھونڈا۔ نہ ملا۔ ناچار گرتا پڑتا اوپر گیا۔ اپنے کمرے میں بستر پر وہ اوندھے منہ لیٹا پڑا تھا۔

میں نے آواز دی۔ نہ بولا۔ ہلایا۔ نہ ہلا۔ ذرا زبردستی میں نے اُسکا منہ اپنی طرف کیا۔ آنکھیں لال تھیں۔ اور بستر آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

میں نے کہا ــــ "سروپ حوصلہ کرو"

اور وہی سروپ جسے میں سنگدل کہا کرتا تھا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر ...

جناب سید الطاف مشہدی

پردیسی اور ہوا کا جھونکا

سُن ہوا کے نرم رو جھونکے! ذرا دل تھام کر — ہو وطن کی دلنشیں گلیوں سے گر تیرا گذر
منتظر تجھ کو نظر آئے گا کوئی بام پر — چونک کر دیکھے گا تیری سمت میرے نام پر
اُس سے کہنا اے وطن کے گلستانوں کی بہار — درد سے معمور ہیں الطاف کے لیل و نہار
آگئی ہے اُسکے رُخساروں پہ اشکوں سے خراش — ہجر کے مسموم تیروں سے جگر ہے پاش پاش
وہ وطن کی صحبتوں کے واسطے بیتاب ہے — زندگانی اُس کی مثلِ ماہیٔ بے آب ہے
موت سے بدتر ہے اب پردیس کا جینا اُسے — پڑ رہا ہے غم کے ساغر میں لہو پینا اُسے

اُس کو خط لکھو کہ اب پردیس کو وہ چھوڑ کر
دیکھ لے آکر وطن کی صحبتوں کو اِک نظر

آسماں پر شب کو جب شمعیں جلاتا ہے کوئی — اُسکو اک جانب اشاروں سے بلاتا ہے کوئی
دم بخود چپکے سے اُسکے ساتھ ہو لیتا ہے وہ — کشتیٔ بحرِ تصور اس طرح کھیتا ہے وہ
دیکھتا کیا ہے اپنی ہوا بے کسی کا شاہکار — بہہ رہے ہیں اشک اور دل ہے رہینِ انتظار
پھر رہی ہو گاؤں کی گلیوں میں اکتائی ہوئی — زندگانی کے تصور تک سے گھبرائی ہوئی
سامنے پا کر تمہیں آپے میں کب رہتا ہے وہ — کانپتے ہاتھوں کو رکھ کے دل پہ یوں کہتا ہے وہ
اے مرے دل کی دھڑک اے آرزوؤں کے سہاگ — تجھ کو خاکستر نہ کر دے عشق کی بے نام آگ
جس پریشاں حال نے تجھ کو بنایا ہے نڈھال — جس خرابِ زیست کا تجھ کو ستاتا ہے خیال
جس کے غم میں قیرگوں زلفیں گلے کا ہار ہیں — ہجر میں جسکے مہکتے پھول مثلِ خار ہیں
جس نے تیری زندگی کو وقفِ حرماں کر دیا — جس نے اک ناآشنائے غم کو حیراں کر دیا
جس کے ہاتھوں لٹ گئی تیرے گلستاں کی بہار — چھن گیا جس کی بدولت زندگانی کا قرار

اب کوئی دن میں ترے پہلو میں وہ آجائے گا
راحتوں کے پھول پھر سر پر ترے برسائے گا"

اتنا کہہ کر اے مرے غمخوار جھونکے اس سے تو
جھک کے پھر دریا سے کہنا اے وطن کی آبرو

مجھ کو اِک غربت زدہ بیکس نے بھیجا ہے سلام
اور میں اس کی زباں سے دے رہا ہوں یہ پیام

کیا میرے ہمجولیوں سے اب کوئی آتا ہے یاں
کیا ترے بربط پہ کوئی بھیرویں گاتا ہے یاں

شام جب زریں شعاعوں کا بجاتی ہے ستار
کیا کنارے پر ترے کرتا ہے کوئی انتظار

کیا کوئی پرسوز نغمہ سن کے رک جاتا ہے تو
گانے والے کے قدم پر اب بھی جھک جاتا ہے تو

کیا وطن کے ہمنوا میرا ابھی لیتے ہیں نام
اب بھی کیا آکر سناتے ہیں کوئی دلکش پیام

کیا کوئی غربت زدہ اب بھی کسی کو یاد ہے
کیا کسی کا دل بھی میری یاد سے آباد ہے؟

صبحدم آتا ہے ساز زندگی جب ہوش میں
کھیلتا ہے حسن تیرے سبزگوں آغوش میں؟

یاد میں عہدِ گذشتہ کی بھی سر دھنتا ہے تو
دھڑکنیں سہمے ہوئی دل کی کبھی سنتا ہے تو

کیا یہ سچ ہے تو نے میرے غم میں ہو کر بے قرار
کرلیا ہے دوسرا رستہ کوئی اب اختیار

اب مرے دیوان خانے کے تلے بہتا نہیں
دیکھ کر ویراں اُسے رنج و الم سہتا نہیں

آہ لیکن میں کسی قابل نہیں اب اے چناب
مجھ سے تو میرا مقدر بھی ہے سرگرم عتاب

اے مرے محبوب اک دن دفعتہً آؤنگا میں
اور ترے رنگیں کناروں سے لپٹ جاؤنگا میں"

پاکے دریا سے فراغت، شرق کو بڑھنا ذرا
سامنے تجھ کو نظر آئے گا اک پیپل کھڑا

اُس سے کہنا میری جانب سے کہ اے ذی احترام
بعد مُدت کے تجھے بھیجا ہے اب میں نے سلام

سچ بتا اب بھی کبھی آتا ہوں تجھ کو یاد میں
اب بھی کرتا ہوں ترے دل کا سکوں برباد میں

کیوں نہ ہو جب کی ہیں راتیں تیرے سائے میں بسر
ہے بجا تجھ کو کہوں میں سایۂ رحمت اگر

یاد ہے وہ رات بھی جب دیر سے آئی تھیں وہ
منتظر پا کر مجھے کچھ دیر شرمائی تھیں وہ

آہ اے پیپل تجھے وہ یاد ہے زرّین ہار
تارِ اشک و آہ میں ہم نے پرو کر ایک ہار

تیری گردن میں جو ڈالا تھا بطور یادگار
اے مرے پیپل بتا محفوظ ہے اب تک وہ ہار

اس قدر نایاب تحفے کو اگر کھوئے گا تُو
یاد رکھ اس بات پہ پھر عمر بھر روئے گا تُو

ہاں! وہ ہم نے نام جو کھودے تھے تیری شاخ پر
تجھ کو لازم ہے حفاظت اُن کی بھی شام و سحر

سار بانوں کے ترانوں کی صدا آتی ہے اب
بانسری کی لَے تری شاخوں سے ٹکراتی ہے اب

سچ بتا اب بھی کبھی آتی ہے وہ زُہرہ جمال
دُور رہ کر جس سے میری زندگانی ہے وبال

حکمراں ہیں جس کے جلوے طُور کے انوار پہ
ہے تسلط جس کا میرے سحر زا افکار پر

آنکھ جس کی نرگسِ بیمار کو بھی یاد ہے
زُلف جس کی بادلوں کی یاد میں آباد ہے

جس کے رخساروں کی لالہ ہے قسم کھائے ہوئے
جس کے اعضا کی لچک شاخوں کو شرمائے ہوئے

اے مرے مخلص! وطن میں جب کبھی آؤں گا میں
تیرے قدموں میں وہی زہرہ جبیں لاؤں گا میں

ہو کے رُخصت اُس سے پھر پنگھٹ پہ بھی جانا ضرور
جُھک کے کہنا اے وطن والوں کی بینائی کے نُور

اب بھی آتی ہیں کبھی کافر ادا پنہاریاں
پرورش پاتی تھیں جن کے قہقہوں میں بجلیاں

چلبلاہٹ جن کی اک آزار تھی میرے لئے
ہر نظر جن کی کھٹکتا خار تھی میرے لئے

سہم جاتی تھیں جو مجھ کو دیکھ کر آتے ہوئے
دیکھتی تھی اُن سے اِک مُڑ مُڑ کے شرماتے ہوئے

جو نگاہوں سے مجھے کہتی تھی آنے کے لئے
چاہتی تھی جو مدد گاگر اٹھانے کے لئے

جو ہے ایوانِ تصور میں مرے اب تک مکیں
جس نے میری فکر میں بھر دی شرابِ احمریں

جس نے ضو بخشی مرے افکار کو وہ مہ لقا
جس نے دی ہے زندگی اشعار کو وہ مہ لقا

رشک کرتا ہوں مرے پنگھٹ! تری تقدیر پر
کاش مل جائے ترے نزدیک اِک چھوٹا سا گھر

اے ہوا کے نرم جھونکے دے کے یہ پیغام تو
پھر اسی وادی میں آکر خود کو کرنا سُرخرو

آرزو دے گی دُعا جب لوٹ کر آئیگا تو

جناب سید عبدالرشید یزدانی - مدیر معاون "شاہکار" لاہور

فنِ افسانہ نگاری

اگر غور و فکر سے دیکھا جائے تو ڈراما نویس، ناولسٹ، اور افسانہ نگار ایک ہی صنف میں نظر آئینگے۔ تینوں انسانی زندگی کے مصور ہیں۔ اُسکے باوجود افسانہ نگار کو اول الذکر دونوں پر تفوق حاصل ہے۔ افسانہ در اصل ناول یا ڈرامے کے مقابلہ میں ایجاز و اختصار کا پہلو لئے ہوئے ہے لیکن اختصار کے باوجود فنی حیثیت سے وہ ایک حسنِ کامل ہوتا ہے اور اپنے حسن و تکمیل کی وجہ سے ناظرین کے لئے ذہنی مسرت کا سامان۔

ہرچند یہ ناول جتنی وسعت نہیں رکھتا مگر پہنائی کی کمی، گہرائی اور تیزی سے پوری ہو جاتی ہے۔ اور افسانہ نگار اپنے محدود دائرے میں اپنے تخلیق کردہ افراد (Characters) کی زندگی کا ایک مختصر حصہ نہایت واضح طور پر بیان کر دیتا ہے۔ تمثیل (ڈراما) اور ناول کے درمیان افسانہ ایک جاذب و ممیز جگہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں کی چند خصوصیات کا حامل ہوتے ہوئے بھی اپنی فنی انفرادیت آزادانہ طور پر برقرار رکھتا ہے تمثیل نگار کی طرح افسانہ نویس کسی ایک انوکھے موقع اور چند کرداروں میں رنگ بھرتا ہے جسکے باعث افسانے میں اتنی کشاکش اور شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ ناول نویس کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ دوسری جانب ناولسٹ کی مانند افسانہ نگار مناسب موقعوں پر کرداروں کو ایسی تکمیل و شرحت سے روشناس کراتا ہے کہ بڑے سے بڑے ڈراما نگار کی دسترس سے باہر ہے۔

افسانہ کی خصوصیات - اختصار کے علاوہ افسانہ چند ذاتی خصوصیات رکھتا ہے۔ سب سے پہلی اور ضروری خصوصیت اسکا پلاٹ ہے مسٹر جی۔ این۔ پوکاک (G. N. Pocock) پلاٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ واقعہ یا واقعات جن میں ابتدا، تعمیر اور انجام ہو پلاٹ کہے جا سکتے ہیں۔ پلاٹ در اصل انسانی زندگی یا تخیل کا خاکہ یا Snapshot ہے۔ افسانہ کے لئے پلاٹ کا ہونا ناگزیر ہے اس کے بغیر افسانہ افسانہ ہی نہیں رہتا۔ انسانی زندگی کا ہر واقعہ مکمل پلاٹ نہیں ہے۔ افسانہ نگار مشاہدہ کے بعد وہ کڑیاں جو زنجیر میں نہیں تخیل کی مدد سے خود مہیا کر لیتا ہے۔ دوسری خصوصیت حسن و تکمیلِ تعمیر یا بالفاظ دیگر ترتیب و تسلسل ہے۔ افسانے میں واقعات کی ایک خاص رفتار ہونی چاہئے۔ تمام اجزا ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوں کہ ذرا سی لغزش سے یہ شیرازہ منتشر ہو سکتا ہو اور ہر واقعہ آئندہ واقعہ کی خبر دے رہا ہو۔

واقعات کا تعلق جسقدر مربوط ہوتا جائیگا۔ افسانہ کے حسن میں اضافہ ہوتا جائیگا۔

افسانہ کا اختتام بے حد نازک مرحلہ ہے مصنف کیلئے کردار وں اور مواقع میں گہرائی اور وقعت پیدا کرنے کا بھی ایک موقعہ ہوتا ہے۔ اختتام پر ہمیں یہ احساس نہ ہو کہ ابھی افسانہ کو ختم نہ ہونا چاہیئے۔ یا بعض کیرکیٹر اور واقعات بے فائدہ و حشو ہیں۔ مغربی افسانوں میں آپکو اختتام کی نادر ترین مثالیں نظر آئیں گی۔ یہاں افسانوں کی انتہا اچانک مگر ناگزیر ہوتی ہے۔ خط و خال جو مصنف کردار میں دکھانا چاہتا ہے۔ یا موقع کا پیچ و خم جو وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے اس پر صنعت حسن و تکمیل سے نمایاں ہوتے ہیں کہ افسانہ ختم ہو جانے پر بھی پڑھنے والے نیم مدہوشی کے عالم میں گزرے ہوئے واقعات کو صفحۂ تصوّر پر مرتسم پاتے ہیں۔

زبان کی سادگی اور طرز ادا کی بیساختگی بھی افسانہ کے حسن میں اضافہ کا موجب ہے۔ افسانے میں وہ الفاظ و تراکیب استعمال کی جائیں جو کاملاً جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔

افسانہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکے کردار نمایاں اور ممیز انفرادیت کے مالک نہیں ہوتے بلکہ وہ کسی خاص گروہ کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے افسانے میں کردار کا تجزیۂ نفسی بال کی کھال اتارنے کی حد تک نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار کے پاس اتنا وقت ہی کہاں کہ وہ جذبات کی نازک عجوبہ کاریوں پر سے پردہ اٹھا سکے، احساس کی نیرنگیوں کو منظرِ عام پر لائے۔ وہ اپنی ہنرمندی سے کردار کی زندگی کا عطر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور ناظرین کی توجہ کردار کی زندگی کے صرف ایسے واقعہ کی جانب مبذول کراتا ہے جو ہمارے تخیل کے لئے سب سے زیادہ مہمیز کا کام کرے۔

یوں بھی جزو زندگی سے کسی انسان کی ذہنی قلبی اور اخلاقی حیثیت کا پورا یا قریباً پورا اندازہ کرنا انتہائی دقت طلب ہے۔ افسانہ نویس کا کام حیاتِ انسانی کے حسن و نیرنگ کی نمائش نہیں ہوتی بلکہ ان کی طرف بلیغ اشارہ کر دینا ہوتا ہے۔ وہ انسان کے افعال و اطوار کی تفسیر صرف کنایہ کے ذریعے کرتا ہے۔

افادی حیثیت۔ افسانے کی خصوصیات کے بعد اس کی افادی حیثیت پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے مشرقی ادباء کی اکثریت اور یورپین افسانہ نگاروں کی ایک جماعت جسمیں بڑے بڑے ادیب شامل ہیں۔ اس بات پر زور دیتی ہے کہ ادب کے ذریعے مجلسی برائیوں کی نقاب کشائی و اصلاح کیجائے مشہور مصنف ایڈگرویلس لکھتا ہے:۔

"افسانہ اسلئے لکھو کہ تم اپنے عہد کی معاشرت اور علمی سرگرمیوں کا نقشہ قارئین کے سامنے کھینچنا چاہتے ہو۔ نہ کہ تحسین و آفرین اور معاوضہ کے لئے۔ اور اگر تم محض معاوضہ اور تحسین کے لئے افسانہ لکھتے ہو تو تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ قہوہ کی دوکان کھول لو۔"

اگرچہ لفظ بہت سخت ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ معاوضہ و تحسین کے خیال سے افسانہ لکھنا اسکی روح کو فنا کر دیتا ہے۔

لیکن مذہبی مجلس یا سیاسی مقصد کے پیش نظر افسانہ لکھتے وقت اس امر کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے کہ اپنے مقصد کو براہِ راست ظاہر نہ کیا جائے بلکہ اُسے قارئین کی قوتِ متفکرہ کیلئے وقف کر دیا جائے۔ ورنہ وہ فن کار نہیں بلکہ محض پروپاگنڈسٹ (Propagandist) بنکر رہ جائیگا۔ اُسے صرف اُن محسوسات کے پیش کرنے پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ جو جو وہ زندگی کے مختلف واقعات سے حاصل کرتا ہے۔ اور پس کسی خاص نظریئے کی مخالفت یا حمایت اسکا فرض نہیں۔ ص

جناب سرشار کسمنڈوی

اندھا مصوّر

(ایک دردناک منظوم افسانہ)

"ادب لطیف" کے افسانہ نمبر کے لئے برادرِ گرامی حضرت میرزا ادیب بی۔اے نے منظوم افسانہ کی فرمائش کی اور میں نے افسانہ "اندھا مصوّر" مطبوعہ ادب لطیف" جنوری ۱۹۳۷ء کا پلاٹ سامنے رکھ کر موزوں کر دیا، یہ افسانہ منثور مشہور افسانہ نگار حضرت سیاح سنامی جرنلسٹ کی جنبشِ قلم کا رہینِ منت ہے، مجھے یہ افسانہ کس درجہ عزیز و پسند ہے اسکا اندازہ آپ اسی سے لگا سکتے ہیں کہ میں نے اپنی کاوشِ فکر کیلئے اسکو منتخب کیا۔ یہ میں نہیں جانتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا نہیں اسکا فیصلہ میرزا ادیب صاحب یا ادب لطیف کے مقتدر ناظرین کرینگے،

بخیالِ طوالت بعض مواقع قصداً چھوڑتا گیا ہوں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے افسانہ کا کوئی ایسا ضروری مقام ترک نہیں کیا گیا ہے جس سے افسانے کے تسلسلِ واقعات میں کسی قسم کی بے ربطی کا احتمال و امکان ہو۔ بہرحال جو کچھ ہو سکا۔ بے تکلف ہدیۂ نظر ہے، مناسب ہوگا کہ نظم پڑھنے سے پہلے افسانے پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ افسانہ کی خصوصیات پیشِ نگاہ اور محفوظ حافظہ رہیں، ممکن ہے اس طرح نظم کے بعض خاص مقامات کچھ زیادہ دلچسپ ثابت ہوں۔

سرشار

فلک بوس اک عمارت رفعتیں جس کی امیرانہ
سوادِ دلنشیں سرمایہ دارِ طرزِ شاہانہ
خس و خاشاک کی اک جھونپڑی تھی قرب میں اسکے
تھی جس کی کم سوادی مظہرِ حالِ فقیرانہ

تبسم ریز تھا نوحہ سے نغمہ متصل ہوکر
بلندی پستیوں سے مل رہی تھی ایک دل ہوکر
تر و تازہ فضائیں کوہساروں کی مچلتی تھیں
جہاں لرزاں تھے میدانی مناظر مشتعل ہوکر

شعاعِ خور سے جب اونچی پہاڑی جگمگاتی تھی
قدم پر جھونپڑی کے اسکی چھاؤں لوٹ جاتی تھی
مہارانا کی منزل عیش کی تھی مرکزِ عبرت
شکستِ متصل کا ہر سحر پیغام لاتی تھی

وہ چھاؤں جھونپڑی کے پاؤں چھو کر یوں پلٹ آئے　　نقابِ روئے گُل موجِ صبا جس طرح سرکائے
حدِ دیوار سے آگے بڑھے بھی تو بڑھے کیوں کر؟　　جلالِ قصرِ شاہی اُسکے دل میں جب سما جائے

رُکے اِسطرح سے جیسے کوئی معتوب و بدقسمت　　گناہوں سے خجل، شرمندۂ افعالِ بہیمیت
منائے کس طرح روٹھے ہوئے دیوتا کو وہ آخر　　جسے معبود کی رکھتی ہو خائف رفعت و عظمت

مگر برعکس اِسکے شام کا منظر نرالا تھا　　یہ دیکھا، زینتِ آغوشِ تاریکی اُجالا تھا
اُبھر کر جھونپڑی کا سایۂ خاموش جب پہنچا　　اٹاری کے کلس اور کنگروں کا رنگ کالا تھا

بالآخر رات کی تاریکیاں جب خوب چھا جاتیں　　محل کو جنت الفردوس کا پیکر بنا جاتیں
بروونِ پاش فانوسوں کی نھیں شفاف تنویریں　　شگافوں سے نکل کر جھونپڑی کو جگمگا جاتیں

اِسی غربت کدے میں اِک گوالے کی سکونت تھی　　وہ تھا اور اُسکی بوڑھی ماں شریکِ رنج و راحت تھی
ضعیفی اور علالت، اور پھر مایوسِ بینائی　　غرض یہ ہے کہ اُسکی زندگانی اک مصیبت تھی

گوالہ سترہ سالہ جواں تھا سانولی رنگت　　نہ دیکھی تھی کبھی باشندگانِ قصر کی صورت
کبھی شیشوں جڑی کھولی نہ جاتیں کھڑکیاں اسکی　　مہاراتا پہ بھی روشن نہ تھی ان کی زبوں حالت

اسی ماحول میں اک روز کا یہ ماجرا سنئے　　خدائے عشق کا پُرہول و خونیں فیصلا سنئے
کسی کا دِل ہوا کیونکر ہدف کیوپڈ کے تیروں کا　　یہ غم آگیں کہانی اور رودادِ وفا سنئے

صدا آنے لگی ہر سمت سے آیا "بسنت" آیا　　جہانِ رنگ و بو کا غنچہ غنچہ کھل کے لہرایا
پرِ طاؤس کے کچھ بند باندھے پہلے "لاٹھی" پر　　گوالے نے پھر اپنی "بانسری" کو ہار پہنایا

یکایک جھونپڑی سے دردناک آواز اک آئی　دوا کھانے میں اُسکی ماں کراہی اور چلائی
مریضہ اُٹھکے کہنی کے سہارے بھی ذرا بیٹھی　مگر یکلخت اس پر موت کی سی خامشی چھائی

یہ حالت دیکھ گوالے نے ٹھنڈی سانس اک کھینچی　بصد الحاح و زاری پھر خدا سے یہ دعا مانگی
"نہ دے صحت تو اپنے آستانے پر طلب کر لے　کہ اب تو مجھ سے ماں کی خستگی دیکھی نہیں جاتی"

اِدھر ماں کی بُری حالت نے یوں تڑپا دیا اسکو　اُدھر دو قہقہوں کی گونج نے چونکا دیا اُس کو
یکایک کچھ ہوئیں سرگوشیاں اونچی اٹاری پر　تماشا اک نیا تقدیر نے دکھلا دیا اُسکو

کھلی اتنے میں کھڑکی عیش منزل کی تو کیا دیکھا　شگفتہ اور قوی اک مرد کو اُس نے کھڑا دیکھا
ٹپکتا تھا جلال و رعبِ شاہی اُسکے چہرے سے　گوالے نے بحیرت جلوۂ ناآشنا دیکھا

پھر اسکے بعد اُسکو ایک عورت بھی نظر آئی　فرشتے جس کے قدموں پر روا رکھیں جبیں سائی
پہن رکھے تھے دونوں نے بسنتی رنگ کے جوڑے　نیاز و ناز، حسن و عشق تھے باہم تماشائی

یکایک ایک شورِ قہقہہ پھر بام سے اُٹھا　مہاراجہ نے ہنسکر اپنی رانی سے کہا "دیکھا؟
پسندِ خاطرِ نازک نہ ہو تو پھینکدوں اس کو"　مہارانی کی بے پروا زباں نے کہدیا "اچھا!"

چمکتی سی پھر اسکے بعد کوئی شے گری باہر　گرے جیسے فلک سے ٹوٹ کر گلدستۂ اختر
بظاہر وہ کوئی زیور جڑاؤ تھا رئیسانہ　ایسے کہکر مہارانی نے جھانکا نہ سے جھک کر

مہارانی کا منہ کھڑکی سے بے ساختہ نکلا　ہوا دھوکا یہ چہرا ہے کہ ماہِ پُر ضیا نکلا
نگاہیں اس کی خیرہ ہو کے پتھرا سی گئیں فوراً　نہ ارمانِ نظر کوئی، نہ دل کا حوصلا نکلا

خدا جانے ہوئی کب بند کھڑکی عیش منزل کی　　کب آکر بارہ اٹھا کر لے گئی نیچے سے اک باندی
ہوا گم جلوۂ رنگیں کی نزہت میں وہ بیچارا　　تماشائی پہ خود روشن نہ تھا اپنا تماشا بھی

بالآخر سلسلہ ٹوٹا گوارے کے تخیل کا　　وہ اپنے دل میں سوچا آخرش مجھ کو ہوا کیا تھا
گزرنے ہی کو تھا تاریک شب کا حصۂ اوّل　　ملی آنکھیں ہتیلی سے ادھر دیکھا ادھر دیکھا

خیال آیا اسے اتنے میں ماں کا ہو گیا بسمل　　بھڑک اٹھی دل بیتاب میں اک آتش کامل
پریشاں تھا مگر بھولا نہ اپنی بانسری، اٹھی　　انہیں لیتا ہوا تیزی سے وہ گھر میں ہوا داخل

ہر اک سو جھونپڑی میں جب اندھیرا گھپ نظر آیا　　تاسف خیز غصہ واقعات شام پر آیا
اندھیرے میں بڑھا آگے تو ٹکرایا کسی شئے سے　　وہاں سے وہ انگیٹھی کے قریں پھر کود کر آیا

دبی تھی آگ جو اس میں کریدی اس نے چمٹے سے　　جلا کر پھوس تا ٹکرانے والی چیز کو دیکھے
ہوئی جب روشنی تو اس کو اک کتا نظر آیا　　دیئے کا تیل پی کر جو کھڑا تھا پاس ڈیوٹ کے

ادھر گزرا یہ قصہ اور اس کی جیب خالی تھی　　سیاہی شام غربت کی رفیق خستہ حالی تھی
ہوئے روشن جو تنکے پھوس کے تو یہ سماں دیکھا　　اجالی میں اندھیری تھی اندھیری میں اجالی تھی

بہ سرعت وہ ماں کی چارپائی کی طرف لپکا　　وہاں دیکھا وہ منظر جو کبھی اس نے نہ دیکھا تھا
نہ آنکھوں میں چمک تھی اور نہ جاں نبض و تنفس میں　　پڑا تھا ہڈیوں کا خشک و ہیبتناک اک ڈھانچا

مہارانی کے جب وہ جلوۂ صد رنگ میں گم تھا　　فرشتہ موت کا شاید انہیں لمحات میں پہنچا
وہاں دم ماں کا نکلا مشکلیں آساں نہ ہوئیں اسکی　　محبت کا یہاں بیٹے کے دل میں چبھ گیا کانٹا

بہت رویا گوالا اپنی بوڑھی ماں کی میّت پر
کہ یہ پہلی ہی آفت تھی گرفتارِ مصیبت پر
خبر کیا تھی کہ رکھوالی جنازے کی بھی کرنا ہے
جنوں لحظہ بلحظہ چھایا جاتا تھا طبیعت پر

اِسی حالت میں گزرا رات کا ہر جاں گسل لمحہ
پلک جھپکی، نہ چین آیا، نہ رکے آنسو نہ دل ٹھہرا
گلے اب مل رہی تھی شب کی تاریکی اُجالے سے
سیہ خانہ میں تھا اب نور رقصاں صبحِ کاذب کا

گوالوں نے تہیّہ کر لیا قصّہ مٹانے کا
غریبانہ کیا سامان یک جا پھر جلانے کا
بس اب شمسان بھومی میں فقط شعلے ہی شعلے تھے
اِسے دستور کہیئے یا ستم کہیئے زمانے کا

گوالا ناخلف ہوتا تو اِس غم کو بھلا دیتا
پڑا تھا داغ جو دل پر تغافل سے مٹا دیتا
منایا سوگ اُس نے اپنی ماں کا ایک مدت تک
وہ جب رونے پہ آتا خون کی ندّی بہا دیتا

بالآخر رفتہ رفتہ اُس کا صدمہ ہو گیا ہلکا
مگر وہ عیشِ منزل کا ابھی منظر نہ بھولا تھا
محبت نے لگا دی آگ پھر اُسکے رگ و پے میں
نگاہِ شوق سے پھر اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا

مہارانی کے درشن کی ہوئی پھر جستجو اُس کو
بہت بیتاب رکھتا تھا ہجومِ آرزو اُس کو
اُدھر ہی دیکھتا رہتا تھا پہروں ٹکٹکی باندھے
نہ شوقِ ہمنشینی تھا، نہ ذوقِ گفتگو اُس کو

ہر اک لمحہ تخیل کی نئی دُنیا بسا لینا
نئی تصویرِ رنگیں صفحۂ دل پر بنا لینا
اُسی سے کھیلنا بس رات کے سنسان لمحوں میں
محبّت کا پھر اپنی رُوح کو نغمہ سُنا لینا

نہ بھولی تھیں جمالِ یار کی رنگینیاں اُس کو
ابھی تک یاد تھیں نیچی نظر کی شوخیاں اُس کو
محبّت اور پھر ایسی محبت! اُف معاذ اللہ؟
جلائے ڈالتی تھیں عشق کی چنگاریاں اُس

جب اسکو بھوک لگتی خشک دانوں کو چبا لیتا — برائے نام پانی پی کے پیاس اپنی بجھا لیتا
اب اُس نے چھوڑ رکھا تھا مویشی کا چرانا بھی — جو بڑھتی لاغری تو آنکھ کھڑکی پر جما لیتا

اُسے امید تھی کھڑکی کھلے گی عیش منزل کی — مگر یہ اُس کی حسرت، حسرتِ موہوم ہی نکلی
کہ دوبارہ نہ چمکی حسن کی بجلی فضاؤں میں — نہ وہ معصوم روحوں کی صدا لئے قہقہہ گونجی

گو اُس نے یہ سوچا ایک دن یہ کیا مصیبت ہے — نہ دل پر دسترس میرا نہ قابو میں طبیعت ہے
اُٹھا کرتی ہے کیوں اِک ہوک سی ہر وقت سینے میں — حقیقت میں مہارانی سے کیا مجھ کو محبت ہے

اگر در اصل ایسا ہے تو یہ باتیں ہیں غیرت کی — جھکی جاتی ہیں آنکھیں شرم سے ناموس و عزّت کی
مہارانی رعیت کی ہوا کرتی ہے ماں بیشک — تو پھر کیوں میرے دل میں آگ سوزش ہے محبت کی

مگر پھر قلب کی گہرائیوں سے اِک صدا اُٹھی — جگر کے درد و دل کی ٹیس نے تائید کی اُسکی
گوالا جا پڑا پھر حُسن کی رنگین وادی میں — محبت "فرض" اور "رشتوں" کی کچھ پروا نہیں کرتی

وہ سوچا بارگہہ میں پُرسشِ دلگیر کیا ہوگی — زبانِ بے زبانی روکشِ تاثیر کیا ہوگی
غریب و مفلس و نادار ہوں میں اور بدصورت — مہارانی کی نظروں میں مری توقیر کیا ہوگی

علاوہ اِسکے اُس کو علم تھا راجہ کی طاقت کا — سنا تھا ذکر اُس نے بارہا زورِ حکومت کا
نظر بھر کر کوئی رانی کو دیکھے کس کی قدرت تھی — خطائے یک نظر پر خاتمہ تھا جان و عزت کا

پھر اسکے بعد دروازے پہ چھوڑا بیٹھنا اُٹھنا — اُسے احساس غیرت ہو کہ ہو جذبہ رقابت کا
پرِ طاؤس سے وہ چہرۂ محبوب کی اکثر — بھگو کر فرش کو اشکوں سے تصویریں بناتا تھا

یہ تصویریں یقیناً بذبِ دل کی ترجماں ہوتیں بالفاظِ دگر ذوقِ نظر کی داستاں ہوتیں
گوالہ ان میں سب زورِ تخیل صرف کر دیتا لکیریں رالکھ پڑھ دینے والی سرخیاں ہوتیں

اُدھر سے اِک کباڑی لیکے کچھ ساماں آنکلا گوالے کو پکارا جھونپڑی کے پاس جا ٹھہرا
"میں تیرے واسطے اک بانسری لایا ہوں او لڑکے" یہ کہکر چھابڑی کو اپنی فرشِ خاک پر رکھا

گوالا اپنی دُھن میں مست اور محوِ تخیل تھا کسی کی اب اُسے آواز سننے میں تامل تھا
اب اُسکے واسطے دنیا و مافیہا برابر تھے سوادِ منزلِ مقصود سے نزدیک بالکل تھا

کباڑی نے نہ جب پایا جواب اپنی صداؤں کا تو آکر جھونپڑی میں اُسکے سالِ زار کو دیکھا
لحد کی سی اداسی ہر طرف پھیلی ہوئی پائی گوالہ سرنگوں، دلگیر اور خاموش بیٹھا تھا

کباڑی نے کہا "کیوں سست ہو کیا سانحہ گزرا تمہارے واسطے اک بانسری عمدہ سی لایا تھا
کیوں ہو سست تم رو بھی رہے ہو ماجرا کیا ہے" گوالے نے کہا "جی! ماں کا سر سے اُٹھ گیا سایا"

کباڑی نے کیا افسوس کا اظہار یہ سنکر کہا بے شُبہ اک تازہ مصیبت پھٹ پڑی تم پر
محبت اور شفقت سے ہمیشہ پیش آتی تھی ضعیفہ بامروت، نیک دل تھی اور حیا پرور

گوالے نے کہا اب ذکر چھوڑو اُس زمانے کا مجھے درکار ہے ساماں تصویریں بنانے کا
اگر تم بُرش و کاغذ، رنگ لائے ہو تو دکھلاؤ یہ چیزیں دیکھے تم کردو ادا حق دوستانے کا

یہ سُنکر چھابڑی والے نے حیرت سے اُسے دیکھا "کہا اِس قسم کا ساماں تم لے کر کرو گے کیا
"یہ لو یہ برش ہے یہ رنگ کا ڈبہ ہے یہ کاغذ" گوالے نے دیا غلہ تو جی خوش کر دیا اُس کا

جنابِ عشق کی یہ کارسازی تو کوئی دیکھے   گوالہ حُسن کی تصویریوں باقاعدہ کھینچے
حدودِ فن کے اندر یہ کشش یہ رنگ آمیزی   یہ فیضِ عشق تھا یہ سب محبت کے کرشمے تھے

سحر ہوتے ہی اپنا کام جاری کر دیا اُس نے   خطِ عارض میں زندہ بجلیوں کو بھر دیا اس نے
ارے تو بہ اِبجائے نقطہ پیشانی پہ دل رکھّا   جگر کے خون کا ڈورا لبِ تر پر دیا اُس نے

قریبِ شام نقشہ کھینچ گیا تصویرِ جاناں کا   گوالے نے ہر اک پہلو سے اسکو غور سے دیکھا
کوئی خامی نظر آئی نہ جب اُسکو تو خوش ہو کر   رکھا سینے پہ اپنے زندگی کا اپنی سرمایا

مگر اس رات گوالے پر بہت رقت رہی جاری   قریبِ آنکھوں سے اُسکی خون کے آنسو رہے جاری
پھر دن چڑھ گیا لیکن نہ دیکھی روشنی اُس نے   خدا جانے ہوئی کس قسم کی آج اُسکو بیماری

یکایک کوئی اُس کی جھونپڑی کے آگیا اندر   یہاں یہ کون ہے؟ آئی صدا وہ ہو گیا مضطر
کہا تم جھونپڑی میں میری کیسے رات کو آئے   میں اک بیکس گوالہ ہوں مِری قسمت میں ہے چکر

وہ اندر آنے والا شخص اک شاہی مصور تھا   کہا اُس نے کہاں کی رات دن کتنا ہی چڑھ آیا
گوالے کو بڑی حیرت ہوئی یہ ماجرا سُنکر   وہ سوچا کیا مری بدبختیوں نے کر دیا اندھا

یہ پوچھا اُس نے یہ تصویر کیا تم نے بنائی ہے   گوالے نے کہا جی ہاں یہ آل آشنائی ہے
گزشتہ شام کو یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی   نجانے کیوں مرائے کو یہ چیشمی میں پاتی ہے

مصور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ہو گیا رخصت   کہ کرنا تھی ابھی دربارِ شاہی میں اُسے شرکت
جنم دن تھا مہارانا کا بزمِ عیش برپا تھی   درِ دولت پہ سجدے کر رہی تھی رفعت و عظمت

دہاں کچھ پیش تصویریں ہوتی تھیں خوشجمالوں کی — ثنا خوانی میں تھے مصروف سب روشن خیالوں کی
مصور نے کہا تصویر اک ایسی بھی دیکھی ہے — کمالِ فن سے جس نے لاج رکھ لی بے کمالوں کی

مہارانا نے پوچھا کون ہے کس نے بنائی ہے — مصور نے کہا اک بے پڑھے لکھے گوالے نے
نگاہِ خاص کی طالب ہیں چابکدستیاں اُس کی — وہ جسکی جھونپڑی واقع ہے شاہی قصر کے نیچے

مہارانا نے پھر اندھے مصور کو بُلا بھیجا — وہ آیا اور بغل میں دابکر تصویر بھی لایا
کہا اُس سے مخاطب ہو کے پھر شاہی مصور نے — دکھاؤ تم مہارانا کو وہ تصویرِ دل آرا

گوالے نے بڑھا دی کانپتے ہاتھوں سے چپ رہکر — نگاہیں دیکھنے والوں کی جم کر رہ گئیں اُس پر
مہارانا نے خوش ہو کر کہا اندھے مصور سے — حقیقت میں یہ ہے تصویر ہر تصویر سے بہتر

گوالے کو مبارکباد دی شاہی مصور نے — کہا لو اب پھری تقدیر اب دن آ گئے اچھے
جگہ پائے گی یہ تصویر اب تصویر خانے میں — ہزاروں اشرفی دی جائینگی تم کو خزانے سے

سنی یہ بات تو اندھا مصور چونک کر بولا — یہ میری جان ہے تصویر میں ہرگز نہ بیچوں گا
مجھے انعام کی خواہش نہ قیمت کی تمنا ہے — سمجھتا ہوں میں اسکو حاصلِ صد زندگی بابا!

ٹٹولا اور مٹھی میں لیا دل لاکھ لاکھ اُس کا — مگر اندھے مصور نے نہ بدلا فیصلہ اپنا
نکالو اس کو دھکے دیکے دربارِ معلّٰی سے — مہارانا یہ حکمِ آخری غصے میں دے بیٹھا

سنو اک روز کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے — یہی اس دردناک افسانۂ الفت کا حاصل ہے
پسند آیا نہ رانی کو جو راجہ نے روا رکھا — جو کمزوروں کو دکھ دے وہ کوئی انسان کامل ہے؟

مہارانی نے اکدن غور سے تصویر کو دیکھا — مہارانا کے جب وہ جھل رہی تھی مور کا پنکھا
نظر آئے اُسے تصویر کی آنکھوں میں دو آنسو — دفورِ خوف سے سینے میں دل کانپا جگر لرزا

نتیجہ غالباً کچھ اس کا اچھا ہو نہیں سکتا — مآلِ نیک شاید دل شکن کا ہو نہیں سکتا
ابھی تصویر واپس کیجئے اندھے مصوّر کو — کہا راجہ نے دیوانی ہو ایسا ہو نہیں سکتا

بلانے کے لئے کچھ آدمی بھیجے گئے آخر — کہ اُس اندھے مصوّر کو ابھی لاکر کریں حاضر
وہ بیچارہ کنارہ کش ہوا ناپاک دنیا سے — بصد افسوس آکے چوبداروں نے کیا ظاہر

دیا یہ حکم راجہ نے چتا تیار کی جائے — جو شئے درکار ہو شاہی خزانے سے وہ لی جائے
جلا دی جائے اُسکے ساتھ ہی تصویر بھی اسکی — مصوّر کے کمالِ فن کی اب یوں داد دیجائے

نہایت دردناک انجام نکلا اس فسانے کا — گو اُسے کو ملا انعام اچھا دل لگانے کا
فضائیں لرزہ براندام تھیں شمسان بھومی کی — تعجب ہے نہ کیوں اُس دن ورق اُلٹا زمانے کا
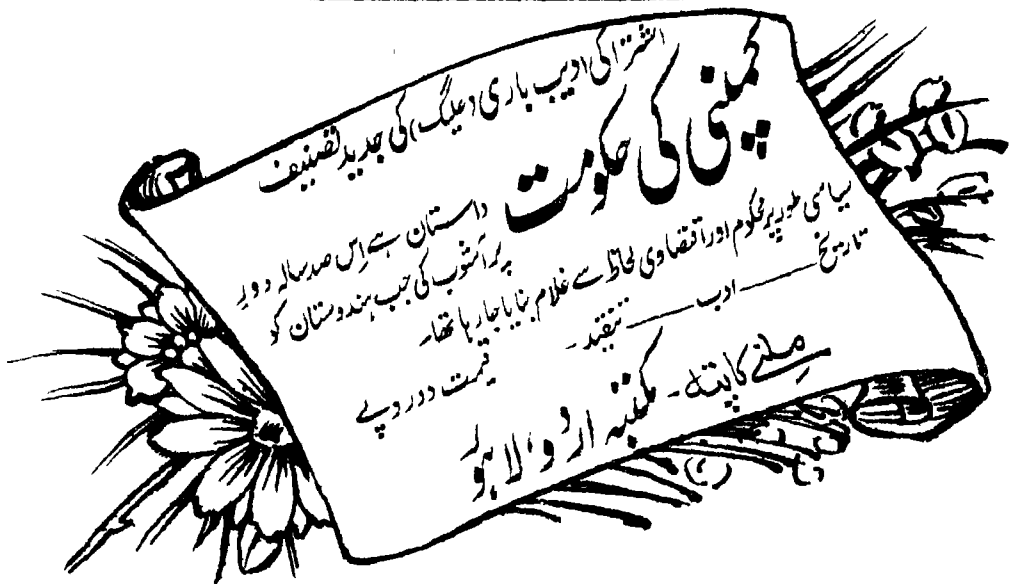
حضرت ایم۔ اسلم صاحب

دلِ ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

میں پچھلے پہر کی چائے ہوٹل میں ہی پیا کرتا تھا۔ ہوٹل کے برآمدے سے سمندر کا منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی پانی ہی پانی نظر آتا۔ کبھی جو ہوا تیز چلنے لگتی تو امواج وہ آسمان کی خبر لاتیں۔ اور غالباً اسی منظر کی کشش تھی جو مجھے اس ہوٹل میں کھینچ لاتی۔

میں عموماً برآمدے میں کونے والی میز پر بیٹھا کرتا تھا۔ ایک نوجوان جو خوش وضع بھی تھا۔ اور خوش قطع بھی کئی روز سے میری داہنی جانب والی کرسی پر آ بیٹھتا۔ لیکن میں اُسے ہمیشہ کسی خیال میں کھویا ہوا پاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ چائے کی پیالی میز پر رکھی ہے اور وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے سمندر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور کچھ گنگنا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں خود بھی تنہائی پسند ہوں۔ لوگوں سے زیادہ میل جول پیدا کرنے سے مجھے ہمیشہ نفرت سی رہی ہے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس شخص سے بات چیت کرنے کی خواہ مخواہ میرے دل میں کچھ کریدسی پیدا ہونے لگتی۔ وہ جب ہوٹل میں آتا اسی جگہ پر بیٹھ جاتا۔

ایک روز وہ میرے آنے سے پیشتر اپنی جگہ پر بیٹھا تھا میں جو پاس سے گذرنے لگا تو میری ٹھوکر سے وہ چھوٹی سی تپائی جس پر اسکی چائے رکھی تھی ہل گئی۔ اور تھوڑی سی پیالے فرش پر گری اور شاید اسکے کپڑوں پر بھی۔

"معاف کیجئے!" میں نے کہا "بہت غلطی ہوئی۔"

اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"چائے تو محض اتفاق سے گری۔ اس میں آپ کی غلطی تو ہے نہیں۔"

میں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا

"گری تو واقعی اتفاق سے۔ لیکن میری ہی غلطی تو تھی۔"

وہ سُنکر مسکرایا اور چپ ہو رہا۔

لیکن جب میں نے چائے کے لیئے ہوٹل کے لڑکے سے کہا تو وہ بولا۔

"آیئے میرے ساتھ شامل ہو جایئے۔"

"شکریہ!" میں نے مسکرا کر کہا "وہ آجائے گی ابھی۔"

"چائے تو موجود ہے" اُس نے کہا۔

"بہت اچھا تو میں شامل ہو جاتا ہوں" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی کرسی کا رُخ اس کی جانب کر لیا۔ اور ہم دونوں چائے پینے لگے۔

ہوا بہت خوشگوار تھی۔ اور سینۂ آب پر چھوٹی چھوٹی لہریں رقص کر رہی تھیں۔ ہم دونوں خاموش تھے۔

ہوٹل میں خاص رونق تھی۔ ہمارے بالمقابل دو جوان لڑکیاں اور ایک نوجوان بیٹھے چائے پی رہے تھے لڑکیاں

بہت حسین تھیں اور رقاصہ بہاکی طرح چنچل اور طرحدار بھی تھیں۔ بات بات پر ہنستیں ــــــ ان کی ہنسی میں بھی ایک لذت تھی اور گاہے گاہے ادھر اُدھر سر ہلا کر دیکھنے کا انداز بھی دلکش تھا۔

برآمدے میں جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے وہ کسی نہ کسی بہانے سر اٹھا کر ان کی طرف بھی دیکھ لیتے۔ لیکن یہ صاحب جو میرے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اسی طرح متفکر اور پریشان سے نظر آرہے تھے میں نے ہنس کر کہا۔

"دیکھئے! یہ ہیں آزادی کے کرشمے"۔

"جی ہاں!" اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ اور پھر پیالی اٹھاتے ہوئے کہا "سچ ہے! غلطی بھی تو میری ہی تھی"۔

یہ سنکر میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا وہ ذرا مسکرایا اور کہنے لگا۔

"آپ شاید یہاں سیر کے لئے تشریف لائے ہیں؟"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"اور آپ؟" میں نے پوچھا۔

"میں؟" اس نے ایک لمبا سانس لے کر کہا "جی ہاں!"

میں مسکرا کر چپ ہو رہا۔ وہ بھی کچھ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"معاف فرمایئے! جانے میں کیا واہی تباہی بک رہا ہوں"

میں صرف مسکرا دیا۔ اس نے پھر کہا۔

"کچھ عادت سی ہو گئی ہے مجھے تو"

گفتگو کے اس انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہونا چاہتا ہے میں نے ہنسکر کہا۔

"اس لئے تو آپ نے غلطی کا اعتراف کیا تھا"

"غلطی؟" اُس نے پوچھا "یہ کیسی غلطی؟"

میں ہنسنے لگا اور وہ بھی ذرا مسکرانے لگا۔

یہ تھی میری نسیم سے پہلی ملاقات۔

چند ہی روز میں مراسم اس قدر بڑھے کہ وہ دن کا زیادہ حصہ میرے پاس ہی گذارتا۔ اور اکثر ع

دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

گنگنایا کرتا۔ ایک روز اسی طرح ہم ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ وسعتِ نگاہ کے سامنے بحرِ ذخار تھا جو ایک اژدہے کی طرح پھنکارے مار رہا تھا۔ کنارے کے ساتھ اکثر شوقین کشتیوں میں بیٹھے سیر و تفریح کر رہے تھے۔ اور نسیم ہولے ہولے وہی ع

دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے!

گنگنا رہا تھا۔ میں نے ہنسکر کہا۔

"یہ تو آپ کی شکل ہی کہہ رہی ہے"

"کیا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہی" میں نے جواب دیا کہ ع

دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے!

لیکن اس پریشانی کی آخر کچھ وجہ بھی تو ہوگی"

"بلا وجہ تو کچھ ہوا نہیں کرتا" نسیم نے جواب دیا۔

"لیکن آپ نے تو کبھی یہ بتایا نہیں کہ آپکا دل زندگی سے پریشان کیوں ہے" میں نے کہا۔

"جس طرح دل پریشان ہوا کرتا ہے" نسیم نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دل کی پریشانی کے لئے ایک کلیہ تو ہے نہیں" میں نے

جواب دیا۔

"ایک ہی تو ہے" نسیم بولا۔

"مجھے تو معلوم نہیں" میں نے کہا "آپ ہی فرما دیجئے۔"

"ناکامی! نامرادی!" نسیم نے جواب دیا۔

"لیکن ان دونوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ وجہ ہونی چاہئے" میں نے ہنسکر کہا۔

"ناکامی اور نامرادی کی صرف ایک ہی وجہ ہوا کرتی ہے۔" نسیم بولا "عشق اور محبت!"

"عشق اور محبت!" میں نے کہا "تو گویا آپ عشق و محبت کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا رونا رویا کرتے ہیں۔"

"بے شک!"

"کس جفا کار کے پالے پڑے ہونگے آپ!" میں نے ہنسکر کہا۔"

"جفا کار تو وہ ازل سی تھی" نسیم نے جواب دیا۔

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی غارت گر دین و ایمان!"

"کوئی شاہد بازاری ہوگی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"راہزن صبر و ایمان کہئے" نسیم نے جواب دیا۔

"تو پھر ازلی جفا کار مت کہئے نا" میں نے کہا۔ "ازلی جفا کار تو ...."

نسیم بات کاٹ کر بولا۔

"یہ فلسفیانہ تشریح آپ رہنے دیجئے۔ اور میری سنئے۔"

"فرمائیے!"

"ہمارے مکانوں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ اور وہ سارا سارا دن سنور کر کوٹھے پر بیٹھی رہتی!"

"گھر میں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا" میں نے کہا۔

"بھئی!" نسیم نے کہا "پہلے میری تو سنو پھر جس طرح بھی کر لیجو۔"

"کہئے!"

"جب میں اس کی طرف دیکھتا تو وہ کسی اور طرف دیکھنے لگ جاتی اور جب میرا دھیان دوسری جانب ہوتا تو وہ میری طرف دیکھنے لگتی یعنی . . . ."

"یعنی!" میں نے بات کاٹ کر کہا "یہ تو وہی بات ہوئی کہ ؎

میں دیکھتا ہوں یہ کہ کدھر دیکھتے ہو تم
تم دیکھتے نہیں کہ کدھر دیکھتا ہوں میں

ٹھیک ہے نا؟"

"پھر کیا ہوا؟" نسیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خوب!" میں نے مسکرا کر کہا "آپ بیتی تو آپ کہہ رہے ہیں۔ اور پوچھا مجھ سے جاتا ہے۔"

"آپ سنتے جو نہیں" نسیم بولا "میں تو . . . ."

"ہاں! ہاں!" میں نے پھر ہنسکر کہا "آپ یہی کہنا چاہتے ناکہ ؏

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

نسیم ہنسکر کہنے لگا

"غمخوار ہو تو بس آپ ایسا ہی ہو۔ میں نے جانا کہ آپ سے کچھ اپنی کہوں گا تو کچھ جی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"اچھا!" میں نے کہا۔ "اب نہ بولوں گا۔ کہئے۔"

"کہنے کی رہنے دیجئے!" نسیم نے کہا۔ "شاید قیامت تک بھی کسی سے نہ کہتا لیکن جانے کیا بات ہے جو خود بخود کہنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"نسیم! تمہاری پریشانی تمہارے دل کی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ اور خدا کی قسم! مجھے اس کا احساس بھی ہے۔ اس لئے میں ذرا بیچ میں کوئی مذاق کی بات کہہ دیتا ہوں۔ اب نہ کہوں گا"

"خدا کی قسم!" نسیم بولا۔ "مجھے بھی تمہاری ہمدردی کا اگر یقین نہ ہوتا تو کبھی یہ دکھڑا تمہارے سامنے نہ لے بیٹھتا۔ خیر سنئے۔ اس کی یہی حرکتیں غالباً میرے لئے اس وقت زیادہ دلچسپی کا باعث بن رہی تھیں۔ کبھی یوں ہوتا کہ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے لیکن جہاں میری نگاہ ادھر ہوئی۔ وہ غائب۔!

آپ جانئے اس بہانہ ساز کے چھپنے اور پھر سامنے آنے سے جو چوٹ دل پر لگتی اب آپ سے کیا کہوں؟ پچھلے پہر تو اس کی سج دھج دیکھ کر اندر کے اکھاڑے کی پری کا گمان ہوتا لیکن صبح کے وقت اس کے حسن کا کارواں کچھ لٹا لٹا سا نظر آتا۔ اس وقت وہ اس پھول کی طرح معلوم ہوتی جسے صرف رات بھر میں ہوا کے نفس گرم نے جھلس دیا ہو۔ مرجھایا ہوا اور پھیکا پھیکا سا اور پھر اس کا بار بار انگڑائی لینا صاف ظاہر کرتا کہ غریب بہت تھکی ماندی ہے لیکن خدا کی قسم! یہ انگڑائی بھی قیامت سے کم نہ ہوتی۔ اُس کے کسے ہوئے بدن کی لطافتیں کچھ اس طرح عریاں ہوتیں کہ دل ہزار تمناؤں کا آماجگاہ بنجاتا۔"

"میں خاموش بیٹھا اس نوجوان کا قصہ حسن وعشق سن رہا تھا۔

"سنتے ہو نا" نسیم نے بے تکلفی سے میرے زانو پر ہاتھ مار کر کہا۔ "سنتے ہو یا سوتے ہو؟"

"سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"خیر! کچھ روز تو یوں ہی ہوتا رہا لیکن پھر اس نے نیا طریقہ نکالا۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اب وہ دو دو چار چار روز چھپی رہتی اور جو کبھی کوٹھے پر مجھے دیکھ پاتی تو فوراً ایک طرف ہو جاتی اور میرا یہ حال کہ اس تماشہ کو صرف ایک نظر دیکھنے کو پہروں دھوپ میں بیٹھا رہتا۔ اور جو وہ کبھی سامنے ہوتی بھی تو منہ پھیر کر کھڑی ہوتی۔"
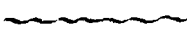
ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں سینما سے واپس آ رہا تھا۔ کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ رات اسی قتالہ کی زلف سیاہ کی طرح تاریک تھی جھکڑ سا چل رہا تھا۔ ابر ہو رہا تھا۔ بادلوں میں بجلی بھی کوندتی۔ اور بادل کی گرج بھی سنائی دیتی۔ اچانک پانی برسنے لگا۔ اس کے کوچے سے میرے مکان کو جو راستہ جاتا تھا۔ وہی سب سے نزدیک تھا۔ میں لانبے لانبے ڈگ بھرتا اسی رُخ پر ہو لیا۔ بارش سے بچنے کے لئے میں نے اپنا "اوور کوٹ" کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ جس وقت میں اُسکے مکان کے قریب آیا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس وقت برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں نے چاہا کہ چپکے سے گذر جاؤں لیکن وہ مجھے دیکھتے ہی نیچے بازار میں آگئی۔ بازار تقریباً

سنسان پڑا تھا۔ میں جب پاس سے گذرنے لگا۔ تو اس نے دو چار قدم آگے آکر میرا کوٹ پکڑ لیا اور بولی۔

"ایسے میں آپ کہاں جائینگے۔ ذرا تشریف اوپر لے چلیئے"

وہ مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئی۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں دو ایک کرسیاں اور ایک خوبصورت پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دیوار سے آئینہ لگا تھا۔ اس نے مجھے تو پلنگ پر بٹھا دیا اور آپ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔

"کچھ بات چیت ہی کیجئے"

"ارشاد؟"

"یہ آپ کہاں چھپے رہتے ہیں" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں یا آپ!" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی اور پھر بولی۔

"آپ کو مجھے پر کسے دیکھا کرتے ہیں؟"

"آپ کو!"

"مجھے؟" اس نے کہا۔

"ہاں!"

"اور یہاں کیوں نہ آئے؟"

"کیسے آتا؟" میں نے کہا۔

"کیوں دروازہ بند تھوڑا ہی ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے معلوم نہ تھا۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"سینما سے!"

کچھ دیر اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ بارش موسلادھار ہو رہی تھی۔

"اب اجازت دیجئے!" میں نے کہا۔

"کہاں جائینگے آپ؟"

"گھر"

"کیوں؟"

"مجھے نیند آ رہی ہے"

"یہ بھی تو آپکا ہی گھر ہے" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "سو رہیئے!"

صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ ابھی سوئی ہوئی تھی۔ اس وقت اسکے حسن کا کاروان لٹا لٹا سا نظر آرہا تھا۔ اور وہ اس پھول کی طرح تھی جسے رات بھر بیس ہوا کے نفسِ گرم نے جھلس دیا ہو۔ مرجھایا ہوا اور پھیکا پھیکا!

کچھ دیر بعد وہ بھی بیدار ہوئی اور مجھے دیکھ کر شرما گئی۔

کچھ عرصہ بعد ہر روز ملاقات ہونے لگی۔ وہ طرح طرح سے مجھے اپنی غیر فانی محبت کا یقین دلاتی۔ اور پھر اپنے طرزِ عمل سے بھی ظاہر کرتی کہ کم بخت میری محبت میں گھلی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"کم بخت!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کمبخت نہیں!" نسیم بولا "بلکہ" خوبصورت بلا کہئے جتا ع
دل کے ساتھ میں ہر روز مال و زر بھی اسکے حُسن کے شوالے پر بھینٹ
چڑھاتا رہتا۔ اور دل میں خوش ہوا کرتا کہ خیر! آخر کسی کو مجھ
سے محبت تو ہے۔ پانچ سات مہینے اسی طرح گذر گئے۔ ایک
روز وہ باتوں باتوں میں بولی۔

"سنا کرتی تھی کہ مرد کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ بلکہ پتھر
ہوتا ہے۔ شکر ہے کچھ تجربہ بھی ہو گیا۔"

"گویا!" میں نے ہنسکر کہا! "میرے پہلو میں دل نہیں
بلکہ پتھر ہے؟"

"بے شک!" اس نے ایک خاص انداز سے میری
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"

انعام تو تم نے خوب دیا۔" میں نے کہا۔

"انعام!" اس نے ایک جنبش جانانہ سے سر ہلا کر کہا۔
"میں نے تو جان تک قربان کر دی لیکن افسوس آپ کے
دل کا حال نہ کھلا۔"

"ذرا اپنے دل سے تو پوچھو۔" میں نے کہا۔

"سو بار پوچھ چکی!" وہ کہنے لگی "لیکن ان تلوں میں تیل
نظر نہ آیا۔"

"آخر کوئی خطا بھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہی تو آپ مردوں میں ایک کمال ہے۔" وہ کہنے لگی
"جہاں آپ کو مجھ ایسی عورت کی محبت کا یقین ہو جائے۔
پھر ذرا "دماغ" کرنے لگتے ہیں۔"

"یہ تو بس خدا کو ہی معلوم ہے کہ مجھے تم سے کس قدر
محبت ہے!" میں نے کہا۔

"سچ؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم!" میں نے کہا۔ "بالکل سچ ہاں! تمہارے
دل کی کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"جی ہاں!" اس نے پھر سر ہلا کر کہا۔ "ذرا دل سے پوچھئے
یہ آٹھوں پہر دھوپ میں کون بیٹھتا ہے۔"

"بخدا" میں نے کہا "میں تو اسے تمہارا احسان
سمجھتا ہوں۔"

"اور مجھے آپ کے ہی سر کی قسم!" وہ کہنے لگی "میں اپنے
آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت ہے۔" اس
نے ہنسکر کہا۔

"اور ابھی کیا کہہ رہی تھیں تم!" میں نے مسکرا کر پوچھا
"آپ کی محبت کا امتحان لے رہی تھی۔"

"تو پھر میں پاس ہوں یا نہیں؟"

پاس ہی سمجھئے۔ . . . ."

یہ تو رات کا قصہ تھا لیکن اسی روز کوئی دوپہر کے
وقت میں نے اسے کوٹھے پر خوب بنے سنورے دیکھا۔
وہ کچھ دیر تو میرے سامنے کھڑی رہی لیکن میرا دوسری
طرف دھیان ہوتے ہی ہٹ گئی۔ میرے دل میں جو آئی تو
میں اسی وقت اسکے مکان پر جا پہنچا۔ پہلے ہمیشہ میں اسے
اطلاع کر کے جایا کرتا تھا۔ لیکن شوق نے آج اطلاع کرنے
کی بھی فرصت نہ دی۔ میں چپکے سے سیڑھیاں چڑھکر اوپر

چلا گیا۔ وہ کمرہ جہاں بیٹھ کر وہ مجھے ہر روز اپنی محبت کا یقین دلایا کرتی تھی اور قسمیں کھا کھا کر نباہ کے قول و اقرار کیا کرتی سیڑھیوں کے پاس ہی تھا۔ کمرے کے کواڑ بند تھے۔ اور چلمن پڑی ہوئی تھی۔ میں نے چلمن ہٹا کر کواڑ کو جو ذرا دھکیلا تو کواڑ کھل گیا۔ اس وقت وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ محوِ اختلاط تھی جسے وہ اپنا بھائی بتایا کرتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گئی لیکن میں اسی وقت وہاں سے چلا آیا۔"

اتنا کہہ کر نسیم خاموش ہو گیا۔

"کتنا عرصہ ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی پانچ سات مہینے" نسیم نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم اس کے بعد پھر تو اس سے نہیں ملے" میں نے پوچھا۔

"نہیں!"

لیکن ملنے کو دل تو چاہتا ہوگا" میں نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"چاہتا تو ہے" نسیم کہنے لگا "لیکن اب قیامت تک بھی نہ ملوں گا۔"

"کیوں!"

"میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں" نسیم بولا "لیکن جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس وقت ان دو لڑکیوں میں سے ایک انگریزی میں دوسری سے کہہ رہی تھی

"آدم اگر عقلمند ہوتا تو حوا کے دام میں کیوں آجاتا!"

اور دوسری نے جواب دیا۔

"اور تم اسی لئے مرد کو کم عقل کہتی ہو؟"

"اور کیا؟"

"محض غلط ہے!" دوسری نے کہا "ہاں بعض اوقات عورت کی محبت اس کی عقل پر پردہ ڈال دے تو اور بات ہے۔"

"چلو یونہی سہی!" پہلی نے ہنس کر کہا۔ "تنا تو تم بھی مانتی ہو کہ عورت اگر چاہے تو مرد سے بازی جیت سکتی ہے۔"

"فریب کی قائل نہیں" دوسری نے کہا "فریب کاری اور جھوٹ عورت کے لئے سب سے بڑا دھبہ ہے۔"

"اور محبت؟" پہلی نے پوچھا۔

"عورت کی محبت مرد کی دنیا کو جنت بنا سکتی ہے۔"

"اور جو وہ ریاکاری پر اتر آئے؟" ان کے ساتھ والے نوجوان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر جنت کو جہنم!"

تینوں ہنسنے لگے۔

نسیم خاموش بیٹھا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میرا دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

نوشتہ "چارلس ڈکنس"

مترجمہ سید شریف حسین انور گیلانی بی۔اے بی۔ٹی۔

سیاہ پوش عورت

[illegible] سن عیسوی کا اختتام تھا۔ موسم سرما کی شام تھی۔ ایک نوجوان ڈاکٹر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا انگیٹھی کے سامنے آگ تاپ رہا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ بارش کے قطرے کمرے کی کھڑکی اور روشندان کے ساتھ ٹکرا کر ایک بھیانک سماں پیدا کر رہے تھے۔ ہوا تیز و تند تھی۔ اور سردی کی شدت تھی۔ دن بھر مینہ برستا رہا تھا۔ نوجوان ڈاکٹر بارش اور کیچڑ میں مریضوں کی دیکھ بھال میں پھرتا رہا تھا لیکن اب اپنے گھر پر ہونے کی وجہ سے مطمئن تھا۔ اُس نے شبخوابی کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں مختلف خیالات تھے کبھی اسکے ذہن میں آتا کہ اگر وہ اس وقت گھر پر موجود نہ ہوتا تو بارش۔ تند ہوا اور سردی کی وجہ سے سخت مصیبت کا سامنا ہوتا کبھی وہ اُن ایام کو یاد کرتا جب وہ کرسمس کے دنوں میں اپنے وطن پہنچا تھا اُسے آئینہ تصور میں آشنا اور خویش و اقارب نظر آرہے تھے۔ پھر اُسے خیال آتا کہ اس کی پیاری "روز" بہت شادماں ہوتی جب وہ اُسے اپنی کامیابی کا حال سناتا اور بتاتا کہ اب اُس کی شہرت ہو چکی ہے۔ اور اسکے پاس بہت بڑی تعداد میں مریض علاج کیلئے آتے ہیں۔ پھر وہ سوچتا کہ عنقریب وہ اُس سے شادی کریگا اور اُن دونوں کی زندگی کیف و مسرت میں گذرے گی۔ آخر یہ خوش کن خیال بھی جاتا رہا اور وہ کسی مریض کا انتظار کرنے لگا لیکن جب کافی وقت گذر گیا۔ تو اونگھنے لگا۔ اور سو گیا اُسے خواب میں معلوم ہوا کہ اُسکے کانوں نے "روز" کی کیف آور آواز سنی ہے۔ اور اُس کے ہاتھ اُس کے کندھے پر ہیں۔ مگر یہ ہاتھ اُس کی "روز" کے نہیں۔ بلکہ اُسکے ملازم لڑکے کے تھے۔

خادم۔ آقا! کوئی عورت آپسے ملاقات کرنی چاہتی ہے۔

ڈاکٹر۔ (بدحواسی میں آنکھیں ملتے ہوئے) کونسی عورت کیا "روز" ہے؟

خادم۔ جناب۔ ایک سیاہ پوش عورت ملحقہ کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

اسی اثنا میں وہ عورت اُس کمرہ میں آپہنچی۔ ڈاکٹر اُسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

یہ اجنبی عورت ایک سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ اور دروازہ کے قریب استادہ تھی۔ اُس کے چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ وہ اس طرح کھڑی تھی گویا ایک مجسمہ غم ہے۔

ڈاکٹر۔ (عورت سے) کیا آپ مجھ سے طبی مشورہ چاہتی ہیں۔

عورت۔ (دبی زبان میں) ہاں۔

ڈاکٹر۔ قریب آجائیے۔

عورت کچھ آگے بڑھ کر ڈاکٹر کے قریب رُک گئی۔ ڈاکٹر
سمجھ گیا۔ اور خادم کو چلے جانے کے لئے کہا۔ اُس نے دروازہ
بند کر دیا۔ اور پردہ چھوڑ دیا۔ اور پھر عورت کو بیٹھنے کے لئے
کہا۔ جب وہ ڈاکٹر کے قریب آکر بیٹھ گئی تو معلوم ہوا کہ اُس کا لباس
پانی سے بھیگا ہوا ہے۔

ڈاکٹر۔ (عورت سے) آپ کے تمام کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔

عورت۔ ہاں۔

ڈاکٹر۔ (ہمدردی سے) آپ بیمار معلوم ہوتی ہیں۔!

عورت۔ ہاں لیکن مجھے کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے۔
میرے دل پر زخم ہے میں کسی دوسرے کی وجہ سے غمزدہ ہوں
اور اسی غرض سے آئی ہوں۔ اگر میرے اپنے جسم کو کوئی تکلیف
لاحق ہوتی۔ تو میں یہاں کبھی نہ آتی۔ اور خوشی سے بستر علالت
پر پڑی رہتی اور جان دے دیتی میں دوسرے کے لئے آپ سے
مدد کی خواہاں ہوں شاید آپ مجھے دیوانہ سمجھیں ——
مجھے کسی کی ہمدردی کا خیال بے تاب کر رہا ہے۔ اور اگرچہ میں
جانتی ہوں کہ *اس کی تجہیز و تکفین پر ہمدردی کا اظہار ہو سکے۔

جب وہ درد بھری آپ بیتی سنا رہی تھی۔ تو اس کے
نحیف جسم میں لرزش پیدا ہوئی۔ جو ڈاکٹر نے محسوس کی۔ اُس
کی آواز میں بھی اس قدر سوز تھا کہ سننے والے کا دل متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر ابھی نوجوان تھا۔ اور اُسکی آنکھوں
نے ابھی انسانی تکالیف کا بہت کم نظارہ کیا تھا۔

ڈاکٹر۔ (اپنی نشست گاہ سے اُٹھکر) اگر بیمار کی حالت بہت
ناگفتہ بہ ہے تو ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ میں
آپکے ساتھ ابھی چلنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ نے مجھے اس
سے قبل کیوں نہ بلایا۔

عورت۔ میں آپکو ضرور پہلے بلاتی لیکن اس وقت طبی امداد
بے فائدہ تھی۔ اور اب بھی بے سود نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر نے غور سے نقاب میں سے عورت کی جسمانی
حالت کا جائزہ لیا۔

ڈاکٹر۔ آپ بیمار ہیں۔ اگرچہ آپ کو اس کا احساس نہیں۔
آپ سخت بخار کی حالت میں میرے پاس چلی آئی ہیں۔ کچھ
دیر آرام کیجئے۔ پھر مجھے مریض کی تمام کیفیت بتائیے۔
(پانی کا گلاس دیکر) یہ گلاس نوش کر لیجئے۔ آپکی کلفت
دُور ہو جائے گی۔

عورت نے گلاس اُٹھایا کہ پانی پئے لیکن پھر رکھدیا
اور زار زار رونے لگی۔

عورت میں جانتی ہوں کہ جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں۔ وہ
دل کی جلن ہے۔ اس سے پہلے بھی مجھے یہی کہا گیا میں نوجوان
عورت نہیں ہوں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے
آخری ایام اُس کی اولین زندگی کے زمانہ سے زیادہ دلفریب
ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان ایام میں اُسکے احباب خویش و اقارب
اور اہل و عیال اُس سے موت کی وجہ سے بچھڑ گئے ہوں۔
اور اس کی کشتی حیات عالم کے بحر ناپیدا کنار میں ہچکولے کھا
رہی ہو۔ اور اُسکا کوئی کھیوا نہ ہو میں وہی ہستی ہوں۔ جو
زندگی کے ایام ختم کر چکی ہے۔ اور اب چراغ سحری ہے۔
موت میرے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ میں خوشی سے مرنے
کے لئے تیار ہوں۔ کاش جو کچھ میں آپ کو بتا رہی ہوں جھوٹ
ثابت ہو۔ کل صبح جس کے متعلق میں آپ سے مدد کی خواہاں

*انسانی ہمدردی اس کی بہن [illegible] بے سود ہے۔

ہوں انسانی مدد سے بے نیاز ہو گا لیکن آج رات جبکہ وہ ایک مہلک خطرہ میں ہے آپ اس کی مدد نہ کرسکیں گے۔

ڈاکٹر۔ مزید حالات پوچھکر میں آپکے رنج میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ جبکہ آپ ابھی مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔ آپکے حالات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مریض کی حالت بہت خراب ہے اور وہ شاید رات زندہ نہ رہ سکے لیکن مجھے سخت تعجب ہے کہ آپ اس وقت اسکے علاج میں کوتاہی اختیار کر رہی ہیں آپ سمجھتی ہیں کہ کل اسکا علاج بے سود ہوگا لیکن اب آپ اُسے دکھانا نہیں چاہتیں۔ اگر واقعی آپ کو اس سے محبت ہے جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے۔ تو آپ کو اس کی زندگی بچانی چاہیے۔ اور اسکے مہلک مرض کی روک تھام کرنی چاہئے۔

عورت۔ (روتے ہوئے) پروردگار میری مدد کرے افسوس میں دوسروں کو اسکے متعلق یقین نہیں دلا سکتی جس کا مجھے خود ابھی یقین نہیں (اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے) آپ اس وقت مریض کو نہیں دیکھ سکتے۔

ڈاکٹر۔ مجھے خطرہ ہے۔ اگر آپ اب مجھے دکھانے میں کوتاہی کریں گی۔ تو مریض کی جان کا خطرہ ہوگا۔ اور اگر وہ مرگیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔

عورت۔ لیکن یہ ذمہ داری کسی دوسرے پر عائد ہوگی میں جس بات کی ذمہ دار ہوں اسکو پوری طرح نباہتی ہونگی۔

ڈاکٹر۔ خیر اگر آپ یہی چاہتی ہیں۔ کہ میں اس مریض کو صبح کے وقت دیکھوں۔ تو میں رضامند ہوں۔ آپ مجھے گھر کا پتہ بتادیں۔ نیز وقت کے متعلق بھی مطلع کردیں۔

عورت۔ وال ورتھ۔ دن کے نو بجے۔

ڈاکٹر۔ (مزید سوالات کرتے ہوئے) کیا مریض اس وقت آپ کی زیرِ نگرانی ہے۔

عورت۔ نہیں۔

ڈاکٹر۔ اس حالت میں آپ اس کی مدد نہیں کرسکتیں۔ اگر میں کوئی ہدایت کروں۔

عورت بے ساختہ رو پڑی اور کہا۔ ہاں میں اُسکی مدد نہیں کرسکتی۔

جب ڈاکٹر کو معلوم ہوا۔ کہ اب مزید حالات دریافت کرنا بے سُود ہے۔ اور عورت کی پریشانی بڑھ رہی ہے۔ تو اس نے اُسے جانے کی اجازت دیدی۔

وہ عورت تو چلی گئی لیکن ڈاکٹر دیر تک محوِ خیال رہا وہ مریض کی حالت کے متعلق سوچتا رہا کبھی وہ یہ خیال کرتا کہ کہ شاید مریض کو کسی نے اُس کی موت کی بابت بتا دیا ہے۔ اور اُسے یقین ہوگیا ہے کہ وہ اس وقت مرجائے گا۔ اور اب وہ بے ہوشی کی حالت میں ہے۔ لیکن یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ پھر وہ خیال کرنے لگا کہ شاید اس شخص کو صبح کسی نے قتل کرنا ہو۔ اور یہ عورت معالجہ سے اس کو زندہ رکھنا چاہتی ہو لیکن ایسا واقعہ شہر کے قرب وجوار میں نہیں ہوسکتا۔ پھر اُسے عورت کی بدحواسی کے متعلق خیال آیا۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ عورت دیوانی ہے۔ تمام رات خواب میں ڈاکٹر کو اسی عورت کا خیال رہا۔ اور اسے ذہن سے نہ بھلا سکا۔

عورت نے مقام وال ورتھ بتایا تھا۔ جہاں ڈاکٹر نے صبح پہنچنا تھا۔ یہ شہر سے کچھ فاصلہ پر غیر معروف جگہ تھی۔ جہاں صرف غریب طبقہ کے لوگ رہتے تھے جن کے چال

چلن مشکوک تھے۔ مکانات پُرانی وضع کے تھے حفظانِ صحت کی رُو سے یہ جگہ نہایت مضر تھی۔ ڈاکٹر نے صبح اُس مقام کا رُخ کیا۔ سفر کوئی خوشگوار نہ تھا۔ راستہ ایک دلدل میں سے گذرتا تھا۔ جسکے دونوں جانب کہیں کہیں مکانات تھے۔ جو نہایت خستہ حالت میں تھے۔ گذشتہ روز کی بارش کی وجہ سے سڑک پر کیچڑ تھا۔ اکثر مقامات پر پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف بدبو تھی۔ کئی بیماریوں کے جراثیم تھے۔ ڈاکٹر راستہ میں اس مقام کے متعلق دریافت کرتا جاتا تھا۔ لیکن تسلی بخش جواب نہ پاتا تھا۔ آخر کار وہ بصد مشکل اُس مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ جہاں اُس نے جانا تھا۔

یہ ایک پرانی وضع کا چھوٹا سا مکان تھا۔ اور دو منزلہ تھا۔ اِردگرد کا علاقہ نہایت خراب حالت میں تھا۔ اوپر کے حصہ میں کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے اور روشندان بند تھے۔ اُسکے قریب کوئی اور مکان نہ تھا۔ ڈاکٹر کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹائے۔ کچھ دیر وہ رُکا رہا۔ پھر آگے بڑھا۔ اور دروازے کو دستک دی۔ سرگوشی کی سی آواز سُنائی دی۔ غالباً کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے گفتگو کر رہا تھا۔ آخر سیڑھیوں پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی کسی نے چٹخنی کو ہٹایا۔ اور دروازہ کھولا۔ ایک شخص جو طویل القامت تھا نمودار ہوا جس کے بال سیاہ تھے۔ اور چہرہ ایسا بدصورت اور کریہہ تھا کہ کسی مُردہ انسان کا معلوم ہوتا تھا۔ آخر اُس شخص نے ڈاکٹر سے کہا "جناب اندر تشریف لے آیئے"۔

ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اُس شخص نے دروازہ بند کر دیا۔ اور ایک چھوٹے کمرہ میں لے گیا۔

ڈاکٹر - (اجنبی شخص سے) کیا میں وقت پر پہنچ گیا ہوں؟

شخص - ہاں۔ آپ کچھ دیر پہلے آ گئے ہیں۔

ڈاکٹر یہ سُنکر بہت مذبذب ہوا۔ اس شخص نے ڈاکٹر کی پریشانی دیکھی اور کہا۔

"آپ مت گھبرائیں۔ میرے ساتھ دوسرے کمرہ میں چلیں۔ آپ کو پانچ منٹ سے زیادہ دیر نہ لگے گی"

ڈاکٹر اُس کمرہ میں داخل ہوا۔ اُس شخص نے پھر دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں دو کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔ دیواریں نہایت خراب حالت میں تھیں۔ بارش کے پانی سے کمرے میں نمی ہو گئی تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی تھی جس میں سے مکان کی ایک طرف جوہڑ دکھائی دیتا تھا۔ نہ تو مکان کے اندر کسی قسم کا شور تھا۔ اور نہ اس کے باہر۔

ڈاکٹر کرسی پر بیٹھ کر آئندہ واقعات کا انتظار کرنے لگا ابھی اُسے اُس جگہ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ کہ اُسے ایک گاڑی کے پہیوں کی آواز سُنائی دی۔ وہ مکان کے نیچے آکر رُکی دروازہ کھلا۔ دو تین اشخاص مکان کی بالائی منزل میں آئے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے کسی کو کندھوں پر اُٹھایا ہوا ہے کچھ دیر کے بعد نووارد چلے گئے۔ کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔ پانچ منٹ گذر گئے۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ اپنی جگہ [illegible] نقاب پوش عورت کو تلاش کرے۔ اور اُس سے مریض کے متعلق دریافت کرے۔ اس اثنا میں دروازہ کھلا۔ اور وہی عورت نمودار ہوئی۔ عورت ڈاکٹر کو ایک دوسرے کمرے

میں لے گئی۔ اور خود دروازہ پر رک گئی۔ تاکہ ڈاکٹر پہلے داخل ہو۔ کمرہ میں تاریکی تھی۔ روشندان سے بہت کم روشنی آتی تھی۔ اور اندر کی اشیا صاف نظر نہ آتی تھیں۔ وہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ یکایک عورت لپکی اور ایک چارپائی کے سرہانے بیٹھ گئی۔ چارپائی پر ایک نوجوان شخص کی نعش تھی۔ جو ٹاٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ ایک پٹی سر پر بندھی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ بایاں بازو چارپائی پر تھا۔ لیکن دایاں بازو عورت کے ہاتھ میں تھا۔ ڈاکٹر نے عورت کو ایک طرف ہٹا کر بازو ہاتھ میں لیا۔ اور بے ساختہ چلا اٹھا "یہ شخص تو مرچکا ہے"

عورت۔ ڈاکٹر۔ یہ نہ کہو کہ وہ مرچکا ہے۔ میں برداشت نہیں کرسکتی۔ شاید اس میں کوئی سانس ہو۔ ڈاکٹر کوشش کرو کہ وہ جانبر ہو سکے۔

اس عورت نے شخص کی پیشانی کو رگڑا۔ پھر چھاتی کو اور پھر اسکے سرد ہاتھوں کو ــــــ

ڈاکٹر۔ (عورت سے) تم پریشان نہ ہو۔ تمہاری یہ کوشش بے سود ہے۔ پردہ کو روشندان سے ہٹا دو۔

عورت۔ کیوں۔

ڈاکٹر۔ پردے کو ہٹا دو۔

عورت۔ میں نے عمداً پردہ کو چھوڑ رکھا ہے۔

جب ڈاکٹر پردے کو ہٹانے کے لئے بڑھا تو عورت نے روک لیا۔ اور کہا "ڈاکٹر مجھ پر رحم کرو۔ اگر واقعی یہ شخص مردہ ہے۔ اور تم اسے جانبر نہیں کرسکتے تو اس کی نعش کی ماہیت کو سوائے میرے کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دو۔

ڈاکٹر۔ یہ شخص کسی بیماری کی وجہ سے نہیں مرا۔ مجھے ضرور اسکا جسم دیکھنا چاہیئے۔ آخر لپک کر ڈاکٹر نے پردہ کو پھاڑ ڈالا۔ کمرے میں اب پوری روشنی تھی۔

ڈاکٹر نے نعش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کہ کسی شخص نے مرحوم کے گلے کو دبایا ہے۔ اس اثنا میں عورت نے گھبراہٹ کی حالت میں چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ اس کے جسم سے نقاہت آشکارا تھی۔ وہ پچاس سال کی ضعیف عورت تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ غم واندوہ کے آثار اس کی آنکھوں سے نمایاں تھے۔ اس کی ذہنی اور دماغی حالت غم کی وجہ سے بگڑ چکی تھی۔

ڈاکٹر۔ (عورت سے) وہ دیکھو۔ مرحوم کے گلے پر کوئی نشان ہے۔ شاید کسی نے اس کو دبایا ہے۔

عورت۔ ہاں یہ قتل ہوا ہے۔

ڈاکٹر۔ کس نے کیا؟

عورت۔ میں خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کہتی ہوں۔ کہ اس شخص کو کسی نے بے رحمی سے مار دیا ہے۔

ڈاکٹر۔ آخر کس نے قتل کیا؟

عورت۔ مرحوم کی گردن پر جھک کر دیکھو۔

ڈاکٹر چارپائی پر جھکا اور غور سے مردہ شخص کے چہرے کو دیکھا۔ گلا سوجا ہوا تھا۔ اور ایک دائرہ کا نشان نمایاں تھا۔ حقیقت ظاہر ہوگئی۔

ڈاکٹر۔ (عورت سے) یہ شخص آج پھانسی پر لٹکایا گیا ہے۔

عورت۔ ہاں۔

ڈاکٹر۔ یہ کون تھا؟

عورت ۔ یہ میرا بیٹا تھا۔

یہ کہکر وہ بیہوش ہوکر گر پڑی۔ بہت دیر کے بعد ڈاکٹر اُسے ہوش میں لایا۔

یہ سچ ہے مرحوم کا ایک رفیق جو اسی پاداش میں گرفتار ہوا تھا۔ چھوڑ دیا گیا۔ چونکہ کافی شہادت بہم نہ پہنچ سکی۔ لیکن یہ شخص دار پر لٹکایا گیا۔ تمام واقعات کا دُہرانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ شاید بعض احباب کے دلوں کو ٹھیس لگے۔ یہ روزمرہ کے واقعات میں سے ہے۔ عورت بیوہ تھی نہ اُس کے پاس دولت تھی اور نہ کوئی خویش واقارب میں سے زندہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کی مدد نہ کر سکی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا بُری صحبت میں پڑ گیا اور اوباش ہوگیا۔ اس نے والدہ کو چھوڑ کر جرائم کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اُس کی والدہ ماںتا کی ماری اُس کے غم میں نڈھال ہوتی گئی۔ بدنصیب بیٹے کو معلوم نہ تھا کہ اس کی ماں کی کیا حالت ہے۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔

لڑکا اپنے جرائم کی پاداش میں دار پر لٹکایا گیا۔ اور اُسکی والدہ وفورِ غم کے احساس سے دیوانہ ہوگئی۔ اِس واقعہ کے بعد ڈاکٹر کئی سال تک اُس بوڑھی عورت کی دلجوئی کرتا رہا۔ اور حتی الامکان اُسکے دل کی خلش مٹاتا رہا۔ اور مالی امداد کرتا رہا۔ اُس عورت کی دعائیں ڈاکٹر کے شاملِ حال رہیں۔ اور وہ اپنے کاروبار میں بہت کامیاب ہوا حتیٰ کہ وہ شہرت کے آسمان پر آفتاب بنکر چمکا۔ کچھ عرصہ کے بعد عورت مر گئی لیکن اُسکی یاد ڈاکٹر کے دل سے زندگی

جناب پروفیسر احسن مارہروی

عقل کا دشمن

کہتے ہیں کہ ایک احمق النّاس — بیٹھا ہوا اپنی زوجہ کے پاس
مخمورِ شرابِ ما و من تھا — یعنی اس طرح لاف زن تھا
ہو غیر کہ بھائی بند کوئی — مجھ سا نہیں، عقل مند کوئی
ہیں سب سے ہوں مجھسے ہیں سب آگاہ — دیکھی ہوئی میری ہے ہر اک راہ
تھا گرم سخن وہ اس رجز میں — مصروف تھی زوجہ پخت و پز میں
سالن اِدھر پکا دھرا تھا — کھچڑی وہ اُدھر پکا رہا تھا

بی بی نے دوّانی ایک دے کر — اس سے یہ کہا کہ اس کو لے کر
"بازار سے تیل جلد لادو — اتنا مرا ہاتھ تم بٹا دو"
اُٹھا لے کر وہ ظرفِ خالی — یعنی چھوٹی سی اک پیالی
جس میں پیندا بنا ہوا تھا — گھیرے کی طرح گھرا ہوا تھا

القصہ چلا وہ سوئے بازار — جس طرح کہ جاتے ہیں خریدار
بنیئے کی دکان سے لیا تیل — لیتے ہوئے یہ ہوا نیا کھیل
برتن میں نہ تھی زیادہ وسعت — پیدا ہوئی اک طرح کی دقّت
دو ایک پلی بچا جو روغن — لالہ نے کہا کہ مشفقِ من!
برتن کوئی اور تم نکالو — یا، دام بچے ہوئے اُٹھا لو

یہ سُن کے بھرا ہوا کٹورا — اوندھا کیا، اور دکھا کے پیندا
کہنے لگا تیل اس میں بھر دو — لبریز اس کو اِدھر بھی کر دو
ظرف اُلٹے ہوئے کھڑا ہوا تھا — یہ جان کے وہ اڑا ہوا تھا
ہر چند اُلٹ دیا ہے برتن — پھر بھی ہے لبالب اس میں روغن

احمق کو یہ تھا یقین کامل
کج دار و مریز کا ہوں عامل

پھر اُس پہ نہ کوئی غم نہ خطرہ
گویا نہیں پھینکا ایک قطرہ

بنیے نے یہ دیکھ کر سفاہت
ہنس ہنس کے کیا دکاں سے رخصت

آیا اس طرح تیل لے کر
جیسے کوئی معرکہ کیا سر

بولا بی بی سے "دیکھ یہ تیل
کیسا ہے خالص اور بے میل

اور دیکھ تو کیسی جھلک ہے اسمیں
سرسوں کی سی مہک ہے اس میں

ایسا اگر کوئی اور لاتا
کچھ دام ضرور وہ بچاتا"

دیکھی بی بی نے جب پیالی
اوندھی ہوئی ہاتھ میں ہے خالی

جھلا کے وہ بولی ہے یہ کیا رنگ
پی تو نہیں آئے ہو کہیں بھنگ

دو آنے کا لائے ہو یہی تیل
کس طرح منڈھے چڑھیگی یہ بیل

لائے بھی تو پیندے میں ہو لائے
ایسے احمق کہاں بن آئے؟

بی بی کی یہ لعن طعن سنکر
بگڑا، اُچھلا، بنائے تیور

کہنے لگا ظرف کر کے سیدھا
یہ تیل بھرا ہوا ہے کیسا

سیدھا کیا اُسنے ظرف کو جب
پیندے کا بھی تیل گر گیا سب

اس کی حرکت یہ فطرتی تھی
بے ساختہ اور قدرتی تھی۔

من جملۂ حسیاتِ فطری
انساں میں ہے حسِ واہمہ بھی

جب قوتِ مدرکہ دبیگی
ہوگی نہ بشر سے بے وقوفی

بے سوچے ہوئے جو کام ہوگا
انجام یہی تمام ہوگا

ہے دشمنِ عقل خود فراموش
آنکھیں ہیں کھلی مگر ہے بیہوش

جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدر آبادی

مختصر افسانہ اور اسلوب بیان

اسلوب بیان کا دلکش ہونا کسی اور صنف ادب میں اتنا ضروری نہیں جتنا مختصر افسانہ میں لازمی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانہ کا دارومدار پلاٹ پر ہوتا ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اسلوب بیان اگر دلکش نہ ہو تو پلاٹ کی ساری خوبیاں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ناول میں اگر طرز بیان اور اندازِ نگارش دلچسپ نہیں ہے تو پڑھنے والا صفحے الٹ کر جلد جلد پلاٹ کی دلچسپیوں سے گذر کر انجام پر پہنچ جاتا ہے لیکن مختصر افسانہ میں یہ طریقہ کار عمل میں لایا نہیں جاسکتا کیونکہ مختصر افسانہ میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہ پڑھنے والا طرز نگارش کو چھوڑ کر پلاٹ کی دلچسپیوں میں اپنے آپ کو منہمک کرلے مختصر افسانے میں پلاٹ کا اختصار اور اور واقعات کا اجمال پڑھنے والے کو مختصر افسانے کے سارے جزئیات سے گذرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور اگر وہ کسی حصہ سے بغیر پڑھے گذر جاتا ہے۔ تو افسانہ کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس طرح اُسے افسانہ کا کوئی لطف نہیں آتا۔

طرزِ تحریر دماغی اور ذہنی کاوشوں کا عکس ہے۔ اس سے مصنف کے رجحانات اور خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسروں کی طرزِ تحریر کی اندھی تقلید کرنا گویا اپنے آپکو چھپانا ہے۔ اور یہی حرکت پڑھنے والا افسانے میں پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ دوسروں کی طرز تحریر کا مطالعہ اس لئے کرتا ہے کہ اُنکے خیالات اور رجحانات معلوم کرے۔ اور جب اُسکو توقع کے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنی شخصیت کو چھپا کر دوسروں کے خیالات پیش کر رہا ہے۔ تو ایک قسم کی بے لطفی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ کیوں نہ اس مصنف کا اندازِ بیان اصلی رنگ میں دیکھا جائے جس کی یہ نقل ہے کیونکہ نقل نقل ہی ہے۔ اور اصل اصل یہاں وہ انشا پرداز خارج از بحث ہیں۔ جو دوسروں کی تقلید کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اپنی انفرادیت کو سچ مچ گم کر دیتے ہیں۔ اور اپنے پیش رو کے نقش قدم پر کچھ اس طرح گام زن ہوتے ہیں کہ نقل اور اصل میں سرمو فرق نہیں رہتا لیکن یہ یاد رہے کہ اس قسم کی مثالیں اتنی کم ہیں کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ ورنہ اکثر و بیشتر تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ تقلید کے سلسلہ میں اکثر لوگ منہ کی کھاتے ہیں اور ایسی بھونڈی ریس کرنے لگتے ہیں کہ ادب میں ایک ایسا برا عنصر پیدا ہو جاتا ہے کہ جس کو کوئی وقعت نہیں دیا جاسکتا۔ نومشق اور ادبیات کا پختہ مذاق نہ رکھنے والے اصحاب اس قسم کے گمراہ کن لٹریچر سے کچھ عجیب انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ اصل اور نقل میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں

رکھتے اس لئے اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا گمراہ کن ادب مذاقِ عامہ میں ایک قسم کی خرابی پیدا کرتا ہے اور اس میں عام طور سے بیزاری کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔

شوپنہار کا خیال ہے کہ بدنما نقالی سے چہرہ بیجان سا ہو جاتا ہے۔ اور اس سے تو ایک جاندار اور کریہہ المنظر چہرہ بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں حقیقت کے آثار جھلکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ افسانہ پڑھنے والا حقیقت کو زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ اس میں اجنبیت نہیں رہتی۔ اور اس کا دل و دماغ اس سے مانوس ہوتا ہے۔

اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انشاپرداز کسی کی تتبع ہی نہ کرے۔ اور ہمیشہ اپنے قلم کو بے لگام چھوڑ دے یقیناً ادھر ادھر بھٹکنے سے رہبر کی تلاش زیادہ مفید ہے اور بے راہ روی سے سیدھے راستہ کی تقلید بہتر ہے لیکن ہمیشہ تقلید اور خصوصاً ایسی کہ جسے اندھی تقلید کہا جاتا ہے۔ ادبیات کی بقا اور ترقی کیلئے مضر ہے۔ کیونکہ ادبیات کی ترقی ایک ہی فرسودہ لکیر پیٹنے سے نہیں ہو سکتی۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ رجحانات بھی بدلتے ہیں، خیالات میں بھی تمدن کے انقلاب کے ساتھ تغیر ہوتا ہے۔ اور معاشی و سیاسی نظام کی کایا پلٹ ہوتے ہی ادب کی ضروریات میں بھی فوری تبدیلی ہوتی ہے۔ اسلئے آج اگر کوئی شاعری میں ولی کے اسلوبِ بیان کی اندھی تقلید کرے اور بالکل اسی طرز میں غزل کہے یا نثر میں رجب علی بیگ سرور کی تتبع میں مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھے تو کس طرح بھونڈا پن ظاہر ہو؟ اساتذہ کا کلام اور اُن کی تصانیف کو سامنے رکھکر مکھی پر مکھی مارنے سے فائدہ -

مختصر افسانہ کو ناول کی ادبی اولاد کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں ناول کی ساری خوبیاں جمع ہونی ضروری ہیں اور انکے علاوہ بھی بعض اور خصوصیتوں کا وجود لازمی ہے۔ مثلاً اختصار نویسی۔ ناول میں چونکہ اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ مصنف اپنے قلم کی جولانیاں دل کھولکر دکھا سکتا ہے۔ اس لئے اسلوبِ بیان میں اختصار نویسی کا کوئی جزو شریک نہیں ہوتا انشاپرداز جانتے ہیں کہ مختصر نگاری کتنی مشکل چیز ہے۔ اور جب یہ بات مسلّمہ ہے کہ افسانہ کی انشا کا دارو مدار مختصر نگاری پر ہے تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مختصر افسانہ کی نگارش ایسی آسان نہیں کہ ہر نومشق ابتداء ہی صنف ادب سے کرے باوجود اسکے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جس کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ وہ "صاحب قلم" ہے سب سے پہلے افسانہ نگاری پر ہی ہاتھ صاف کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ کسی صنفِ ادب میں دخل (در معقولات) نہیں دے سکتا تو کیا ہوا افسانہ تو بلاشبہ ایسی صنف ہے جس پر اس کا پیدائشی حق ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج افسانہ نگار شاعروں کے پہلو بہ پہلو ادبِ اردو میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ میرا اندازہ تو یہ ہے کہ افسانہ نگاروں نے شاعروں کے گروہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے!

مختصر نویسی میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک تو محتاط طرزِ نگارش اور دوسرے نظرِ ثانی۔ محتاط طرز نگارش میں مصنف صرف ان خیالات، احساسات اور جذبات کو بیان کرتا ہے۔ جنکا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ اور جن کے اظہار کے بغیر افسانہ کا لطف ہی نہ آئے گا۔ اس بارے میں

مختصر افسانہ نویس اور شاعر ہم خیال اور ہم زبان ہیں۔ یوں تو دنیا میں روز بے حد و حساب واقعات اور انقلابات گذرتے رہتے ہیں اور ہر کھلی ہوئی آنکھ ان کو دیکھتی اور حیران رہ جاتی ہے مگر اُن پر تبصرہ کرنے، نتائج اخذ کرنے اور سبق حاصل کرنے کا امکان ہر شخص میں نہیں ہوتا۔ شاعر اور افسانہ نویس ان سب واقعات کو دیکھتے اور سرسری طور پر گذر جاتے ہیں۔ البتہ جہاں شعریت اور افسانویت نظر آتی ہے۔ اُن کی آنکھیں دلچسپی لینی شروع کرتی ہیں۔ شاعر جس چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کو نظم کرتا ہے۔ اس پیرایہ میں کہ دوسرے پکار اُٹھتے ہیں کہ ع

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

لیکن پھر بھی وہ ان واقعات کو اپنی زبان سے اس طرح بیان نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی حال افسانہ نویس کا بھی ہے وہ روزمرہ ہی کے واقعات کو لیتا ہے البتہ اس ذخیرہ میں سے چنتا اُن کو ہے جو دل پر ایک چوٹ سی لگاتے ہیں۔ اور اُن کو اپنے مشاہدہ کی مدد سے اور اسلوب بیان کی اعانت سے کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا دل تھام لیتا ہے طویل افسانے میں مصنف کو اتنی آزادی ہوتی ہے کہ وہ ان واقعات کو ذرا پھیلا کر بیان کرتا ہے۔ جس سے اُس کا اسلوب بیان نکھر جاتا ہے اور تفصیل کی وجہ سے واقعات کا سلسلہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ لیکن مختصر افسانہ نویس اس آزادئ تحریر سے محروم ہے۔ اسکو جو کچھ بیان کرنا ہوتا ہے اس میں بھی کاٹ چھانٹ اور انتخاب کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ کیونکہ مختصر افسانہ کو بعض ماہرین نے چار ہزار الفاظ کے لگ بھگ کا مجموعہ بتایا ہے اور گو کہ افسانہ نویس الفاظ گن گن کر نہیں لکھتا۔ لیکن میدان کی تنگی سے ہر وقت باخبر رہتا ہے۔ پڑھنے والا مختصر افسانہ میں بھی وہ تمام چیزیں مکمل دیکھنا چاہتا ہے جو ایک طویل افسانے یا ناول میں ہوتی ہیں۔ کردار کی ترقی پلاٹ کا عروج و زوال، فضا کی عکاسی اور ماحول کی جھلک غرض یہ کہ افسانہ کی ساری ضروریات نہ صرف یکجا ہونی لازمی ہیں بلکہ انکا تعین رکھا ہو۔ اور اُن کی تنظیم میں کوئی نقص نہ رہنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مختصر افسانہ نویس صرف اشاروں، کنایوں اور اجمال کو اظہار خیال کا وسیلہ بناتا ہے اور ادبیات کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ خصوصیات کتنی نازک ہیں۔

مختصر کرنے کے خیال سے افسانہ نگار اپنے افسانہ کو بار بار پڑھتا ہے اور ہر وقت اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور کرتا ہے۔ خیال کو جامع الفاظ میں ظاہر کرنے کی فکر میں وہ الفاظ کے پورے ذخیرہ سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جب کبھی کوئی موزوں لفظ ذہن میں آتا ہے۔ بٹھاتا چلا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کہنہ مشق افسانہ نویس نومشق حضرات کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ افسانہ کو بار بار لکھا جائے اور جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اس سے بہتر نہیں لکھ سکتے کوشش جاری رکھیں بعضوں کا خیال ہے کہ افسانہ لکھنے کے بعد فوراً ہی اس پر نظر ثانی نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ کچھ دنوں تک اسکو رکھ چھوڑنا چاہئے۔ اور ایک عرصہ کے بعد جب خیالات کا طوفان ذرا سکون کی طرف مائل ہو جائے تو اطمینان قلب کے ساتھ نظر ثانی کرنی چاہئے۔

سفید کاغذ پر فونٹین پن کو رکھنا اور نوک قلم کی

ہر حرکت کو بلا سوچے سمجھے "قلم برداشتہ" کہنا چاہیئے کبھی ہو
لیکن انشا پردازی نہیں۔ بہترین اسلوب بیان تو اسی کو کہیں
گے جس میں الفاظ کا صحیح استعمال کیا گیا ہو۔ جملوں کی بندشیں
چست ہوں' محاورے اپنی اپنی جگہ پر اس طرح بیٹھے ہوں۔
جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ربط و تسلسل ایسا ہو کہ پڑھنے والا نطق
و استدلال کی ساری کڑیوں کو یکجا پائے۔ انداز تفہیم ایسا
ہو کہ مصنف جتنا کہنا چاہتا تھا بس اتنا ہی کہے۔ ایک قدم
بھی آگے نہ جائے اور اس طرح کہے کہ پڑھنے والا وہ سب سمجھ
جائے جو مصنف کے دل میں ہے۔

چونکہ افسانے کی دو بڑی قسمیں طربیہ اور المیہ ہیں اسلئے
اسلوبِ بیان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ایسا اسلوب جو پڑھنے
والے کے پیٹ میں بل ڈالدے اور دوسرا ایسا انداز جس سے
رنج و الم کے دریا میں اس درجہ تلاطم ہو کہ قطراتِ اشک آنکھوں
سے ٹپکے بغیر رہ نہ سکیں۔ مصنف کا کمال اس میں ہے کہ جیسا
موقع ہو اسی رنگ کا اسلوب بیان اختیار کرے۔ ہنسانا ہو تو
گدگدائے۔ اور رُلانا ہو تو نشتر زنی کرے۔ آسکر وائلڈ کا مشہور افسانہ
"شہزادہ خرم اور ابابیل" پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ مصنف طنز نگاری
میں ایسا اسلوبِ بیان اختیار کرتا ہے کہ پڑھتے پڑھتے آپ
کبھی بے اختیار ہنس پڑینگے اور کبھی آپ کی آنکھیں ڈبڈبا
جائیں گی۔

موثر اسلوبِ بیان کے سلسلہ میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ
یاد آیا۔ ایک صاحب کو افسانہ نگاری کا نیا نیا شوق ہوا۔ اپنے
خیال میں مست افسانے لکھا کرتے تھے۔ اور خیر سے سب کے سب
المیہ ہوتے تھے۔ انکا خیال تھا کہ انکا اسلوب بیان بے حد موثر
اور المیہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ گو میں نے پڑھے نہیں اس لئے
میں اس بارے میں کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ ہاں
تو وہ المیہ افسانے لکھتے۔ ایک دفعہ کسی رسالہ کو ایک افسانہ بھیجا
کچھ دنوں بعد وہ ملے۔ تو فرمانے لگے:۔

"فلاں رسالہ کا اڈیٹر بڑا نامعقول ہے"۔

"کیوں کیوں خیریت تو ہے؟" میں بولا۔

"کیا کہیں۔ لاحول ولا۔ میں نے اپنا ایک المیہ افسانہ بھیجا
تھا"۔۔۔۔۔۔ "اور انہوں نے اس کی اشاعت سے انکار کر دیا"
میں نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"انکار کرتا تو خیر مضائقہ نہ تھا۔ مگر پڑھ تو لیتا۔ اس
نامعقول نے اسکو بغیر پڑھے واپس کر دیا۔"

یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ اسنے بغیر پڑھے واپس
کر دیا؟ میں نے پوچھا۔

"اس طرح کہ کاغذ پر آنسوؤں کے نشان ہی نہیں
ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی صاحب دل سے اُسے پڑھے اور
آنسو بہائے بغیر رہ سکے۔"

آپ نے بعض ایسے افسانے پڑھے ہونگے جنہوں نے
آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا دئے ہونگے۔ اور بہت ایسے
پڑھے ہونگے جن سے متاثر ہوئے بغیر آپ نہ رہ سکے ہونگے۔
ہر مصنف کے قلم میں اتنی قدرت نہیں ہوتی۔ اور پھر ہر افسانہ
میں یہ بات پیدا نہیں ہوسکتی۔ اگر ہر المیہ افسانہ رُلانے لگے۔ تو وہ
افسانہ کاہے کو کہلائیگا مرثیہ ہو جائیگا اور اسی طرح اگر ہر افسانہ
ہنسانے لگے تو وہ لطیفہ بنکر رہ جائیگا۔ اسلوب بیان کو موثر
بنانے کے لئے موزوں الفاظ کا انتخاب سب سے زیادہ ضروری ہے۔

پھر ان الفاظ کی مدد سے وہ کیفیت پیدا کرنا جو پڑھنے والے کو متاثر کرے لازمی ہے۔ یہاں مصوری اور افسانہ نگاری کے حدود ملتے ہیں۔ مصور بھی پہلے مختلف رنگوں کو جمع کرتا ہے پھر مناسب رنگوں کی آمیزش سے ایک ایسا آمیختہ تیار کرتا ہے جس کی مدد سے کاغذی پیکر میں زندگی کی آثار پیدا کر سکے مصنف اگر اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے اسکو دو چیزوں کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ ایک نفسیاتی تجزیہ کی اور دوسرے مشابہت کی۔ افسانہ نگار کو سب سے پہلے اس بات کا خیال کرنا ہوتا ہے کہ انسان متاثر کب ہوتا ہے کس ماحول میں، کن واقعات سے اس کا دل لرزتا اور اس میں ایک ہیجان سا ہوتا ہے۔ رنج والم کی نفسیات ہو یا خوشی کی جب تک افسانہ نگار اُنسے کامل طور پر واقف ہو کر اُن سے استفادہ نہیں کرتا۔ اس کا اسلوب بیان اس قابل نہیں ہوتا کہ پڑھنے والے کے دل پر اسکا کوئی اثر ہو۔ دوسری ضرورت افسانہ نگار کو مشابہت پیدا کرنے کی ہے افسانہ کا پلاٹ ایسا ہو کہ پڑھنے والا اس کی مثال اپنے حافظہ کی مدد سے تلاش کر سکے یا کم از کم یہ کہ اسکا دل یہ مان لے کہ اس قسم کا واقعہ ظہور پذیر ہو سکتا ہے ورنہ مشابہت کی بجائے اگر اجنبیت پیدا ہوگی تو پڑھنے والا اس سے مانوس نہ ہو سکے گا اور جب مانوس نہ ہو سکیگا تو متاثر بھی نہ ہو سکیگا۔ اسوجہ سے کہ اُنس اور یگانگی ہی سے انسان متاثر ہوتا ہے غیریت اور بیگانگی کی وجہ سے التفات کی عنان ہی نہیں پھر سکتا تو متاثر ہونا کیسا؟

ازمترجمہ جناب عبدالرحیم شبلی بی، کام۔

شہر کا جادو

(ولیم ورڈزورتھ کے ایک دیہاتی منظوم افسانے کا ترجمہ)

اگر آپ شاہراہ سے ہٹ کر گرین ہیڈگل کی پُرشور ندی کی طرف جانے کا ارادہ کریں۔ تو آپ کو عمودی راستہ اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ دیکھ کر شاید خیال پیدا ہو کہ آپ کے پاؤں لڑکھڑا جائیں گے لیکن ہمت نہ ہارئیے! کیونکہ اُس ہنگامہ خیز ندی کے اردگرد پہاڑ اِس طرح سے کھڑے ہیں کہ وہاں ایک پُراسرار وادی بنگئی ہے۔ اُسجگہ کوئی آبادی نظر نہیں آتی۔ لیکن جو اُدھر جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو چند بھیڑوں، چٹانوں، پتھروں اور فضائے آسمانی میں تیرتی ہوئی چیلوں کے ساتھ پاتے ہیں!! یہاں فی الواقع شہر خاموشاں کا سا بھیانک سکوت طاری رہتا ہے —!!

مجھے اس وادی کا ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن ایک چیز ہے جس کو شائد آپ دیکھیں لیکن اُس پر غور نہ کریں۔

ندی کے پاس کھُرّے پتھروں کا ایک بے ترتیب ڈھیر پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اِس معمولی سی چیز کے ساتھ ایک افسانے کا تعلق ہے۔ جو اگرچہ تحیّر خیز واقعات سے مربوط تو نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پھر بھی موسم گرما کے سایوں اور موسم سرما کی آگ کے لئے غیر مناسب نہیں ہے۔

یہ اُن اولین گھریلو کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے۔ جسکے ذریعہ مجھے چرواہوں اور وادیوں میں رہنے والے آدمیوں کے متعلق علم ہوا۔ اور مجھے اُن سے ایک گونہ اُنس پیدا ہو گیا۔ اگرچہ یہ اُنس اُن کی ذات کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اُن پہاڑیوں اور سبزہ زاروں کی وجہ سے تھا۔ جن میں وہ بودوباش رکھا کرتے تھے!!

جب میں ابھی کمسن تھا۔ اور کتابوں کی پروا نہ کیا کرتا تھا اور صرف قدرت کی چیزوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی وجہ سے قدرت کی فسوں کاری سے واقف ہو گیا تھا —— مجھ میں اِس کہانی کی وجہ سے اُن جذبات کا احساس پیدا ہو گیا۔ جو میرے ذاتی معلوم نہیں ہوتے تھے — اور میں اِنسان۔ انسانی دل۔ اور انسانی حیات کے متعلق خواہ وہ کس قدر ہی نامکمل اور غیر منضبط ہوتے تھے۔ غور کرنے لگا۔

پس اگرچہ یہ ایک سادہ اور خشک داستان ہو لیکن میں صرف اُن "قدرت پرست دلوں" اور اُن نوجوان شاعروں کی خاطر اِسکو بیان کرونگا۔ جو میرے بعد اِن پہاڑوں پر میرے

قائم مقام ہونگے۔

وادی گراسمیر میں جنگل کی طرف ایک گڈریا رہا کرتا تھا۔ اُس کا نام تھا مائیکل۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا لیکن خوب تنومند اور دل کا مضبوط۔ اُس کا جسم جوانی سے بڑھاپے تک غیر معمولی طور پر مضبوط اور کسرتی رہا تھا۔ وہ غضب کا ذہین و دقیق بین معتدل مزاج اور ہر فن مولا تھا۔

وہ اپنی چرواہی کے کام میں نہایت مستعد اور عام لوگوں سے زیادہ ذمہ داری کا احساس کرنے والا تھا اُس نے تمام قسم کی ہواؤں اور ہر قسم کے جھونکوں کا مفہوم سمجھنے میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی۔ اور اکثر اوقات جب دوسروں کو علم نہ ہوتا۔ اُس کو جنوبی ہوا کی آواز، زیر زمیں موسیقی کی طرح، یا دُور کسی پہاڑی پر بین کی طرح نغمہ باریاں کرتی ہوئی، سنائی دیتی اور وہ اس انتباہ پر اپنے گلے کی طرف متوجہ ہوتا اور اپنے آپ کو کہتا "ہوائیں میرے لئے کام مہیا کر رہی ہیں" اور بسا اوقات طوفان مسافروں کو پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے اُسکو پہاڑوں پر ہی گھیر لیتا۔

درحقیقت وہ ہزاروں کہروں کے درمیان جو آتی تھیں اور اُسکو بلندیوں پر چھوڑ جاتی تھیں۔ یکہ و تنہا رہ چکا تھا۔
اسی حال میں اُس کی زندگی کے اسی برس گذر گئے!!

وہ آدمی سخت غلطی پر ہے جو خیال کرے کہ زمرّدیں وادیاں، چٹانیں اور ندیاں گڈریئے کے خیالات پر کوئی اثر نہ ڈالتی تھیں۔ وہ میدان، جہاں اُسنے مسرّت انگیز جذبات کے ساتھ عام ہوا میں سانس لئے تھے، اور وہ پہاڑیاں، جن پر وہ کئی مرتبہ مضبوط قدموں کے ساتھ چڑھ چکا تھا۔ اور جنہوں نے اُسکے دماغ پر شفقت، مہارت، یا جرأت، اور خوف یا مسرّت کے کئی واقعات و حوادث مرتسم کر دیئے تھے۔ اور جہاں سب بے زبان جانوروں کی یادداشت جن کو اُس نے محض نیکی کی خاطر بچایا، یا کھلایا، اور پناہ دی تھی، ایک نقش محفوظ کی طرح اُسکے دماغ پر منقش ہو گئی تھی۔ یہ تمام چیزیں اُس کو حد درجہ عزیز تھیں۔ اور ان پہاڑیوں اور میدانوں کے لئے اُس کی اندھی محبت کا بیشتر حصہ حلاوت اندوز جذبات کے ساتھ وقف ہو چکا تھا اور یہ جذبات اُسی حلاوت کے حامل تھے جو خود انسانی زندگی میں پائی جاتی ہے ——— !

اُسکے ایام تنہائی میں بسر نہ ہوئے تھے۔ اُس کی رفیقہ زندگی ایک قبول صورت معمر عورت تھی۔ اگرچہ وہ بوڑھی تھی لیکن مائیکل سے بیس برس کم عمر کی تھی۔ وہ بڑی مستعد و فعال تھی۔ اور اُس کا دھیان ہر وقت گھر کے کام کاج کیطرف رہتا تھا۔ اُسکے پاس پُرانی وضع کے دو چرخے تھے۔ ایک بڑا، اُون کاتنے کے لئے۔ اور دوسرا چھوٹا، سن کے لئے اگر ایک چرخہ بیکار نظر آتا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرا کام کر رہا ہوتا تھا۔

اس جوڑے کے ساتھ اُنکے گھر میں صرف ایک بچہ تھا۔ جو مائیکل کے یہاں اُس وقت پیدا ہوا جب اُس کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یا جیدا ہوں کی زبان میں جب، وہ اپنی ٹانگیں قبر میں ڈالے ہوئے تھا۔

یہ بچہ اور دو بھیڑوں کی رکھوالی کے لئے دو بہادر کُتے جن کا متعدد طوفانوں میں امتحان ہو چکا تھا۔ اور

جن میں سے ایک بڑی قیمت کا تھا' اُن کے گھرانے
کی ساری کائنات تھے۔

وہ وادی میں اپنی لاانتہا محنت و مشقت کے لئے
بلاشک وشبہ ایک کہاوت تھے۔ جب دن ختم ہوجاتا اور
باپ اور بیٹا اپنے باہر کے کام سے فارغ ہوکر ـــــ گھر
لوٹتے تو اُس وقت بھی اُن کی محنت و مشقت ختم نہ ہوئی
تھی کہ وہ ایک صاف دسترخوان پر جہاں ہر ایک کے
آگے کچھ دلیہ، چھاچھ، سادہ گھر کا بنا ہوا مکھن اور ٹوکری
میں مکی کی روٹیاں ہوتیں، شام کا کھانا کھانے کے لئے
بیٹھ جاتے تھے۔

جب کھانا ختم ہوجاتا تو لیوک (جو اُس بچہ کا نام
تھا) اور اُسکا بوڑھا باپ کسی اور کام کو جو آسانی کے ساتھ
آگ کے سامنے بیٹھ کر کیا جاسکتا تھا لے بیٹھتے۔ مثلاً وہ
گھروالی کے چرخہ کے لئے اُون ہی دھنکا کرتے۔ یا درانتی
کھرپا اور بیلچہ وغیرہ میں سے اگر کوئی کھپت یا گھر کا اوزار
ٹوٹ جاتا تو اُس کی مرمت ہی کرنی شروع کردیتے تھے۔

جب دن کی روشنی مدہم ہونی تو چھت کے نیچے
انگیٹھی پر ایک بڑے سے تاریک طاقچہ میں' جو ہمارے
پرانے دیہاتی فیشن کے مطابق اسی مقصد کے لئے بنا ہوتا ہے'
گھروالی ایک دیا جلادیتی تھی۔ یہ برسوں کا پرانا برتن سا تھا۔
جس نے اپنی قسم کے سب برتنوں سے زیادہ خدمتگذاری
کی تھی۔ اسکو سرِشام ہی روشن کردیا جاتا تھا۔ یہ اُن لاتعداد
ساعتوں کا واحد پسماندہ تھا، جو برسوں کی صورت میں
آئے۔ اور اس جوڑے کو نہ تو خوشی اور نہ غمی کی حالت
میں، لیکن پُرامید اور محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے ہوئے
پیچھے چھوڑ گئے۔

اب جبکہ لیوک اپنے اٹھارھویں سال میں تھا۔ باپ
اور بیٹا اُسی پرانے دیئے کی روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور
گھروالی اپنے مخصوص کام میں مصروف۔ جھونپڑی کی خاموش
فضا موسم گرما کی مکھیوں کی طرح بھنبھناہٹ میں تبدیل
ہورہی تھی۔

دیئے کی روشنی تمام قرب وجوار میں خوب مشہور تھی
اور یہ اُس کفایت شعار جوڑے کی زندگی کا ایک نشان تھا۔ جو
عام لوگوں کو بھی نظر آسکتا تھا۔ چونکہ اُن کی جھونپڑی تن تنہا
ایک ٹیلہ پر واقعہ تھی۔ اسلئے وہ شمال اور جنوب میں اَپرڈیل
سے لیکر ڈیمیل ریزنگ اور گاؤں کے مغرب میں جھیل تک
خوب نظر آسکتی تھی۔ اور اس باقاعدہ اور مستقل روشنی کی وجہ
سے اس گھر کا نام ہی "نجم شب" پڑ گیا تھا۔

اتنے برس یوں زندگی بسر کرتے ہوئے اگر مائیکل کو
اپنے آپ سے محبت ہوگئی تھی تو وُہ اپنی رفیقۂ حیات کو بھی لازماً
چاہنے لگا تھا۔ لیکن اُسکو سب سے زیادہ محبت اپنی آخری عمر کے
بچہ سے تھی۔ اور یہ اُس قدرتی جذبہ کی وجہ سے نہ تھی۔ جو کورانہ
ہر کہ ومہ کے خون میں موجزن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اُس بچہ کی وجہ
سے تھی۔ جو ایک بوڑھے آدمی کو زمین اپنے بہترین تحفہ کے
طور پر پیش کرسکتی ہے۔ اور جو اپنے ساتھ امید اور توقع کے
خیالات لاتا ہے۔ اور جب اعضا مضمحل ہوجاتے ہیں۔ تو
اُن میں جوش کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔

اُسکو اپنے بچہ سے ازحد اُلفت تھی۔ وہ اُسکے دل

کا سرور اور آنکھوں کا نور تھا۔ اکثر اوقات بوڑھے مائیکل نے جب وہ ابھی گود میں تھا۔ اُسکے لئے عورت کا کام بھی کیا تھا۔ صرف شغل کے طور پر نہیں جیسا کہ عام باپوں کا دستور ہوتا ہے۔ بلکہ صابر و شاکر دل کے ساتھ محض محبت کی خاطر ——! اور اُس نے اکثر اُسکے جھولنے کو بھی ماں کے سے شفقت بھرے ہاتھوں کے ساتھ جھلایا تھا ——!

جب بچہ ذرا بڑا ہوا۔ اور لڑکا کہلانے لگا تو اُس وقت بھی مائیکل کی باوجود درشتیٔ طبع کے یہ خواہش ہوتی کہ وہ اُسکی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ جب وہ کھیتوں میں کام کرتا یا اپنے گھر کے دروازہ کے سامنے ایک بڑے سے برگد کے درخت کے نیچے جو اپنے بے نظیر سایہ کے لئے مشہور تھا۔ اور اب بھی موجود ہے۔ ایک سٹول پر بیٹھ کر بھیڑیں مونڈھتا۔ جو اُسکے سامنے بندھی ہوئی پڑی رہتیں۔ اگر اُس کا لڑکا ٹانگیں پکڑ کر کسی بھیڑ کو چھیڑتا۔ یا شور و غل ڈالکر اُن کو ڈراتا، تو وہ اُسے نرمی سے سمجھاتا۔ اور بعض اوقات اصلاح کی خاطر اُسے زجر و تنبیہہ بھی کرتا تھا۔

جب یہ لڑکا خدا کے فضل سے نوجوان ہوا۔ اور اُسکے رخساروں پر دو خوبصورت گلاب پیدا ہو گئے۔ تو مائیکل نے شیشم کے درخت سے ایک نرم شاخ کاٹ کر اُس پر لوہے کا ایک پترا جڑ دیا۔ اور اُس کو چرواہوں کا لٹھ بنا کر اُس نوجوان کو دیا جس کو ہاتھ میں لے کر اُسے اکثر دروازے پر یا کسی درہ پر ایک چوکیدار بنا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ گلہ کو واپس ہانکے۔ اور جیسا کہ آپ سمجھ گئے ہونگے۔ چونکہ اس لڑکے کو ابھی قبل از وقت یہ فرض تفویض کر دیا گیا تھا۔ اُس کی کوششیں

کچھ مزاحمت اور امداد کے درمیان ہی رہتی تھیں۔ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ اُس کو اپنے باپ کی طرف سے ہر وقت شاباش نہ ملتی تھی۔

لیکن جب لیوک کی عمر دس برس ہو گئی۔ اور وہ تمام پہاڑی آندھیوں کا مقابلہ کرنے کے اہل ہو گیا۔ تو وہ اپنے باپ کے ساتھ تھکان اور مشقت سے بے پرواہ بلندیوں کی طرف چڑھ جایا کرتا تھا۔ اور وہاں وہ دونوں بہترین ساتھی ثابت ہوتے تھے۔

مجھے یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ جن اشیاء سے گڈریے کو پہلے محبت تھی۔ اب اسکو ان سے زیادہ محبت محسوس ہونے لگی۔ اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ لڑکے کے لئے اُسکے دل میں کچھ ایسے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ جو سورج کو زیادہ تابندگی اور ہوا کو زیادہ موسیقی دینے کا باعث بنتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھے آدمی کا دل از سرِ نو پیدا کیا گیا ہے۔

اس طرح وہ لڑکا باپ کی نظروں کے سامنے جوان ہوتا گیا۔ اور اب وہ اٹھارہ برس کی عمر تک پہنچ گیا تھا۔ وہ مائیکل کے لئے ہر روز امید پرور اور موجبِ اطمینان ثابت ہو رہا تھا۔

جب یہ خاندان اس طرح آرام سے زندگی بسر کر رہا تھا تو مائیکل کو ایک اندوہناک خبر پہنچی۔ جس زمانہ کی میں بات کر رہا ہوں اُس سے کہیں پہلے اُس چرواہے نے کسی معاملہ میں اپنے بھتیجے کی ضمانت دی تھی۔ اگرچہ یہ شخص محنتی اور خوشحال تھا لیکن بعض غیر متوقع مصائب اُس پر آ پڑے

تھے۔اس لئے اب بوڑھے مائیکل کو ضمانت کا روپیہ ادا کرنے
کے لئے کہا گیا۔ یہ بہت بھاری رقم تھی۔لیکن اُس کی اپنی جائداد
کے نصف سے کچھ کم ہی تھی۔

اس غیر متوقع مطالبہ کو سنتے ہی اُس کی تمام امیدوں
پر پانی پھر گیا۔ اُسکا خیال تھا کہ اتنا صدمہ کبھی کسی بوڑھے
آدمی کو نہیں پہنچا ہوگا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب مائیکل کے اندر صورتِ حالات
کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمت پیدا ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ اُس
کے پاس سوائے اسکے کہ وہ اپنی موروثہ جائداد کا کچھ حصہ فروخت
کرنے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور یہی اُس کا پہلا ارادہ تھا۔
اُس نے دوبارہ اس بات پر غور کیا۔لیکن اُسکا دل نہ مانا۔

آخر اُس نے اِس غمناک خبر کے سننے سے دو دن کے
بعد اپنی بیوی سے کہا۔

ایزابل! میں نے ستر برس سے زیادہ عرصہ تک محنت
کی۔ اور خداوند کی محبت کی نکھری ہوئی دھوپ میں ہم
رہتے رہے ہیں۔لیکن اگر ہمارے یہ کھیت کسی اجنبی کے پاس
چلے جائیں۔ تو میرا خیال ہے کہ میں قبر میں آرام سے نہیں سو
سکوں گا۔ ہماری قسمت کس قدر خراب ہے۔ سورج بھی
اتنا فرض شناس نہیں رہا جتنا کہ میں رہا ہوں لیکن میں نے
اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے اب تک بیکار زندگی
بسر کی ہے۔ اگر اُس شخص نے مجھ سے دھوکا کیا ہے تو وہ بہت
خراب آدمی ہے۔ اور اُس نے اچھا کام نہیں کیا لیکن
اگر دھوکا نہیں کیا تو لاکھوں آدمی اِس دنیا میں موجود ہیں
جنکو شاید اِس قسم کا صدمہ کوئی تکلیف نہ دیتا ——— !
میں اُسے معاف کرتا ہوں۔لیکن ایسی باتیں کرنے سے
کیا فائدہ؟

"ہاں، تو جب میں بات کرنے لگا تھا۔ تو میرا خیال تھا
کہ ان مشکلات کے حل کے لئے میں کوئی امید افزا اور عمدہ
تجویز پیش کروں۔ ایزابل! ہمارے لیوک کو ہم سے رخصت
ہونا پڑے گا۔ ہم زمین نہیں چھوڑ سکتے۔ لیوک اُس کو
سب زمینداریوں سے آزادی ورثے میں پائے گا۔ اسی طرح کی
آزادی جو ہماکو حاصل ہے۔

"تم جانتی ہو ہمارا ایک دور رشتہ دار ہے۔ وہ ان
مشکلات میں ہمارا دوست ہوگا۔ وہ کافی خوشحال ہے۔
اُس کی تجارت خوب چمک رہی ہے۔ لیوک کو اُس کے پاس
جانا پڑے گا۔ اس رشتہ دار کی امداد اور اپنی کفایت شعاری
کے ذریعہ وہ اس نقصان کی تلافی کر لے گا۔ اور پھر ہمارے
پاس آجائے گا۔ اگر وہ اسی جگہ رہے تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟
جہاں سب غریب ہیں وہاں نفع کی کیا امید ہو سکتی ہے؟"

اور یہاں آکر بوڑھے مائیکل نے توقف کیا۔ اور
ایزابل بھی خاموش ہو گئی۔ کیونکہ اس کا دماغ ماضی کے
واقعات سوچنے میں مصروف تھا۔

اُس نے سوچا یہاں ایک رچرڈ بیٹمین ہوا کرتا
تھا۔ وہ ایک معمولی گھرانے میں خادم تھا لوگوں نے اُس کے لئے
گرجے کے دروازے پر چندہ جمع کیا جس سے انہوں نے
ایک ٹوکری خریدی اور اُس میں اُس کو چند برتن رکھ کر
دیدئے۔ وہ اُسکو اپنے کندھے پر اٹھا کر لندن چلا گیا۔ یہاں
اُسے ملازمت مل گئی۔ اور چونکہ اُسکے آقا کو بات کی تلاش تھی

بعد ایک دیانتدار ملازم ملا تھا۔ اس لئے اُس نے لڑکے کو اپنے برتنوں کو دیکھ بھال کے لئے کسی دوسرے ملک میں بھیجدیا وہاں اُس نے تحیر خیز دولت جمع کی اور غریبوں کے لئے بے انتہا دیہات اور جاگیر چھوڑ گیا۔ اور اپنے وطن میں ایک گرجا بھی بنوایا جسکا فرش سنگ مرمر سے جو اس نے کسی نوبک سے خرید تھا تیار کیا گیا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات ایزابل کے دماغ میں سرعت کے ساتھ چکر لگانے لگے اور اس کا چہرہ خوشی کے مارے دمک اُٹھا۔

بوڑھے آدمی کو بھی مسرت محسوس ہوئی اور اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

ہاں" ایزابل! یہ تجویز میرے لئے ان دو دنوں میں روٹی اور پانی کا کام کرتی رہی ہے۔ جتنا ہمیں نقصان ہوا ہے اُس سے زیادہ ابھی ہمارے پاس موجود ہے۔ درحقیقت ہمارے پاس کافی ہے۔ کاش میں پھر جوان ہو جاؤں لیکن یہ خواہش بالکل عبث ہے۔

"لیوک کے بہترین کپڑے جمع کرو۔ تاکہ ہم اُسے کل یا پرسوں بلکہ آج رات ہی رخصت کر سکیں۔ اگر یہ ممکن ہو سکتا تو پھر اُسے آج ہی روانہ کر دیتے"

یہ کہکر مائیکل پھر رُک گیا اور افسردہ دلی کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

گھر والی کے لئے یہ پانچ روز ---- رات اور دن ---- بڑی بے چینی سے گذرے۔ وہ تمام دن اپنے بیٹے کے سفر کے لئے بہترین چیزیں اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھی

جب اتوار نے آکر اُس کے کام میں وقفہ پیدا کر دیا تو ایزابل کو خوشی ہوئی۔ کیونکہ اُس نے مائیکل سے سنا تھا کہ کس طرح گذشتہ دو راتوں میں فرط غم کی وجہ سے اُس کی نیند حرام ہوتی رہی۔

اُس دن دوپہر کو ایزابل نے لیوک سے کہا تھا "بیٹا ہمت جاو۔ تمہارے سوا ہمارا کوئی اور لڑکا بھی نہیں ہے جس کو ہم بھیج سکیں یا جو ہمیں یاد کر سکے ---- نہ جاؤ۔ کیونکہ اگر تم چلے گئے تو تمہارا والد تمہارے پیچھے ہلاک ہو جائیگا"

لڑکے نے اسکا جواب مسرت انگیز لہجہ میں دیا۔ اور جب ایزابل اُس کو اپنے تمام خدشات اور تفکرات بتا چکی۔ تو اُسکا دل ہلکا ہو گیا۔

اُس رات بہترین زادہ راہ کے ساتھ جو وہ مہیا کر سکے سب کرسمس کی آگ کے سامنے اکٹھے بیٹھ گئے !

صبح ہوتے ہی ایزابل نے پھر کام شروع کر دیا۔ یہ ہفتہ گھر میں اس طرح گذر گیا جس طرح موسم بہار کے درخت ہوں۔

آخر کار اُس رشتہ دار کی طرف سے متوقع خط آگیا۔ اُس میں لڑکے کی خبر گیری اور اُس کی بہبودی کے لئے کوشش کرنے کے لئے بہت یقین دلایا گیا تھا۔ اور اُس کے ساتھ ہی پے درپے درخواستیں کی گئی تھیں۔ کہ جتنی جلدی ہو سکے لڑکے کو ضرور اُسکے پاس بھیجدیا جائے۔ دس بلکہ اس سے بھی زیادہ بار وہ خط پڑھا گیا۔ ایزابل اُسے اپنے ہمسایوں کو دکھانے کے لئے لے گئی۔ انگریزی علاقہ میں اُس وقت لیوک سے زیادہ کسی کو فخر حاصل نہیں ہوگا۔

جب ایزابل گھر واپس آئی تو بوڑھا کہنے لگا۔

"وہ کل روانہ ہوجائے گا۔"

اس پر گھر والی نے کئی چیزوں کے متعلق کہا کہ اگر جلدی کی گئی تو وہ بھول جائیں گی۔ اور آخر کار وہ رضامند ہوگئی اور مائیکل کو بھی اطمینان میسر ہوا۔

گرین ہیڈ گل کی عوغا آرا ندی کے قریب اُس گہری وادی میں مائیکل نے ایک باڑہ بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اور اُس حوصلہ فرسا نقصان کی خبر سے قبل اُس نے ندی کے قریب پتھروں کا ایک ڈھیر بھی اِس غرض کے لئے اکٹھا کیا تھا۔

اُس شام لیوک کے ساتھ وہ اُس طرف آیا۔ اور جب وُہ اُس جگہ پہنچا تو وہاں رُک گیا۔ اور لیوک سے کہنے لگا۔

"میرے بچے! کل تم مجھ سے رخصت ہوجاؤ گے۔ مجھے تم بہت عزیز ہو۔ کیونکہ تم وہی ہو جو میرے لئے باعثِ امید تھے۔ اور تمام عمر تم نے میری زندگی کو پُرنشاط بنائے رکھا۔

"میں تمہیں اپنی اور تمہاری روداد حیات کا کچھ حصہ سناتا ہوں۔ جب تم مجھ سے دُور ہوگے تو اِس سے تمہیں فائدہ پہنچے گا۔

"جب تم اِس دنیا میں پہلے پہل آئے۔ تو جیسا کہ ننھے بچوں کا قاعدہ ہے۔ تم پورے دو دن تک سوتے رہے اور تمہارے باپ کی زبان سے برکتیں تم پر نازل ہوتی ہیں دن گزرتے گئے اور میں تم سے زیادہ محبت کرتا گیا۔ جب میں نے تمہیں آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے پہلی مرتبہ قدرتی آواز میں بولتے ہوئے سُنا تو مجھے محسوس ہوا کہ اُس سے قبل میرے کانوں میں ایسے شیریں الفاظ کبھی نہ آئے تھے۔ [illegible] دودھ پیتے بچے تھے۔ تو اپنی خوشی کی دھن میں تم ماں کی چھاتی پر نغمہ سرائیاں کیا کرتے تھے۔

"مہینے گذرتے گئے اور میری زندگی پہاڑوں اور کھیتوں میں بسر ہوتی رہی تم اپنے باپ کے گھٹنوں پر پرورش پاتے رہے۔ لیکن لیوک! ہم دونوں ہمجولی تھے۔ شائد تمہیں یاد ہو ان پہاڑیوں پر ہم دونوں اکٹھے کھیلتے رہے ہیں۔ اگرچہ میں بوڑھا تھا اور تم بچے لیکن تمہیں ذرا بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ تم اُس خوشی سے محروم ہو جو ایک بچے کے ساتھ کھیلنے سے ہوتی ہے۔"

لیوک مضبوط دل تھا۔ لیکن ان الفاظ پر وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگا۔ بوڑھے آدمی نے اُسکا بازو تھام لیا۔ اور کہنے لگا "نہیں میرے بیٹے! [illegible] مت ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے یہ باتیں نہیں کہنی چاہئے تھیں میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اپنے آپ کو ایک بہترین اور مہربان باپ ثابت کردوں۔ اور ایسا کرکے میں نے صرف اُس تحفہ کا عوض دیا ہے۔ جو مجھے دوسروں سے ملا۔ کیونکہ اگرچہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں لیکن مجھے ابھی تک وہ ہستیاں یاد ہیں۔ جو مجھ سے بچپن میں محبت کیا کرتی تھیں۔ وہ دونوں یہاں سو رہے ہیں۔ وہیں اپنے آباؤ اجداد کی طرح رہتے تھے۔ لیکن بیٹے! بہت عرصہ ہوگیا ہے اور ساٹھ سال کی عمر میں کچھ بھی ٹھوس کام کیا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہ اراضیات جب میرے پاس آئیں تو سب زیربار تھیں۔ جب میں چالیس سال کا ہوا۔ تو اُس وقت ورثہ کا نصف میرے قبضہ میں آیا۔ میں نے خوب محنت کی۔ اور

خدا نے میرے کام میں برکت دی ہے کہ تین ہفتے ہوئے
یہ زمینیں بالکل آزاد ہو گئیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اراضیات
کسی اور مالک کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتیں لیوک!
خدا مجھے معاف کرے اگر میں تمہارے متعلق کوئی بدگمانی
کروں لیکن مصلحت یہی ہے کہ تم چلے جاؤ۔"
اس پر بوڑھے آدمی نے توقف کیا۔ پھر جن پتھروں کے
پاس وہ کھڑے تھے۔ اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور کچھ
دیر خاموش رہتے ہوئے اُس نے کہا۔
"بیٹا! یہ کام ہمارا تھا لیکن اب صرف میرا رہ گیا۔
مگر ایک بنیادی پتھر رکھتے جاؤ۔ یہاں لیوک! صرف میرے
لئے ایک پتھر اپنے ہاتھوں سے رکھ جاؤ۔ نہیں بچے! امید
رکھو۔ تم دونوں نے بہتری کے دن کی آرزو میں زندگی بسر
کی ہے۔ چوراسی برس کی عمر میں بھی میں توانا و صحت مند ہوں
تم اپنا کام کرو میں اپنا کروں گا۔ میں پھر وہ کام کرنے شروع
کروں گا۔ جو میں نے تم پر چھوڑ رکھے تھے۔ میں اب تمہارے
بغیر ہی بلندیوں پر اور طوفانوں میں جاؤں گا۔ اور تمہاری
شکل دیکھنے سے قبل جس طرح کیا کرتا تھا، وہ سب کام اکیلا
ہی سرانجام دوں گا۔ خدا تم پر اپنے فضل نازل کرے۔۔۔
تمہارا دل ان دو ہفتوں میں امیدوں کے ساتھ دھڑکتا
رہا ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ ہاں، ہاں۔۔۔ میں جانتا
ہوں لیوک! تم مجھ سے کبھی علیحدہ ہونے کی خواہش نہیں
کر سکتے تھے۔ تم مجھ سے محبت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے
ہو۔ جب تم چلے جاؤ گے تو ہمارے پاس کیا رہ جائیگا؟
"لیکن ہاں، میں اپنا مقصد بھول گیا۔ اب جیسا کہ
میں نے خواہش کی تھی، ایک بنیادی پتھر رکھتے جاؤ۔ اور
اور اسکے بعد لیوک! اگر بُرے آدمی تمہارے ساتھی بنیں
تو میرے بیٹے! صرف میرا خیال کر لینا اور اس لمحہ کا۔۔۔
اپنے خیالات اس طرف مبذول کرنا۔ اور پھر خدا تمہیں
استقامت بخشے گا۔ لیوک! میں خدا سے دعا کرتا ہوں۔
کہ وہ تمہیں تمام خدمات اور ہر حرص و آز میں اُس زندگی
کے یاد کرنے کی توفیق بخشے جو تمہارے آبا و اجداد نے بسر
کی تھی۔ کیونکہ وہ معصوم ہونے کی وجہ سے نیکی کے راستہ
سے متزلزل نہیں ہوتے تھے۔۔۔!
اچھا! اب خدا حافظ۔ جب تم واپس آؤ گے تو یہاں
ایک چیز دیکھو گے۔ جو اب موجود نہیں ہے۔ تمہارے اور میرے
درمیان یہ ایک معاہدہ ہوگا۔ لیکن جو بھی تمہاری قسمت ہو،
میں تم سے آخری وقت تک محبت کروں گا۔ اور تمہاری یاد
کو اپنے ساتھ قبر تک لے جاؤں گا۔"
گڈریا یہاں پہنچکر خاموش ہو گیا۔ جیسا کہ اُسکے باپ نے
درخواست کی تھی۔ لیوک نے جھک کے باڑہ کا بنیادی پتھر رکھدیا
یہ دیکھ کر بوڑھے کا دل ۔۔۔۔۔۔ بھر آیا۔ اور اُس نے اپنے
لڑکے کو سینہ سے لگا کر پیار کیا۔ اور آنسو بہائے۔ پھر وہ
دونوں گھر واپس آ گئے۔
شام ہونے سے قبل ہی اُس گھر میں خاموشی یا شاید
صرف ظاہری خاموشی طاری ہو گئی۔
علی الصبح لڑکا روانہ ہو گیا۔ جب وہ شاہی سڑک
پر پہنچا تو اُس نے تمام خوف اپنے دل سے نکال دیا۔
تمام ہمسائے جو اُس کو اپنے گھر کے قریب سے گذرتے

ہوئے دیکھ کر دعائیں اور برکتیں دیتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔
اُسکے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لیوک اور اُس کی کارگذاریوں کے متعلق ابھی اچھی اطلاعات آتی رہیں۔ اور لڑکے نے بھی والدین کو محبت بھرے خطوط لکھے جن میں عجیب عجیب خبریں ہوتیں۔ اور جیسا کہ گھر والی انکو کہتی "وہ حسین ترین مراسلات" تھے۔ ماں باپ دونوں انکو نہایت مسرت بھرے دل کے ساتھ پڑھتے تھے!

کئی مہینے گذر گئے۔ اور گڈریا ایک دفعہ پھر اُمید افزا خیالات کیساتھ اپنے مخصوص کام پر جانے لگا۔ اور اس دوران میں جب اُس کو فرصت ہوتی تو وہ اُس وادی میں بھی چلا جاتا۔ تاکہ وہاں باڑہ کی تعمیر کر سکے۔

اس اثنا میں لیوک اپنے فرائض میں کوتاہی برتنے لگا۔ اور آخر کار اُس مخرب اخلاق شہر میں وہ بدقماش بن گیا۔ وہ ننگِ انسانیت اور حیا سوز افعال کا مرتکب ہونے لگا۔ اور آخر کار اُسے پناہ کی خاطر کسی دوسرے ملک کی طرف بھاگنا پڑا۔

محبت کی قوت میں ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ وہ حوادث کو جو شاید انسان کو پاگل بنادیں یا اُسکا دل توڑ دیں قابل برداشت بنا دیتی ہے۔ میں نے کئی آدمیوں سے جو بوڑھے مائکل کو جانتے ہیں۔ اس المناک خبر کے سننے کے بعد اُس کی حالت کے متعلق دریافت کیا ۔۔۔ وہ جوانی سے بڑھاپے تک غیر معمولی قوت و طاقت کا مالک تھا۔ وہ اب بھی چٹانوں کی طرف جایا کرتا تھا۔ اور سورج اور بادلوں کی طرف دیکھتا اور ہوا کی موسیقی کو سنتا۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی اپنی بھیڑوں اور چھوٹی سی زمین پر خوب محنت کیا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ اُس وادی میں بھی چلا جایا کرتا تھا۔ جہاں اُس نے اپنی بھیڑوں کے لئے ایک باڑہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

یہ بات اب تک فراموش نہیں ہوئی۔ کہ کس طرح لوگ ان دنوں اُس بوڑھے آدمی سے ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور یہ ہر کوئی جانتا ہے۔ کہ وہ ہر روز اُدھر جایا کرتا تھا لیکن اُس نے کبھی ایک پتھر بھی نہ رکھا تھا۔

وہاں اکثر اوقات وہ باڑہ کے پاس تن تنہا یا کبھی کبھی اپنے وفادار کتے کے ساتھ، جو اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور اُسکے قدموں میں پڑا رہتا تھا بیٹھا ہوا دیکھا گیا۔ پورے سات برس تک وہ باڑہ پر کام کرنے کے لئے گیا۔ لیکن جب اُس نے وفات پائی تو باڑہ ابھی نامکمل تھا

اپنے خاوند کی وفات کے بعد تین برس یا اس سے کچھ زائد عرصہ تک ایزابل زندہ رہی۔ اور جب وہ بھی راہیٔ عدم ہوئی تو جاگیر کو فروخت کر دیا گیا اور وہ کسی اجنبی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ وہ جھونپڑی جسکو "نجم شب" کہتے تھے اب ناپید ہو گئی ہے اُسجگہ اب کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ قرب وجوار میں بہت سے تغیرات واقع ہو چکے ہیں لیکن وہ برگد کا درخت جو اُنکے دروازہ کے سامنے اُگا ہوا تھا ابتک موجود ہے۔ اور اُس نامکمل باڑہ کے نشان بھی م

جناب رشید احمد صحرائی

پرستارہ

ادبیاتِ یونان کا ایک ورق

ارسطاس —— سبزہ در بر و چمن بکنار ایک قصبہ تھا جسکا ہر ذرہ **منروا** کے جمالِ دلفروز سے کیف افروز تنویر تھا۔ ارسطاس کی جمال پرور فضاؤں میں اُسکے تنفس نے جنتیں تخلیق کی ہوئی تھیں۔ وہ اِس گاؤں کے شہرہ آفاق ساحر و حکیم لاڈمیڈن کی دخترِ فرخندہ اختر تھی۔ جو ہر صبح ہیرسس نامی شاہراہ کے ذروں پر عشاق کے لئے سجدہ گاہیں بناتی ہوئی جوپیٹر کے معبدِ عظیم و رفیع میں جایا کرتی اور خداوند کے حضور اپنی حسین عقیدتوں کی نذر پیش کرتی ——!

ان دنوں جب وہ اپنے شباب کی ہلاکت آفرینیوں سے بے خبر تھی۔ اُسکے ساحر باپ نے بتایا تھا کہ عنفوانِ شباب میں اُسکا اخترِ حسن آغوشِ ماہ کے لئے بیتاب ہوگا۔ کچھ مدت بعد ایک ہلالی جبین والا جمیل نوجوان جس کا نام ٹیتھونس ہوگا۔ بربط نوازی کرتا ہوا ارضِ روم سے سرزمین یونان میں داخل ہوگا۔ اور خداوند جوپیٹر کی برکتوں کا سایہ شامل حال رہا تو وہ قبیلہ ٹوائی کا مشہور بربط نواز منروا کے حسن کی سحر کاریوں کا شکار ہو جائے گا۔ وہ خداوند کی عقیدت کے گیت گائیگا۔ جوپیٹر کی بارگاہ سے ان دونوں کو زندگی کا دوام نصیب ہوگا۔ اور وہ غیر فانی شباب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے"۔ منروا کے معصوم دل پر یہ خیالی تصویر نقش ہوگئی۔ نمودِ شباب کیساتھ ہی یہ نقش بھی ابھرتا گیا۔ وہ تصویرِ تصور کی پرستارہ جستجو میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ مگر جس کی جستجو اور انتظار میں اُسکا شباب صرف ہوا جاتا تھا۔ ہنوز بے نیازِ شہود تھا۔

ارسطاس کی ایک آرزو پرور صبح ——!

منروا - زنانگانِ سحر سے بہت پہلے اپنے حسن کی تجلیوں کو افقِ بصارت پہ بکھیرتی ہوئی بیدار ہوئی۔ اس کی بادہ پرور نگاہوں نے عالم ایجاد کو پیامِ حیات دیا۔ دور —— بہت دور —— کوہستانی سلسلے کی سرمئی دھاریوں کے عقب میں افق پر —— کسی مہجور کی آنکھوں میں جھلکنے والے پیازی آنسوؤں کا سا رنگ نمودار تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی ستارا ٹمٹما رہا تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے کنول کے کٹورے میں دودھ کی دو چار بوندیں ٹپکانے سے جو بصارت نواز کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ آسمان پر بالکل وہی کیفیت پیدا تھی۔

منروا اٹھی —— کائنات جاگ اٹھی۔ اُس نے ایک انگڑائی لی —— فطرت اپنی تجلیوں کے اظہار پر مجبور ہوگئی۔ یونان کی خوابیدہ جوانیاں بیدار ہوگئیں اور انوار فوارۂ افق سے اچھلنے لگے۔ زمزمہ سنج طیور نے منقاریں کھول دیں۔ فضا

نغموں سے معمور ہو گئی۔ اُس کی انگڑائی نے کارخانۂ تکوین میں حرکت پیدا کر دی۔

جوانی کے احساس نے اُس کی انجم افروز جبین پر تمکنت کی شکنیں پیدا کر دی تھیں۔ اس نے ناز آفریں انگلیوں سے اپنی پریشان بھوری زلفوں کو سلجھایا۔ ظلمتیں کافور ہو گئیں وہ لالہ رنگ ردا کو سنبھالتی ہوئی گھر سے نکلی۔ ارسطاس کے منتشر جھونپڑوں کے گرد بل کھائی ہوئی راہوں کو قطع کرتی ہوئی چلی گئی۔ کمسن بھیڑوں کے ممیانے کی آواز کبھی کبھی فضا کے سکوت کو توڑ دیتی تھی۔ اور بعض وقت کسی سحر خیز گڈریئے کی بانسری کے زمزمے سیلِ انبساط میں روح کو بہالے جاتے۔

وہ حسبِ معمول خداوند جوپیٹر کی مقدس بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کیلئے جا رہی تھی۔ شاہراہ ہرمس پر مینائے معبد کے نظر نواز ہوتے ہی اُس کی عقیدتوں میں مد و جزر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے ہجومِ جذبات سے مجبور ہو کر اس طرح گنگنانا شروع کیا:

"آرزو پرور دیوتا!

تیری عظمت اور تقدیس کے گیت گانے والی زبان؛

کبھی خاموش نہیں رہ سکتی۔

تیرے سکوتِ مستقل میں اپنے رنگین خوابوں کی روشن تعبیر؛

تیری سنگین تمکنتوں میں اپنے معصوم تخیل کی تابندہ تصویر؛

تیرے خیر منزلِ استقلال میں اپنی ارادت کی مہر پر در تنویر؛

دیکھ رہی ہوں ـــــ خداوند!

تمنا آفریں ـــــ دیوتا!

تیرے عرشۂ جلال کی رفعتوں کے نغمے سنانے والا ساز ـــــ

کبھی ساکت نہیں رہ سکتا۔

تیرے حضور ـــــ

اپنے سازِ دل کی مغموم تاروں پر لرزاں۔ سرودِ الم فروش؛

تیری بارگاہِ تجمل میں ـــــ

اپنی چشمِ منتظر سے ٹپکنے والے قطراتِ اشک کا نالۂ غم خروش؛

تیرے آستانۂ عالیہ پر ـــــ

خستۂ ملال طائرِ روح کی

نوائے حسرت بدوش؛

سُن رہی ہوں ـــــ دیوتا!"

وہ معبد کے صدر دروازے میں داخل ہوئی۔ مگر زاہد فریب حسن کی تجلیوں کو ردائے لالہ رنگ میں چھپائے ہوئے۔ اُسٹس کے مجسمۂ احمریں کے قریب سے ہوتی ہوئی دائیں پہلو کی دیوار کے پاس سیابکی کے مجسمۂ مرمریں کے سامنے ایک لمحے کے لئے رُکی۔ بت کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ نگاہ ـــــ جو کسی انسان پر پڑتی تو اُسے مسحور کر لیتی ـــــ دیوانہ بنا دیتی۔ دودِ لوبان میں پیچ و خم پیدا ہو گیا۔ اُس نے کیوپڈ پر ایک رقیبانہ نگاہ ڈالی۔ وہ کانپ اُٹھا۔ زعفرانی پیکر پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کمان کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ ترکش پاش پاش ہو گیا۔ ننھے

ننھے سنہری تیر فضا میں پرّاں نظر آنے لگے۔ اُس نے قلب
کی گہرائیوں میں میٹھی میٹھی خلش محسوس کی۔
منروا نے ——— غرقِ حیرت، منروا نے کیوپڈ کے
مرتعش مجسمے کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ کیوپڈ کی قوسِ ناشتہ ——
ایک خوبصورت بربط کی صورت میں بدلتی ہوئی معلوم ہوئی،
اور کیوپڈ کا مجسمہ سنگ ایک جوانِ رعنا کا پیکرِ حسین و لطیف
اختیار کرتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک خوبصورت شکیل و جمیل انسان
——— جسم پر شیر کی کھال لپیٹے ہوئے ایک بازو نصف سینے
تک عریاں، دوسرا بازو شانے تک بالکل عریاں، بربط سنبھالے
چہرے کی متانتوں میں ہلکے تبسم کا رنگ لئے ہوئے، سراپا نگاہ
بنا ہوا تھا۔ اُس کی نگاہیں سائیکی کے مرمریں چہرے پر جمی
ہوئی تھیں۔

منروا بت بنی اپنے فریبِ تخیل پر غور کر رہی تھی۔ کہ
نوجوان کے سر کو جنبش ہوئی۔ اس کی نگاہیں سائیکی کے چہرے
سے ہٹ کر منروا کی سحر آگیں نگاہوں سے متصل ہوتی ہوئی،
جوپیٹر کے مجسمے کی بلائیں لیتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ منروا اپنے پاؤں
کی لغزشوں کو احتیاط کی کوششوں کے سپرد کرتی ہوئی ع

جبیں پہ نقش کئے قوسِ نازش و تمکین

آہستہ آہستہ بڑھی۔ شمیم کے نکہت آگیں لطیف جھونکے کی
طرح بڑھتی چلی گئی۔ اُسنے اپنے دامن کے تمام پھول ———
متبسم پھول۔ ناشگفتہ کلیاں بند غنچے۔ جوپیٹر کے قدموں
پر ڈال دئے۔ لوبان کی تقدس مآب خوشبو اُسکے وارفتہ
گیسوؤں کی طرح پریشان تھی۔ حلقہ طراز دھوئیں کی لہریں
اُس کے معنبر گیسوؤں کو چھوتی ہوئی پھیل رہی تھیں۔ اُس
نے ایک حسرت آگیں آہ بھری اور مصروفِ دعا ہوگئی ———

"برکتوں والے ——— خداوند!
عظمتوں والے ——— آقا!
میرے شاہدِ تصور کی جلوہ آرائی۔
تیری منشا کا دوسرا نام ہے۔
اپنے سینے کی مستور وسعتوں میں انوارِ حسن رقصاں
دیکھ رہی ہوں ——— خداوند! میں اُسے ہمیشہ اپنے
من مندر میں دیوتا بنا کر رکھنا چاہتی ہوں۔
وہ مہر و ماہ سے زیادہ تجلیوں والا،
گلاب سے زیادہ شگفتہ رو،
وہ دیوتا پیکر! روح کی آسودگی، قلب کیلئے سکون،
ضمیر کے لئے راحت، اور میری زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔
اُسے اپنی ان آنکھوں کے سامنے تیرے خداوندی
پیکر کی طرح موجود دیکھنا چاہتی ہوں۔
دیوتا ———!
میں محبت کی بھکارن اور محب کی آرزومند ہوں۔
اے مملکتِ دل کے بادشاہ!
محبت نواز خداوند!
میں تیری خدمت میں عرض گذار ہوں۔
اپنے دیدار کی سعادت نصیب کر۔
تیرا وجود زندگی کے دوام کا آئینہ دار ہے۔
بس ———
اے آسائش گیتی کے علمبردار!
اے محبت کے معتی!

معصومیت
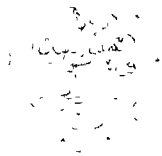
اپنے ساز کی مرتعش تاروں کے ساتھ مشہود ہو جا۔

اپنے وجود کو اذنِ نمو دے۔

آسمان کے تارے اور زمین کے ذرّے شدتِ انتظار سے بیتاب ہوئے جاتے ہیں۔

جوپیٹر دیوتا ——!

رہگذارِ یونان کے ذرے گواہ ہیں۔

میں نے دل کی تصویر کے زندہ پیکر کو ہر جگہ تلاش کیا۔ اُس کے نقشِ قدم کو تیری وسیع مملکت میں ڈھونڈتی پھری مگر وہ کہیں نظر نواز نہ ہوا۔

میں نے کشت و تخیل کی سبزہ پرور وادیوں میں جذب و کشش والے نغمے سنے، مگر اس مغنی آتش نفس کو نہ پا سکی۔

میں نے قلزمِ ذخار کی ساحل ناآشنا موجوں کے دوش پر زورقِ حیات کے ناخدا کو پیرتے ہوئے محسوس کیا، مگر اُسے اپنے سفینۂ آغوش میں جذب نہ کر سکی۔

ناکام تلاش پر کرم کر دیوتا ——!

مایوس تمنا پر رحم کر خداوند ——!

ٹیتھونس اپنے بربط کی تاروں کی طرح ساکت و جامد وجدان و کیفیت کے عالم میں مبہوت کھڑا تھا۔ فضا کے سکون پذیر ہوتے ہی بربط کی تاروں میں ارتعاشِ لطیف پیدا ہوا، اور وہ موجۂ دود کی طرح بڑھنے لگا۔ اس نے ساز کے بیتاب نغموں کو اذنِ ظہور دیا۔ اُسکا سینہ ضبطِ تنفس سے پھول رہا تھا۔

منروا نظر بھر کر دیکھنے لگی۔ اُسنے ٹیتھونس پر نگاہ ڈالی ٹیتھونس نے اپنی حسرت نواز نگاہوں سے اُسکا خیر مقدم کیا۔

منروا کے فانوسِ خیال نے اُس کی قلبی تصویر کے نقوش کو متجلا کر دیا۔ وہ سروِ آزاد کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اور ان الفاظ نے فضا میں تحرک پیدا کر دیا۔

"میرے خوابِ دیرینہ کی تعبیر حسین!!"

وہ اب بھی خاموش تھا۔

جوپیٹر کے پیکرِ سنگین کی طرح۔

اُس نے چپ و راست ایک متحیرانہ نگاہ ڈالی۔

معبد کے تمام ستون لرز رہے تھے۔ کیوپڈ اور سائکی کے مجسمے کانپ رہے تھے۔

منروا کے معجز نما لبوں پر چند الفاظ رقص کرنے لگے۔

مبہم سی آواز سماعت نواز ہوئی۔

وہ کہہ رہی تھی:۔

خوبصورت جادوگر!

ٹیتھونس نے قدرے تفکر کے بعد کہا۔

"خداوند جوپیٹر کی عظمتیں ۔حق ہیں۔ نظر نواز حسینہ! تم کون ہو ——"؟

منروا نے خواب کی سی کیفیت میں سنا اور جواب دیا۔

"لوحِ زندگی کا حرفِ مکرر"

ٹیتھونس ۔ حرفِ مکرر نہیں۔ بلکہ فطرت کا نقشِ محبوب۔

منروا ۔ نقشِ محبوب نہیں نوجوان! تمہاری نگاہیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ نقشِ نامحمود اپنی اکملیت کا آرزومند ہے۔ اور شائد تم نہیں جانتے ناتکمل نقش کبھی دیدۂ مصوّر میں محبوب نہیں ہو سکتا۔

ٹیتھونس۔ مگر تم اپنے نقشِ رعنا میں کیا کمی محسوس کرتی ہو؟

منروا۔ اپنے بربط کے ساکن تاروں سے پوچھو۔

ٹیتھونس۔ ساکن تارو! — جب ان تاروں پر زخمہ رقص کرتا ہے تو دیوتاؤں کی غارا تنگادت تمکنت مبدل بہ ابتسام ہوجاتی ہے۔

منروا۔ لیکن جب کا بربطِ روح زخمہ ناشناس ہو؟

ٹیتھونس۔ تمہارا منتہائے مقصود؟

منروا۔ شبابِ دوام

ٹیتھونس۔ خداوند تمہارا معاون و مددگار ہو۔ تمہارا اخترِ جبیں اپنی تابندگی کے اعتبار سے اقبالمندی کا مظہر ہے

منروا۔ اور طلوعِ بالاں کا منتظر!

ٹیتھونس۔ ساعتِ طلوع سے بے خبر سینہ انجم ان کی تابانیوں کے اکتساب سے بے بہرہ ہو۔

منروا۔ میں نے اس کی جستجو میں بہ تیاب کی آنکھ بند کر ڈالی۔ شہابِ ثاقب کے سیمیں ذرے اڑا ڈالے کہکشاں کی ریگ کو چھان ڈالا۔ فلک کی ردائے نیلگوں کو پھاڑ کر دیکھا مگر وہ جلوہ کہیں بھی نظر نواز نہ ہوا۔

ٹیتھونس۔ تمہاری نگاہیں جذب و کشش سے عاری ہیں۔

منروا۔ ممکن ہے۔ مگر تمہارا —— نام۔

ٹیتھونس۔ ٹیتھونس نبیرۂ نوائی کا ایک آوارہ بطانوا۔

منروا۔ ٹیتھونس! ٹیتھونس!! میرا حاصلِ جستجو" وہ ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی۔ مگر اسے دودِ لوبان کی حلقہ طراز لہروں پر یہ الفاظ رقص کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"معاف کرنا منروا —— ! میں اس فعل پر قادر نہیں"

منروا اس غیر متوقع جواب سے پریشان سی ہوگئی۔ اور اس عالم میں ایک لمحہ کے لئے کھوسی گئی۔ اس نے حواس مجتمع کئے۔ اور مزید استفسار کے لئے تیار ہوگئی۔ اس نے نگاہ اٹھائی —— مگر فضا خاموش تھی۔

ٹیتھونس غائب ——

منروا ہمیشہ کے لئے جوپیٹر کے قدموں پر سجدہ ریز تھی ——

جناب سید اختر احمد اختر اورینوی ۔ ایم ۔ اے ۔

افسانے میں حقیقت طرازی و مثال نگاری

زندگی نام ہے پورے ہونے والے اور نہ پورے ہونے والے خوابوں کا۔ زندگی عبارت ہے فطرت کی بخششوں اُسکے مظالم اور غلط بخشیوں سے، سماج کی نا انصافیوں اور انصاف سے، افراد کی گمراہیوں اور راہ روی سے اور اُن غلط یا صحیح ارمانوں سے جو فرد اور جماعت کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ صرف وہ چیزیں جو ہمارے اردگرد ہیں اساس حیات نہیں۔ بلکہ وہ آرزوئیں بھی جو ہمارے دل میں ہیں۔ بنیادِ ہستی میں داخل ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ "ادب آئینۂ زندگی ہے"۔ ادب کو زندگی کے قدم بہ قدم اور دست بہ دست رہنا چاہئے۔ یہ سچ ہے۔ مگر حیات کے مختلف و متضاد پہلو ہیں۔ سچا ادب وہی ہو سکتا ہے۔ جو زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالے۔ خارجی اور داخلی آئینہ سامانی ادب کا نصب العین ہونا چاہئے۔ ایسا نظریۂ ادب جو صرف خارجی پہلو پر زور دیتا ہو غیر صادق ہے۔

جس طرح ایک فرد کی زندگی میں شعور و ارادہ کے علاوہ غیر شعور و تحت الشعور کا بھی دخل ہے، اسی طرح مجموعی طور پر زندگی کے بھی دو سوتے ہیں۔ خارجی و داخلی۔ ایک شخص صرف وہ نہیں جو وہ نظر آتا ہے۔ بلکہ اُس کی ہستی میں اُسکی اندرونی شخصیت بھی شامل ہے۔ زندگی بھی صرف اتنی ہی نہیں۔ جتنی وہ نظر آتی ہے بلکہ زندگی کا ایک پس منظر بھی ہے۔ اور اس پس منظر کا وجود ہمارے اندر ہے فن بغیر پس منظر کے مکمل نہیں ہو سکتا۔

زندگی اپنے حقیقی ماحول سے متاثر ہو کر مثالی دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔ وہ جو نہیں ہے اُسکے ہونے کی تمنا عالم مثال کا سنگ بنیاد ہے۔ چمن کی ویرانیاں ارمانِ بہار کی ضامن ہیں۔ دنیا کی تلخ یا فرسودہ حقیقتیں ہمارے نشۂ تخیل کو بہشت آفرینی پر مجبور کرتی ہیں۔ لہٰذا مثال حقیقت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور خود بھی ایک حقیقت ہے۔

زندگی کی جڑیں اگر حقیقت کے آب و گل میں ہیں تو اُسکا گل نادمیدہ مثال کی فردوسی فضا میں شگفتہ ہونے کے لئے بے چین ہے جس طرح ایک فنکار سنگ خارا سے زہرہ و ناہید کے شہکار پیدا کر دیتا ہے، اسی طرح حقیقت سے مثال جنم لیتا ہے۔ سنگ تراش کے تخیل میں مجسمہ کی

صورت ہر چند کہ مبہم ہی سہی، موجود ضرور ہوتی ہے۔ اور یہ تخیلی وجود ایک حقیقت ہے۔ اگر ایک افسانہ نویس بُت گر کے ظاہری تصویر کشی کرے اور اُسکے تخیل و جذبات کی مصوری کو فراموش کر جائے تو اُسکا فن نامکمل ہوگا۔

آج کل "نظریہ گری" کے شوق یا "ترقی پسندی" کے جنون میں لوگ حقیقتِ کلی کو فراموش کر جاتے ہیں۔ صرف وہی چیزیں ہی حقیقی نہیں بلکہ جذباتی، تخیلی، نفسی، اور وہمی اشیا بھی حقیقی ہوتی ہیں کیونکہ انکا احساس قلبِ انسانیت کو ہوتا رہتا ہے سچ تو یہ ہے کہ کامیاب "حقیقتین" (Realists) بھی زندگی کے داخلی عنصر کو نظر انداز نہیں کرتے۔ زولا، بیلزاک، چیخوف، ترجنیف وغیرہ اپنے کامیاب افسانوں میں یا تو کردار کی داخلی کیفیات کو بھی الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں یا اپنی روح کا عکس ماحول میں دیکھتے ہیں۔

فرض کیجئے ایک افسانہ نگار ایک کسان کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ جہاں تک ماحول کا تعلق ہے، یہ خالصتاً خارجی بھی ہو سکتا ہے اگرچہ تشبیہہ و استعارہ کے ساتھ اور اُس تعلق کی وجہ سے جو ماحول کو کردار کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ داخلی عناصر بھی اجاگر ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً کسان کی جھونپڑی سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو دل کی آہ سے تشبیہہ دیا جا سکتا ہے اور اُسکے حالِ تباہ کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ ــــ "اسکی بے حال کٹیا پر "فرشتۂ رحمت" نے کبھی پرواز نہ کی"۔ اب دیکھئے کردار اور ماحول کے تعلق کے لحاظ سے کیا افسانہ نویس کسی ابر آلود مگر پُرشفق شام کو کسان کے دل کی ترجمانی اس طرح نہیں کر سکتا ــــ "کسان نے نازک ابر پاروں اور رنگین شفق کو دیکھ کر ایک آہِ سرد کھینچی۔ کاش وہ اُن پُرامن ٹاپوؤں میں پہنچ جاتا۔ جہاں ملکیت اور سرمایہ داری کے مظالم نہیں" اور کردار کی مصوری کے وقت تو نہ جانے کتنی نفسی کیفیات کو عریاں کرنا پڑے۔ نفس ایک سرچشمہ ہے جس سے جذبات، تخیل اور اوہام پیدا ہوتے ہیں۔ غرض ایک خالص حقیقت نگار بھی دنیائے مثال کو بھول کر پورے طور پر سرسبز نہیں ہو سکتا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلیگا کہ حقیقت نگاری و مثال طرازی میں ہم آہنگی ہے۔ ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہوتی ہے۔ جس طرح جسم و روح میں اختلاف کے باوجود ربط اور ہم آہنگی ہے بالکل اسی طرح حقیقت و مثال کے درمیان واسطہ اور توازن ہے۔ زندگی کی تکمیل اُن دونوں عناصر سے ہوتی ہے جس طرح جسم و روح کی سرحد کا پتہ نہیں چلا، ویسے ہی حقیقی و مثالی دنیا کے حدود متعین نہیں ہو سکے۔ میرا تو خیال ہے کہ ایک دوسرے میں گھلا ملا ہؤا ہے۔

اب آئیے ہم دیکھیں کہ دبستانِ ادب اور مختلف نظریوں کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض فنکار زندگی کے کسی ایک یا چند پہلوؤں کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ اور حیات کے کسی خاص پہلو کی طرف مائل رہنے کے نتیجہ میں اُنکے فن پر بھی اُسکا عکس پڑتا ہے۔ اگر کوئی فنکار حیات کے حسین مناظر و مظاہر کی طرف شغف رکھتا ہے۔ تو اُسکے فن میں لطافت و نزاکت، اور تناسب و توازن پایا جائیگا۔ کوئی اگر زندگی کی قوت و شوکت و جلال سے متاثر ہے

تو یہی رنگ اُسکے فن پر چڑھیگا۔ ایک دوسرا اگر زندگی کی حیرت کاریوں، اعجوبگیوں اور طرفگی کو پسند کرتا ہے۔ تو اُسکا فن بھی اسکی پسندیدگی کو آئینہ دکھلائیگا۔ رومان پسند کا فن بھی رومانی ہوگا۔ ناش حقیقت پسند عریاں حقیقتوں کی مصوری کریگا۔ اور دنیائے مثال کی سیر کرنے والا مثالیت کے رنگ بھریگا۔ ان فنکاروں میں کوئی ممتاز فن کا کسی خاص نظریۂ ادب یا دبستان (School) کا معیار بن جاتا ہے۔
اکثر و بیشتر صناع خود اپنے دبستان سے بے خبر رہتا ہے وہ تو غیر شعوری طور پر وہی راگ گاتا۔ اور گانے پر مجبور ہے جو فطرت اُس سے گواتی ہے اور یہی مبارک اختلاف فن میں تنوع وجدت پیدا کرنیکا ضامن ہے۔ کیونکہ الماسِ فطرت کے ہزاروں ہی نہیں بلکہ لاتعداد پہلو ہیں۔ عروسِ حیات کی لاتعداد ہی ادائیں ہیں، کوئی کسی کا گھائل ہے۔ کوئی کسی کا ان دبستانوں اور نظریہ ہائے ادب و فن کی تخلیق تو نقادوں یا متوسط صلاحیت کے شاگردان و پیروانِ اُستاد سے ہوتی ہے کسی خاص دبستان کی خصوصیات کا مطالعہ کرنا ہو تو اُستاد کے فن کو نہ دیکھئے۔ بلکہ شاگرد کے کارناموں کو ملاحظہ فرمائیے۔

لیکن وہ لافانی ہستیاں جو ادب و فن کی پیغمبر بالکتاب ہوتی ہیں اُنکے شاہکاروں میں فطرت و حیات اپنے اکثر جلووں کو بے نقاب کرتی ہے۔ اُنکے یہاں حقیقت و مثال طلابیت و رومانیت ہم آغوش ہوکر رقص کرتی ہے۔ وہ شاہدِ فطرت کے تبسم و چین برجبینی کے یکساں ہمراز ہیں۔ اُنہوں نے زندگی کی سوتی اور جاگتی ہوئی دلہن کے مزے لوٹے ہیں۔ غرض یہ رجال فن عطر مجموعہ ہوتے ہیں۔ نابغہ (Genius) کے سمندر میں سارے دبستانوں کے دریا آکر گرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی شاعری کی تاریخ دیکھئے۔ شیلے مثالیت پسند تھا اور کیٹس جذبات پرست۔ مگر شیکسپیئر اور ملٹن باوجود مختلف دبستانوں کے معیار ہونے کے مسلّم ہیں، ساری خوبیوں کے باوجود شیکسپیئر رومانی (Romantic) ہے۔ مگر اُسکے یہاں "کلاسیت" (Classicism) کی تکمیل و تناسب بھی ہے۔ اسکے یہاں جذبات کی فراوانی ہے۔ مگر بے راہ روی نہیں۔ وہ مثالی دنیا کی تخلیق بھی کرتا ہے اور حقیقت نگار قلم سے کرتا ہے۔ آپ اناطول فرانس، وکٹر ہیوگو اور ٹالسٹائی کے ناولوں کا مطالعہ کیجئے۔ تو آپ پر ظاہر ہوجائے گا۔ کہ لا میزریبل، تائیس اور انا کرینینا میں حقیقت و مثال کا ازدواج شیریں ہے۔

ان دنوں اردو افسانہ نویسی کی دنیا میں حقیقت نگاری کی تحریک زوروں پر ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ ضروری اور لازمی ردِ عمل ہے۔ ہمارے ادب میں خواب بہت دیکھے جاتے ہیں۔ اور جاگتی زندگی کی طرف بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خواب بھی ہماری زندگی کا حقیقی جزو ہے۔ مگر صرف جزو ہے۔ حیات بیدار اساس و بنیاد ہے۔ خواب اور تخیل ہماری زندگی کو بلند تر کرتی ہے مگر جب بنیاد ہی استوار نہ ہو تو پھر ترقی و سربلندی معلوم۔
اس مقالہ کے لکھنے سے میرا مقصد یہ بتلانا ہے۔ کہ ردِ عمل کبھی بھی کامل نظریۂ ادب یا نظریۂ حیات نہیں ہوسکتا۔

ردِ عمل ہمیشہ مصلح ثابت ہوتا ہے اور بس۔ ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کے جوش میں ہمیں ہرگز یہ فراموش نہیں کرنا چاہئیے کہ دنیائے خواب و خیال بھی ایکطرح دنیائے آب و گل کے اوپر سایہ فگن ہے۔ اور عالمِ خواب و خیال کے پیکر ابر پاروں کی طرح دنیا زادہ ہی ہیں۔ ہر چند کہ یہ دنیا سے جدا معلوم ہوتے ہیں مگر ہیں یہ اسی دنیا کی چیز اور اس دنیا کو بہتر بنانے میں ممد ہوتے ہیں۔ یہ پیامِ نو بہار ہیں۔

مافوق الفطرت فطرت کا ایک بلند زینہ ہے ۔ اور ماورائے حیات نخل زندگی کی ایک اونچی شاخ۔ قلبِ انسانیت میں ابتدا سے انہونی باتوں کی تمنا ہوتی ہے۔ ایک بچہ اپنے گہوارے سے ہی ستارے توڑنا چاہتا ہے۔ یہ ستارہ طلبی دراصل انسان کی آئندہ ترقی کا محرکِ اوّل ہے۔ یہ جدتِ ارتقا کی ضامن ہے۔ مثالی دنیا کی ایک جھلک عمل کیلئے مہمیز ثابت ہوتی ہے۔ مگر جھلک ہی کیونکہ اگر ہمارے ادب میں مثالی دنیا کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے ہوں۔ تو ہم فریب کھا جاتے ہیں۔ اور مثال کو حقیقت سمجھکر تسکین حاصل کر لیتے ہیں ہم مستقبل کو حال سمجھنے لگتے ہیں۔ اور مطمحِ نظر کو ماحول۔ ہمیں غیر شعوری طور پر یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ مقصد حاصل ہو چکا اور ہمارے ہر طرف رومان و شعر کی جنت ہی جنت ہے۔

ہمارے ادب کے لئے ایچ۔ جی۔ ولز کا "سفر ماہ" بھی اسی طرح ضروری ہے جیسے مکسیم گورکی کا "ماں" یا "تین مزدور اور ایک لڑکی" ہمیں پروفیسر احمد علی کے "شعلوں" اور "انگاروں" کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی نیاز اور ل۔ احمد اکبرآبادی کے رومانی افسانوں کی۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں۔ کہ حیات کی وسیع تر و عمیق مفہوم کو سمجھنے کی خاطر ہمیں "الف لیلہ" شیکسپیئر کے ڈرامے "وسط تابستان کی رات کا خواب" اور "طوفان"
(Mid Summer nights' dream)
("Tempest") کی بھی حاجت ہے ہمیں حجاب امتیاز علی کے ہیبتناک افسانوں اور میرزا ادیب کے صحرا نوردی کے حیرت زا رومانی قصوں کی بھی احتیاج ہے۔ ان سے ہمارے تخیل و تدبر کو تحریک ہوتی ہے۔ ہماری نظر زندگی کی طرف غائر پڑنے لگتی ہے۔ اور نتیجۃً ہماری انسانیت تکمیل کو پہنچتی ہے۔

ختمِ کلام پر میں یہ عرض کرونگا کہ یہ سچ ہے۔ کہ ہندوستانی ادب کی صحیح تعمیر کے لئے ہمیں حقیقت نگاری کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئیے ہمیں سانس لینے والی جیتی جاگتی دنیا کی ترجمانی کو مقدم رکھنا چاہئیے۔ اور اسکے بعد اس لٹی ہوئی ویران دنیا کی تباہ شدہ آبادی کے دل کی آرزوؤں کو بھی منظرِ عام پر لانا ضروری ہے۔ ہمیں ان دوزخ میں رہنے والوں کی نجات کی فکر کرنی چاہئیے۔ اور اُنکے لئے ایک جنت کی تعمیر۔ جنت پہلے دنیائے مثال میں آباد ہوتی ہے۔ اور اُسکے بعد عمل کی کارفرمائی سے اسی دنیا میں حقیقت بن جاتی ہے۔ زندہ حقیقت۔

ان باتوں کے باوجود زندگی یا ادب کے کسی ایک پہلو، خواہ وہ بنیادی ہی کیوں نہ ہو، پر انتہائی زور دیکر نظریہ سازی کفر ہے۔ حیات و ادب کے دوسرے پہلوؤں کا۔ یہ اور بات ہے کہ فنکار اپنے انفرادی رجحان کے سبب زندگی کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کرے

بلکہ یہ مناسب اور بہتر ہے، یا کسی ادب کی اصلاح کے لئے مفقود عناصرِ زندگی کو پیدا کر کے چمکانا بھی سعی مشکور ہے مگر کوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے حلقہ کو کائنات تصور کر لینا پستی و تنگ نظری کی دلیل ہے۔

آپ موجودہ روس کے افسانے پڑھیئے۔ یہ دورِ اشتراکیت کے افسانے عہدِ زاریت کے افسانوں سے مختلف ہیں۔ وہاں کے افسانوں میں جہاں جدت، ترقی، تنوع اور علوئے تخیل ہر طرف نظر آتا ہے۔ وہاں اس مبارک عہد میں حیات مثال کو حقیقت بنا رہی ہے۔ روس میں شاعروں کی "دنیا۔ دورِ زریں" (millenism) آچکا۔ وہ ملک اب اپنے صحیح ذوق سے اپنی حاصل کی ہوئی جنت کی چمن بندی کر رہا ہے۔ اور مثالیت کی نورانی دنیا سے تازہ سمن و گل لالہ و ریحان لا کر گل اندازی و خیابان طرازی میں جوش کے ساتھ منہمک ہے۔ کیا نظریہ اشتراکیت خود ہی پہلے ایک معصومانہ خواب کی سی بات نہ تھی؟ کیا اشتراکیت کو لوگ مثالیت (idealism —) کہکر پہلے مسکرا نہیں دیتے تھے؟ مگر اب مثال حقیقت بنگیا اور انسانی ترقی کی کوئی حد نہیں غرض مثالیت کا وجود عمل کے لئے شمع ہدایت رہبر عزلیت اور منزلِ مقصود ہوتا ہے۔

جیسا میں اوپر کہہ آیا ہوں آج ہمارے ادب کو نبضِ حیات پر ہاتھ رکھنے والے ادیبوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر ساتھ ساتھ زندگی کے دل کی آرزوں سے آشنا اہلِ فن کی بھی احتیاج ہے۔ بلکہ نہیں ان اکابر کی حاجت ہے جو حقیقت کو اسکا حصہ دیں اور مثالیت کو اسکا۔ نیز ہمیں ایسے بصیرت دوں کی بھی طلب ہے جو طوفان کے وقت کشتی ادب کو صحیح و سالم نظریہ فن کے مینارے سے ہدایت کی روشنی پہنچائیں۔

(بقیہ افسانہ ارتکابِ جرم)

ہوں۔ کیونکہ ۲۱ر اور ۲۲ر مارچ ۱۸۸۵ء کی درمیانی شب کو یعنی عین اسی وقت جبکہ ہوٹل کی رنڈی قتل ہوئی میں آٹھ میل کے فاصلہ پر ایکول میں ارتکاب جرم کر رہا تھا۔ جس خادمہ کو میں نے زخمی کیا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اور غالباً اب بھی مجھے شناخت کرے گی۔ وہ اس وقت بنوٹی میں بطورِ محافظہ ملازم ہے۔ میں آپکو اسکا مفصل پتہ بھیج دوں گا۔ مزید براں وہ خنجر بھی یقیناً برآمد ہوگا۔ جو میں نے سٹیشن کے قریب ایک ویران کنوئیں کی تہ میں آج سے بارہ برس پہلے پھینکا تھا۔

ان حالات کے ماتحت میں سمجھتا ہوں کہ میرا مقدمہ ضرور کامیاب ہوگا۔ کیونکہ جس جرم کی میں سزا پا رہا ہوں۔ اس میں میری بے گناہی نہایت واضح و بدیع ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے مقدمہ کی پیروی کیلئے ان واقعات پر اچھی طرح غور فرمائینگے اور بواپسی ڈاک مجھے اپنی گرانقدر رائے سے اطلاع بخشینگے۔ والسلام

خاکسار

پی۔ ایل۔ براؤن۔ کلرک دفتر جیل مقام نومیا۔ جزیرہ نیو کیلیڈونیا۔

حکیم الشعراء حضرت امجد (حیدر آبادی)

"عبدِ اعظم"

دورِ عمرؓ کا سنئے قصہ عدل و کرم تھا جن کا حصہ
اونٹ اک بیت المال کا بھاگا جس کا نہ تھا کچھ آگا پیچھا
فاروقؓ اس کو ڈھونڈھ رہے تھے دوڑ رہے تھے اونٹ کے پیچھے

عرض کسی نے کی یہ اس دم آپ تو ہیں فاروقِ اعظم
حکم غلام کو کیوں نہیں دیتے تاکہ وہ جا کر اونٹ کو ڈھونڈھے
سن کے عمرؓ نے یہ فرمایا میں بھی ہوں اس کا ادنیٰ بندہ
خادم ہوں میں قوم کا اپنی
اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ
مجھ سے زیادہ تر غلام کون ہے

میرزا ادیب

صحرا نورد کا چوتھا خط

مشفق دوست ______ !!

حسب وعدہ آج چوتھا افسانہ بھیج رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم اسے گذشتہ افسانوں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ، زیادہ دلآویز پاؤگے! یہ افسانہ کیا ہے۔ چند پُراسرار، تحیر زا اور دلپذیر واقعات کے ایک ایسے حسین و جمیل مجموعے کا، جسے پڑھتے وقت انسان زندگی کے تلخ حقائق و کوائف، کشمکش و اضطراب، ہمہمہ زائی و ہنگامہ خیزی سے یکسر علیحدہ ہو کر ایک عجیب و غریب، رومانیت انگیز و علاماتی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ میں اسے تین بار پڑھ چکا ہوں، اور ہر بار میرے دل نے دورانِ مطالعہ میں ایک نئی لذت، ایک تازہ مسرت حاصل کی ہے۔ یہ افسانہ تم گذشتہ افسانوں سے، ایک حد تک مختلف پاؤگے۔ یہ اختلاف ایک ایسے عنصر کی موجودگی ہے، جس سے گذشتہ افسانے تہی دست ہیں۔ اور یہی عنصر اسکی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے!

پیشتر اسکے کہ میں اپنی موجودہ حالت، قیام اور دیگر امورِ متعلقہ کے سلسلے میں کچھ کہوں، یہ بتا دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ یہ افسانہ مجھے کہاں سے ملا؟ پچھلے خط میں میں نے ملکہ مصر کی داستان بھیجتے ہوئے تمہیں بتایا تھا کہ کس طرح صحرا نوردی کرتے کرتے ہمیں ایک ضعیف و لاغر بوڑھا ملا تھا، اور پھر کس طرح اس سے تین افسانے حاصل کئے تھے! پہلا افسانہ "بعنوان" ملکہ مصر" تمہیں بھیج چکا ہوں۔ یہ دوسرا افسانہ ہے۔ میں نے اس میں ایک حد تک رد و بدل کر دیا ہے۔ ایک شخص "رشدی" نے خود اس میں حصہ لیا ہے، اور یہ اُسی کی زبانی ہے!

اس دوران میں متعدد داستانیں پیارے رفیقِ سفر، آغا بہرام نے مجھے سنائی ہیں، اور ہر ایک اتنی موثر، اتنی دردناک اور اتنی درد انگیز ہے کہ تم اُسے پڑھتے وقت اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکوگے! تیسرا افسانہ بھیجنے کے بعد میں ان کی طرف متوجہ ہونگا!!

پیارے دوست! جیسا کہ تم جانتے ہو مجھے تمہاری شورش افزا دنیا سے نکل کر اس دنیا میں آئے ہوئے ڈھائی سال کی مدت گذر چکی ہے اور میں نہایت مسرور زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ہر طرف، دور دور پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں چلنا، شیریں چشموں کے کنارے خیمہ زن ہونا، کبھی کبھی قافلوں کو صحرا نوردی کرتے ہوئے دیکھنا، انکے اونٹوں کی گھنٹیوں کی خوش آئند آواز کو سننا، طلوعِ آفتاب کے وقت، ریت کے عظیم الہیئت خوفناک تودوں کے عقب میں، مشرقی آسمان کی نیلگوں وسعتوں کو سیلابِ نور میں نہاتے ہوئے دیکھنا، ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں کو، ٹیلوں کی پیشانی پر حسرت خیز نگاہیں ڈالتے ہوئے محسوس کرنا، عجیب عجیب محو شدہ صحرائی داستانوں کو سننا ______ آہ یہ واقعات کتنے مسرت بخش ہیں ______ کس درجہ دلآویز ______ ؟؟

صحرا میں، جب کبھی کوئی ٹوٹی پھوٹی عمارت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ تو اسوقت کا منظر عجیب ہوتا ہے۔ میرا رفیق سفر، کوئی حسین صحرائی داستان سنانے لگتا ہے۔ داستان کے افراد جیتے جاگتے، آنکھوں کے آگے ظاہر ہو کر اپنا پارٹ ادا کرنے لگتے ہیں، ان کے غمگین چہروں پر آنسوؤں کے قطرے لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فضا میں دلخراش آوازیں تڑپتی ہیں۔ اور پھر وہ بےبنیاد سایوں کی صورت اختیار کر کے برستے ہوئے بادلوں کی مانند، جو آہستہ آہستہ پانی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ شکستہ دیواروں پر رقص کرتے ہوئے غائب ہو جاتی ہیں۔ اس منظر سے میرے دل پر کیا اثر ہوتا ہے، اسکا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں ---!!

مگر اسکے باوجود، صحرائی زندگی، خوفناک زندگی ہے۔ سموم ہوا کے خطرناک جھونکے، جنگلی جانوروں کی موجودگی تمہیں بتاؤ کیا زندگی خطرے میں نہیں ہے؟؟ لیکن یہ خطرات، صحرائی زندگی کی ان مسرتوں کے مقابلے میں، جو مجھے حاصل ہو رہی ہیں۔ کوئی حیثیت و اہمیت نہیں رکھتے۔ میں مسرور ہوں، انتہا مسرور!! صحرائی زندگی کی لذتیں چھوڑ دینے کا خیال بھی، میرے دل میں نہیں آتا۔

اس وقت میں ایک شاداب نخلستان میں پہنچ چکا ہوں۔ صبح کی روشنی بتدریج پھیل رہی ہے۔ میں خیمے کے دروازے پر بیٹھا ہوا صحرائی مناظر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، میرا پیارا ساتھی خیمے کے اندر ابھی سو رہا ہے ---- !! اچھا اب تھوڑی سی مدت کے لئے الوداع

تمہارا .... "صحرانورد"

میرا نام "رشدی" ہے۔ والدین نے میرا کیا نام رکھا؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ میرے ایک دوست کے باپ نے جسے میں چچا کہا کرتا تھا۔ مجھے بتایا کہ میرا حقیقی نام "غیاث" ہے۔ میں نہیں جانتا یہ بات کہاں تک درست ہے! بہرحال لوگ مجھے رشدی ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ اور اب بھی، جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میرا یہی نام ہے! اسوقت میں عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں انسانی زندگی اور موت کے غار کی اتھاہ گہرائیوں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ حال یہ ہے کہ رہی سہی طاقت بھی جواب دے چکی ہے۔ جوانی کی گرمجوشی اور زندہ دلی ضعیف، مضمحل اور بوڑھے جسم کی شکنوں میں غائب ہو گئی ہے۔ اگرچہ میری نظروں میں یہ وسیع کائنات، تمام دلچسپیوں سے محروم ہو چکی ہے، ارد گرد کے مناظر میں مسلسل تغیر میرے دل کی دنیا میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ تاہم، ابھی ایک ذریعہ ہے۔ جو میرے لئے ایک ناقابل تلافی سامان تفریح سے کسی طرح کم نہیں! یہ سامان تفریح، یہ ذریعہ مسرت کیا ہے؟؟ صرف گذشتہ حیرت انگیز واقعات کی یاد میں کھو جانا! میری موت کے بعد جو شخص بھی میرے عجیب و غریب حالات کو پڑھے گا، وہ انہیں یقیناً دماغی کاوش کا حاصل، اور ذہنی جنون زدگیوں کا نتیجہ سمجھے گا! مجھے اعتراف

ہے کہ میرے قصے میں ایسے عناصر ہیں، جن پر انسانی عقل کبھی یقین نہیں کر سکتی، لیکن یہ درست نہیں، یہ واقعات، میری نگاہوں کے سامنے پیش آتے رہے ہیں۔ اور میں نے خود ان میں اہم حصہ لیا ہے۔ دنیا میں ہر ایک چیز ممکن ہے، اگر یہ حقیقت ہے، تو پھر میری داستان کو کیوں ناممکن الوقوع سمجھا جائے؟؟

چند دن سے میرا ارادہ تھا کہ اسے لکھ ڈالوں، لیکن چند وجوہ کی بنا پر جن میں شدتِ نقاہت اور بیماری کا زیادہ حصہ ہے، میرا یہ ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ اب میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس عزم راسخ کے ساتھ اٹھایا ہے۔ کہ اپنی پوری داستان لکھ کر ہی اسے ہاتھ سے چھوڑونگا! اللہ میرا مددگار ہو——!!

جب میں نے ہوش سنبھالا، تو اپنے آپکو "عطفہ" میں پایا "عطفہ" ایک چھوٹا سا شہر ہے، جو دریائے "فورز" کے کنارے آباد ہے۔ ہوش سنبھالنے سے پیشتر میرے والدین راہی ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ اور میں ایک بوڑھے "خادم" کے ساتھ اپنے شاندار مکان میں رہتا تھا۔ جب میں نے عالمِ شباب میں قدم رکھا، تو یہ بوڑھا خادم بھی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا! اُسکی موت اور "عطفہ" کی آبادی کے بیشتر حصے کی موت کا باعث ایک خاص بیماری تھی، جو آناً فاناً تمام شہر میں پھیل گئی تھی۔ اسکے بعد "عطفہ" ویران مقام نظر آنے لگا۔ فطری طور پر میں وہاں رہنے سے گھبراتا تھا۔ لیکن چونکہ اپنی زندگی کا زریں حصہ وہاں گذار چکا تھا۔ اسلئے "نقلِ مکانی" کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اور تن تنہا اپنے مکان میں رہنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شہر میں کئی قسم کے تغیرات پیدا ہوئے، کئی لوگ باہر سے آکر وہاں آباد ہو گئے، اور متعدد آدمی وہاں سے چلے گئے۔ جو لوگ باہر سے آئے ان میں سے بہتوں کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ایک شخص سے میں بہت ڈرتا رہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنے، اسکے پاس جانے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا تھا۔ یہ شخص، ایک دراز قد، سیاہ رو بوڑھا تھا۔ جسکا نام کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اور نہ کسی کے ساتھ اُسکی ملاقات تھی۔ اہلِ "عطفہ" کی نظروں میں اُس کی شخصیت، ایک پُراسرار ساحر کی تھی، اور اسے، شہر کے ہر گوشے میں ساحر ہی سمجھا جاتا تھا۔ ساحر کا چہرہ بہت خوفناک تھا۔ مگر سب سے زیادہ خوفناک اس کی آنکھیں تھیں۔ آہ وہ بڑی بڑی، خشمگیں، سُرخ سُرخ آنکھیں!! اب بھی، انکا خیال، میرے دل کو خوفزدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا! صبح ہی صبح جب میں بغرضِ سیرِ ساحل پر جاتا، تو بوڑھے ساحر کو یا تو کشتی سے اترتے ہوئے دیکھتا یا ٹہلتے ہوئے پاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ میں رات کا کافی حصہ ایک دوست کے ہاں گذارنے کے بعد گھر جا رہا ہوں، تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی آواز نہیں، کوئی متنفس نہیں۔ یکایک دور، چاند کی دھندلی روشنی میں، میری نگاہوں کو ساحر کا خوفناک چہرہ نظر آتا ہے! میں ڈر کر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ میں ہی نہیں، دوسرے لوگ بھی اسے خوفناک ہستی سمجھتے تھے۔ خود تو وہ کسی سے بولتا ہی نہیں تھا اور دوسرے بھی اس سے گفتگو کی جرأت نہیں کر سکتے تھے——!

ساحر کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ چند سال پیشتر "دیوی ساموٗ" کے مندر کے مضافات میں رہتا تھا، اور

دیوی کا پجاری بھی تھا۔ ایک اور بات بھی اسی سلسلے میں سنی جاتی تھی اور وہ یہ تھی کہ بوڑھا ساحر "روحانیات" میں کامل دسترس رکھتا ہے۔ اور اب کوئی خاص علم حاصل کر رہا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کا خیال تھا کہ ساحر کسی کی تلاش میں رہتا ہے! کس کی تلاش میں رہتا ہے؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا ــــــ!!

متعدد بار اسے رات کو اس طرح پر اسرار طریقے پر گھومتے دیکھ کر میرے دل میں اسکا بھید لینے کا خیال پیدا ہوا۔ تاہم اسکی خونخوار آنکھوں کے سامنے اس خیال کو دم توڑتے ہی بنی! اس طرح ایک سال گذر گیا۔ میرے دل میں اپنی خواہش کے پورا کرنے کا خیال کافی قوت حاصل کر گیا ــــــ!!

(۲)

ایک دن شام کے وقت میں، ساحل دریا پر ایک چٹان سے سہارا لگائے، دور افق کے آغوش میں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ایک کشتی کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہی بتدریج پھیل رہی تھی ۔ آسمان کے گوشۂ مغرب میں شفق کی سرخیوں کے درمیان ڈوبتا ہوا سورج ایک زخمی، خون میں شرابور سپاہی کی مانند دکھائی دے رہا تھا، جو میدان جنگ میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو دریا کے دوسرے کنارے پر "دیوی سامو" کے مندر کے عقب میں، بلند سوکھے درخت ظلمت پوش فضا کی لا متناہیوں میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ کشتی ہلکا سا شور پیدا کر کے روانہ ہو جاتی اور جب تک وہ دوسرے کنارے تک پہنچے، ملاح کے گیت سے فضا میں مترنم ارتعاش جاری رہتا۔ ملاحوں کے گیتوں سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اور میں ان کو بڑے شوق سے سنتا رہا ہوں۔ اس وقت بھی ملاحوں کی معصومانہ آواز میرے شوق کے لئے سامان تسکین پیدا کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں میرے قریب پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر چپوؤں کی حرکت سے مدہم سا شور کان میں پڑا ــــــ سمجھا کہ کوئی شخص دوسرے کنارے کو جا رہا ہے۔ میں ملاح کے گیت کا منتظر تھا۔ مگر ایک دو منٹ گذر گئے اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر ایک کشتی بہ رہی تھی۔ اور کشتی میں سے ساحر کی خوفناک، خونخوار آنکھیں گھور گھور کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں بوڑھے ساحر کی آنکھوں کی تاب لانا میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ کشتی بہتی جا رہی تھی۔ اور اسکے ساتھ ہی میرے دل کی گہرائیوں میں ایک جذبہ شدت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ پر اسرار بوڑھے ساحر کا تعاقب کرنا اسکا بھید لینا۔ چند منٹ کے بعد کشتی کنارے پر جا لگی ساحر اترا، اور ایک طرف چلنے لگا۔ دور، تاریکی میں، وہ سائے کی مانند حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا اسکے غائب ہو جانے کے بعد میں بمشکل چار پانچ منٹ وہاں کھڑا رہا، پھر کشتی میں بیٹھ گیا اور اسے کھینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ خوف ولذت کا ملا جلا جذبہ ایک لہر بنکر میرے دل ودماغ میں دوڑ گیا۔ میرے اردگرد چاند کی مدہم روشنی چھائی ہوئی تھی۔ "دیوی سامو" کے مندر سے پجاریوں کی آواز نکل نکل کر فضا میں گونج رہی تھی۔ ہر طرف مہیب رومانیت برس رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا، میں مندر کے قریب پہنچا اور دروازے میں سے اندر دیکھا

کریہہ المنظر پجاری جلتی ہوئی لکڑیاں ہاتھوں میں لئے گا رہے
تھے۔ گاتے وقت انکے پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا
سا کمرہ تھا جسمیں دیوی سامو کی مورتی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا
یکایک میری نظریں ساحر پر پڑیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ کھڑا
دیوی سامو کے کمرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

اب گیت ختم ہو چکا تھا، اسلئے پجاری دروازے کے
باہر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کی موجودگی میں میرا اندر رہنا ناممکن امر تھا۔
ساحر بھی کہیں غائب ہو چکا تھا۔ دوسرے دن پھر میں اسی وقت
وہاں پہنچا۔ گیت جاری تھا۔ دروازے میں سے جھانک کر میں
نے اندر دیکھا۔ ساحر ایک طرف کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد حسب
معمول پجاری دروازے کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ حیران تھا کہ کیا کروں
جی میں آیا کہ واپس چلا جاؤں۔ لیکن رازجوئی کا وہ جذبہ جو فطرت
انسانی کے ساتھ ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے
اندر جانے کی کوشش کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے دل
کڑا کیا۔ اور مندر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مشرقی دیوار
کے اختتام پر پہنچکر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ کیونکہ آگے ایک
چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے جھک کر اندر دیکھا۔ ایک طرف
چراغ جل رہے تھے۔ اسکے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے دروازے
کے اندر قدم رکھدیا۔ دماغ میں بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔ چند
قدم طے کرنے پر میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں چھوٹی سی کھڑکی
میں سے دیوی سامو کی مورتی صاف طور پر نظر آ رہی تھی۔ یہ بُت
سنگ مرمر کا ایک نہایت خوبصورت دلآویز اور حسین و جمیل
نسوانی پیکر تھی۔ جسکے سر پر شانوں پر پیشانی پر سنہری بال بکھرے
ہوئے تھے۔ اردگرد چراغ جل رہے تھے۔ فضا میں روشنی کے
سیلاب کے اندر عود و عنبر کی لہریں دھوئیں کے پیچ در پیچ
حلقوں میں تیر رہی تھیں۔ مورتی کے پاس کوئی پجاری نہیں
تھا۔ اور میں اسکے خوبصورت پیکر کے دیکھنے میں مشغول تھا۔ کہ
ایکطرف سے شعلہ نظر آیا۔ اور پھر کمزور ضعیف و کہولت زدہ
پجاری کا غمگین چہرہ۔ پجاری نے جلتی ہوئی لکڑی مورتی کے پاس
فرش پر رکھدی اور خود اسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یکایک اسکی
آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل نکل کر اس کی داڑھی میں
غائب ہونے لگے۔ اسکے لب تھرتھرانے لگے۔ اور فضا میں اسکی
غمگین مدہم آواز گونجنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اے خداوندۂ آتش! میں کب تک آنسو بہاتا رہونگا؟
کیا میری آرزو کبھی بھی پوری نہیں ہوگی؟
میری ملکہ! مجھ پر رحم کر ——— رحم کر"

یہ کہتے ہوئے اسنے اپنے ہونٹ مورتی کے پاؤں پر
رکھدیئے۔ انہیں چوما۔ پھر اسکے ہاتھوں کو چوما۔ اسکے بعد
وہ سجدے میں گر پڑا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اچانک
دروازے کے پاس پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اور چند لمحوں کے
بعد بوڑھا ساحر اندر داخل ہوا۔ اسنے خونخوار نظروں سے ادھر
ادھر دیکھا۔ اور جھک کر اپنا ہاتھ پجاری کے سر پر رکھدیا۔ پجاری
نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اور ساحر کو دیکھا۔

"اتنی بیتابی درست نہیں" ساحر نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بیتابی تو مجھے مار ڈالے گی! آہ میں کیا کروں؟"

"صبر"

"صبر اب مجھ سے نہیں ہو سکتا ——— نہیں ہو سکتا۔"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"یہ بیتابی تمہارے حق میں نقصان دہ ہے۔ اگر اس طرح روروکر جان کھو دوگے تو اس وقت جب تمہاری آرزو پوری ہوگی کیا کروگے؟"

ان الفاظ سے پجاری کے حسرت انگیز چہرے پر ہلکی سی بشاشت دوڑ گئی "میری آرزو پوری ہوگی؟" اُسنے پوچھا۔

ہاں، اپنے مقررہ وقت پر! ساحر نے جواب دیا۔

"وہ مقررہ وقت ابھی نہیں آیا؟"

"ابھی نہیں! —— صبر کرو"

دونوں خاموش ہوگئے، بوڑھے نے آہستہ سے کچھ کہا، جسے میں سن نہ سکا چند لمحے بوڑھا ٹھہرا اور پھر باہر نکل گیا۔ پجاری اسکے جانے کے بعد دیوی کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے "سنہری بالوں والی دوشیزہ —— کہاں —— ؟ سنہری بالوں والی دوشیزہ!" اسنے آہستہ آہستہ کہا۔ اور آنسو خشک کئے۔ اپنی لکڑی کیطرف دیکھا۔ جو جلکر خاکستر ہو چکی تھی۔ پھر حسرت ناک نظریں مورتی پر ڈالیں اور فرش پر لیٹ گیا —— !!

ہر طرف خاموشی، پُراسرار خاموشی چھاگئی۔ سنگ مرمر کے چبوترے پر دیوی، ایک خوبصورت دوشیزہ کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتی ہیں —— !

میں مندر سے باہر نکلا۔ اور واپس چلنے لگا۔ یہ خیال کہ پجاری سنہری بالوں والی ایک دوشیزہ پر عاشق ہے۔ میرے ذہن پر مسلط ہوگیا تھا باتی پجاری کھلے میدان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ساحل پر پہنچکر میں کشتی میں بیٹھ گیا —— دوسرے کنارے پر میں نے دیکھا کہ ساحر کشتی سے نکلا اور ایک طرف چلنے لگا۔ !

(۳)

گذشتہ واقعے کو گذرے ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ اس اثنا میں بوڑھے ساحر کو میں نے کہیں نہ دیکھا۔ متعدد بار مندر میں گیا، پجاریوں کی نگاہوں کے سامنے، ان کی نظروں سے چھپکر میں نے اسے ڈھونڈا۔ مگر بیسود! معمر ساحر کی غیر موجودگی کوئی معمولی سا واقعہ نہ تھا۔ ہر روز اس سلسلے میں عجیب وغریب افواہیں سننے میں آرہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ساحر کسی ناگہانی موت کا شکار ہو چکا ہے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے !

خوفناک بوڑھے کی ساحرانہ و پُراسرار شخصیت نے میرے دل میں اسدرجہ اہمیت حاصل کرلی تھی کہ میں اسکی ہر حرکت کو ایک راز، اسکے ہر فعل کو ایک بھید، اور اُسکے ہر کام کو ایک معمہ سمجھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اور اسوقت بھی اُسکی غیر موجودگی میری نظروں میں کوئی نہ کوئی راز لئے ہوئے تھی۔

اس رات کو جسکے آخری حصے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، میں خلاف معمول جلد سوگیا۔ اور جب میری آنکھ کھلی فضا میں کہیں کہیں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے اعضا کچھ مضمحل سے تھے۔ اسلئے میں مکان سے نکل کر ساحل دریا پر چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے مکان سے بہت دور نکل گیا میں واپس آنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ کہ میں نے اپنے پاس ہی بوڑھے ساحر کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اُسکے پیچھے ایک نہایت خوبصورت عورت، جسکے سنہری بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا لہرا کر عجیب منظر پیدا کر رہے تھے

ایک خوبصورت و توانا نوجوان کے پہلو میں، قدم اٹھا رہی تھی
میں نے دیکھا کہ نوجوان، مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا ہے۔ اس نے
بوڑھے کو مستفسرانہ نظروں سے دیکھا، جسکے جواب میں ساحر نے
دائیں ہاتھ کو جنبش دی۔ اور خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا
میں نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ مگر کھڑا وہیں رہا تینوں
چلتے گئے۔ یہاں تک کہ گنجان درختوں کے پیچھے غائب!

بوڑھا ساحر پہلے ہی میری نظروں میں بہت پُراسرار تھا
مگر اس منظر کے بعد تو وہ زیادہ خطرناک، زیادہ خوفناک ہستی معلوم
ہونے لگا۔ اُسکے ساتھ ہی، سنہری بالوں والی دوشیزہ کو دیکھ کر،
مجھے پجاری کے یہ الفاظ یاد آ گئے ــــ "سنہری بالوں والی دوشیزہ
کہاں ــــ"؟ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا۔ کہ یہ سنہری بالوں
والی دوشیزہ، ضرور اس پجاری کی محبوبہ ہے۔ جسے یہ ساحر
کہیں سے لے آیا ہے ــــ مگر یہ نوجوان؟ اسکا جواب
میں کیونکر دے سکتا تھا ــــ؟؟

اب سورج کی شعاعیں بکھرتی جا رہی تھیں۔ رات کے
آغوش میں سویا ہوا ہنگامہ، انگڑائی لیکر بیدار ہو رہا تھا۔
میں مکان میں آیا۔ دل میں اضطراب موجزن تھا۔ دوسرے
دن بھی میں نے دوشیزہ کو دیکھا۔ ایکے اسکے ساتھ صرف
نوجوان تھا جس سے وہ ہنس ہنسکر باتیں کر رہی تھی۔ نوجوان
نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ اور منہ دوسری طرف پھیر
لیا۔

دو دن اور گذر گئے۔ چوتھے دن حسبِ معمول صبح کے
وقت میں ساحل پر ٹہل رہا تھا۔ کہ مجھے دُور دریا میں غوطے
کھاتے ہوئے کسی کا ہاتھ دکھائی دیا، فنِ شناوری میں مجھے
کامل مہارت حاصل تھی۔ اور جوانی کے عالم میں یہ فن میرے لئے
بہت بڑا ذریعہ تفریح تھا۔ میں نے فوراً دریا میں چھلانگ لگا
دی اور تیزی سے تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اگر چند لمحے میں
دیر سے پہنچتا تو وہ شخص یقیناً ڈوب چکا ہوتا۔ خوش قسمتی سے
میں عین موقع پر پہنچ گیا۔ اور کوشش و ہمت سے،
اُسے کنارے تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ جب میں نے
اُسکے چہرے کو دیکھا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ
یہ وہی شخص تھا جسے میں نے ساحر کے ساتھ، اور پھر دوشیزہ کے
ساتھ دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب اُسکے ہوش و حواس
ٹھکانے لگے اُسنے ممنونانہ مجھے دیکھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ
اُس کی نظروں میں شکوک و شبہات کے اثرات تھے۔ اور
ایک اب یہ وقت تھا کہ وہ احسان مندی کا اظہار کر رہا تھا
"حیران ہوں کہ آپ کا شکریہ کیونکر ادا کروں"؟ اُسنے
اُٹھ کر کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ انسانی
ہمدردی کا تقاضا ہے! آپ اگر میری بجائے ہوتے تو یہی
کرتے!"

"یقیناً یہی کرتا ــــ لیکن چونکہ اسوقت آپ نے
یہ فرض ادا کیا ہے، اسلئے تا دمِ واپسیں آپکا شکر گذار رہونگا!
آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اسکا اندازہ صرف
میں ہی لگا سکتا ہوں۔ میرے عزیز محسن! میری موت کے
ساتھ ایک اور ہستی بھی بے مراد دنیا سے رخصت ہو جاتی!
مجھے بچا کر آپ نے دو جانوں کو بچایا ہے!!"

"دو جانیں؟؟" میں نے متعجبانہ پوچھا۔

"ہاں میرے محسن"! اس وقت مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ آپ اپنا دو لتکدہ مجھے بتا دیجئے، میں دو تین گھنٹے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کروں گا۔"

"آپ بخوشی جا سکتے ہیں! رہا میرے مکان کا پتہ، تو وہ دیکھئے ---- بڑا سا مکان!" میں نے اس مکان کا پتہ بتا دیا اور وہ چلا گیا۔

مجھے اپنے مکان میں پہنچے ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ وہی اجنبی ---- میرے مکان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے نیچے جاکر دروازہ کھولدیا اور اوپر آکر ہم دونوں کوچ پر بیٹھ گئے!

"اسوقت میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا" میں نے کہا۔

"لیجئے میں حاضر خدمت ہو گیا۔" اسنے ذرا مسکرا کر جواب دیا ---- "آپکے احسان عظیم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کہ میں آپ کو اپنا سمجھوں۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی مغائرت و اجنبیت نہ رہنی چاہئے۔ میرا راز آپکا راز اور آپکا راز میرا راز ---- ہے! جس شخص نے میری جان بچائی ہے۔ وہ کسی صورت بھی میرے حق میں نقصان پسند نہیں کرے گا۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہے، جو میرے متعلق آپ یہ خیال رکھتے ہیں!" میں نے کہا۔

"میرے محسن! یہ میرا فرض ہے" وہ ذرا ٹھہرا اور پھر نرم و شیریں آواز میں کہنے لگا "جیسا کہ آپ پر ظاہر ہے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کا جواب ہی میں آپ کو دینے لگا ہوں ---- ! میرا نام شہاب ہے۔ اور شمشاد آباد میرا وطن۔ بچپن نہایت آرام و آسائش سے گذرا

کیونکہ میرے والد محترم فوج میں ایک بہت بڑے افسر تھے جب میں جوان ہوا۔ تو انہوں نے سپہ سالار سے مخالفت کی بنا پر استعفٰے دیدیا۔ چونکہ انہوں نے حکومت کی کافی خدمت کی تھی۔ اسلئے مجھے بآسانی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اور میں بہت جلد ترقی کرکے، فوج کے ایک دستے کا افسر بن گیا۔ سپہ سالار مجھ پر بہت مہربان تھا۔ میں اُسکے گھر اکثر جایا کرتا تھا اسی اثنا میں میں نے اسکی اکلوتی لڑکی 'رحیلہ' کو دیکھ لیا۔ عشق کے اندھے دیوتا نے تیر پھینکا، جو میرے سینے کو چیرتا ہوا ایک اور دل کو بھی زخمی کر گیا ---- اور وہ دل ---- نازک دل 'رحیلہ' کا تھا۔ عشق چھپانے سے چھپ نہیں سکتا۔ ہماری 'محبت' بھی بدنام ہو گئی! 'رحیلہ' کے رشتہ داروں نے اس امر کو اپنے حق میں ایک 'ذلت' سمجھا۔ اور انتہائی کوشش کی 'رحیلہ' کو مجھ سے بدظن کر دیں۔ مگر ان کی ظالم کوششوں کو ناکامی ہی اٹھانی پڑی۔ ان کی مخالفتوں نے ہماری محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ دنیا میں صرف ایک شخص تھا۔ جسنے ہماری آرزو کی مخالفت نہ کی۔ اور وہ تھا رحیلہ کا والد۔ اُس نے مرتے وقت بھی اصرار کیا کہ مجھے رحیلہ کا رفیق زندگی منتخب کر لیا جائے۔ مگر بدبخت رشتہ داروں کی ظالمانہ مخالفت نے ہماری آرزوؤں کی پائمالی ہی کو پسند کیا۔ ہم پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ آخر کار میری اور رحیلہ کی صلاح ہوئی کہ ہم دونوں رات کے وقت شمشاد آباد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر کہیں چلے جائیں! ہم اسکے لئے موقعہ کی تلاش میں تھے۔ کہ وہ بوڑھا شخص جسے آپ نے اسدن ہمارے ساتھ دیکھا ہے، مجھے تنہائی میں ملا۔ اور کہنے لگا "بیٹیا! رحیلہ کے ساتھ جو صلاح

تم نے کی ہے۔ وہ نہائت مناسب ہے۔ یہاں تمہاری محبت آہوں اور آنسوؤں ہی میں تڑپتی رہے گی!"

یہ سنکر بہت حیرت ہوئی۔ کیونکہ یہ ارادہ میرے اور رحیلہ کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ —— ہم نے نہائت خفیہ جگہ پر یہ صلاح کی تھی۔ میرے پوچھنے پر اُسنے بتایا کہ وہ ہمارا نہایت ہمدرد ہے۔ اور ہمارے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے واسطے تیار ہے! مختصر یہ کہ ایک رات میرے دروازے پر دستک ہوئی جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ بوڑھا کھڑا ہے۔

"تمہاری آرزو کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ تمہارے مکان کے عقب میں گھوڑے کھڑے ہیں۔ رحیلہ بھی آرہی ہے"

یہ سنکر میں سخت متحیر ہوا۔ میں نے سمجھا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ چند منٹ کے بعد رحیلہ آگئی —— !

ہم تینوں گھوڑوں پر سوار ہوکر یہاں آگئے —— یہ ہے میری زندگی کی داستان!"

"تو آپکے ساتھ اسدن رحیلہ تھی؟"

"ہاں!"

اب آپ بوڑھے ہی کے پاس رہتے ہیں!"

"ہاں بوڑھا بہت مہربان ہے —— اور خدا کرے مہربان ہی رہے!"

یہ الفاظ سنکر میں بے حد متعجب ہوا۔ شہاب بوڑھے کو مہربان سمجھ رہا تھا۔ اور میری نظروں میں وہ نہائت خطرناک انسان —— چند منٹ خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا: "تو صبح کا واقعہ کیونکر پیش آیا؟؟"

"وہ اس طرح، کہ رات میری طبیعت بہت خراب رہی۔ صبح سویرے مجھ سے بوڑھے نے کہا "جاؤ دریا کے کنارے کچھ دیر ٹہل آؤ" میں اور ایک شخص دریا پر آئے۔ اس آدمی نے، جو بوڑھے کا خادم ہے، مجھے کشتی کی سیر کے لئے کہا مجھے کیا انکار ہوسکتا تھا؟ جب ہماری کشتی منجدھار میں پہنچی، تو اس آدمی نے چپو میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے یہ کام تمام عمر میں نہیں کیا تھا۔ اسلئے کشتی چکرانے لگی۔ اس نے چپو جلدی سے پکڑ لئے —— مگر کشتی میں پانی آنے لگا —— اور اسکے بعد وہ واقعہ پیش آیا جو آپ پر ظاہر ہے —— میرا خیال تھا کہ وہ خادم ڈوب چکا ہے۔ مگر وہ بھی بچ گیا"!

"اُسے تیرنے کا طریقہ آتا تھا؟؟"

"میرے پوچھنے پر اُسنے بتایا کہ بہت کم!"

اسکے بعد ایک گھنٹہ تک اور باتیں ہوتی رہیں۔ —— پھر اُسنے صمیمانہ شکریہ ادا کیا۔ تو ہم نے وعدہ کیا کہ ایک دوسرے کی مدد کرینگے۔ اسکے بعد وہ چلا گیا —— !!

دو تین ملاقاتوں کے بعد ہم ایک دوسرے سے بے تکلف دوست بنگئے!!

(۴)

کسدرجہ ہولناک خواب؟ اب بھی مجھے اسکا خیال آتا ہے تو دل لرز جاتا ہے۔ رات کے آخری حصے میں دیکھتا ہوں کہ ساحلِ دریا پر ایک شکستہ کشتی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ دُور سے ایک کشتی تیزی کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کشتی میں کون ہے؟ میں یہ نہیں دیکھ سکتا، ہاں آفتاب کی روشنی میں کسی کے سنہری بال چمک رہے ہیں۔ چند منٹ کے بعد کشتی میرے قریب

آ جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسمیں رحیلہ ایک دلآویز انداز میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اسکے چہرے سے غم و افسردگی کے آثار نمایاں ہیں۔ آنکھوں سے خوف کے اثرات ٹپک رہے ہیں۔ میں اسے بلانا چاہتا ہوں۔ مگر بلا نہیں سکتا۔ ایک قسم کا خوف میری رگ رگ ریشے ریشے پر طاری ہے! ایک طرف شور سنائی دیتا ہے۔ میں اسطرف مڑ کر دیکھتا ہوں۔ ایک اور کشتی آ رہی ہے۔ اسمیں ساحر بیٹھا ہے، جو خونخوار نظروں سے رحیلہ کو دیکھ رہا ہے۔ اسکی کشتی بڑھتی آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ رحیلہ کی کشتی کے قریب پہنچ جاتا ہے —— زور سے دھماکے کی آواز آتی ہے۔ میری متحیر نظریں دیکھتی ہیں۔ کہ ساحر رحیلہ کی کشتی میں کود پڑا ہے۔ رحیلہ ڈر کر ایک کونے میں بیکس زخمی پرندے کی مانند جو شکاری کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ ساحر اپنے لمبے لمبے، خوفناک ہاتھ اُسکے سینے کی طرف بڑھاتا ہے —— اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ اس ظالم کے طویل، ڈراونے اور خون آشام ناخن اسکے سینے کو چیرتے جا رہے ہیں! رحیلہ خون میں تر اور تڑپتی ہوئی، دردناک آوازیں نکالتی ہوئی دریا میں گر پڑتی ہے —— میں چیخ کر بیدار ہو جاتا ہوں۔

سورج کی حدت بکنار کرنیں میرے سینے پر پڑ رہی تھیں صراحی فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ اور میرے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ حالتِ اضطراب میں میرا ہاتھ صراحی سے جا لگا تھا۔ جس سے وہ فرش پر گر پڑی تھی۔ اور میری انگلی بھی زخمی ہو گئی تھی۔ میں نے چارپائی سے اُٹھنا چاہا لیکن خوف نے کچھ اس طرح دماغ پر اثر ڈالا تھا۔ کہ میں خاموش وہیں لیٹا رہا۔ خواب کا ہولناک منظر پھر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ کافی دیر تک میں چارپائی پر لیٹا رہا۔ اور معلوم نہیں کب تک لیٹا رہتا۔ کہ کسی نے نیچے دروازے پر دستک دی میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا شہاب تھا۔

"میں تمہیں سے ملنے والا تھا!" میں نے اپنا اضطرابِ قلبی چھپاتے ہوئے کہا۔

"کیوں خیر تو ہے؟" اُسنے گھبرا کر پوچھا۔

"میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے —— بہت ہولناک خواب!"

ہم اوپر جا کر بیٹھ گئے، اور میں شہاب کو اپنا خواب سنانے لگا۔ میں جب خواب کا آخری حصہ سنا رہا تھا۔ تو شہاب کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ اور وہ نہایت مضطرب دکھائی دیتا تھا۔

"میں اس خوفناک بوڑھے سے بے حد خوفزدہ ہوں" میں نے کہا۔ شہاب کی نظریں صراحی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پر گڑی تھیں!

"اگر کہو تو میں تمہیں اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ سناؤں؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے سر کے اشارے سے آرزو ظاہر کی۔ اور میں نے وہ واقعہ جو دیوی سامون کے مندر میں پیش آیا تھا، اُسے سنا دیا۔

"میں خود بھی اس بوڑھے سے ڈرتا ہوں۔ اور رحیلہ بھی اس سے خوفزدہ ہے۔ اُسنے ہم پر احسان کیا ہے —— سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے"

اُسنے میرے الفاظ سنکر کہا۔

"میں ڈرتا ہوں مبادا تم پر کوئی ناگہانی مصیبت آئے پجاری کے یہ الفاظ سنہری بالوں والوں والی دوشیزہ کوئی گہرا راز اپنے اندر رکھتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

یہ الفاظ سُنکر اُسنے سر جھکا لیا۔ اور پھر یک لخت بول اُٹھا گویا اُسے کوئی فراموش شدہ بات یاد آگئی ہے۔ "کل شام کو ایک دبلا پتلا شخص بوڑھے کے پاس آیا تھا۔ جسے دیکھ کر 'رحیلہ' ڈر گئی تھی۔ میرا خیال ہے وہ شخص 'پجاری' ہوگا!"

شہاب سے 'حلیہ' پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ 'پجاری' کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

"تو اُس نے بوڑھے سے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"چند لمحے تو وہ بوڑھے کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اُسنے کہا" میرے بزرگ! کیا وقت ابھی نہیں آیا؟؟" اسکے جواب میں بوڑھے نے بصورتِ انکار سر کو جنبش دی۔ پجاری نے پوچھا" تو وہ کب آئیگا؟" اُسکی آواز میں مایوسانہ رنگ غالب تھا۔

بوڑھے نے جواب دیا "ابھی انتظار کرو!" یہ سُنکر پجاری خاموشی سے چلا گیا۔ رخصت ہونے وقت اُس نے 'رحیلہ' کو عجب انداز سے دیکھا تھا"!

یہ الفاظ سُنکر میرے دل میں یقین پیدا ہوگیا۔ کہ بوڑھا کوئی سخت فریب کارانہ چال رہا ہے جس سے شہاب اور رحیلہ کی زندگیاں معلوم نہیں کن خطرات میں پڑ جائیں گی!

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں مجھ پر کافی اعتماد حاصل ہوگیا ہے۔ اسلیئے میرا فرض ہے کہ ہر معاملے میں اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق تمہاری مدد کروں۔ اور ہر ممکن قربانی سے کام لوں۔ تم مجھے اپنا رفیقِ صادق پاؤ گے!"

یہ الفاظ میں نے اس وقت کہے جب وہ جانے کے لیئے تیار ہوا ـــــ اُسکے جانے کے بعد میں خیالات کے ہجوم میں غرق ہوگیا۔ میرے دل میں اس بات کا بھی یقین پیدا ہوگیا کہ 'شہاب' کی کشتی الٹ جانے کے معاملے میں بھی 'ساحر' کا ہاتھ تھا ـــ!

میری نگاہ تصورِ مستقبل قریب کے پردے پر کسی خطرہ عظیم کا اعلان شعلوں کے حروف میں پڑھ رہی تھی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کوئی روح فرسا راز منکشف ہونیوالا ہے کوئی خوفناک بھید معلوم ہونے والا ہے۔ بوڑھا ایک تو خود اسرار کی دنیا، اور پھر تازہ واقعات کی تحیر زا پیچیدگیاں! کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہ کتنا بڑا خطرہ آنے والا ہے خون آلود افق پر ستارے قیامت خیز شور پیدا کرتے ہوئے ٹکرانے کے لیئے ایک دوسرے کی طرف برق آسا رفتار کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ اس خیال سے روح لرز رہی تھی!

شہاب کے جانے کے بعد میں نے غسل کیا، لباس بدلا اور اس قسم کے دیگر فرائض انجام دینے میں مصروف تھا۔ کہ شہاب گھبرایا ہوا آیا۔ اُسکی سراسیمہ صورت دیکھ کر مجھے خطرے کے وقوع پذیر ہونے کا یقین ہوگیا۔

"میں برباد ہوگیا ہوں!" اسنے یہ الفاظ اس سراسیمگی کے عالم میں کہے کہ میں بے حد ڈر گیا!

"کیا ہوا؟"

"رحیلہ ـــــ میری رحیلہ [illegible] نہیں ہے"!

"کہاں گئی ؟"

"ادھر بھی وہاں کوئی نہیں —— رشدی! میری جان بچاؤ!"

"وہ کہیں سیر کو نہ گئے ہوں!"

"نہیں، رحیلہ میرے بغیر ایک منٹ کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ کوئی سخت دھوکا ہوا ہے"!

"جس چیز کا مجھے ڈر تھا وہی پیش آئی۔"

"تو اب کیا کیا جائے؟ رشدی!"

"میرے دوست! گھبرانے کی ضرورت نہیں میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ سب سے پہلے تمہاری قیام گاہ پر جانا لازم ہے پھر کہیں اور چلیں گے" میں نے کہا' اور ہم دونوں مکان سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہو کر بوڑھے کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

آتشیں چہرہ آفتاب فضائے بسیط میں چھوٹے چھوٹے بھورے بھورے بادلوں کے درمیان نور کا سیلاب اگل رہا تھا اسکی گرم گرم شعاعیں ریت کے تودوں پر سنہری زنجیروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ اثنائے راہ میں ہم نے ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ یہانتک کہ ہم ساحر کے فراخ و کشادہ مکان میں داخل ہو گئے! سب سے پہلے ایک کمرے میں گئے شہاب نے اسکے کونے کونے چپے چپے پر متجسسانہ نظریں ڈالیں مگر بیسود۔ اسوقت کا منظر عجیب منظر تھا سورج کی کرنیں روشندان میں سے داخل ہو ہو کر اسکی فطرت آلود پیشانی' اسکے بکھرے ہوئے سیاہ بالوں پر روشنی کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں پڑ رہی تھیں' اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ادھر جاتا تھا اور کبھی اُدھر۔ اسکے بعد ہم دوسرے کمرے میں گئے۔ وہاں سے مایوس ہو کر ہم تیسرے کمرے میں پہنچے! وہاں بھی کچھ نہیں تھا ہم اس میں سے باہر نکلنے لگے تھے کہ شہاب کی نظر کمرے کے آخری گوشہ میں ایک چھوٹی سی کھڑکی پر پڑی۔ وہ تیزی سے وہاں پہنچا —— دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ اُسنے اندر جھانک کر دیکھا۔ اور عجلت اندر چلا گیا۔ میں بھی تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اب ہم دونوں ایک فراخ کمرے میں تھے۔ ہمارے دل میں یہ خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہاں بھی کمرہ ہے! مدہم سی روشنی وہاں آرہی تھی۔ یکایک مجھے فرش پر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں اسکے پاس جا کر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ شہاب نے اس کے بازوؤں کو ہلایا۔ اس کے سر کو جنبش دی۔ مگر فضول اُسنے کوئی حرکت نہ کی ہم نے سمجھ لیا کہ یہ مردہ پایا گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر ہم نے پھر کمروں کو دیکھا شہاب بار بار مجھے چلنے کو کہتا تھا۔ حالات کے اس روح فرسا تغیر واقعات کے اس حوصلہ شکن انقلاب نے اسکی عجیب حالت کر دی تھی۔ حیرت' مایوسی اور خفگی کے ملے جلے جذبات نے اسے ایک ایسی سطح پر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں انسان سے انتہائی بہیمانہ حرکت کے ارتکاب کا بھی امکان ہو سکتا ہے! میں اسے برابر تسلی دے رہا تھا۔ مگر وہ ساحر کے تعاقب کرنے پر مصر تھا۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ساحر رحیلہ کو لیکر کہاں گیا ہے؟"

"اب کیا ہوگا؟ —— وہ شیطان ساحر ——!"

فرط خفگی کے باعث وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا!

"ہم اسی شخص کے پاس جاتے ہیں! —— میرا خیال ہے وہ مردہ نہیں ہے"! میں نے شہاب سے کہا۔

"وہ مردہ نہیں ہے؟" شہاب نے متعجبانہ کہا۔

"ہاں، میرا یہی خیال ہے۔" ہم دونوں پھر وہیں پہنچے وہ شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اسکے جسم کو جنبش دی اور یہ دیکھ کر مجھ پر مسرورانہ حیرت طاری ہوگئی کہ وہ شخص زندہ ہے۔ کیونکہ اُسنے حرکت کی۔ میں نے اسکے بازوؤں کو زور سے ہلایا، کچھ دیر کے بعد اُسنے آنکھیں کھولدیں، اور ہمیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

"وہ کہاں ہیں؟" شہاب نے اسکے شانوں کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"کون؟" اجنبی نے پوچھا۔

"رحیلہ ـــــ ساحر ـــــ"

اجنبی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شہاب کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دو تین منٹ تک تو وہ شخص ہمارا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بیہوشی کے اثرات ابھی تک اسکے دماغ پر مسلط تھے۔ آخر کار اُسے ہوش آیا اور اُسنے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں، حوصلہ کرو!"

"جلدی کہو!" شہاب نے بیتاب ہوکر کہا۔

"صبح بیچاری آیا تھا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں جن سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ اسکے بعد ساحر نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے ہی مکان میں گئے ہیں۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ـــــ مکان یہاں سے بہت دور ہے، جنوبی سمت پہاڑوں کے پہلو میں۔"

یہ سنکر شہاب جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

"ذرا ٹھہرو شہاب!" میں نے اُس سے کہا۔ اور اُس شخص سے پوچھا "تم کون ہو، اور ساحر کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"جس مکان کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میں اس میں تنہا ہوں۔ زناو میرا نام ہے، اور میں ساحر کا خادم ہوں! رات کے ابتدائی حصے میں ساحر مجھے یہاں لے آیا تھا۔ معلوم نہیں میرے یہاں لانے سے اسکا کیا مقصد تھا؟" میرے سوال پر اُسنے کہا۔

"اگر ساحر کو معلوم ہوگیا کہ میں نے آپکو کچھ بتایا ہے تو وہ یقینی طور پر مجھے ہلاک کر دے گا۔!"

میں نے اُسے حوصلہ دیا، اور اخفائے راز کا وعدہ کرکے ہم نیچے اترے۔ اس شخص نے نیچے آکر ہمیں منزل مقصود کا راستہ بتادیا اور ہم گھوڑوں پر سوار ہوکر روانہ ہوگئے۔ شام کیوقت کہیں جاکر ہم نے پہاڑوں کے پاس ایک بڑا سا شکستہ مکان دیکھا۔ ہم گھوڑوں سے اترے اور اسکا دروازہ ڈھونڈنے لگے کئی منٹ گذر گئے اور ہمیں پراسرار مکان کا دروازہ نظر نہ آیا۔ مکان کی دائیں دیوار میں چند گز کے فاصلے پر ایک کھڑکی نظر آرہی تھی۔ شہاب کے دماغ میں ایک تجویز آئی، اُسنے گھوڑا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ اور اس پر کھڑے ہوکر زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ ایک پٹ کھل گیا ـــــ پھر دوسرا بھی کھل گیا۔ اور وہ بیدھڑک اندر چلا گیا۔ میں نے بھی اسکی پیروی کی ـــــ اردگرد تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ ایک طرف کو بڑھایا کسی نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔ میں نے پکارا "شہاب" یہ دیکھ کر کہ یہ میرا ہاتھ ہے۔ شہاب نے اُسے چھوڑ دیا۔ اور ہم

دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم نیچے اتر رہے ہیں۔ آخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یکایک نسوانی آہ و زاری کی آواز ہمارے کان میں آئی "میری رحیلہ" شہاب نے کہا اور جلدی سے ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رحیلہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگیا۔ بیچاری عورت کا چہرہ مرجھا چکا تھا۔ آنکھیں فرطِ غم سے اندر دھنسی ہوئی تھیں بمشکل ہم اسی کھڑکی تک پہنچے۔ اب نیچے اترنے کا سوال تھا شہاب نے نیچے چھلانگ لگا دی ـــــ گھوڑے کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ اور اس طرح میں اور رحیلہ نیچے اترنے میں کامیاب ہو سکے!

اصرار کر کے میں انہیں اپنے مکان میں لے گیا۔ رحیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر شادابی حاصل کر گیا ـــــ!!!

دو دن گذر گئے۔

ایک دن شام کے وقت رحیلہ کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی، کہ وہ لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی اپنے محبوب سے جا لپٹی "خوفناک بوڑھے نے مجھے دیکھ لیا ہے ـــــ" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ہم نے اُسے تسلی دی۔ باوجود انتہائی کوشش کرنے کے ہم ساحر کو کہیں نہ دیکھ سکے ـــــ چند دن سکون کے ساتھ گذر گئے!

اسی اثنا میں بدقسمتی سے رحیلہ بیمار ہو گئی۔ اسکی بیماری کی وجہ وہ خوف تھا، جو ہر وقت اسکے دل پر چھایا رہتا تھا۔ ایک دن ہم چند گھنٹوں کے لئے باہر گئے جب واپس آئے تو دیکھا کہ رحیلہ بستر پر مردہ پڑی ہے!

---

(۵)

کس قدر تحیر خیز! کس قدر دردناک واقعہ! دو تین گھنٹے بیشتر ہم جس گل اندام حسینہ کو چلتے پھرتے، بولتے چالتے دیکھ رہے تھے۔ کتنا ستم تھا کہ اب وہ ہماری نظروں کے سامنے زندگی کی حرارت سے محروم، بے حس و حرکت پڑی تھی، شہاب نے اسے زور کے ساتھ پکارا۔ اسکے شانوں کو، سر کو، ہاتھوں کو ہلایا، مگر اب اسکی دلنواز محبوبہ پتھر کی ایک مورتی تھی، حس و حرکت سے محروم، برف کی ایک ڈلی تھی۔ خونِ حیات سے تہی دامن! اسکا سفید چہرہ کوچ کے بازو پر یوں نظر آرہا تھا۔ گویا گلاب کا ایک افسردہ پھول شاخِ نخل سے ٹوٹ کر ایک خاردار ٹہنی پر اٹکا ہوا ہے، وہ رومال جسے وہ کاڑھ رہی تھی، اُس کے پہلو میں پڑا تھا۔ کمرے میں سب کچھ اسی حالت میں تھا جس حالت میں ہم چھوڑ گئے تھے کسی قسم کا تغیر، کسی نوع کی تبدیلی واقعہ نہیں ہوئی تھی۔ شہاب نے اپنے دونوں ہاتھ اسکے سینے پر رکھ دیئے، اور اسے زور زور سے پکارنے لگا۔ آہ وہ کتنا دردانگیز منظر تھا۔

"قسمت کو یہی منظور تھا، ہم کیا کر سکتے ہیں"، میں نے کہا۔

"میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ـــــ معاملہ کیا ہے، رحیلہ بولتی کیوں نہیں؟" شہاب نے گھبرا کر کہا۔

"اب صبر سے کام لو ـــــ شہاب!"

"مگر رحیلہ جاگتی کیوں نہیں؟ اتنی گہری نیند کیوں سو رہی ہے؟؟"

آہ بدنصیب انسان موت کو گہری نیند سمجھ رہا تھا۔ بہتہ

خوفناک حقیقت اس پر منکشف ہوگئی۔ اسکے باوجود اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر انسان سب کچھ سمجھنے کے باوجود، کچھ نہیں سمجھ سکتا!

"تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ دردناک واقعہ رونما ہوچکا ہے۔ مگر صبر سے کام لو۔ رحیلہ دنیا سے رخصت ہوچکی ہے۔ اب اسکی نعش پر چیخنا چلانا، دیوانوں کی مانند کپڑے پھاڑنا عبث ہے صبر کرو میرے عزیز دوست!" میں نے کہا۔

"رحیلہ دنیا سے رخصت ہوچکی ہے؟؟ کیا کہہ رہے ہو؟؟ یہ گہری نیند ——— رحیلہ! رحیلہ!!" اسنے چیخ چیخ کر کہا۔

"یہ ایسی گہری نیند ہے جسکے بعد بیداری ممکن نہیں!"

"کیوں نہیں؟ رحیلہ جاگے گی، اسے جاگنا چاہئے،

——— اسکے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔!"

"میرے دوست! قسمت کو یہی منظور تھا یہ نہیں۔ اس کے بغیر بھی زندہ رہنا ہوگا۔"

کافی دیر تک میں اُسے تسلی دیتا رہا اگر میں اسکے پاس نہ ہوتا تو یقیناً فرطِ صدمہ سے وہ جان کھو دیتا۔ میں اور میرے دو دوستوں نے رحیلہ کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کئے۔ بدنصیب عورت کی نعش کو تاریک قبر میں اتارتے وقت شہاب اس طرح چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کہ سنگدل سے سنگدل انسان بھی رونے پر مجبور ہوجائے۔ وہ دردناک منظر میں تا دمِ واپسیں بھی نہیں بھول سکتا۔ اس بیچارے کے دل کو کتنا صدمہ ہوا، اسکا اندازہ انسانی طاقت لگانے سے قاصر ہے۔ رحیلہ کی ناگہانی موت ایک معمّا تھی۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ ساحر ہی کا ظلم ہے۔ مگر ایک تو وہ مفقود الخبر ہوچکا تھا۔ اور شہر کے چند لوگوں نے اس کی نعش کو بھی ساحل پر دیکھا تھا۔ دوسرے یہ کہ رحیلہ کی نعش آٹھ گھنٹے تک ہمارے سامنے رہی تھی، اور اس دوران میں ہم نے اسے ہوش میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ آخر کار لوگوں کے ساتھ مجھے بھی یہی یقین کرنا پڑا کہ رحیلہ کی موت دل کی حرکت بند ہوجانے سے ہوئی ہے۔ شہاب ایک دن مشکل میرے ہاں ٹھہرا۔ پھر کہیں چلا گیا۔ جانے سے پیشتر میں نے باصرار اس سے پوچھا کہ کدھر جارہے ہو، مگر اس نے میرے سوال کا یہی جواب دیا "میں دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں بقیہ زندگی گذاروں گا!" میں پھر تنہا تھا۔ تنہا اور مغموم!!

اسکے جانے کے بعد میں اسی کمرے میں گیا۔ جہاں بدنصیب شہاب کی زندگی ہمیشہ کے لئے تاریک ہوگئی تھی۔!

دوسرے دن میں جب اپنے ایک دوست کے ہاں سے آرہا تھا کہ میں نے نادو کو دیکھا۔ جلدی سے اس کے پاس پہنچ کر اپنا ہاتھ اسکے شانے پر رکھ دیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے ٹھٹکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"مجھ سے تمہارا کیا کام؟" اسنے آہستہ سے کہا۔

"نادو! ایک دفعہ پہلے بھی تم نے مجھ پر احسان کیا تھا، اب ایک احسان اور کرو، میں تمام عمر ممنون رہونگا۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں ——— ؟ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا!"

"تم مجھے کچھ نہ کچھ بتا سکتے ہو، دیکھو میری التماس کو رد نہ کرو۔"

اسنے چاروں طرف دیکھا پھر کہا، "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ مجھے تم لوگوں پر رحم آرہا ہے۔!"

"ساحر واقعی مرچکا ہے؟!"

"ساحر زندہ ہے!"

"اگر وہ زندہ ہے تو لوگوں نے کس کی نعش دریا کے کنارے دیکھی ہے!"

"ساحر زندہ ہے!"

"تو خدا کے لئے بتاؤ رحیلہ کی موت میں اسکا ہاتھ ہے؟؟"

"رحیلہ ــــــــ!"

یکایک اسکا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اسکی آنکھیں پاس ہی درخت کی ایک ہلتی ہوئی شاخ پر لگی تھیں۔ بغیر ایک لفظ کہے، وہ ایک طرف چلا گیا اور غائب ہوگیا۔ میں اس شاخ کے قریب گیا، وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔!!

(۶)

'نادو' کی گفتگو کا ہر لفظ، ہر حرف میرے لئے ایک ناقابلِ حل چیستان، ایک پُراسرار معمّا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور تو اور، اسکا ٹھٹک ٹھٹک کر باتیں کرتے ہوئے ایک طرف دیکھ کر، ایک دم عالمِ خوف میں خاموش ہوجانا، اور پھر منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر تیزی سے چلے جانا کچھ کم تعجب انگیز امر نہیں تھا۔ میں جب اپنے مکان میں پہنچا، میرا دل سخت حیرت میں تھا، واقعات پر جتنا غور کرتا جاتا، خوف، مجھ پر طاری ہوتا جاتا۔ نادو کے چند الفاظ نے مجھے اس پُراسرار دنیا میں پہنچا دیا تھا، جہاں دیمع و غیر محدود فضاؤں میں، خوفناک بھیانک غیر انسانی صورتیں سمع خراش شور پیدا کرتی ہوئی، آگ کے مہیب شعلوں پر رقص کر رہی تھیں۔ میں دوبارہ گھر سے نکلکر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اور جب وہاں سے لوٹا تو رات نصف منزل طے کرچکی تھی، دلچسپ مشاغلِ تفریح میں حصہ لینے کی وجہ سے کسی حد تک خوف کے اثرات

میرے دل سے دور ہوچکے تھے، اور اس امر کا احساس کر کے کہ ایک 'مبہم خوف' سے متاثر ہوکر رات کے وقت مکان پر جاتے ہوئے ڈرنا، بزدلی ہے، میں تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ اردگرد چاند کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے درختوں سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے ــــ کہ میں مکان کے قریب آگیا۔ اب چاند، بادل سے نکل آیا تھا۔ اور اس کی روشنی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ دفعتہً مجھے اس چیز کا احساس ہوا کہ کوئی میری طرف آ رہا ہے۔ ہلکی سی آواز میرے کان میں آئی۔ میں کمزور دل انسان نہیں ہوں مگر اس وقت ڈرنے لگا۔ سوکھے ہوئے پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی، میں نے اپنا ہاتھ ایک درخت کے تنے پر رکھ دیا، اور ادھر ادھر دیکھا ــــ مگر کچھ نظر نہ آیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر رحیلہ کی قبر کا پتھر چمک رہا تھا، میں آگے قدم اُٹھانے ہی لگا تھا، کہ ایک طرف، چند گز کے فاصلے پر ایک سایہ حرکت ہوا نظر آیا۔ وہ سایہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میرے سامنے آگیا۔ چاند کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ سایہ انسانی پیکر میں تبدیل ہوگیا ہے۔ میری طرف اسکی پشت تھی، اس لئے میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا ــــ! کچھ دور ایک اور سایہ حرکت کر رہا تھا، چند لمحوں کے بعد وہ اسکے قریب آپہنچا۔ پہلے نے رُخ بدلا، خوف کی لہر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے دل و دماغ میں دوڑ گئی ــــ میرے سامنے بوڑھا ساحر اور پجاری کھڑے تھے یہ منظر دیکھ کر میں ڈر گیا۔ اور درخت سے چمٹ گیا، ساحر نے آہستہ سے اپنا دایاں ہاتھ پجاری کے شانے پر مارا اور دونوں میرے گھر کی طرف چلنے لگے۔ کیا ان کا مقصد مجھے ہلاک کرنا ہے؟

یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا اور یہ دیکھ کر کہ میں ان کے قبضے سے باہر ہوں۔ خوف کا کچھ حصہ زائل ہوگیا۔ رحیلہ کی قبر کے پاس پہنچکر دونوں ٹھہر گئے۔ بوڑھے نے قبر پر ہاتھ رکھدیا، پھر جلدی جلدی اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالکر کچھ چیزیں نکالیں۔ اور دونوں ان سے قبر کے پتھر کو اکھیڑنے لگے۔ فضا میں ضربوں سے آہستہ آہستہ آواز پیدا ہونے لگی۔ چند منٹ کے بعد قبر کا پتھر ہٹ گیا۔ بوڑھا ساحر قبر میں داخل ہوا، پجاری بھی دہانے پر جھک گیا۔ ایک منٹ اور گذر گیا۔ اب ساحر کفن میں ملبوس نعش ہاتھوں پر اٹھائے قبر سے نکل رہا تھا۔ اس روح فرسا منظر کو دیکھ کر میرا دل دہل گیا پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ نیم بیہوشی کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی نیم بیہوشانہ حالت میں میں نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ پجاری اور ساحر نعش کو اٹھائے تیزی کے ساتھ جارہے ہیں۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں غائب ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ہوش آیا۔ تو گھر کی طرف جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی میں واپس چلا گیا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا۔ کہ ساحر اور پجاری میرے مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور قدم اندر رکھتے ہی مجھے ہلاک کردینگے ـــــ!

صبح کے وقت جب لوگ چلنے پھرنے لگے۔ میں رحیلہ کی قبر کے پاس پہنچا۔ پتھر اپنی جگہ رکھا پڑا تھا لیکن اسکے نیچے مٹی اکھڑی ہوئی تھی۔ یکایک میری نظر ایک چیز پر پڑی، میں نے اسے اٹھالیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہتھیار تھا۔ رات کا واقعہ جسے میں خوابِ پریشاں سمجھنے لگا تھا۔ اب "حقیقت" اختیار کرچکا تھا ـــــ!!!

(۷)

میرے دل میں رحیلہ کی قبر کھودنے اور رات کے ہولناک واقعے کی تصدیق کا خیال پیدا ہوا، مگر ایک مبہم خوف کے زیر اثر میری یہ خواہش پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ بوڑھے ساحر کی موت کا یقین آبادی میں ہر شخص کو ہوچکا تھا اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا، جسنے اس کی موت کی افواہ کے بعد اسے کہیں دیکھا ہو۔ ان حالات میں لوگوں کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرکے، قبر کو کھودنا خود کو تختۂ تضحیک بنانے کے مترادف تھا۔

دو دن اور گذر گئے۔ اور اس دوران میں میں کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا۔ اچانک ایک عجیب افواہ میرے کان میں آئی تمام شہر میں دیوی ساموؔ کے غائب ہوجانے پر اظہار تعجب کیا جارہا تھا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا واقعہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا تعجب برابر بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے مندر میں جانے کا ارادہ کیا، اور دن ڈھلے روانہ ہوگیا۔ لوگ جوق در جوق جارہے تھے، اور ہر شخص اس تحیرزا واقعے پر، اپنے اپنے خیال کے مطابق روشنی ڈال رہا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ دیوی ساموؔ لوگوں کی سیاہ کاریوں کی وجہ سے چلی گئی ہے۔ اور عنقریب کوئی بہت بڑی مصیبت کوئی بہت بڑا عذاب آئیگا میں مندر میں گیا۔ جو کچھ سنا تھا، بالکل صحیح تھا۔ مورتی غائب تھی۔ پجاریوں کے چہرے رنج وغم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر مندر سے باہر نکلا اور کشتی میں بیٹھ گیا۔ رات کی تاریکی بتدریج پھیلتی جارہی تھی۔ ابر آلود فضا نے بسیط پر مغموم چاند اس طرح نظر آرہا تھا۔ گویا ایک مرجھایا ہوا پھول ہمگیں موجوں کے تھپیڑے

کھاتا ہوا، دریا میں بہہ رہا ہے! میرا دماغ عجیب دغریب
خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کتنے ہولناک خواب میں عالم
بیداری میں دیکھ چکا تھا؟؟

کشتی سے اترنے کے بعد بجائے اپنے مکان کی طرف
جانے کے، میں ساحرہ کے مکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے ارد
گرد تاریکی ہی تاریکی مسلط تھی۔ میں نے بیبی لیمپ نکالا اور اسکی
روشنی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ اب ساحرہ کا مکان میرے
سامنے تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ میں ایک لمحہ توقف
کئے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ پہلے زینے پر قدم رکھا۔ روشنی نظر آئی
دائیں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سوراخ میں چراغ
جل رہا ہے۔ اوپر سے ہلکی سی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ مگر اسکے
باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اوپر کئی خونخوار ہستیاں چیخ چیخ کر
انسانی زندگی کی مصیبتوں کا تذکرہ کر رہی ہیں۔ پہلے کمرے سے
ہوکر میں دوسرے کمرے میں پہنچا اور ایک گوشے میں کھڑے ہوکر
چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی متنفس نہیں تھا۔ ایک
طرف شمعدان سے روشنی نکل نکل کر کمرے کی فضا میں حلقہ در
بنا رہی تھی۔ آخر میں اُس کھڑکی کے پاس پہنچ گیا، جسکا تذکرہ ہو چکا
ہے۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا، اور اندر سے ایک مغموم آواز بلند
ہو رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا، روشنی کم تھی۔ ڈر ڈر کر، جھجک جھجک کر،
سانس کو روکتے ہوئے میں نے اپنا چہرہ پٹ کے ساتھ لگا دیا۔
اور اندر دیکھا۔ اُف کس قدر تحیر زا منظر ——؟؟

کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ ایک چھوٹے سے چوبی میز
کے اوپر دیوی ساحرہ کی مورتی کھڑی تھی۔ اسکے سامنے پجاری
کھڑا تھا۔ اسکا ایک ہاتھ مورتی کے ایک ہاتھ میں تھا اور دوسرا
اسکے سینے پر۔ چراغ کی مدہم روشنی انہیں احاطہ کئے ہوئے
تھی۔ پجاری کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اور وہ مغمومانہ
آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میری دیوی! میں نے پچیس برس تک تیری
پوجا کی —— دل و جان سے تیری خدمت
کی۔ اب وقت آگیا ہے کہ تو مجھے اپنی خدمت
کا معاوضہ دے۔ جب میری مراد حاصل ہو جائیگی
اسوقت میں کتنا خوش قسمت ہوں گا؟ میری
دیوی —— میری ساحرہ!!"

اس نے ہاتھ وہاں سے ہٹا لئے اور مورتی کے
پاؤں پر سر رکھ کر آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ دو تین منٹ کے
بعد وہ اُٹھا مورتی کے سامنے کھڑا ہوگیا اور منہ ہی منہ میں الفاظ
دہرانے لگا۔ اسکے بعد اسنے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ میں نے چہرہ
وہاں سے ہٹا لیا، ذرا سی دھمک کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ کھڑکی
کی طرف آنے لگا —— "بزرگ باپ!" اسکے ہونٹوں سے یہ الفاظ
نکلے، اور اُسکے ساتھ ہی اُسکا پاؤں کھڑکی سے باہر نکلا۔ میں نے
دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ وہ کھڑکی سے نکلکر
اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "بزرگ باپ!" اسنے دوبارہ کہا۔ اور جب
جواب نہ پایا، تو قدم اٹھانے لگا۔ میں دروازے پر پہنچ چکا تھا۔
اُسے آتے ہوئے دیکھ کر میں تیزی کے ساتھ دروازے میں
سے نکلا، اور عجلت سے چلنے لگا، دروازے تک وہ میرے پیچھے
پیچھے آیا۔ مگر مجھے دیکھ نہ سکا۔ دروازے میں سے نکل کر میں مکان
کے عقب میں پہنچا —— سفید بادلوں میں پھیکا پھیکا،
زرد زرد چاند کفن میں لپٹی ہوئی نعش کے چہرے کی مانند دکھائی

دے رہا تھا۔ ہر طرف وحشتناک تاریکی چھائی ہوئی تھی ہوا کے جھونکے اردگرد کے سوکھے ہوئے سائیں سائیں کرتے ہوئے درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر ایک عجیب منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر رہے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا فضائے بسیط میں بیتابانہ، مضطربانہ چکر لگاتی ہوئی زخم نصیب روحیں اپنے دکھوں کی کہانی بیان کر رہی ہیں۔

میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ چاند بادلوں سے نکل چکا تھا۔ اور اسکی مدہم روشنی پھیل رہی تھی۔ یکایک پاس ہی سے ایک ہلکی سی درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ میں ذرا آگے بڑھا آواز پھر آئی۔ ایسا محسوس ہوا گویا کوئی سوتے ہوئے بول پڑ رہا ہے! ایک فوری جذبے کے زیر اثر میں نے چند قدم تیزی سے اٹھائے، اور اردگرد دیکھا۔ دریا کے کنارے مٹی کے تودے پر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اسنے آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ اور سر جھکا ہوا تھا۔ درخت کے دو تین پتے اس پر گرے گھبرا کر اسنے ہاتھ اٹھا دئے۔ اسکا چہرہ صاف طور نظر آ رہا تھا ــــ یہ نادو تھا۔

میں عجلت اسکے پاس پہنچا۔ اور اسکے شانے پر ہاتھ رکھ دئے مضطربانہ حرکت کے ساتھ وہ پیچھے ہٹا۔

"اب مجھ پر رحم کرو ــــ رحم!"

"نادو!" میں نے کہا۔

"تم کون ہو؟"

یہ منظر دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ میں اسکے سامنے کھڑا ہوں، پھر بھی وہ مجھے پوچھ رہا ہے!

"نادو! میں وہی شخص ہوں جو اسدن شہاب کے ساتھ تمہارے پاس آیا تھا۔ اور اسکے بعد بھی تم سے ملا تھا۔ میرا نام "رشدی" ہے۔ اور تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ــــ آنکھیں کھولتے کیوں نہیں؟؟"

"تم نے میری آنکھوں کو دیکھ لیا! رشدی!"

"آنکھیں کھولتے کیوں نہیں؟"

"میں اندھا کر دیا گیا ہوں ــــ میں اب دیکھ نہیں سکتا ــــ"

"کسنے تم کو اندھا کیا؟؟"

"اسی نے!"

"ظالم ساحر نے؟ افسوس میں کیا دیکھ رہا ہوں!"

"میرے ساتھ تو جو کچھ ہوا وہ ہوا! تم اپنی جان بچاؤ۔ خوفناک ساحر تمہاری تاک میں ہے، جاؤ اپنی جان بچاؤ!"

"ڈرو نہیں نادو! میں اس ظالم سے سمجھ لونگا"

"کیا کہہ رہے ہو تم ــــ خوفناک ساحر کی طاقتوں سے تم واقف نہیں۔ مجھے اسنے اندھا کر دیا ہے تمہارے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کریگا!"

یہ کہتے ہوئے اسنے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

"لیکن تمہارے ساتھ یہ واقعہ پیش کیوں آیا؟؟"

"اسدن ساحر نے مجھے تم سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا ــــ اور ایک آدھ بات بھی سن لی تھی۔ یہ اسکی سزا ہے۔ تم بھی اپنی زندگی خطرے میں ڈال رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے ــــ ورنہ اسی زمین دوز کمرے میں تمہارا بھی یہی حال ہوگا۔"

"یہ تو دریا کا کنارہ ہے ــــ!" میں نے کہا۔

"دریا کا کنارہ ——— آہ کتنی مہیب سزا ——— آنکھوں سے محروم کرکے، جان لینا —کتنی خوفناک سزا ہے ؟ ؟"

"نادو! اس ظالم کے ظلم اب ختم ہو جائیں گے اس کی ہلاکت اب قریب آچکی ہے !"

"کیا کہہ رہے ہو تم رشدی! وہ بیحد ظالم شخص ہے۔ اور نہایت خوفناک طاقتوں کا مالک ہے! تم جاؤ اور اپنی جان بچاؤ"

"تمہیں چھوڑکر تو میں نہیں جاسکتا ۔"

"تو کیا کروگے۔ میری طرح اندھا ہونا چاہتے ہو۔ رشدی! مجھے چھوڑ دو ۔!"

اور رحیلہ ———" میں آگے کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ نادو نے میرے الفاظ کاٹ کر کہا ۔ اس قسم کی باتیں مجھ سے نہ پوچھو۔"

"اچھا یہاں کچھ نہ بتاؤ ——— چلو میرے ساتھ !"

"کہاں ؟"

"میرے ہاں !"

"نہیں ——— یہ نہیں ہوگا ۔"

"تمہیں چلنا ہوگا نادو!" یہ کہکر میں نے اُسکے ہاتھ پکڑ لئے کافی اصرار کے بعد وہ چلنے پر راضی ہوا ۔

(۸)

میں نے ایک ہاتھ میں جیبی لیمپ اور دوسرے میں نادو کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکے سمع خراش شور پیدا کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ درخت سائیں سائیں کر رہے تھے چاند تاریک بادل میں چھپ گیا تھا۔ آسمان کے گوشے میں ایک تنہا ستارہ یوں نظر آرہا تھا گویا شام صحرا میں دور کسی فقیر کی کٹیا میں ایک دیا روشن ہے۔ نادو کو میں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔ تاہم وہ سخت خوفزدہ تھا۔ اُسے تسلی دینے کے باوجود مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ کوئی بڑی مصیبت ہم پر آنے والی ہے۔ میں اسے اپنے مکان میں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ کہیں اور جانے پر مصر تھا۔ میں نے اُسکی رائے عمل کرنا ہی مناسب سمجھا اور دریا کے دوسرے کنارے اپنے ایک دوست کے مکان میں جانے کا ارادہ کیا۔ ساحل پر کوئی کشتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اسلئے میں اپنے مکان کی طرف چلنے لگا۔ کیونکہ میری اپنی کشتی مکان کے سامنے بندھی رہتی تھی۔ ابھی تک ہم نے ان پُر اسرار واقعات کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا، جو چند دن سے پیش آرہے تھے۔ میں نے نادو کے ہاتھ کو دبایا اور کہا۔

"نادو! تم ساحر کے متعلق کچھ بھی بتانا نہیں چاہتے ہو؟"

"میں کیا بتاؤں؛ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائیگا۔ ساحر اسقدر خوفناک قوتوں کا مالک ہے کہ انسانی ذہن اُن کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ افسوس تم اسکے راستے میں حائل ہو رہے ہو۔ اُس کی قوت کے سامنے تمہاری ہستی ایک حقیر تنکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ——!"

"ممکن ہے ایسا ہو" میں نے کہا۔ "جو کچھ میں پوچھنا چاہتا ہوں تم اُسکا جواب دو۔"

"تم خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہو!"

"نادو! تم یہ الفاظ بار بار کیوں کہہ رہے ہو؟ ساحر نے کئی ہستیوں کو تباہ و ہلاک کیا ہے۔ اب موقعہ آگیا ہے۔ کہ اس سے بدلہ لیا جائے۔ ہماری قوت حقیر ہونے کے باوجود اس سے انتقام لینے میں کامیاب ہوگی۔ یہ میرا یقین ہے!"

میں نے پُرجوش لہجے میں کہنا شروع کیا "میری زندگی

کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔ اور وہ ہے بوڑھے ساحر کے پُراسرار افعال و اقوال کو معلوم کرنا، لوگوں کو اسکے پنجہ آہنی سے بچانا! کیا تم اس کام میں میری مدد نہیں کرسکو گے؟؟"

میرے الفاظ سنکر اُسکی حالت میں بھی تغیر پیدا ہوا "تم جو کچھ کہہ رہے ہو بالکل درست ہے۔ اتنا خوفناک و ظالم شخص آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا"

"ان باتوں کو چھوڑ دو پہلے مجھے یہ بتاؤ رحیلہ کہاں ہے"

نادو آہستہ آہستہ کہنے لگا "میں نے اسدن بھی نہیں بتانا چاہا تھا کہ رحیلہ مری نہیں ــــ وہ ابھی زندہ ہے۔ اُس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا یہ میں نہیں جانتا۔ جس دن سے 'ساحر' نے میری آنکھیں نکال دی ہیں۔ اس دن سے میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکا لیکن ایک بات ضرور ہے، رحیلہ کی زندگی محفوظ ہو!

"رحیلہ کی زندگی محفوظ ہے"؟؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں"

"اور محفوظ ہی رہے گی؟؟"

"اسکے متعلق میں کچھ نہیں جانتا" !

"اور یہ واقعات جو اسکے ساتھ پیش آئے کیا راز اپنے اندر رکھتے ہیں؟؟"

"صرف ایک راز ــــ اور وہ یہ ہے بوڑھا ساحر مدت سے سنہری بالوں والی دوشیزہ کی تلاش میں تھا۔ اُسے رحیلہ ملی، مگر شہاب کے ساتھ۔ دوشیزہ کو 'شہاب' سے علیحدہ کرنے کے واسطے جو کچھ کیا، تم اس سے بیخبر نہیں ہو 'شہاب' کی کشتی کا اُلٹ جانا ــــ رحیلہ کو پہاڑوں والے مکان میں لے جانا۔ پھر اُسے مُردہ بنا دینا۔ اور آخر میں اُسے قبر سے نکالنا، یہ تمام واقعات 'شہاب' سے رحیلہ کو جدا کرنے کی ہولناک کوششیں تھیں"

"اور اب وہ کہاں ہے؟"

"ایک علیحدہ مکان میں ــــ جس کی تمہیں خبر نہیں، اور نہ جس کی مجھے خبر ہے"!

"تمہیں اُس کی خبر نہیں؟"

"بالکل نہیں ــــ اُسے ساحر کے مکان سے لیجایا گیا ہے۔ کہاں یہ میں نہیں جانتا"

"وہ پہاڑوں والے مکان میں ہوگی"

"نہیں ــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اُسے دیکھ لیا ہے ــــ ساحر کسی کو اپنے کاموں میں مخل نہیں دیکھ سکتا۔ جو شخص مخل ہوتا ہے یا تو اسے مار ڈالتا ہے، یا بالکل علیحدہ کر دیتا ہے"!

"یہ بتاؤ کہ رحیلہ مرگئی تھی۔ پھر قبر سے لیکر اسے زندہ کیونکر کیا گیا۔ اتنا عرصہ کیا وہ بے ہوش ہی پڑی رہی"

"نہیں وہ بے ہوش نہیں تھی مردہ تھی۔ اس کی روح ساحر نے نکال لی تھی ــــ اور پھر قبر سے نکالنے کے بعد اُسے زندہ کر دیا گیا ــــ ساحر اسی قسم کی خوفناک قوتوں کا مالک ہے"!

اس سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ یہ واقعہ سنکر میرے دل و دماغ پر خوف طاری ہوگیا ــــ لیکن میں نے دل کڑا کیا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو نادو"!

"نہیں ــــ ابھی کشتی نہیں آئی۔"؟

"بس چند قدم اور چلو!"

اچانک مجھے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

"وہ آگیا ——؟" نادو نے میری خاموشی اور مضطربانہ حرکت سے اندازہ لگا کر گھبرائے ہوئے کہا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ حوصلہ رکھو!"

ہم چلنے لگے۔ چند قدم طے کرکے میں نے پھر اپنی دائیں طرف دیکھا۔ چند سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ مگر اتنی جلدی غائب ہوگئے کہ میں نے اس منظر کو آنکھوں کا دھوکا سمجھا۔ چونکہ کشتی کے پاس پہنچ چکے تھے اس لئے اس میں بیٹھ گئے۔ اور کشتی چلنے لگی۔ ایک مبہم خوف میرے دل پر چھا چکا تھا۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی مصیبت ہم پر ٹوٹنے والی ہے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے ایک اور کشتی آرہی تھی۔ میں خطرے کا اندیشہ تھا وہ پیش آرہا تھا۔

"تم خاموش کیوں ہوگئے؟" نادو نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں!"

"تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا!"

کشتی قریب آتی جا رہی تھی۔ اور میرا ڈر بڑھتا جا رہا تھا۔

"مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ یہ کیا معاملہ ہے!"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"جو معاملہ ہے" —— "میں نے تم سے پہلے کہا تھا۔ کہ خطرہ آنے والا ہے۔ تم نے میری بات نہ مانی!"

"ایک کشتی آرہی ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔ میں مقابلہ کرونگا!"

"تم مقابلہ نہیں کرسکتے!"

اب ہماری کشتی وسط دریا میں پہنچ چکی تھی۔ ہماری اور دوسری کشتی کے درمیان تین چار گز کا فاصلہ تھا۔

"نادو!" میں نے اُسکے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "مصیبت آگئی ہے لیکن میں اسکا مقابلہ کرونگا۔ کیا تم میری آخری آرزو پوری نہیں کروگے؟"

"کیا —— کہو"

"رجیلہ کہاں ہے؟"

"پہاڑوں والے مکان میں ——"

"اس کے ساتھ کیا ہوگا؟"

"اُس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ کل نصف رات کو اسکا دل ——"

یکایک ایک بہت بڑا پتھر ہماری کشتی میں گرا اور اسکی آواز پتھر کی دھماک میں ڈوب گئی۔ اِبنیشتر اسکے کہ وہ الفاظ دوبارہ کہتا، دو لحیم وشحیم شخص، بچاری اور ساحر کود کر ہماری کشتی میں آگئے۔ میں تیزی سے اُٹھا۔ اندھے کی حالت اُس وقت قابلِ رحم تھی۔ اُسنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اُسکی طرف بڑھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ ایک لحیم و شحیم شخص نے زور کے ساتھ میرے سینے پر گھونسہ مارا۔ میں لڑکھڑا کر گرا، پھر اٹھا۔ مگر دوسری بار بھی میرا یہی حشر ہوا۔ اب میں نے مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے منہ میں خون آگیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا —— مردے کی مانند میں تختے پر بےحس و حرکت پڑ گیا۔ انہوں نے کشتی الٹ دی۔ میں پانی کے نیچے جانے لگا۔ نیم بےہوشی کی کیفیت تو مجھ پر طاری تھی، مگر اپنی موجودہ حالت کا اندازہ

لگانے سے میں قاصر رہا۔ میں نے ڈبکی لگائی۔ اور دور جا کر انتہائی
کوشش سے آہستہ آہستہ تیرنے لگا۔!!

(۹)

جب میں کنارے پر پہنچا، میرا جوڑ جوڑ عضو عضو ٹوٹ
رہا تھا۔ سینے میں ناقابل برداشت درد محسوس ہو رہا تھا۔ اور
پاؤں کا تو یہ حال تھا کہ ایک قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ سر کے پچھلے
حصے میں، چپو کے لگنے سے سخت چوٹ آئی تھی اور ابھی تک زخم
میں سے خون بہہ رہا تھا میں نے رومال زخم پر باندھ دیا۔ اور ایک
بڑے سے پتھر کے ساتھ سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک میں
وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھا۔ اور بڑی مشکل سے قدم اٹھانے لگا۔ حالت
یہ تھی کہ ایک ایک قدم پر محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے دماغ میں نشتر
چبھو دیا ہے۔ آخر کار بمشکل تمام گھر پہنچا اور پہنچتے ہی لیٹ گیا
درد لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ فرط نقاہت اور درد کی
شدت سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بے ہوشی
تو دور ہو گئی۔ لیکن درد میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ پہلو بدلنا بھی
میرے لئے مشکل ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا جسم آتشیں
زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ تمام دن اسی حالت میں گذر گیا
شام کے وقت میں کہیں حرکت کرنے کے قابل ہو سکا۔ گذشتہ
واقعات ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔
بالخصوص بدنصیب اندھے کی دردناک موت کا واقعہ دل کو بیقرار
کرنے لگا۔ کافی دیر تک میں انہی خیالات میں غرق رہا۔ یکایک
نادو کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "رحیلہ"
کی پراسرار زندگی کا سوال میرے پیش نظر تھا۔ ممکن ہے رحیلہ زندہ
ہو ـــ پھر اسے بچانا میرا فرض نہیں ہے۔؟" یہ سوال میرے
دل میں پیدا ہوا۔ مگر اس حالت میں ساحر کے مکان میں جانا
اور ساحر کے کام میں مداخلت کرنا انتہائی مصیبت کو دعوت
دینے کے مترادف تھا تاہم ایک جذبہ تھا۔ جو مجھے ہر مصیبت
ہر تکلیف کے برداشت کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ اور وہ جذبہ تھا
راز جوئی۔ اسکے علاوہ رحیلہ کی زندگی بچانے کی تمنا بھی میری
سعی تجسس کو تقویت دے رہی تھی۔ میں بستر سے اٹھا، اور
مکان کے نیچے آیا۔ گھوڑے کی لگام پکڑی اور اس کے ساتھ
آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہر طرف
خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی تھم گئی تھی۔ میں گھوڑے کی
پشت پر بیٹھ گیا ـــ اور روانہ ـــ

ایک مضبوط ارادے کی قوت، ایک قوی جذبے کی طاقت
جسمانی تکلیفوں اور دنیاوی کشمکشوں کے اثرات، مختصر سی
دیر کے لئے تو ضرور زائل کر دیتی ہے۔ اسوقت میرا بھی یہی
حال تھا، رازجوئی کا جذبہ، رحیلہ کی زندگی کے بچانے کا خیال
میرے دل و دماغ پر پوری قوت کے ساتھ چھایا ہوا تھا۔ جسمانی
تکالیف، اس خطرناک اقدام کا ہولناک انجام، بوڑھے ساحر
کی ہیبتناک شخصیت کی ہیبت خیزیاں، الغرض میں ان تمام
چیزوں سے بے پروا ہو گیا تھا ـــ فضا میں میرے
گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گونج رہی تھی۔ آخر کار میں منزل
مقصود تک پہنچ گیا۔ پہاڑوں کے پاس ساحر کا مکان کھڑا
تھا۔ میں نے گھوڑا درخت سے باندھ دیا۔ اب مشکل یہ تھی۔ کہ
اوپر کیونکر جاؤں ؟ گھوڑے کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے
کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہونے کا خیال میرے دل میں
پیدا ہوا۔ مگر ایک مبہم سا خوف دل پر طاری ہو گیا۔ بغیر

کچھ معلوم کئے۔ خطرے میں پڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ اسدن شہاب نے بھی یہی اقدام کیا تھا۔ تاہم اس اقدام کے پسِ منظر کوئی اور جذبہ تھا۔ عشق کے راستے میں عقل کی پختہ کاری و دور اندیشی کو ذرہ بھر اہمیت حاصل نہیں ہے میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ میرے پاس سے کوئی گذرا میں درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ کچھ دور جاکر اُسنے چند پتے اٹھائے اور پھر واپس چلنے لگا۔ اور میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ مکان کے عقب میں چلا۔ چند قدم طے کرکے میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ جہاں اُسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ آدمی ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے غائب ہوگیا۔ کچھ دیر میں وہاں کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ چٹان کی طرف چلا۔ مجھے یقین تھا کہ اس چٹان کے پیچھے مکان کو جانے کا راستہ ہے۔ چٹان کے پاس پہنچکر میں جھکا، راز جوئی کے جذبے نے اکسایا اور میں چٹان کے پیچھے جاکر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا چار پانچ سیڑھیوں کے بعد میں گھپ اندھیرے میں تھا۔ میں نے جیبی لمپ کو روشن کیا۔ یہ ایک زمین دوز کمرہ تھا، جسکے وسط میں بڑے بڑے ستون کھڑے تھے۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا تھا جگہ زیادہ زیادہ نکلتی آتی تھی۔ حیران تھا۔ کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ آخر کار پلٹا، اور دیوار کے ساتھ واپس آنے لگا۔ ایک جگہ پہنچ کر کافی روشنی دکھائی دی۔ وسط میں ایک خلا سے روشنی آرہی تھی۔ میں نے سمجھ لیا کہ مکان کے نیچے کی جگہ ہے۔ اسی اثنا میں میری نظر ایک اونچی سی جگہ پر پڑی۔ جلدی سے وہاں پہنچا معلوم ہوا کہ یہ چبوترہ ہے۔ اور اسکے بعد سیڑھیاں چبوترے پر پہنچکر میں نے سیڑھی پر قدم رکھدیا۔ دل دھڑکنے لگا ــــــ! میں نے دل کڑا کیا اور چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ آخری سیڑھی پر

پہنچ گیا۔ آگے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دیوار میں ایک دیا جل رہا تھا۔ آگے نشیبی راستہ تھا۔ دائیں طرف ایک اور کمرہ تھا، دروازے میں میں نے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ چند قدم طے کرکے، میں ایک اور دروازے پر پہنچ گیا۔ اسکا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر سے 'ساحر' کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اندر دیکھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں روشنی تھی، اور باقی حصہ نیم تاریکی میں تھا جس گوشے میں روشنی تھی وہاں 'دیوی ساموا' کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اور 'پجاری' اسکے سامنے سجدے میں گرا ہوا تھا۔ میں نے جرأت کرکے دروازے میں قدم رکھا، اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میری نظر ایک گوشے میں گئی ــــــ اور ایسا محسوس ہوا گویا میں کوئی وحشتناک خواب دیکھ رہا ہوں۔ دیوار کے ساتھ 'رحیلہ' کا مرجھایا ہوا چہرہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ میں قدم آگے بڑھاتے ہی لگا تھا کہ 'ساحر' کی خونخوار نظریں میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ وہ ایک طرف کھڑا تھا۔ خوف سے میں بے حس و حرکت کھڑا ہوگیا۔ آہ فطرتِ انسانی کی کمزوری!

'رحیلہ' کا چہرہ چھپ گیا۔ روشنی زیادہ مدہم ہوگئی!! میں نے اُسے دیکھنے کی کوشش کی مگر بے سود!! پجاری اُٹھا، اور یہ الفاظ اسکے لبوں سے نکلنے لگے۔

"میری ساموا اب وقت ہے کہ میری آرزو
پوری ہو۔ میری ساموا! ساموا!!"

یہ کہتے ہوئے وہ 'مورتی' کے پاؤں سے چمٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد 'ساحر' مورتی کے پاس آیا۔ اور اُسنے آہستہ سے کہا۔ "بیٹا!

یہ سنکر پجاری اُٹھ بیٹھا۔

"تمہاری آرزو پوری ہونے والی ہے —— خاموش کھڑے رہو!"

"میری آرزو —— میری آرزو پوری ہو جائیگی ——"

پجاری نے مورتی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اور خاموش ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ساحر تاریک گوشے میں چلا گیا۔ دو منٹ تک خاموشی طاری رہی پھر فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی۔ پجاری سجدے میں گر پڑا تھا۔ اور اُس کی ہلکی ہلکی آواز فضا میں گونج رہی تھی —— مگر چیخ —— میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

ساحر ہاتھوں میں کچھ لئے ہوئے مورتی کے پاس آیا۔ میں نے دیکھا کہ اُسکے ہاتھوں میں پتے ہیں۔ اور اس پر کوئی سُرخ سی چیز —— !!

پجاری زور زور سے کچھ کہنے لگا۔ اسکے الفاظ میری سمجھ سے باہر تھے۔ پھر وہ اُٹھا اور انگیٹھی میں سے جلتی ہوئی لکڑیاں لیکر مورتی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مورتی کے چہرے کے آگے دھواں اور شعلے تھے —— !! میں دو قدم آگے بڑھا۔ اب ساحر اور پجاری کی خوفناک آوازیں گونجنے لگیں۔ میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ دونوں کے ہاتھ پُراسرار حرکت کرنے میں مشغول تھے۔ وہ حرکت کیا تھی؟ دھوئیں اور شعلوں کی وجہ سے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پجاری نے لکڑیاں انگیٹھی میں رکھدیں۔ اور پھر واپس آکر پجاری کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد دونوں سجدے میں گر پڑے اسکے بعد جو منظر میں نے دیکھا وہ میں تادمِ واپسیں نہیں بھول سکتا اُف کس قدر دہشتناک واقعہ !!

مورتی میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ اسکے بازو آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے لگے۔ فرطِ خوف سے میں کانپنے لگا۔ پجاری جلدی سے اُٹھا۔ اُسکے لبوں سے نعرہ مسرت بلند ہوا اور وہ پُراسرار مورتی سے لپٹ گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر یہ خواب نہیں تھا۔ میری زندگی کا سب سے زیادہ تحیّرزا، سب سے بڑھ کر حیرت خیز واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

مورتی برابر حرکت کر رہی تھی، اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اُسکے لبوں کو حرکت ہوئی اور فضا میں ایک شیریں آواز گونجی !!

فرطِ خوف و حیرت سے میرے پاؤں ڈگمگانے لگے میں دیوار کے ساتھ سہارا لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہیبتناک انسان جسے دنیا ساحر کہتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن کو سن رہا ہے! اور ابھی اسکے خونخوار پنجے میرے سینے کی طرف بڑھیں گے۔

پجاری جلتی ہوئی لکڑیاں اٹھائے رقص کر رہا تھا۔ کمرے میں روشنی پھیلتی جاتی تھی۔ میری زندگی انتہائی خطرے میں تھی۔ اور یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ کایک مجھے محسوس ہوا کہ میں گر رہا ہوں۔ دھم کی سی آواز آئی —— اور پھر —— ساحر کی خوفناک خونخوار نظریں۔ میرے چہرے کے قریب تھیں۔ اسنے مجھے پاؤں کی ٹھوکریں لگائیں۔ اور گرجتے ہوئے لہجے میں کچھ کہا۔ اسکے بعد کئی طاقتور ہاتھوں نے مجھے اٹھا لیا۔ اور بے جانے کیسے میں بے ہوش ہو گیا —— !!

جب میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میں مکان کے نیچے ستون کے ساتھ مضبوط رسے سے باندھ دیا گیا ہوں! اوپر

خلا میں سے روشنی میرے پاس مختصر سی جگہ پر پڑ رہی تھی۔ باقی حصہ تاریکی میں تھا۔ سامنے کے ستون ہیبت ناک اژدہوں کی مانند پھنکارتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میرا جسم اس مضبوطی اور سختی سے جکڑا گیا تھا۔ کہ ذرہ سی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا اُف کس قدر مہیب سزا تھی؟ میں نے نظریں اوپر اٹھا کر خلا کو دیکھا۔ "ساحر" کی خونخوار، خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ملعون انسان! میرے کام میں مداخلت کرنے کی یہ سزا ہے!"

اسنے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور اپنے آپکو مطعون کرنے لگا کہ کیوں یہ اقدام کیا۔؟

بھوک اور پیاس کی شدت، فرط نقاہت اور اپنے دردناک انجام کا تصور، آہ اس وقت میں کتنی مصیبت میں تھا قلم اس وقت کی مصیبت کا اظہار کرنے سے یکسر قاصر ہے!

وقت گذرتا گیا اور تکلیف بڑھتی گئی دل چاہتا تھا۔ کہ موت جلد آجائے۔ تاکہ اس ناقابل برداشت مصیبت سے نجات ملے۔ اب بھی اس حالت کا خیال کرتا ہوں تو بے اختیار کانپ جاتا ہوں "ساحر" بار بار آکر خلا میں سے مجھے خوفناک انجام کی خبر دیتا میں کہنا چاہتا "کہ مجھے جلد ہلاک کر دے" مگر میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔

اب دن یا رات اسکا امتیاز کرنے سے قاصر تھا۔ ہر آنیوالا لمحہ میری تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔ اسوقت جبکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دو منٹ کے بعد میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایک نرم و نازک ہاتھ میرے شانے پر لگا۔ دو تین لمحوں کے بعد ایک حسین پیکر میرے سامنے تھا۔ یہ حسین پیکر، دیوی سامو تھی۔۔۔ زندہ، حسین و جمیل عورت!!

"تم کتنی مصیبت میں ہو؟" اسنے شیریں آواز میں کہا

میں نے اپنی زبان باہر نکالی۔ وہ وہاں سے چلی گئی چند منٹ کے بعد واپس آئی۔ اُسکے ایک ہاتھ میں گلاس تھا۔ اور دوسرے میں جلتی ہوئی لکڑی۔ گلاس اُس نے میرے منہ سے لگا دیا۔ مجھ میں ذرا سی قوت پیدا ہوئی پھر اسنے جلتی ہوئی لکڑی سے میرے رسے کو آگ لگا دی ۔۔ دو تین منٹ کے بعد میں آزاد تھا اور وہ سنہری بالوں والی حسین و جمیل مگر پُر اسرار عورت مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سامو! سامو!!"

پجاری کی آواز اوپر سے آئی ۔ "سامو" چلی گئی۔

میں باہر نکلا اور چلنے لگا۔

گھوڑا بھوکا، پیاسا، درخت سے بندھا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس خیال سے کہیں "ساحر" دیکھ نہ لے۔ اور میں پھر کسی جانگداز مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں، میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گیا۔ کافی دور جانے کے بعد میں اترا۔ گھوڑے کو چشمے میں سے پانی پلایا۔ اور پھر روانہ ہو گیا۔ جب میں گھر پہنچا میرے ریشے ریشے، رگ رگ میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں تمام جسم جکڑے رہنے کی وجہ سے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ سینے پر تو ہاتھ بھی نہیں رکھا جاتا تھا۔ سر سے خون بہہ کر گردن پر جم گیا تھا۔ ایک دوست کی تیمارداری نے مجھے مرتے مرتے بچا لیا۔ چند دن گذر جانے کے بعد کہیں جا کر میں چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا۔ جسمانی تکلیف میں تو کمی واقع ہوئی مگر ذہنی اضطراب لمحہ بھر چین سے نہیں دیتا تھا۔ واقعات

نے کچھ اس طرح کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کہ میں عجیب کشمکش میں تھا حیرت خیز سے حیرت خیز واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پیش آچکا تھا۔ اور سب سے زیادہ حیرت ناک واقعہ دیوی ساموٗ کا زندہ ہونا تھا۔ ایک بے جان، بے حس و حرکت، سنگ مرمر کی مورتی کا چلنا، پھرنا، بولنا، چالنا، اور مسکرانا! اف کتنا تعجب خیز امر تھا! اسکے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ ساحر ایسی خوفناک قوتوں کا مالک ہے جنہیں ذہن انسانی تصور بھی نہیں لا سکتا۔ میں دیر تک انہی خیالات میں غرق رہا۔ جب رات کے وقت بستر پر سویا، تو بھی واقعات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ایک واقعہ بار بار میرے ذہن میں آتا۔ بار بار ذہن میں آکر بیتاب کرتا۔ بعد وہ واقعہ اسوقت پیش آیا تھا۔ جبکہ میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا یعنی ساموٗ کا مجھے پانی پلانا، میرے رسے کو جلانا اور میری زندگی بچانا۔۔۔!! جب اسنے گلاس میرے منہ سے لگایا تھا اس وقت وہ کتنی خوبصورت، کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی؟

ساموٗ۔۔۔

حسین ترین عورت، مگر اسکے ساتھ نہایت پُر اسرار!

جب اُسنے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر، مجھے سیاہ لانبی لانبی پلکوں کے نیچے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا تو ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی تھی اُسکے سُرخ رخساروں پر بکھرے ہوئے سنہری بال کتنے دلآویز منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر رہے تھے؟ مجھے شاید اس پراسرار عورت سے محبت ہوگئی ہے! میں نے دل میں کہا۔ اور بیتاب ہو کر کروٹ بدلی! ساموٗ کا مسکراتا ہوا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا!

ایک دن اور گزر گیا لیکن یہ عجیب و غریب جذبہ میرے دل کی گہرائیوں میں ترقی کر گیا مجھے یقین ہوگیا کہ یہ بےتابی ساموٗ کی محبت کے باعث ہے لیکن جب یہ خیال آیا کہ چند دن ہی ہوئے مرتے مرتے بچا ہوں، اور دیوی ساموٗ کا زندہ دیکھنا بھی فریب نظر ہے، تو ذہن گذشتہ واقعات دہرانے لگا۔ بار بار غور کرنے کے بعد واقعات دہرانے کے بعد بھی میں اس خیال کو رد نہ کر سکا کہ ساموٗ کو میری نظروں نے زندہ دیکھا ہے۔ رحیلہ کے ساتھ کیا کیا گیا؟ شاید یہ رحیلہ ہی ہو مگر رحیلہ اور ساموٗ کی صورتوں میں بہت فرق تھا گو دونوں کے بال سنہری تھے تاہم اُن میں کسی قسم کی مشابہت نہیں تھی۔ اچانک مجھے وہ الفاظ یاد آگئے جو اندھے "نادر" نے کشتی میں کہے تھے "رحیلہ کا دل" افسوس میں آگے کچھ نہ سن سکا معلوم نہیں یہ کتنا بڑا راز تھا بچپن میں میں نے سُنا تھا کہ انسانی دل دیوی کے سامنے پیش کرنے سے آرزو پوری ہو جاتی ہے، اور یہاں کونسی آرزو تھی؟ دیوی کا زندہ ہونا۔۔۔! ممکن ہے رحیلہ کا دل ساموٗ کے سامنے پیش کیا گیا ہو اور وہ اسی دل کی گرمیٔ حیات سے زندہ ہوگئی ہو! یہ خیالات ایک ساتھ میرے دماغ میں آئے، اسی عالم استغراق میں میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو وہی خطرناک جذبہ کافی ترقی حاصل کر چکا تھا، اور وہ جذبہ کیا تھا؟ ساموٗ کی محبت!!

یہ ساموٗ کی محبت ہی تھی جسنے مجھے اس مہلک مقام پر جانے کے لئے اکسایا! میں گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب میں ساحر کے مکان کے پاس پہنچا۔ جب گھوڑے کو باندھ رہا تھا کہ میری نظروں نے دور ایک شعلہ دیکھا! میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ ایک دو منٹ

کے بعد "ساموؔ" جلتی ہوئی لمبی لمبی لکڑیاں، ہاتھوں میں اٹھائے اچھلتی، کودتی، سامنے کے میدان میں آگئی۔ میں آگے بڑھ کر جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ حسین ساحرہ عجیب انداز سے رقص کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹھہر گئی۔ اسکی لکڑیاں آدھی سے زیادہ جل چکی تھیں۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر دائیں جانب آگ بلند ہوئی۔ میں حیران تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کہ وہاں سے پجاری، جلتی ہوئی لکڑیاں لئے آگے بڑھا۔ ساموؔ نے وہ لکڑیاں پھینک دیں دوسری لکڑیاں لے لیں۔ اور پھر اپنے شغل میں مشغول ہوگئی کیسا عجیب نظارہ تھا۔ جو شخص خود جلتی ہوئی لکڑیاں اٹھا کر، یاد کے طور پر دیوی کے سامنے ناچا کرتا تھا، اب اسکے سامنے اسکی معبودہ اُسے خوش کرنے کے واسطے ناچ رہی تھی!!!

وہ لکڑیاں بھی نصف سے زیادہ جل گئیں۔ اُسنے لکڑیاں پھینک دیں۔ اور مسکراتی ہوئی پجاری کی طرف آئی پجاری نے آگے بڑھکر اسے آغوش میں لے لیا۔

"میری محبوبہ ساموؔ" پجاری کے لبوں سے نکلا اور اُسکے ہونٹ، ساموؔ کے ہونٹوں کی طرف بڑھنے لگے! اور ــــــ پھر پیوستہ ہوگئے۔ ساموؔ نے اپنے ہونٹ علیحدہ کر دئے۔ اسکے چہرے پر آزردگی کے آثار نمایاں تھے۔ پجاری نے ہاتھ چھوڑ دئے۔ ہلکی سی تھرتھری آواز مجھے یہ کہتے ہوئے سنائی دی۔

"بوڑھے ہونٹ"!

"ساموؔ" ایک طرف کو چلنے لگی، پجاری بھی اُسکے پیچھے پیچھے روانہ ہوگیا۔ وہ چلتے گئے۔ اور میں جھاڑیوں میں سے نکل کر انہیں دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے، تو میں نے ادھر اُدھر دیکھا، سامنے کا منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ ساحر خوفناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ گھوڑے کو کھولا۔ اور اسپر سوار ہوکر روانہ ہوگیا۔!!

مکان کے قریب آکر میں گھوڑے سے اترا۔ اور چلنے لگا۔ یکایک رجیلہ کی قبر کے پاس مجھے ابھری ہوئی چیز دکھائی دی۔ بعجلت وہاں پہنچا۔ رجیلہ کی قبر کا پتھر علیحدہ کھڑا کیا ہوا تھا اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں میں نے قبر کے اندر دیکھا، وہاں چند اینٹوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت میں ایک جذبۂ بے اختیار کے زیر اثر، جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا، رجیلہ کی قبر کے پاس پہنچا۔ وہ اسی حالت میں تھی جس حالت میں میں ایک دن پیشتر اسے دیکھ چکا تھا۔ پتھر ایک طرف پڑا تھا۔ اکھڑی ہوئی اینٹیں دوسری جانب اور اُنکے درمیان ایک خوفناک گڑھا۔ میں نے بیبی لمپ روشن کرکے نہایت احتیاط کے ساتھ اُس پُر اسرار گڑھے میں نظر ڈالی اینٹوں کے علاوہ درخت کے چند پتے بھی اب نظر آرہے تھے۔ انکے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں چند منٹ وہیں کھڑا رہا، ہجوم خیالات میں غرق!! حیرت ناک واقعات کے تسلسل نے مجھے اس سطح پر پہنچا دیا تھا۔ جہاں تحیرزا سے تحیرزا واقعہ بھی انسانی ذہن پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتا۔ میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا تھا، بے جان، بے حس و حرکت سنگ مرمر کی مورتی کا زندہ ہونا، مدفون نعش کا قبر میں سے لے جایا جانا ــــ اور ابھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اُن سے بڑھ کر تعجب انگیز و محیر العقول واقعات رونما ہونے والے ہیں ــــ!!

جب کافی تاریکی پھیل گئی۔ تو میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا

ہؤا مکان کو چلنے لگا۔ ہوا کے تیز و سرد جھونکے درختوں سے ٹکرا کر اس طرح شور پیدا کر رہے تھے گویا ایک زخمی شیرنی مسموم تیر پہلو میں لئے چنگاڑ رہی ہے۔ فضائے بسیط میں سیاہ بادل مصر قدیم کے حبشی غلاموں کی مانند وحشیانہ رقص کر رہے تھے۔ ایک سیاہ بادل کے پاس مرجھایا ہؤا افسردہ چاند اس طرح نظر آرہا تھا گویا ایک بدقسمت عورت ماتمی لباس میں ملبُوس، ہاتھوں میں چراغ پکڑے رات کی تاریکی میں ٹھوکریں کھاتی، گرتی پڑتی اپنے شوہر کے مرقد کی طرف جا رہی ہے!

میں گھر جا کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور باہر دیکھنے لگا وہاں بیٹھے ہوئے۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ میرے دل میں 'ساحر' کے مکان میں جانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ 'ساحر' کا حسین وجمیل، دلآویز و سحرزا چہرہ میری آنکھوں کے آگے پھرنے لگا۔ میں بعجلت مکان سے نیچے اترا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر 'ساحر' کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب میں 'ساحر' کے مکان سے کچھ فاصلے پر گھوڑے سے اتر رہا تھا اسوقت یہ خیال کہ آج کی رات ایک ہولناک ترین واقعہ رونما ہونے والا ہے یقین کی قوت حاصل کر چکا تھا۔ مکان کے پہلو میں عظیم الہیئت پہاڑ بزبانِ خاموشی میرے یقین کی تائید کر رہے تھے۔ گھوڑے کو باندھ کر میں مکان کے عقب میں پہنچا۔ ابھی چٹان کے پاس بھی نہیں پہنچا تھا کہ پاس ہی میری نگاہوں نے کسی شخص کو دیکھا میں ایک طرف ہو گیا، اُس شخص کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ یکایک اُسنے رُخ میری طرف کیا۔ میں نے چاند کی مدہم روشنی میں دیکھا کہ وُہ 'شہاب' ہے ——!!

قریب جا کر میں نے اُسکے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔

'شہاب'!

'شہاب' نے میری طرف دیکھا، غصے سے اسکی آنکھیں خونفشاں نظر آرہی تھیں۔

"رشدی! تمہیں کچھ خبر ہے؟" اسنے بلند آواز سے کہا۔

"آہستہ سے بولو۔" میں نے انگلی لبوں پر رکھتے ہوئے کہا "موقعہ کی نزاکت کا خیال رکھنا چاہیئے"

"تم نہیں جانتے کیا ہؤا ہے؟؟"

"کہو، کوئی اور گل کھلا ہے؟"

"اس قدر ظلم —؟"

"محبوبہ کی موت انسان کے لئے سب سے بڑا ظلم ہے!"

"یہی نہیں بلکہ اس کی نعش بھی قبر میں نہیں ہے—! سنتے ہو رشدی!

"تم نے اس کی قبر کھود دی ہے؟" میں نے متعجبانہ پوچھا۔

"ہاں —— سخت بیتاب ہو کر میں اس کی قبر پر گیا۔ اور اس کی قبر کھود ڈالی —— مگر اس کی نعش —— اس کی نعش کہاں گئی —— اسے کون لے گیا؟؟"

"میں نے اُسے ساحر کے پاس زندہ دیکھا ہے!" میں نے بے اختیارانہ کہدیا۔ "دفن کرنے کے بعد اُسے زندہ تو میں نے دیکھا تھا۔ مگر کیا وہ اسوقت بھی زندہ تھی؟ اسکے متعلق مجھے کیا خبر ہوسکتی تھی؟

'زندہ —— کون؟؟ میری رمیلہ؟؟!' یہ کہتے ہوئے 'شہاب' مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"ابھی سب کچھ معلوم ہو جائیگا!"

"کیا — ؟؟"

" اتنا مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہاب!"

شہاب وحشیانہ طور پر مکان کی طرف جانے لگا۔

"شہاب!" میں نے جلدی سے اسکا بازو پکڑ لیا" مکان میں جانے کا راستہ بھی تمہیں معلوم ہے؟؟"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میں اندر چلا جاؤنگا — کسی نہ کسی طرح!"

" ذرا ٹھہرو مجھے راستہ معلوم ہے۔ صبر سے کام لو۔ اس طرح بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔!"

"تو چلو — !"

اسوقت شہاب عجیب حالت میں تھا۔ محبت میں انسان کیا کچھ نہیں ہو جاتا؟ میں نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا، اور چٹان کے عقب میں جا کر ٹھیرا۔ لمپ روشن کیا اور اسکے آگے سیڑھی پر قدم رکھا اضطراب و ہیجان کے باعث وہ بار بار مجھسے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اور مجھے تیزی کے ساتھ چلنے کے لئے کہتا۔ سیڑھی کے بعد اب زمین دوز کمرہ آچکا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کافی دور تک چلے گئے مگر اوپر جانے کی سیڑھیاں نہ ملیں۔ افسوس میں راستہ بھول گیا تھا۔ ہمارے آگے روشنی کا مدہم سا حلقہ نور تھا۔ اور دائیں بائیں خوفناک تاریکی، ہیبت ناک خاموشی۔!!

شہاب نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر میں نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ آخری حد تک پہنچنے کے بعد ہم دونوں مڑے — یکایک ایک طرف روشنی نظر آئی شہاب اپنا ہاتھ چھڑا کر جلدی سے وہاں پہنچا۔ میں بھی اس کے پیچھے وہاں گیا۔ ہم دونوں خلا کے نیچے تھے۔ وہی جگہ جہاں مجھے ستون کے ساتھ جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا۔ اور جہاں میری نگاہوں نے ایک خواب جمیل کو انسانی پیکر میں دیکھا تھا۔ مجھے قریب ہی ستون کے پاس کوئی چیز پڑی ہوئی دکھائی دی۔ میں فوراً اسکے پاس پہنچا۔ اور جیبی لمپ کی روشنی میں ایک نہائت لرزہ خیز منظر دیکھا۔ "رحیلہ" کی نعش خاک پر پڑی تھی۔ اُسکے سینے میں بڑا سا شگاف تھا — !! اف یہ ہولناک منظر!!

شہاب دیکھتے ہی نعش سے لپٹ گیا

اس منظر نے تمام بکھری ہوئی کڑیوں کو ملا دیا۔ ساحرہ کو "رحیلہ" کی نہیں "رحیلہ" کے دل کی ضرورت تھی کیونکہ میں اندھا نادو یہی کہنا چاہتا تھا۔ اس بدنصیب عورت کے دل ہی نے بے جان مورتی میں زندگی پیدا کی تھی! میں نے شہاب کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ برابر اپنی مردہ محبوبہ کی بے نور مگر حسرت بداماں آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"بدنصیب دوست! اٹھو! قسمت کو یہی منظور تھا!"

شہاب نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اور خاموش رہا۔

"شہاب! اب اٹھو۔ قسمت نے ہمیں کیا کچھ نہیں دکھایا؟؟"

"میری رحیلہ کی نعش — سینہ — ؟؟"

"ہاں۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری محبوبہ مرگئی تھی — اور اب بھی مردہ حالت میں ہے۔!" "یہ تمام کارروائی اس شیطان کی ہے — میں اُس کی ہڈیاں چبا ڈالونگا —" اس کی خونفشاں آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اُسنے "نعش" کو اٹھا لیا "میں ابھی اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا

اتنا ظلم —— ؟؟؟"

میں نے اسکا دامن پکڑا، مگر وہ دامن چھڑا کر تاریکی میں غائب ہوگیا۔ پھر دھم کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا وہ گر پڑا ہے۔ اسلئے اسطرف بڑھنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایکدم دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں بعد ازیں میں دو لحیم و شحیم آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ چار پانچ اور آدمی آرہے تھے وہ مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر مجھے لے جانے لگے۔ موت کی ہولناک تصویر میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں "ساحر" کی خونخوار نظروں کے سامنے تھا۔ خلا کے پاس "ساحر" کھڑا تھا اور اسکے پاس پجاری خلا میں دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بدبخت انسان! تو ابھی زندہ ہے؟" ساحر نے مجھے دیکھ کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری آخری آرزو" پجاری نے ملتجیانہ نظروں سے ساحر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" ساحر نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی پشت پر رکھ کر کہا۔ "تمہاری آخری آرزو کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔"

پھر اُسنے مجھے گھور کر دیکھا "حقیر ہستی! یہاں آکر بیٹھ جا۔"

یہ سُنکر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ خوف نے میرے لب سی دئے تھے۔ پجاری للچاتی ہوئی نظروں سے میرے بازوؤں اور سینے کو دیکھنے لگا۔

"میری آخری آرزو ۔"

وہ ابھی فقرہ ختم کرنے بھی نہیں پایا تھا۔ کہ "شہاب" کو تین چار آدمی پکڑے ہوئے اوپر لائے۔

"تم پھر آگئے شہاب! تمہاری رشیدہ مرچکی ہے۔ اور یہ صدمہ تمہارے لئے کافی تھا۔ مگر تم اپنی جان بھی گنوانا چاہتے ہو۔ آج تمہاری یہ آرزو بھی پوری کردی جائے گی۔"

"شیطان! کمینے —— !!" شہاب نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ساحر نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ اور کہا۔ "خاموشی سے یہاں کھڑے رہو۔ تمہارا خاتمہ قریب ہے۔"

"میرا خاتمہ کرنے سے پہلے میں تمہاری ہڈیوں کو چبا ڈالونگا —— شیطان!"

تم خاموش نہیں رہوگے!؟

"نہیں؟"

"اتنی جرأت" "تم میری طاقتوں سے واقف نہیں؟؟"

"واقف ہوں اور انہیں مٹا دینے کے لئے آیا ہوں بے رحم، سفاک، شیطان۔"

"اسکی سزا یہ ہے کہ تمہارے جسم میں ایک غیر روح داخل کی جائے گی، اور تمہاری روح ہمیشہ تک فضا میں غم سے جلتی رہے گی۔" ساحر نے گرج کر کہا، اور ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اور جب آیا تو اُسکے ہاتھوں میں مضبوط رسے اور سلاخیں تھیں۔ ان آدمیوں نے شہاب کو کرسی پر بٹھا کر رسی سے اس طرح جکڑ دیا کہ وہ حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا اور مجھے انہوں نے، کمرے کے ایک گوشے میں، ایک موٹے سے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ ساحر نے مجھے دیکھتے ہوئے سلاخیں میرے قریب ہی رکھی ہوئی انگیٹھی میں ڈالدیں۔ اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "تم نے کئی دفعہ میرے کاموں میں مداخلت کی۔ اور میری سزا سے بچتے رہے۔ آج کوئی طاقت بھی تمہیں میرے ہاتھ سے

نہیں بچا سکے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد تم ہمیشہ کے لئے اندھے ہو گے!"

اسکے بعد ساحر نے خلا کے قریب ایک چھوٹی سی میز رکھ دی۔ اسکے اوپر دو شیشے کے ظروف رکھے ہوئے تھے۔

پجاری اس تمام کارروائی کو نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا بعد ازیں ساحر کے حکم سے اسکے تمام خادم باہر نکل گئے۔

ساحر نے دروازہ بند کر دیا اور کنڈی لگا دی۔

میرے قریب سلاخیں آگ میں تپ رہی تھیں۔ اپنی مہیب ترین سزا کا تصور کر کے میں اپنی حرکت پر پچھتانے لگا۔ پجاری بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یکایک ساحر نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے بازو اوپر اٹھائے شعلہ طراز خونخوار نظروں سے شہاب کو دیکھا۔ پھر اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ میں نے دیکھا کہ شہاب کے چہرے پر مردنی چھا رہی ہے۔ ساحر نے ایک ظرف اٹھایا۔ اسکا ڈھکنا اٹھایا اور اسے شہاب کے قریب لے آیا ـــ پھر ڈھکنا اس پر رکھکر ظرف کو میز پر رکھ دیا۔

میری متحیر نظروں نے دیکھا کہ ظرف کے اندر مختصر سا دھواں تیر رہا ہے۔ اور شہاب بالکل بے حس و حرکت بے جان مردہ کرسی پر پڑا تھا۔ یہی کارروائی اس نے پجاری کے ساتھ بھی کی۔

میز کے اوپر دو ظروف پڑے تھے جن میں دو انسانوں کی روحیں مقید تھیں!!

ساحر کی پیشانی پر پسینہ آگیا تھا۔ آنکھیں زیادہ خوفناک ہوگئی تھیں۔ اسنے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسکا ہاتھ ایک ظرف کیطرف بڑھا۔ ظرف اٹھاکر وہ شہاب کے جسم کے قریب لایا۔ اسکا ڈھکنا اٹھایا۔ اور پھر ـــ!

شہاب کے چہرے پر ذرا سی سرخی دوڑی۔ ساحر کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اور وہ جلدی جلدی شہاب کا رسہ کھولنے لگا۔ رسے سے جکڑے ہوئے انسان کے چہرے سے مردنی جا چکی تھی!

"لو میں نے تمہاری آخری آرزو بھی پوری کر دی ـــ ساموکا حسن و شباب لوٹو" یہ کہتے ہوئے اسنے شہاب کو بالکل آزاد کر دیا۔ شہاب کے بازوؤں میں حرکت ہوئی۔ اسکا چہرہ متغیر ہونے لگا۔

چند لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور وہ ایکدم ساحر پر جھپٹا۔

"شیطان ذلیل" ساحر پیچھے ہٹا، مگر شہاب کے ہاتھ اسکی گردن تک پہنچ چکے تھے۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ ساحر اسکی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ شہاب کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی۔ مگر پھر اسنے گردن دبوچ لی ـــ گتھم گتھا حالت میں وہ میرے قریب آگئے۔ ساحر کی پتلیاں نکلنے لگیں۔ شہاب کی ٹانگ انگیٹھی میں چلی گئی۔ تمام آگ بکھر گئی۔ اور اسکے کپڑوں کو بھی لگ گئی۔ مگر اسنے ساحر کی گردن نہ چھوڑی۔ ساحر نے آخری بار زور لگایا۔ مگر بے سود۔ شہاب کی انگلیاں اس کی گردن میں دھنس گئی تھیں۔ ساحر کی تمام جدوجہد ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑایا ـــ شہاب پیچھے ہٹا اور خلا میں گر پڑا۔ زور سے دھم کی آواز پیدا ہوئی ـــ!

وہ بوڑھا ساحر مردہ میرے سامنے پڑا تھا۔

میں اپنی جان بچانے کے لئے سوچنے لگا۔ اچانک

ایک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا۔ لکڑی کا ایک جلتا ہوا ٹکڑا میرے
پاؤں کے پاس آپڑا تھا۔ میں نے نہایت مشکل کے ساتھ اُسے پاؤں
کی انگلیوں میں دبا کر کھڑا کیا۔ اسکا جلتا ہوا سرا رسّے تک پہنچ گیا۔
رسّا جلنے لگا۔

دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی اور ساتھ ہی آواز
آئی "دروازہ کھولو ——" میں نے آواز پہچان لی، یہ آواز اسی
پُراسرار عورت کی تھی، جو چند دن پیشتر دیوی سامو کی بے جان
مورتی تھی —!!

آخر کار میں آزاد ہو گیا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا
"سامو" اندر آگئی۔ یکایک اس کی نظر مردہ پجاری پر پڑی۔ وہ تیزی کے
ساتھ وہاں پہنچی اور اس پر جھک گئی۔

"میرے محبوب!" سامو نے شیریں آواز میں کہا۔

مردہ کیا بول سکتا تھا۔ یکایک میں نے دیکھا کہ ایک طرف سے
دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔

"میرے محبوب!" سامو نے دوبارہ کہا "تم بولتے کیوں نہیں؟"
مردہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

"اف تمہارا جسم سرد — بے حس و حرکت — مردہ — آہ یہ کیا ہو گیا"

"اسکی جان نکل چکی ہے" میں نے نزدیک آ کر کہا۔ اُسنے آنسو
بھری آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اور خاموشی کے ساتھ پجاری
کا سر اپنے زانو پر رکھ دیا۔ اور سسکیاں بھر کر رونے لگی! اسکے
دلآویز رخساروں پر بہتے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں کا غمناک
منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے!

"میرے محبوب! تم مردہ —— بے جان!"

ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دھوئیں کے بادل
کمرے کی فضا میں منڈلا رہے تھے۔

"سامو" میں نے گھبرا کر کہا "اٹھو مکان میں آگ لگ گئی ہے"!

وہ بغیر میری طرف دیکھے سسکیاں بھر کر روتی رہی "میرے محبوب!"
بار بار اُسکے لبوں سے نکلتا تھا —— "سامو تم کیا کر رہی ہو مکان
میں آگ لگ گئی ہے۔ اُٹھو" یہ کہتے ہوئے میں نے اسکی طرف
ہاتھ بڑھایا۔ اسنے میرا ہاتھ جھٹک دیا "میں اپنے محبوب کے
ساتھ مروں گی"

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتی۔ یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا ہلاکت
کو دعوت دینا ہے۔ اٹھو سامو!"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ تم جاؤ۔ میرا محبوب مر چکا ہے
اُسکے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی —— تم جاؤ"

یہ سنکر میں نے آخری بار اُسکی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اُسنے اب کے
بھی میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اُسکے سنہری بالوں میں آگ لگ چکی تھی۔ مگر
اسکا پیارا حسین و جمیل چہرہ پجاری کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ مایوس
ہو کر میں دروازے میں سے نکلا۔ آگ یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ کھڑکی
کے پاس پہنچکر میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ نیچے پہنچکر مجھے معلوم
ہوا کہ پجاری کی روح ظرف میں بند تھی مگر اسوقت کیا ہو سکتا تھا؟
پانی سر سے گذر چکا تھا۔

آگ کے خوفناک دلنشیں شعلے لرزہ خیز آواز پیدا کرتے ہوئے
مکان کو بڑی تیزی کیساتھ نگل رہے تھے۔ دور میں ایک ٹیلے پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا
آگ بڑھتی جا رہی تھی، دھوئیں کے سائے اس طرح زمین پر نظر آ رہے
تھے گویا بھوت موت کی وادی میں مستانہ رقص کر رہے ہیں —!

میں سوچنے لگا کہ اگر ساحر غلطی نہ کرتا اور شہاب کے پیکر
میں پجاری ہی کی روح داخل کر دیتا تو پھر —؟ میں دنیا کی سب سے

جناب سید مقبول حسین صاحب (احمد پوری) بی اے، ایل ایل بی،

حکایت

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ

ہلکا ہلکا ابر گھرا تھا۔ چار طرف سنّاٹا تھا
دور افق پر ایک کبوتر۔ جیسے تتلی۔ جاتا تھا
تیر کے مانند باز کہیں سے اُدھر ہی اڑتا آتا تھا
اپنی غذا کے کھوج میں گردن دائیں بائیں گھماتا تھا
دور کبوتر دیکھا تو پرواز کے رُخ کو پھیر دیا
مثل قضا کے اِدھر اُدھر وہ اُسی جگہ منڈلاتا تھا
دیکھا باز کبوتر نے بھی گرہ[1] لگا کر ڈوب گیا
باز جھپٹ کر نیچے آیا۔ منہ کا نوالا جاتا تھا
پکڑ دبوچا آ کے اُسے بے بس تھا کبوتر کیا کرتا
باز کے پنجوں میں بیچارہ پَر اپنے تھرّاتا تھا
راجہ اندر بادل سے یہ دیکھ کے کچھ بےکل سے ہوئے
کڑک کے بجلی ابر سے نکلی باز خبث بل کھاتا تھا

[1] گرہ لگانا یا گرہ کھانا یعنی ہوا میں غوطہ مارنا۔ کبوتر بازوں کی اصطلاح ہے۔

چھُٹا کبوتر پنجوں سے اور باز کے بازو ٹوٹ گئے
پڑا زمیں پر لہو کے لختے مُنہ سے اپنے گراتا تھا
باز کی حالت دیکھ کے راجہ اِندر کچھ مغموم ہوئے
باز کبوتر دونوں پر اب اُن کو غصہ آتا تھا
اپنے جی میں کہا راجہ نے عقل بڑی یا بھینس بڑی
بجلی چمک کے ہنستی ہو گی ابر بھی کچھ غرّاتا تھا
اپنے بنائے کھیل کو اپنے ہاتھوں کیوں برباد کیا
سُنئے سمے اور وقت وقت سے کھیل یہ جی کو بھاتا تھا
پھڑک اٹھی انصاف کی رگ راجہ اندر کے ماتھے پر
شفق سے شرم کی رحم کا بادل عدل کے ٹکر کھاتا تھا
راجہ اندر ہنسکر بولے "جا" اے باز کبوتر ہو جا"
اور کبوتر باز بنا اپنی فطرت دکھلاتا تھا
اسی طرح دنیا عقبیٰ ہیں ایک ترازو کے دو پلے
رات اور دن حال اور ماضی میں وقت یہی دکھلاتا تھا
عاشق گر معشوق شود ایں ہم از یزداں اِمکاں دارد
کاہ شود گر کوہ تعجب نیست کہ یزداں فرماں[1] دارد

(طبعزاد حکایت)

[1] "فرمان" سے یہاں "قدرت" مراد ہے یہ شعر "ہندوستانی فارسی" میں ہے۔ بدیشی فارسی میں نہیں ہے۔

جناب صادق الخیری (دہلوی) بی۔ اے۔

تیرِ نیم کش

آج خاقان کی باری تھی۔

ہم لوگ آتشدان کے قریب جمع ہوگئے تھے اور صاحبِ خانہ میوے اور قہوے سے ہماری تواضع کر رہا تھا۔ ہر جانب خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی اور بوسے بوسے گرنے والی برف کے نرم نرم گالے شاہ بلوط کے سریلے راگ کو مدہم کر رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سنا چکا تھا اسلئے آج ہم سب کی نظریں خاقان پر لگی ہوئی تھیں اُسنے تمہید کے طور پر ہمیں بتایا کہ چونکہ اس کی زندگی اُسکے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اسلئے آج کی صحبت میں آپ بیتی کے بجائے وہ اپنے ایک دوست کی کہانی سنانی چاہتا ہے جو اس دنیا میں اس یکہ و تنہا اور خانماں برباد مسافر کی طرح ہے۔ جسے اندھیری رات کو کسی ہیبت ناک جنگل میں طوفانِ باد و باراں کے دل دہلا دینے والے عناصر نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہو۔

داستان شروع ہوتے ہی ہم سب خاموش ہوگئے۔ البتہ شمشاد و صنوبر پر دریائی طوطے کبھی کبھی اپنی جھنکار سے موت کے سے سکوت کو توڑ دیتے تھے ــــــ آج خاقان کی باری تھی اور ہم سب اُس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ چنانچہ قہوے کا آخری گھونٹ لیکر اُسنے اپنی کہانی کا آغاز یوں کیا۔

(۱)

یہ میرے دوست مراد کی کہانی ہے۔

وہ پہاڑی علاقوں کے اُن قبیلوں میں رہتا تھا۔ جو قانون کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ دوستوں سے اچھے تعلقات ہونے کے علاوہ اس کی گھریلو زندگی پر بھی دوسرے رشک کرتے تھے۔ اس کی بیوی کی شوہر پرستی اور فرمانبرداری اہلِ قبیلہ میں ضرب المثل تھی، خود مراد طبعاً نیک اور صالح تھا اور سب سے بڑھکر یہ کہ عقل و دانش اُسے فیاضی سے عطا ہوئی تھی۔ لوگ اپنے پیچیدہ معاملات میں اس سے مشورہ لینے دور دور سے آیا کرتے تھے۔ پنچایتوں میں اس کی موجودگی کو خاص اہمیت دی جاتی تھی اور پنچ اسکی رائے کو بہت وزنی سمجھتے تھے۔

مراد کے دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے نادر کی عمر چوبیس پچیس سال کی تھی۔ طاہر ابھی بہت ہی کمسن تھا اور ماں اسکو اسلئے اور بھی چاہتی تھی کہ بیچاری کا عالمِ شباب رخصت ہو چکا تھا۔ اور اسکی کشتیٔ حیات خرابیٔ صحبت کے بھنور میں گھر گئی تھی نادر بڑے ارمانوں کے بعد اسوقت پیدا ہوا تھا جب وہ بچے کے لئے دامن پھیلا کر دعا مانگتے مانگتے مایوس ہوگئی تھی۔ اسکی پیدائش سے، حسرت و یاس کے ان سیاہ بادلوں میں سے جنہوں

نے اُسکی خالی گود پر سایہ کر رکھا تھا، مسرت کا بدرِ کامل ضوفشانی کرنے لگا تھا لیکن مراد اور خانم کے وہ دن اچھے نہ تھے مفلسی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی - اور مراد علالت کے ہاتھوں لاچار تھا تاہم جب خانم کو زندگی اور موت کی کشمکش سے نجات ملی تو اُسنے آہستہ آہستہ اُن مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا جو زنجیریں بن کر اُنکے پاؤں میں پڑ چکی تھیں - بچے کو سینے سے چمٹائے وہ چراگاہوں میں پڑوسیوں کے مویشی چرانے لے جاتی یا کاشتکاروں کے ہاں ہی کچھ کام کر لیتی اور گھر آکر دن بھر کی تکان کے باوجود وہ اپنا آرام شوہر پر قربان کر دیتی - محنت مزدوری سے جو کچھ ملتا وہ شوہر اور بچے پر صرف ہوتا اور وہ غریب اپنی ذاتی تکلیفیں خوشی خوشی برداشت کر لیتی - یہ حالت نادر کے ہوش سنبھالنے تک رہی اور جب شوہر تندرست ہو گیا تو وہ نیک بی بی اپنی زندگی کے وہ دن جب دلہنیں سکھ اور چین کی نیند سوتی ہیں اپنے لال کو بہتر سے بہتر طریقے پر پرورش کرنے میں گذارتی رہی - پھر جب نادر سنِ بلوغ کو پہنچا تو خدا نے جو انصاف والا ہے، انکے دن پھیر دئیے اور وہ چھوٹا سا کنبہ بے فکری سے رہنے لگا -

اب نادر جوان ہو گیا تھا، دونوں میاں بیوی نے ملکر زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ اسکے حوالے کر دیا کہ وہ کھیتی باڑی کر کے اپنے لئے قسمت کا رفیع زریں ایوان بنا سکے، اور جہاں تک ہو سکا وہ اُسکو — مدد دیتے رہے - غرض بڑے لڑکے کی طرف سے وہ مطمئن تھے البتہ چھوٹے لڑکے کا خیال خانم کو رہ رہ کر ستایا کرتا - اور آئے دن کی علالت کیوجہ سے اُسکے دل میں طرح طرح کے وہم آتے "اگر میں مر گئی . . . . تو نہ جانے اسکا کیا حشر ہو؟ مراد کی ضعیفی ہے نہ وہ کیا کر سکیگا؟ نادر کی شادی ہو گئی، تو خدا معلوم اسکی بیوی کا سلوک طاہر کے ساتھ کیا ہو؟ ..."

اس قسم کے فکروں میں گُھل گُھل کر وہ اور بھی دھان پان ہو گئی - اور اکثر شام کی تاریکیوں میں جب بزم انجم سراپا گوش ہوتی - وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو آغوش میں لئے گھنٹوں چپکے چپکے روتی رہتی - وہ اس دکھ میں تنہا مبتلا تھی اور مراد کو اس میں شریک کرنا نہیں چاہتی تھی کہ بڑھاپے میں اس کو ناحق کا روگ ہو گا - تاہم وہ اپنی دھن میں لگی رہی اور اپنے بچے کے خوش آئند مستقبل کو مستحکم بنانے کے لئے اسنے ایک تجویز سوچ ہی لی -

ایک دفعہ اور اُسنے تنگدستی اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کا بیڑا اٹھایا اور جس طرح نادر کی پرورش میں اُسنے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اب طاہر کو اپنے بعد خوش حال بنانے کے لئے اسنے پھر دار آلام سر ناپا اوڑھ لی - اپنا پیٹ کاٹتی، صعوبتیں اٹھاتی اور روزانہ اخراجات سے پس انداز کر کے کوڑی کوڑی پیسہ پیسہ جوڑتی کہ اپنے پیچھے طاہر کے لئے کچھ پونجی چھوڑ جائے - جو کچھ وہ جمع کرتی ایک ہنڈیا میں رکھ دیتی اور اسکا منہ کپڑے سے بند کر کے گھر کے ایک کونے میں جہاں کسی کا گذر شاذ و نادر ہی ہوتا گاڑ دیتی ——— دن رات اسی طرح بیتتے رہے -

پہاڑی علاقوں کے بعض غیر متمدن لوگوں پر اوہام و دلعیت خاص ہوتی ہے، اور مراد کے نیک نام خاندان میں یہ کلنک کا ٹیکہ نادر کی پیشانی پر لگا ہوا تھا - ایک دن سورج ڈھلتے، خلافِ معمول نادر گھر آگیا اور دیکھا کہ ماں نے کچھ نقدی

گن کر ہنڈیا میں رکھی اور اسکا منہ بند کر کے اسے زمین میں گاڑ دیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اسطرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد خانم برابر کے کمرے میں طاہر کے پاس آئی اور اُسے سوتا دیکھ کر اُسکے چہرے پر مسرت و طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

"ماں!" نادر ایکا ایکی خانم کے سامنے آکھڑا ہوا" وہ ـــ ہنڈیا مجھے دیدو ـــــ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے۔"

خانم حیرت سے اسکو تکنے لگی، گویا کوئی اسکی جان مانگ رہا ہو" وہ روپیہ .... میں تم کو نہیں دے سکتی۔ میں نے طاہر کے لئے جمع کیا ہے۔"

"طاہر کا کیا ہے؟" اسنے خشمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" میں بڑا ہوں، میرا حق زیادہ ہے۔ وہ ہنڈیا مجھے نکال کر دیدو۔"

"کیا بکتا ہے نادر!" خانم غصے اور رنج سے تھرتھر کانپتے ہوئے بولی۔" ہم نے تجھے پال پوس کر بڑا کیا اور جو ہو سکا تیرے لئے کیا۔ اب طاہر کیلئے بھی کچھ کریں یا نہیں؟ وہ بچہ ہے، کیا خیر......"

"اپنا وعظ رہنے دو، ماں! تم نے میرے لئے تو کبھی دو پیسے بھی جمع نہیں کئے۔ اور یہ طاہر اتنا چہیتا ہے کہ تم یہ گنج اسکے لئے محفوظ کر رہی ہو۔ مگر تم ایسا کر نہیں سکتیں۔ تم جو کچھ اسکو دینا چاہتی ہو، اتنا پہلے مجھ کو دیدو ـــــ یہ تو ہوگا انصاف! اور اگر تم نے اسکے خلاف کچھ کیا تو اسے میں ہرگز برداشت نہیں کرونگا"

لالچ، نادر کو ہوش و خرد سے محروم کر رہا تھا۔

"بیٹا" خانم بے چارگی سے بولی" تو سمجھ کر تو بات کر مجھے اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں، خدا جانے کب مر جاؤں، اسلئے آپ فاقے کر کر کے اُسکے لئے کچھ جمع کیا ہے۔ کہ اسکا بار تم پر نہ پڑے۔ رہا انصاف تو اللہ بہتر جانتا ہے میں نے کس کس طرح تیری پرورش کی ہے مگر ماں احسان نہیں جتایا کرتی اسلئے تجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تو اس ہنڈیا کا کیا کریگا، خدا تجھے تیرے کام ہی میں اتنی برکت دے کہ تو ہم سب کو تمام فکروں سے بے پروا کر دے۔"

"خوشامد نہ کرو ماں!" نادر پر درندگی طاری ہو رہی تھی" روپیہ مجھے دیدو، ورنہ میں طاہر کو قتل کر ڈالونگا"

خانم اپنے بیٹے کے قدموں میں جس کی جوانی اس نے اپنے خونِ جگر سے سینچی تھی گر پڑی" جیتا رہ نادر! اس دن کے لئے ہی تجھے پالا تھا کہ......"

"ہٹ جاؤ...." کہتے ہوئے خانم کے سپوت، جوان نادر نے اپنی بیمار ضعیف ماں کو مار کر پرے ہٹا دیا۔ اور بندوق تان کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشی پن برس رہا تھا" بول بڑھیا! طاہر زیادہ ہے یا میں؟ روپیہ زیادہ ہے یا نادر؟"

خانم جو جسمانی کرب اور روحانی اذیت سے ادھ موئی ہو چکی تھی شکستہ آواز میں اپنے بیٹے کے آگے گڑگڑاتی ہوئی بولی" نادر! میں تم دونوں کو برابر چاہتی ہوں.... ہاں تم نے میرا دل دکھایا ہے لیکن میں تمہیں معاف کرتی ہوں آہ میرا بچہ طاہر!!"

"پھر وہی طاہر؟!!" مغلوب الغضب نادر دانت پیسکر خانم پر بندوق چلاتا ہوا بولا ـــــ "یہی انجام

ہونا تھا . . . . . روپیہ اب میرا ہے . . . . . "

خانم، خون میں لت پت، عالم جانکنی میں تڑپنے لگی اور طاہر نیند سے چونک کر چیخا "ماں ـــ ماں"۔

آسمان کی کفنی سُرخ ہو گئی تھی اور فرشتے آفتاب کے جنازے کو آخری منزل تک پہنچانے لے جا رہے تھے۔ دور بہت دور ققنس دیپک راگ الاپ رہا تھا۔ اور ننھی مادہ دریا کے کنارے دم توڑ رہی تھی۔ شیطان کا طلسم درہم برہم ہو چکا تھا۔ نادر، ماں کی درد انگیز اور سقف شگاف چیخ سنکر ہوش میں آیا، گویا خواب سے بیدار ہوا اور دھاڑیں مارتا ہوا، خانم کی نعش پر گر پڑا "اے ماں! یہ کیا ہو گیا . . . . ماں! مجھے روپیہ نہیں چاہیئے . . . . . اے ماں! لو اُٹھو میرا سر تمہارے قدموں میں ہے۔ اسے ٹھکرا کر پاش پاش کر دو . . . . . ماں! . . . . طاہر اب میرا بھائی نہیں بیٹا ہے۔"

نادر گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ یکسر بدل چکا تھا، اُسکی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک زندہ لاش اپنی روح کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ سامنے پہاڑیوں کی بلند چوٹیاں دونوں وقت ملتے افق کی جھلملیوں میں خواب کی موجیں معلوم ہوتی تھیں اور دائیں بائیں بل کھانے والی بھیانک وادیاں، سمندر کی نامعلوم گہرائیاں! اسکے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اور وہ دنیا و مافیہا سے بےخبر آگے بڑھا جا رہا تھا۔ کچھ دور چلکر اُسے راستے میں مراد مل گیا۔

"کہاں جا رہے ہو نادر؟" نادر خاموش رہا۔

"نادر! تم چپکے ہو؟ یہ خاموشی کیا معنے رکھتی ہے؟"

نادر اپنے بوڑھے باپ کے قدموں میں گر پڑا۔ اور مراد بھی تحیر میں غرق، زمین پر ہی اس کی کتھا سننے بیٹھ گیا۔ جب نادر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں اپنی خونی کہانی سنا چکا تو مراد نے آہ سرد کھینچی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

"نادر! تیری ماں نے بڑی مدت تک تیرے لیئے دعائیں مانگی تھیں، تب جا کے خدا نے تجھے دیکر اس کی گود بھری تھی۔ تو خیال بھی نہیں کر سکا کہ اُس نے کِس کِس ارمان سے تیری پرورش کی۔ وہ خود بھوکی رہ کر تیرے لئے دودھ اور اچھے اچھے کپڑے مہیا کرتی تھی۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہماری فاقہ مستی اسی کی بدولت آسودگی میں تبدیل ہوئی ـــــ جب میں بیمار ہوا اور صحتیاب ہونے کی کوئی امید نہ رہی۔ تو مجھے بچانے کے لئے اسنے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی آہ میں نے اسکا بدلہ یہ دیا . . . . . کہ میرا ہی لڑکا اس کی جان کا بیری ہو . . . . . نادر! تجھے اپنے بوڑھے باپ کا بھی خیال نہیں آیا؟ . . . . تو نے ہم دونوں کا کتنے عرصے کا ساتھ چھڑا دیا ہے . . . . . اب تو جا کہاں رہا تھا؟"

نادر نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا "اے باپ! اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے! . . . . . یہ بندوق لیجیئے۔"

"نہیں اسے ابھی اپنے پاس رہنے دے! ـــ میرے ساتھ گھر چل" مراد، جسکے چہرے پر موت کی سی زردی کھینڈی ہوتی تھی، تخیل کے جھروکے سے بہشت میں خانم کو دیکھتے ہوئے بولا۔

(۲)

یہاں تک پہنچکر خاقان تھوڑی دیر کے لئے خاموش

ہوگیا۔ اس پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ اور آتشدان میں دہکتے ہوئے انگاروں کے بھڑکتے ہوئے شعلے "انتقام" کے لئے مچل رہے تھے۔ ہم سب آگے سننے کے لئے بے قرار تھے۔ اور جب زیادہ دیر تک صبر نہ ہوسکا تو ہم نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا "پھر کیا ہوا؟ — مراد نے نادر کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

خاقان نے سبکو اسقدر بے تاب دیکھ کر چلغوزوں کو مٹھی میں مسلتے ہوئے اپنی داستان پھر جاری کی:۔

دوسرے دن قبیلوں کے بڑے بڑے لوگ پہاڑی کے دامن میں جمع ہوئے۔ اُنکے دلوں میں نادر کے شرمناک فعل پر غم و غصہ کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ مراد کی بیوی خانم کا قتل اپنے اسی بچے کے ہاتھوں جس پر وہ اپنی جان چھڑکتی تھی۔ اُنکے نزدیک ایسا روح فرسا سانحہ تھا کہ زمین و آسمان کی باہمی گردش کائنات کو یک لخت پیس کر رکھ دیتی۔ خانم وہی تو تھی جس کی بدولت مراد آج زندہ اور باعزت شخص تھا! کیا سب جانتے نہ تھے کہ نادر کی کشتِ حیات کی آبیاری خانم ہی نے اپنے خونِ دل سے کی تھی؛ ایسی باوفا بیوی اور اولاد پر قربان ہونیوالی ماں ایسے سنگدل بیٹے کے ہاتھوں رشتۂ حیات سے محروم ہوجائے!!! پنچایت کے اکثر افراد کی رائے تھی کہ نادر کو سمور کے درخت سے باندھ کر گولی سے ہلاک کر دیا جائے مگر — مراد کی رائے بھی تو ضروری تھی!

ڈھلانوں پر درختوں کے سائے دراز ہونے شروع ہوگئے تھے اور پنچوں کے دلوں میں نفرت و حقارت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی، حسب وعدہ، وقت مقررہ پر مراد، نادر کو وہاں لے آیا اور قطعی فیصلے کیلئے بہت دیر تک رائے زنی ہوتی رہی آخر کار کمیٔ پنچ یک زبان ہوکر بولے "تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مراد کے بیٹے نادر کو اپنی ماں کے قتل کے جرم میں دستور کے مطابق موت کی سزا دینی چاہیئے!"

مراد اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اور جب اس سے اس تجویز کے متعلق رائے طلب کی گئی۔ تو اس نے پُرسکون لہجہ میں کہا "— اور دستور یہ بھی تو ہے کہ... اگر کوئی باعزت شخص قاتل کی ضمانت اور جرگے کو سَو روپے دیدے تو......!"

سب متحیر ہوگئے آخر کار ایک ہمت کرکے بولا "لیکن یاد رہے.... نادر ایسی ویسی عورت کا نہیں، خانم کا قاتل ہے.....؟"

مراد کی گردن وفورِ غم سے جھک گئی، بوڑھا سردار، جسکا سفید سر لگاتار ہل رہا تھا، اپنی لکڑی کے سہارے کھڑا ہوا تھا "مراد سچ کہتا ہے!.... کون ہے جو نادر کی ضمانت اور جرگے کو سَو روپے دے؟"

مجمع پر سناٹا چھا گیا، بھلا نادر جیسے وحشی قاتل کی ضمانت اور اسکے لئے سَو روپے کون دیتا! قدرے توقف کے بعد مراد، بوڑھے سردار سے مخاطب ہوا "اے سردار! ہم تیرے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں.... نادر کی ضمانت میں دیتا ہوں.... یہ سو روپے حاضر ہیں!"

لوگوں کا اضطراب استعجاب میں بدل گیا "مراد کو ہو کیا گیا ہے؛ اپنی بیوی کے قاتل کو یونہی چھوڑ دیگا؟؟" وہ سب آپس میں متحیر ہوکر سرگوشی کرنے لگے۔

"بزرگوں کے دستور کے مطابق" بوڑھا سردار رعشہ دار
آواز میں بولا "مراد! تیری ضمانت اور یہ رقم قبول کی جاتی ہے
مگر بھولنا نہیں! سماج قاتل سے انتقام لینا چاہتی ہے"

برسوں بیت گئے۔

نادر کا جرم آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں سے محو ہوگیا
وہ محنت سے کھیتی باڑی کا کام کاج کرتا اور جو وقت بچتا وہ باپ
اور بھائی کی خدمت میں صرف کر دیتا۔ ملنساری اور دیانتداری
کی بدولت اُسنے بہت سے قبیلوں میں عزت حاصل کر لی اور
ملنے جلنے والے اکثر اس کی تعریف کرتے کہ کتنا سعید بیٹا اور
چاہنے والا بھائی ہے!

کئی سال بعد جب وہ اپنی روارحیات کے سیاہ داغ
کو نیک نامی کے رنگ میں چھپا چکا تھا، مراد نے اسکی شادی
ایک اچھے گھرانے میں کر دی۔ نادر اپنی دلہن کے حسن اور خدمت
گذاری پر فریفتہ تھا اور اسکی بغیر دنیا اُسکے لئے دلچسپی سے خالی
تھی۔ برسوں یونہی گذر گئے۔ نادر کے ہاں دو لڑکے ہوگئے تھے
بڑا جوان ہو چلا تھا لیکن چھوٹا ابھی بہت کمسن تھا۔ ایکدن ــــ
شام ہونے والی تھی نادر برابر کے قصبے میں کچھ خرید و فروخت کرنے
گیا تھا اور اسکی بیوی دھان کے کھیت میں کام کر رہی تھی۔ طاہر
بھتیجوں کے اصرار پر انکے ساتھ گھر پر ہی کھیل میں شریک ہوگیا تھا
مراد جسکے جسم میں زندگی چراغ سحری کی طرح جوش میں آ چکی تھی
چاول کے پودوں کو روندتا ہوا بہو اسکو شفقت و حسرت سے دیکھنے
لگا۔ بہو نے دوپٹے کے آنچل سے سر کو ڈھانکا اور خسر کے سامنے
تعظیم سے دوزانو ہوگئی "اے باپ! میری جان آپ پر قربان ہو
لونڈی آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہے؟"

"بہو بیٹی!" مراد جسکے چہرے پر مُردنی چھا رہی تھی بمشکل ضبط کرتے
بولا "مجھے معاف کر دیجیو... میں تیرا سنگدل خسر ہوں!"
یہ کہکر اُس نے بندوق اٹھائی اور... گولی نادر کی بیوی
کے سینے کے پار ہوگئی۔ مراد نے جھک کر اپنی بہو کی پیشانی پر بوسہ دیا
اور ایک طرف روانہ ہوگیا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک زندہ
لاش اپنی بے چین روح کی جستجو کر رہی ہے۔ سامنے پہاڑیوں کی
کی بلند چوٹیاں دونوں وقت ملتے افق کی جھلملیوں میں خواب کی
محو ہیں معلوم ہو رہی تھیں اور اُس پاس کی ڈراؤنی گھاٹیاں،
سمندر کی نامعلوم گہرائیاں! اسکے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اور
وہ سکتے کے عالم میں آگے بڑھتا جا رہا تھا!... مراد نے اپنا
انتقام لے لیا تھا!... مگر ایک بے قصور بچی کی جان لینے کی سزا
اس کو اس طرح مل رہی ہے کہ وہ روحانی کچوکے کھانے کے لئے
ابھی تک زندہ ہے

آتشدان میں آگ کے شعلے بھڑک بھڑک کر سرد
ہو چکے تھے، اختتام داستان پر ہم نے دیکھا کہ خاقان کی
آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اُس کی داڑھی کے بکھرے ہوئے
بالوں میں جذب ہو رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں؟؟
اب پو پھٹ رہی تھی اور عنقریب بجھنے والی شمع
کی روشنی سپیدہ سحر میں پھیکی پڑ چکی تھی۔ خاقان نے ایک طرف
کان لگا دیئے کہیں دور خانۂ خدا سے حضرت بلالؓ کی سی دل کے
پار ہو جانے والی صدا آ رہی تھی۔

"اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے...!"

نوشتہ ٹرسٹان برنارڈ

مترجمہ حضرت ساغر جعفری بی اے، ایل ایل بی۔

ارتکابِ جرم

نوبیا - ۱۰ فروری ۱۹۰۷ء۔

بخدمت - ایم - ایل - گیوادن اسکوائر

بیرسٹر عدالت اپیل - پیرس

جنابِ محترم! آج میں آپ کی خدمت میں ان واقعات کی پوری تفاصیل بھیج رہا ہوں۔ جنکا ذکر میں نے اپنے پہلے خط میں کیا تھا۔ میرے مقدمہ کے متعلق تمام ضروری باتیں آپکو اس داستان میں نظر آجائیں گی۔

میرا پورا نام پایئر - لوئی - براڈ ہے اور میری جائے پیدائش فرانس کا مشہور شہر لائنز ہے۔ گذشتہ یکم دسمبر سے میری عمر اٹھائیس برس کی ہو چکی ہے۔ ابھی میں بچہ ہی تھا کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اور میرا والد بھی جو اپنے شہر میں پنساری کی دکان کرتا تھا قریباً ڈیڑھ سال ہوئے فوت ہو چکا ہے۔ اس وقت میرے خاندان سے میری صرف ایک شادی شدہ بہن موجود ہے۔ گھر والوں سے میرے تعلقات انیس برس کی عمر ہی میں بگڑ چکے تھے۔ میں نے کئی کارخانوں میں بطور کلرک ملازمت کی مگر میں اپنے کام میں تسلی بخش ثابت نہ ہوسکا۔ کیونکہ میں سست و کاہل تھا اور عموماً کام پر دیر سے حاضر ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ گذشتہ سے گذشتہ تک میں بالکل بیکار رہا۔ میں گھوڑ دوڑ پر شرطیں لگاتا اور اسی قسم کی دیگر فریب کاریوں سے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ کچھ عرصہ میں نے کمیشن پر اخبارات بھی فروخت کئے۔ مگر پبلسٹی ایجنٹوں نے میری چنداں پروانہ کی کیونکہ ایک تو میرا لباس اچھا نہ ہوتا۔ اور دوسرے میں صبح سویرے اٹھنے کا عادی بھی نہ تھا۔

انہی دنوں گھوڑ دوڑ کے میدان میں میری ملاقات ہنری اور جیولس نامی دو عیاروں سے ہوئی اور بہت جلد میں نے ان سے یارانہ گانٹھ لیا۔ انکا کام مضافات میں نقب زنی کرنا تھا۔ اور اس کام میں ان کی ایک ۱۰ سالہ رشتہ دار لڑکی گاز بھی شریک تھی۔ بوقت نقب زنی دو مرتبہ انہوں نے مجھے بھی اپنے کارناموں میں شریک کیا۔ وہ مکان میں نقب لگا کر اندر داخل ہو جاتے اور میں باہر باغ کے دروازہ پر کھڑا رہتا۔ گاز قریباً سو قدم کے فاصلہ پر سڑک پر اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتی تاکہ وہ آنے جانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ ساتھ ہی وہ نہایت ہوشیاری سے ہر طرف نگاہ رکھتی۔ اور اگر کوئی پولیس کا سپاہی اِدھر آنکلتا تو اسے ہنسی مذاق میں مشغول رکھتی۔ ہنری اور جیولس نے میری خدمات کے صلہ میں نہائت حقیر رقم مجھے ادا کی تیس فرانک پہلی مرتبہ اور اڑتالیس فرانک دوسری مرتبہ۔ پس میں نے ارادہ کیا کہ ان سے علیحدہ ہو کر تنہا قسمت آزمائی کروں۔

جولائی [illegible]ء . . میں پیرس کے قریب قصبہ روبیڈکس کی ایک کہنہ ساخت وشکستہ حال قیامگاہ میں جو سمیلٹرز ہوٹل (Smelters Hotel) کے نام سے موسوم تھی قیام پذیر تھا۔ اسجگہ زیادہ تر رنڈیوں اور قمار بازوں کی رہائش ہوا کرتی تھی۔ مارچ [illegible]ء کے دن نہایت خوشگوار تھے موسم قدرے گرم اور خشک تھا۔ دوپہر کے بعد میں سینٹ جرمن سے پرے ان دیہات کی طرف نکل جاتا جو مغربی سرحد پر واقع ہیں میں نہایت تیز بین نگاہوں سے مکانات کا جائزہ لیتا تاکہ نقب زنی کے لئے کوئی موزوں مکان انتخاب کرسکوں بعض اوقات میں اسقدر تھک جاتا کہ میرے لئے واپس قصبہ میں آنا ناممکن ہوجاتا اور میں دیہات ہی میں کسی سٹیشن پر یا سرائے میں رات بسر کرلیتا۔ بظاہر میں مکانوں میں بھیک مانگنے کے لئے داخل ہوتا مگر میرا مقصد اہل خانہ کی تعداد معلوم کرنا ہوتا۔ ہر روز مختلف مکانات پر صدا کرنے کے بعد مجھے بہت سی روٹیاں اور قریباً دس فرانک نقد میسر ہوجاتے۔ خود سیر ہوکر کھا لینے کے بعد بچی ہوئی روٹیاں میں دیگر گداگروں کو دے دیتا اور باسی روٹی کے ٹکڑے کتوں یا پرندوں کو کھلا دیتا۔ بعض اوقات کوئی بیوقوف نوکر مجھے باورچی خانہ میں تنہا چھوڑ جاتا مگر کوئی ایسی چیز میرے ہاتھ نہ لگتی جسے بآسانی چھپایا جاسکتا۔ صرف ایک مرتبہ میں نے مٹی کا ایک پیالہ چرایا جو مجھ سے ایک بھکاری نے نصف پنس کے عوض خرید لیا۔

آخر کار ــــــ ایک دن دوپہر کے بعد قصبہ پائسی کے نزدیک اکیول نامی ایک گاؤں میں ایک سن رسیدہ عورت نے مجھ سے نہایت ہمدردانہ سلوک کیا۔ وہ پست قد اور خوب موٹی تازی عورت تھی۔ کافی دیر تک وہ میرے ساتھ مختلف خیراتی انجمنوں کا تذکرہ کرتی رہی جن میں وہ کافی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس نے مجھے صلاح دی کہ میں اسکے نام پر پیرس کی ایک ایسی سوسائٹی میں درخواست کروں جو بیکاروں کے لئے کام مہیا کرتی تھی ہم باورچی خانہ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، اور ادھیڑ عمر کی ایک قوی الاعضاء خادمہ جو غالباً اپنی مالکہ سے قدرے پست قد تھی۔ ایک طرف آلو چھیلنے میں مصروف تھی۔ بظاہر میں سر ہلا کر مکان کی مالکہ کی باتوں کا اثبات میں جواب دیتا رہا۔ مگر دراصل میری نگاہیں کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ جب میں باہر نکلا تو اپنی کارروائی کے لئے اس مکان کو منتخب کر چکا تھا۔ دروازے کو اندر سے کوئی چٹخنی نہیں تھی۔ باغ کی دیوار بھی چھوٹی تھی۔ اور آس پاس کے مکانات بھی غیر آباد تھے۔ مجھے اس بوڑھی عورت نے ایک کراؤن خیرات میں دیا جس میں سے میں نے ایک لمبا سا خنجر نما چاقو خریدا۔

میں نے دل میں فوری عمل کرنیکا فیصلہ کرلیا۔ اس روز مارچ کی [illegible] تاریخ تھی اور جب میں اکیول سے روانہ ہوا تو تین بج چکے تھے۔ پائسی کے سٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوکر میں شام کے سات بجے اپنی قیامگاہ پہ واپس آیا۔ ہوٹل کی مالکہ سے شمع جلانے کے لئے دیاسلائی طلب کرتے ہوئے میں نے تاکیداً کہدیا کہ میں اپنے کمرہ میں سونے کے لئے جا رہا ہوں۔

ساڑھے آٹھ بجے تک میں اپنے کمرہ میں بیٹھا رہا میرے پاس قفل وغیرہ توڑنے کے لئے دو زنگ آلود اوزار پڑے ہوئے تھے۔ جو میرے نقب زن دوست ہنری نے مجھے تحفتہً دئیے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے میں ہر طرح سے تیار ہوکر اپنے کمرہ

سے نکلا۔ ہوٹل کے دفتر کا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا میں اسی راستے باہر سڑک پر چلا آیا۔ چونکہ ہوٹل کی مالکہ اور نوکر دوسرے کمرہ میں رات کا کھانا کھا رہے تھے لہٰذا میرے نکلنے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پہلے میں نے پالسی تک پیدل چلنے کا خیال کیا تاکہ ریلوے سٹیشن پر کسی واقفکار سے ملاقات نہ ہو۔ مگر چونکہ ہوٹل کی مالکہ کو کمرہ میں میری موجودگی کا مکمل یقین تھا۔ لہٰذا میں نے چار گھنٹے پیدل سفر کرنے کی بجائے ٹرین میں سوار ہونا زیادہ موزوں سمجھا۔

میں ۹ بجکر ۴ منٹ پر سینٹ لانزی سے گاڑی میں سوار ہؤا اور ۹ بجکر ۵۳ منٹ پر پالسی اتر پڑا۔ یہاں سے میری منزلِ مقصود تک صرف پندرہ منٹ کا رستہ تھا۔ جب میں اس مکان کے سامنے پہنچا جہاں سے آٹھ گھنٹے بلینز مجھے خیرات ملی تھی۔ تو نچلی منزل کی ایک کھڑکی میں ابھی تک شمع روشن تھی۔ اور درمیانی منزل کی ایک بند کھڑکی کے شیشوں سے بھی روشنی کی چند شعاعیں باہر نکل رہی تھیں۔ میں نے فوراً اندازہ کر لیا کہ خادمہ ابھی تک باورچی خانہ میں کام کر رہی ہے اور مالکہ اپنی خوابگاہ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں مکان سے آگے نکل گیا اور جب واپس آیا۔ تو درمیانی منزل کی کھڑکی سے بدستور روشنی نکل رہی تھی مگر نچلی منزل کی بجائے اب بالائی منزل کی ایک چھوٹی سی کھڑکی میں شمع روشن تھی۔ یقیناً خادمہ اب سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں وقت گذارنے کے لئے دوبارہ سڑک کے موڑ سے باغ کی دیوار تک اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جب گھڑیال نے ساڑھے گیارہ بجائے تو میں نے پھر مکان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ بالائی منزل میں بالکل اندھیرا تھا۔ مگر درمیانی منزل سے ابھی تک روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں غالباً بوڑھی مالکہ اپنے بستر میں بیٹھی ہوئی مطالعہ کر رہی تھی۔

مجھے انتظار کرتے کرتے آدھی رات سے زیادہ کا عمل ہوگیا۔ مگر وہ روشنی غائب ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میں اب باغ کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اور اس کھڑکی پر نظر جمائے رکھی۔ جہاں سے روشنی نکل رہی تھی۔ کیا اس شمع کو تمام رات جلتے رہنا تھا۔ اور جیسا کہ مجھے یقین ہو چلا تھا کیا مجھے ناکام واپس جا کر بدستور مفلسانہ زندگی بسر کرنا تھا؟

میں اپنے دل میں سمجھ چکا تھا کہ یہ روشنی تمام رات اسی طرح چمکتی رہے گی۔ مجھے رات کی خاموش فضا میں اب صرف گھڑیال کے ایک بجانے کی آواز کا انتظار تھا۔ مگر میری نگاہیں بدستور مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک روشنی غائب ہوگئی اور میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دس منٹ اور انتظار کیا تاکہ مالکہ خوب گہری نیند سو جائے۔ آخر کار میں باغ کی دیوار پھاند کر اندر کود پڑا۔ نہایت خاموشی سے زمین پر پاؤں رکھتا ہؤا مکان کے بیرونی دروازہ تک پہنچا اور ذرا سی کوشش سے دروازہ کا قفل کھول کر اندر داخل ہوگیا اسکے بعد میں ایک چھوٹے سے دالان میں کھڑا تھا جہاں سے سیڑھیاں چکر کاٹتی ہوئی اوپر کی چھت پر جاتی تھیں۔ میں نے احتیاطاً کوٹ اور واسکٹ اتار ڈالا تاکہ خون کے دھبے صرف میری قمیص ہی کو خراب کر سکیں میں نے جیب سے موم بتی کا ایک ٹکڑا نکال کر روشن کیا اور اُسے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے ہوئے دائیں ہاتھ میں اپنا خنجر نما چاقو کھولکر مضبوطی سے پکڑ لیا اور میں آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ جب میں آخری زینے پر پہنچا تو یکدم مجھے کمرے سے بوڑھی مالکہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے خادمہ کو پکارتے ہوئے پوچھا۔

"جین! کیا تم ہو" "ہاں" میں نے دبی آواز میں جواب دیا۔

مجھے امید تھی کہ وہ مطمئن ہو کر سو جائے گی مگر شاید وہ اس بات
سے خائف ہو گئی تھی کہ رات کو اتنی دیر سے اس کی خادمہ نیچے
کیوں گئی ہے۔ میں نے جلتی ہوئی موم بتی کو پھونک مار کر بجھا دیا۔
اور سانس روکے ہوئے دیوار سے لگ گیا۔ یک لخت تمام زینہ
روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ میرے مقابل کمرہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔
اور بوڑھی مالکہ ہاتھ میں شمع لئے ہوئے دروازہ میں کھڑی تھی۔ اس
نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے میں ایک
قدم آگے بڑھا اور اپنے مدِمقابل پر بے تحاشا وار کرنے لگا۔ وہ
فربہ اندام عورت بچے کی طرح کرخت چیخ مارتی ہوئی فرش پر گر پڑی
اور نیم جاں ہو کر دروازے کی دہلیز پر تڑپنے لگی۔ شمع اسکے ہاتھ سے
گر کر بجھ چکی تھی۔ میں اندھیرے میں بنا موم بتی کا ٹکڑا ٹٹول رہا تھا
کہ بالائی منزل سے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ فوراً اوپر
کے زینہ پر ایک مدہم سی روشنی ظاہر ہوئی۔ پھر نہایت تیزی سے
کوئی سیڑھیوں پر سے آنے لگا۔ میں نے دیوار کے ساتھ لگ کر
دیکھا کہ خادمہ میری جانب آرہی ہے۔ وہ سفید جاکٹ پہنے ہوئے
تھی اور اسکے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیمپ تھا جس کی تیز روشنی
اندھیرے میں میرے منہ پر پڑ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا
چہرہ سرخ اور پسینے میں شرابور ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک
گئی۔ یقیناً وہ مجھے شناخت کر چکی تھی۔ اسکا معصوم و کشادہ چہرہ
ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُسنے لیمپ زمین پر رکھا
اور اپنے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے ڈر کر کھڑی
ہو گئی۔ میں نے اپنے تیز چاقو سے اُسکے شانہ پر بھرپور وار کیا۔ اور
بغیر آواز نکالے وہ دھم سے سیڑھیوں میں گر پڑی۔

پھر میں لیمپ اٹھا کر مالکہ کی خوابگاہ میں گھس گیا۔ چارپائی
کے قریب لکھنے کی ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ میں نے ایک
دراز کھولکر دیکھا تو دو سو فرانک کے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔
جنہیں اٹھا کر میں نے جیب میں رکھ لیا۔ دوسری دراز میں سے
ایک سو دس فرانک کے طلائی سکے اور کچھ زیورات نکلے۔ چونکہ
زیورات کو فروخت کرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا اور یوں بھی وہ
کچھ زیادہ قیمتی نہ تھے۔ لہذا میں نے انہیں چھوڑ کر نقدی کو اپنے
قبضہ میں کر لیا۔ عین اسی وقت بوڑھی مالکہ نے سسکتے ہوئے آہ
بھری اور انتہائی درد و کرب کی حالت میں چیخنے لگی۔ میرا چاقو
خبر نہیں کہاں گر پڑا تھا۔ میں اپنے اردگرد نظر دوڑاتے
ہوئے ایک مدوّر میز پر ایک آبدار خنجر دیکھ چکا تھا۔ اسکا پھل
چھوٹا مگر چوڑا تھا۔ اسکے دستہ پر کسی وزنی دھات کا بنا ہوا
تھا۔ نہایت چمکتے ہوئے موتی جڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس
خنجر کو اٹھا کر بوڑھی عورت کی گردن میں بھونک دیا۔ اسے یوں
بے رحمی سے قتل کرنے کے بعد میں نے خون آلود خنجر کو دری سے
صاف کیا۔ اور اس قیمتی اوزار کو جیب میں ڈالکر نیچے پہنچکر . .
لیمپ بجھا دیا اور کھونٹی سے کوٹ اور واسکٹ اتار کر پہنا اور نہایت
احتیاط سے دروازہ بند کر کے باغ کی دیوار پھاند کر باہر نکل آیا۔

سڑک پر کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ اندھیری رات
میں سرد ہوا کے دلکش جھونکے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے
جب میں سٹیشن پر پہنچا تو تین بجنے میں ابھی بیس منٹ* یہاں
پہنچتی تھی۔ میں نے سوچا کہ چار میل پرے جا کر مجھے پچھلے سٹیشن
سے گاڑی میں سوار ہونا چاہیے تاکہ ڈھائی گھنٹہ کے شدید
انتظار سے بچنے کے ساتھ میرا کھوج لگانا اور بھی ناممکن ہو جائے
ایک ملہ میں سڑک کے کنارے رکا اور اپنے کوٹ اور واسکٹ کے

* [illegible]

کھول کر کپڑوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ میری قمیص پر خون کے چند داغ موجود تھے اور پاجامے پر بھی ایک چھوٹا سا دھبہ لگا ہوا تھا مگر وہ اتنا واضح نہ تھا۔ مجھ پر کسی قسم کا شبہ کیا جانا ناممکن تھا کیونکہ گذشتہ شام کو میں ہوٹل کی مالکہ کے سامنے کمرے میں سونے کیلئے داخل ہوا تھا۔ اور اب پھر کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر میں نے دن کے پورے نو بجے ہوٹل میں وارد ہونا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ نو بجے ہوٹل کی مالکہ سودا سلف خریدنے چلی جاتی ہے مرد علی الصبح ہی باہر نکل جاتے اور عورتیں بستروں ہی میں دبی ہوتیں۔ یک لخت سردی محسوس کرتے ہوئے میرے دانت بجنے لگے۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو جیبوں میں ڈالا تو میرا دایاں ہاتھ اس خنجر کے دستہ پر پڑا جس سے میں نے بوڑھی عورت کو قتل کیا تھا اگرچہ یہ نہائت قیمتی تھا تاہم میں اسے اچھی قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پاس رکھنا یقیناً خطرناک تھا۔ لہذا میں نے اسے پھینک دینا مناسب سمجھا اسٹیشن کے قریب ہی ایک ویران کنواں تھا میں نے خنجر کو جیب سے نکالکر اس کنوئیں میں پھینکا۔ اور خود چلتا بنا۔

راستہ چلتے ہوئے میں نے دوبارہ مالِ غنیمت گننا شروع کیا۔ میرے پاس اس وقت پورے تین سو دس فرانک تھے۔ اگرچہ میرے لئے یہ بہت بڑی رقم تھی تاہم اسے حاصل کرنے میں مجھے نہائت جانفشانی سے کام کرنا پڑا رہا تھا۔ مزید برآں میرا جرم بھی نہائت سنگین اور خطرناک تھا میں نے کافی دیر تک اس معاملہ پر غور کیا اور مجھے یقین ہے کہ اکثر پیشہ ور مجرم صرف اسی وجہ سے ارتکاب جرم نہیں کرتے کہ اپنی جان کو پے در پے خطرات میں ڈالکر بھی وہ بہت تھوڑی رقم حاصل کر سکتے ہیں

جب میں گاڑی میں سوار ہوا تو مجھ پر نیند کا انتہائی غلبہ تھا۔ اگرچہ میں نے بیدار رہنے کی انتہائی کوشش کی تاہم چند منٹ بعد میں محو خواب ہو گیا۔ سینٹ لازری کے سٹیشن پر پہنچ کر میں ایکدم جاگ اٹھا۔ گاڑی سے اترا تو مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی اسی وقت ساڑھے چھ بجے تھے اور دن کافی نکل چکا تھا۔ سٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ایک دوکان پر تھوڑی دیر ناشتہ کیا اور پھر مزے سے روبیڈکس کی جانب چلنے لگا۔ آٹھ بجے کے قریب میں نے ایک دوکان سے جو روبیڈکس کے باہر واقع تھی ایک سوتی قمیص اس غرض سے خریدی کہ گھر پہنچتے ہی اپنی خون آلود قمیص اتار کر اسے پہن لونگا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے پڑھنے کے لئے ایک باتصویر ناول بھی خریدا تھا میں عموماً تمام دن بستر میں بیٹھے ہوئے پڑھنے یا آرام کرنے میں وقت گذار دیتا۔ مگر اس وقت میں پہلے کی طرح بیکار رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اور میرا ارادہ تھا کہ اگلے دن ہی سے مجھے کوشش کر کے کسی کام پر لگ جاؤں گا۔

انہی خیالات میں محو میں سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ ابھی میں اپنی قیامگاہ سے قریباً سو قدم کے فاصلہ پر تھا۔ کہ میری آنکھوں نے ایک پریشان کن منظر دیکھا۔ ہوٹل کے سامنے پچاس کے قریب اشخاص کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ایک گاڑی اور پولیس کے چند سپاہی بھی کھڑے تھے۔ یک لخت مختلف خیالات میرے دماغ میں پیدا ہوئے ـــــ میرے جرم کا انکشاف ہو چکا ہے قتل اور چوری کی خبر پولیس کو مل چکی ہے۔ شائد میرے نام کا کوئی خط کوٹ کی جیب سے موقع واردات پر گر گیا ہو۔ میری گرفتاری کا حکم بذریعہ ٹیلیفون ـــ جاری

ہو گیا ہو گا ــــــ ظاہر تھا کہ انہوں نے میرا پتہ معلوم کر لیا ہے بلا سوچے سمجھے میں پیچھے مڑا اور واپس جانے کیلئے تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ یکایک ایک پست قد آدمی سر پر فلیٹ ہیٹ رکھے ہوئے اور بھورے رنگ کا اوور کوٹ پہنے میرے سامنے آکھڑا ہوا۔

"تمہارا نام پائیر براؤن ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں بالکل خاموش تھا۔

"میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں" یہ کہتے ہوئے اس نے پولیس کے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے فوراً مجھے دونوں بازوؤں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ وہ مجھے اسی طرح ہوٹل کے دروازہ پہ آئے۔ پولیس کے سپاہی لوگوں کو دھکے دیکر پیچھے ہٹاتے رہے اور اور میں انتہائی شور و غل کے درمیان ہوٹل میں داخل ہوا۔ پولیس انسپکٹر کی معیت میں، جس نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ میں بالائی منزل پر پہنچا۔ میں ابھی تک خاموش تھا۔ انہوں نے مجھے ایک کمرہ میں دھکیل دیا۔ جہاں چارپائی پر ایک نوجوان عورت کی نعش پڑی تھی اس منظر نے جو حالت میرے دل پر طاری کی میں اسکا اندازہ نہیں کر سکتا میرے خیالات اس طرح خلط ملط تھے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں پیش نظر نعش اس عورت کی نہیں تھی جسے میں نے قتل کیا تھا اور نہ ہی یہ وہ جرم تھا جسکا میں نے ارتکاب کیا تھا میں نے خود کو سنبھالا اور غمگین حالت میں بے حس و حرکت کھڑا رہا ایک لمحہ بعد میں نے یہ سادہ مگر بے معنی سوال کیا "مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے" اور ساتھ ہی یہ بھی پوچھا کہ یہ عورت کون ہے۔

ایک سفید ریش سپرنٹنڈنٹ لمبی ٹوپی پہنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے وہ پارسل جو بوقت گرفتاری میرے ہاتھ سے چھینا گیا تھا اُسے پیش کیا۔ یہ وہ سوتی قمیص تھی جسے میں نے ایک گھنٹہ پیشتر خریدا تھا۔

"اسے لے جاؤ۔ اور اچھی طرح اس کی جامہ تلاشی لو" سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا۔

جامہ تلاشی لینے پر میری جیب سے قریباً تین سو فرانک برآمد ہوئے اور میری قمیص پر سیاہ خون کے دھبے بھی پائے گئے۔ ان باتوں کی اطلاع پا کر سپرنٹنڈنٹ نے مجھے حوالات بھیجدیا۔

مقدمہ کی ابتدائی کارروائی میں ایک ایک کرکے مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا گیا جس جرم کا میں مرتکب گردانا گیا۔ اُسکے واقعات یوں تھے نصف شب کے قریب ہوٹل کی مالکہ نے بالائی منزل سے فرنیچر کے گرنے کی آواز سنی۔ ازاں بعد فوراً کوئی سیڑھیوں سے اتر کر باہر نکل گیا۔ چھت پر سے چیخنے اور سسکنے کی آوازیں سنکر نوکر بیدار ہوا۔ اُوپر جاکر دیکھا گیا۔ تو ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور ایک عورت جو کچھ عرصہ سے ہوٹل میں مقیم تھی مردہ حالت میں فرش پر پڑی تھی۔ کچھ فرنیچر بھی الٹا سیدھا پڑا تھا۔ اور چارپائی پر بچھا ہوا تو شک بھی پھٹا ہوا تھا۔ میرے علاوہ ہوٹل کے تمام کرایہ دار اکٹھے ہو چکے تھے۔ میری عدم موجودگی کا انہیں کیونکر علم ہوا؟ اسکی تفصیل یوں ہے کہ ہوٹل کی مالکہ کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ میں گذشتہ شام کو اپنے کمرہ میں واپس آگیا تھا۔ برعکس اسکے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آیا مقتول عورت گذشتہ رات کو تنہا یا کسی کے ہمراہ ہوٹل میں واپس آئی تھی۔ اس خیال کے پیش نظر سب میرے کمرہ کے دروازہ پر جمع ہوئے اور جب دستک دینے پر کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے دروازہ توڑ کر دیکھا۔ کمرہ اندر سے بالکل خالی تھا۔ پس سب کو مجھ پر شک گذرا۔ میرے چال چلن کی نسبت انہیں پیشتر ہی سے شبہ تھا۔ کیونکہ میرا دوست ہنری جو

اس ہوٹل میں رہتا تھا تمام گرد و نواح میں ایک مشہور دغا باز تصور کیا جاتا تھا جب پولیس موقع واردات پر پہنچی تو سبکو یقین ہو چکا تھا کہ میں ہی قاتل ہوں۔ لہٰذا میرا نام و حلیہ پولیس والوں کو بتایا گیا۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی تکلیف دہ جذبہ تجسس کے زیر اثر مجرم خود بخود دوبارہ جائے واردات پر چلا آتا ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے انسپکٹر پولیس نے ہوٹل کے ارد گرد اپنے سپاہی تعین کر دیتے تھے تاکہ میرے آنے کا خیال رکھیں

مجسٹریٹ کے روبرو بیان دیتے وقت میں نے پُر زور الفاظ میں ارتکاب جرم سے انکار کیا۔ مگر میرے قبضہ سے برآمد شدہ مال اور میری قمیص پر لگے ہوئے خون کے داغ میرے جرم کے بیّن ثبوت تھے۔ جب مجسٹریٹ نے مجھے پوچھا کہ اگر میں سپلنڈ ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ تو پھر ۲۱ اور ۲۲ مارچ کی شب کو میں کہاں تھا؟ تو میں یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کہ عین اس وقت جب ہوٹل میں قتل ہو رہا تھا میں پیرس سے آٹھ میل کے فاصلہ پر دو اور عورتوں کو قتل کر رہا تھا۔

جس جرم کا میں مرتکب گردانا گیا تھا۔ وہ اتنا مشہور نہ ہو سکا "ایک بدنام ہوٹل میں ایک رنڈی کا قتل" اس عنوان میں لوگوں کے لئے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ اسکے برعکس میرے اصلی جرم نے ملک میں سنسنی پیدا کر دی۔ اخبارات نے خوب لمبے چوڑے عنوانات لکھے اور واقعات کی تفصیل لوگوں نے نہایت دلچسپی سے پڑھی۔ میری مقتول ایک مشہور مجسمہ ساز کی بیوہ تھی۔ خادمہ نے جسے میں اپنے زعم میں ہلاک کر چکا تھا ہوش آنے پر میرے تعداد جرم کا مفصل اظہار کر دیا تھا اس نے میرا حلیہ ہوبہو بتایا اور پولیس والوں نے سوائے جیل کے ہر جگہ میری تلاش کی تھی۔ یہاں اس امر کا نوٹ کر لینا نہایت ضروری ہے کہ اس خنجر کی گمشدگی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ جس سے میں نے مکان کی مالکہ کا گلا کاٹا تھا۔ اور جسے میں کنوئیں میں پھینک چکا تھا۔ چونکہ میں عدالت کے روبرو اپنا عذر عدم موجودگی بامو قع واردات ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میرا سزا پانا یقینی امر تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک سزائے موت کا حکم نہ ملے مجھے اپنے اصلی جرم کا اعتراف نہیں کرنا چاہئے لیکن ارکان جیوری نے میرے بار بار کے انکار سے متاثر ہو کر مجھے شک کا فائدہ دیا اور بجائے موت کے میرے لئے سزائے عمر تجویز کی گئی۔

یہ خط میں آپکو نیو کیلیڈونیا سے تحریر کر رہا ہوں۔ جہاں میں گذشتہ گیارہ سال سے قید میں ہوں۔ میرا چال چلن نہایت اچھا رہا ہے۔ اور میں دفتر جیل میں بطور کلرک کام کرتا ہوں۔ اگرچہ یہاں مجھے ہر طرح کا آرام ہے۔ تاہم مجھے دوبارہ فرانس پہنچنے کی انتہائی خواہش ہے۔ اور اب میں قانوناً اس خواہش کی تکمیل کر سکتا ہوں۔ شائد آپ میرا مطلب نہ سمجھے ہوں۔ لہٰذا میں اسکی وضاحت کر دیتا ہوں۔ "قتل ایکیول" کے مقدمہ میں آخری عدالت کا فیصلہ ۱۰ اگست ۱۹۳۶ء کو ہو چکا ہے۔ دیہ اطلاع مجھے ایک دوست سے ملی ہے۔ جو عدالت پیرس میں ملازم ہے، چونکہ یہ اقتناہی نسخہ اب میرے حق میں مفید ہے۔ لہٰذا میں قانوناً اس عذر عدم موجودگی کو ثابت کر سکتا ہوں۔ جو قبل ازیں پیش کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ جس جرم کی مجھے سزا دی گئی ہے۔ میں اسکا مرتکب نہیں

(بقیہ مضمون صفحہ ۷۹ پر ملاحظہ فرمادیں)

مولانا کوثر چاند پوری

پیشین گوئی

پیشین گوئی کا مرض خدا کسی نہ دے آدمی جب اس کا عادی ہو جاتا ہے تو اپنے دماغ کو "عرشِ اعظم" سمجھنے لگتا ہے۔ اور "دل" پر اسے "جامِ جم" کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ہر چیز کو "قلب و دماغ" کے زیرِ نگیں سمجھتا ہے اور زبان سے جو کچھ کہہ دیتا ہے۔ اس کے ظہور پذیر ہونے کا ہر لمحہ بے چینی کے ساتھ منتظر رہتا ہے! وراس سے اختلاف کرنیوالوں سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ روزانہ نئی نئی حماقتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں طرح طرح کی باتیں کرتا ہے، نہ کسی کے مذاق اور تمسخر سے متاثر ہوتا ہے نہ سزا و جزا سے ڈرتا ہے۔ اکثر اوقات اپنی بیوی اور بچوں کے لئے کوئی ایسی پیشینگوئی کر بیٹھتا ہے۔ جس سے خود اسکی جان آفت میں آجاتی ہے۔ اور دو چار وقت روٹی بھی میسّر نہیں ہوتی۔

یہ مرض اکثر ڈاکٹروں کو ہو جاتا ہے خصوصاً جب ان کی عمر چالیس سال سے اونچی ہو جاتی ہے۔ اور اپنی حذاقت و مسیحائی پر انہیں ضرورت سے زیادہ "حسنِ ظن" ہو جاتا ہے' ایسی حالت میں وہ مریضوں کو اپنی حماقتوں کا تختۂ مشق بنا لیتے ہیں طرح طرح کی انکے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور پھر تنہائی میں دُعا کرتے ہیں کہ ابھی ہم نے فلاں مریض کے لئے جو پیشین گوئی کر دی ہے۔ وہ غلط نہ ہو' ورنہ لوگ تیرے اس گنہگار بندے سے بدگمان ہو جائینگے' اُدھر بے چارہ مریض جسکے متعلق وہ دق' سرسام بے ہوشی یا موت کی پیشنگوئی کر چکے ہوتے ہیں۔ رات بھر جاگ جاگ کر دعائیں کرتا ہے کہ خداوند عالم مجھے اس بلا سے نجات دے' اگر دق ہوگئی تو میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کون کریگا' یا سرسام کی حالت میں بار بار کیونکر ڈاکٹر کو بلایا جائیگا سر پر باندھنے کو برف کہاں سے آئیگا' بے ہوشی میں سنگھانے کو لخلخے کہاں سے نصیب ہونگے' اور مر گیا تو کفن کا کیونکر بندوبست ہوگا' بغرض اُسے تو طرح طرح کی فکریں ہوتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو اپنی پشیمانی یا نیک نامی کے علاوہ کوئی خیال ہی نہیں ہوتا۔

اتفاق سے ہمارے ایک دوست جو بحیثیت ڈاکٹر عملی کام کر رہے تھے۔ اس بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ آدمی صورت شکل کے اعتبار سے بھی اگر قاتل نہیں تو جراح ضرور ہیں۔ اور مزاج بھی بہت اچھا پایا ہے۔ بڑے ہنس مکھ اور ہمدرد ہیں۔ مگر عمر کی چالیس منزلیں طے کرتے ہی یہ عیب پیدا ہو گیا کہ مریض کا معائنہ کرتے ہی پیش گوئی کر بیٹھتے تھے۔ یہ بیماری بھی کبھی شدید ہو جاتی تھی اسوقت سینکڑوں مریض ان کی پیشینگوئیوں سے تباہ رہتے تھے کبھی شدت کم ہو جایا کرتی تھی۔ اور ہفتہ میں صرف ایک دو مریضوں ہی کو اس مصیبت سے واسطہ پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ انکا لڑکا معمولی بخار کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔ دو تین روز تک تو وہ اطمینان سے علاج کرتے رہے۔ مگر

مگر عوارض میں کمی نہ ہوئی تو اپنی بیوی کو الگ بلا کر آہستہ سے بولے۔
"بیگم ـــــ منّے کی سانس اکھڑ گئی ہے دو تین گھنٹے میں یہ
ختم ہو جائیگا، اپنا سب کام کاج چھوڑ کر یہیں آ بیٹھو" ـــــ
وہ چولھے پر ہنڈیا رکھ کر اسکے نیچے آگ جلا رہی تھیں خیال تھا کہ
جلدی سے دال پکا کر روٹی سے فارغ ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب
نے منّے کے متعلق یہ "پیشینگوئی" فرمائی تو حیرت و استعجاب
سے وہ انکا منہ دیکھنے لگیں، انکے ہوش و حواس پراگندہ ہو گئے۔
میاں دس بارہ سال سے قبرستان آباد کر رہے تھے۔ پر تو شبہ
بھی اسوقت نہیں ہو سکتا تھا کہ غلط کہہ رہے ہیں۔ وہ ہنڈیا
روٹی کے دھندے کو چھوڑ چھاڑ دوپٹہ سے منہ ڈھانک کر
بیمار بچہ کی پٹی پر جا بیٹھیں اور چپکے چپکے روتی رہیں۔ بار بار
اپنے لخت جگر کے منہ سے رضائی کا پلہ ہٹا کر اُسکے ماتھے پر
ہاتھ پھیر کر دیکھتیں کہ گرم ہے یا ٹھنڈا ہو گیا کبھی سینہ اور پیٹ
پر ہاتھ رکھ کر سانس کی حرکت کو محسوس کرتیں کبھی منہ پر منہ
رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتیں۔ ـــــ "منے اپنی نصیبوں جلی
ماں کو اکیلا چھوڑ کر تم کہاں چلے؟ عید کے کپڑے تو ایک دفعہ
اور پہن لئے ہوتے!"

سخت پریشانی میں رات بسر ہوئی۔ بیگم کو ہر لمحہ یہی
گمان ہوتا تھا کہ منے کی سانس بند ہو گئی اسکا جسم ٹھنڈا ہو گیا
خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ذرا اُن کی عقل ٹھکانے آئی سمجھیں
دو تین گھنٹے میں مر جانے والا بیمار اگر رات بھر زندہ رہ جائے
تو سمجھو خدا اُسے اچھا ہی کر دیگا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو
جگا کر کہا "ذرا منّے کو اب تو دیکھو کیا حال ہے اُسکا، میں تو سمجھتی
ہوں اب خدا کا فضل ہو جائیگا۔"

ڈاکٹر صاحب بھی رات بھر بے چین رہے تھے۔ کچھ تو
بچہ کا خیال کچھ بھوک کی تکلیف، نیند آتی تو کس طرح بس مسہری
پر پڑے کروٹیں ہی بدلتے رہے تھے، فوراً اُٹھے اور جھک کر
پہلے منّے کو نگاہوں سے دیکھا پھر سینہ کو انگلیوں سے ٹھونکا۔
پھر نبض دیکھ کر کہنے لگے "پہلے سے تو کچھ اچھا ہے۔ مگر بالکل
اطمینان ابھی نہیں کیا جا سکتا"۔

بیگم کی بے حواسی میں ذرا سی تو کمی ہوئی اور اُسکا نتیجہ یہ
ہوا کہ رونا دھونا بند کر کے اب وہ دعا میں مصروف ہو گئیں۔
چائے کا وقت ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے رات بھر کے روزے
کو چائے کی پیالی پر افطار کرنا چاہا۔ مگر بیگم نے صاف کہدیا
میرے جی کو جب تک بالکل اطمینان نہ ہوگا۔ اس وقت تک
میں منے کی پٹی نہ چھوڑوں گی" ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر باہر
چلے گئے۔ اور بارہ بجے تک مطب میں بیٹھے رہے۔ اس درمیان
میں چند بار وہ اندر آئے کبھی تو منے کو دیکھنے اور کبھی اُس کے
حیلے سے چولہے کو دیکھنے، مگر چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ بیگم نے منہ
بھی نہیں دھویا تھا، اُنکے لئے پانی بھی حرام ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر
صاحب آتے اور بچے کی نبض دیکھ کر کنکھیوں سے چولھے
کو دیکھتے ہوئے چلے جاتے، آخر دو بج گئے۔ اور اُنکی آنتیں
قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ بھوک سے جان نکلنا شروع ہو گئی۔
کھانا کھائے پورے دو وقت گذر گئے تھے۔ جو شخص دن میں
چار مرتبہ کھانے کے عادی ہو وہ ایک دفعہ بھی نہ کھائے۔ تو
سمجھ لیجئے کیا حال ہوگا، انکا سر چکرانے لگا، اور ہاتھ
پیروں میں تشنج شروع ہو گیا۔ دل ہی دل میں انہوں نے
"کہا روٹی نہیں تو چائے ہی مل جاتی!" مگر ملتی کیونکر بیگم تو بیٹھے

کے پاس سے اُٹھنے والی اسامی تھی نہیں، اور خود انہوں نے کبھی یہ کام کیا نہ تھا۔ آخر اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کر منے کا سینہ وغیرہ دیکھ کر کہا۔ بیگم اب کوئی اندیشہ نہیں رہا، بچہ خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہے لو منہ ہاتھ دھو کر کم سے کم چائے تو بنا ہی لو۔

انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا تو کسی چیز کو جی نہیں چاہتا۔"

"نہیں بیگم، دیکھو تین بج گئے تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا بنصیب دشمناں تمہیں کوئی تکلیف ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ تم ویسے ہی اختلاج کی مریض ہو اگر کہیں بھوک کی تکلیف سے دورہ پڑ گیا تو بڑی مصیبت ہو گی۔"

"مصیبت ہو گی تو ہوا کرے میں اکیلی دنیا میں رہ کر کیا کروں گی؟ میرا پلا پلایا بیٹا ہی جا رہا ہے۔ تو میں رہ کر کیا کروں گی"

"توبہ کرو بیگم توبہ! کیوں فضول ایسی باتیں کرتی ہو تمہارا بیٹا بالکل اچھا ہے!"

"بالکل اچھا ہے؟"

"ہاں اب کوئی خطرہ نہیں!"

"قسم کھاؤ، سچ کہتے ہو!"

"تمہاری جان کی قسم بالکل سچ کہتا ہوں۔ تم اُٹھو۔ چائے پکا کر لاؤ۔ منے کو بھی اس وقت چائے ہی دی جائے گی۔"

یہ سنتے ہی بیگم اُٹھیں اور منٹوں کا کام لمحوں میں ختم کر کے ۔ ۔ ۔ چائے پکا کر لائیں، تینوں نے بیٹھ کر چائے پی۔ منے چائے پیتے ہی رضائی پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے بہت روکا، مگر طبیعت اچھی تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ وہ نہ مانا۔ اور بستر چھوڑ کر گھر میں کھیلنے کودنے لگا، ماں کے جسم میں سیروں خون بڑھ گیا وہ بچہ کی طبیعت بحال دیکھ کر خوشی سے جامہ میں پھولی نہ سماتی تھی۔

جس دن بچہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے پیشینگوئی کی تھی کہ دو تین گھنٹہ میں مر جائیگا۔ اُسی روز صبح کو ان کے ایک بے تکلف دوست جو خوبصورت اور نازک اندام ہونیکے باوجود "خانصاحب" واقع ہوئے تھے، آنکھوں کی تکلیف سے بے چین ہو کر علاج کی غرض سے آئے خانصاحب کے ڈاکٹر صاحب سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ انہوں نے پوری توجہ سے آنکھ کو دیکھا، بار بار پپوٹے لوٹ کر انکا معائنہ کیا، پھر ایک آنکھ بند کرا کر خانصاحب کی کھلی ہوئی آنکھ کے سامنے انگلیاں نچا کر پوچھا "بتاؤ کے ہیں"؟

خانصاحب مداری کے بندر تو تھے نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتے، وہ اپنی دانست میں ایک معمولی سی شکایت لیکر آئے تھے اور خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کوئی اچھی دوا ڈال دینگے جس سے دو چار گھنٹہ میں آرام ہو جائیگا۔ مگر انہوں نے خلاف امید یہ کام شروع کر دیا تو خانصاحب کو بہت غصہ آیا اور بگڑ کر بولے، پاگل ہو گئے ہو ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔ میں کوئی اندھا ہوں؟

"خفا کیوں ہوتے ہو؟ تمہاری آنکھ میں موتیا بند ہو جانیکا کا اندیشہ ہے!"

"موتیا بند، احمق ہیں آپ" خانصاحب نے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"احمق ہم نہیں تم ہو ——— دو سال کے بعد انشاء اللہ

"تمہیں موتیا بند ہو جائیگا!" ڈاکٹر صاحب نے پورے وثوق سے ذرا خفگی کے ساتھ کہا، اور غالباً انشاءاللہ کا لفظ انہوں نے خانصاحب کے لفظ "احمق" کا انتقام لینے کی غرض سے استعمال کیا۔

"انشاءاللہ تم شام تک مر جاؤ گے!" خانصاحب نے جلکر کہا اور وہاں سے اُٹھ کر سیدھے ہمارے پاس آئے، دور ہی سے ہمیں دیکھ کر بولے "لو یار ہمیں تو موتیا بند ہو گیا"۔

ہم خانصاحب کی طبیعت سے واقف تھے۔ انہیں ذرا نئی نئی بیماریاں لاحق ہوا کرتی تھیں۔ دو دن کھانسی آتی رہی تو تیسرے دن وہ ضرور کہدیا کرتے تھے "پھیپھڑے خراب ہو گئے" آنکھوں میں ذرا پیلا پن محسوس ہوا اور فوراً انہوں نے حکم لگا دیا "ہمیں یرقان ہو گیا" غرض وہ خود ڈاکٹر صاحب سے زیادہ پیشینگوئی کے مریض تھے۔ چنانچہ ہم نے ان کی اس عادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بے پروائی سے کہدیا ——— "خدا رحم کرے!"

"خدا رحم کرے ——— بس اور تم کچھ نہ کرو، خدا کی قسم ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے دو سال کے بعد موتیا بند ہو جائیگا۔ ذرا غور سے آنکھیں دیکھو اور کوئی معقول بندوبست کرو"۔

ہم نے قریب بلا کر خان صاحب کی آنکھیں دیکھیں ہماری رائے میں معمولی آشوب کے علاوہ کوئی بات نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے کہدیا "آپ بالکل اچھے ہیں"۔ مگر انہیں یقین نہ آیا بولے۔ "اچھے کیسے ہیں جی ڈاکٹر نے کہا ہے خوب دیکھ بھال کر"

"کہا ہوگا!"

"تم کیا کہتے ہو ——— اچھی طرح دیکھو،"

"میں دو سال پہلے کی بات نہیں بتا سکتا"۔

"پھر حکمت کیوں کرتے ہو؟"

"یونہی پیٹ بھرنے کو!"

"پیٹ یونہی بھرنے کو، اسکے لئے عقل کی ضرورت ہے"

"ایسی عقل میں نہیں چاہتا جو دو سال پہلے ہی آدمی کو اندھا بنا دے!"

"کیا واقعی میں اچھا ہوں!"

"بالکل اچھے ہیں آپ!"

"اچھے ہیں، پھر وہی!"

"بہت بہتر، پھر اچھے نہیں ہو سمجھ لو ہو گیا موتیا بند!"

"تم تو مذاق کرتے ہو!"

"مذاق کرنے کا موقع تم ہی دیتے ہو!"

"دیکھو، خوب دیکھ کر کہو"

"خوب دیکھ لیا"۔

"تو نہیں ہے موتیا بند!"

"بالکل نہیں"۔

"نہیں جی ضرور ہے جبھی تو ڈاکٹر نے کہا ہے"۔

"اچھا تو سمجھ لیجئے ہے۔ اور اسکا علاج اپریشن کے سوا اور کوئی نہیں ہے!"

"اپریشن تو میں نہیں کراؤنگا!"

"نہیں کراؤ گے تو اچھے بھی نہیں ہو سکتے!"

"اپریشن سے آنکھ جاتی رہے گی"۔

"آنکھ تو یوں بھی جائے گی!"

"تمہاری ہی جائے گی تم ہی اندھے ہو جاؤ گے!"

خانصاحب یہ کہتے ہوئے یہاں سے بھی رخصت ہو گئے!"

اور سیدھے گھر پہنچے۔ دنیا میں ان کے تین ہی رازدار تھے۔ ایک ڈاکٹر، دوسرے ہم، تیسرے بیوی۔ دو سے وہ مایوس ہو چکے تھے بیوی سے مشورہ کرنا باقی تھا۔ گھر پہنچتے ہی بیوی سے پوچھا۔

"کیا کر رہی ہو؟

کچھ نہیں چھالیہ کاٹ رہی ہوں!

ذرا ادھر تو آؤ!

ٹھہر و آتی ہوں!

جلدی آؤ جی!

کیوں ایسی جلدی کیا ہے کہیں جا رہے ہو کیا؟

تم نے تو سوالات شروع کر دئے یہاں جان پربن رہی ہے۔ اور تم کو چھالیہ سے فرصت نہیں!

وہ سمجھیں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ فوراً دوڑی ہوئی آئیں اور بیٹھتے ہوئے بولیں کیا ہوا، خیر تو ہے؟

خیر و بر کیا ہے موتیا بند ہو گیا ہمیں!

خانصاحب نے بڑی مایوسی کیساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "موتیا بند"۔ وہ گھبرا گئیں اور مسلسل پوچھنا شروع کیا۔

موتیا بند؟

کیسے ہو گیا؟

بخار بھی تو نہیں ہے ہاتھ پیر تو بالکل ٹھنڈے ہیں تمہارے!

خدا نہ کرے جو موتیا بند ہو تمہیں! کیسے ہو گیا؟ کس نے کہا؟؟

نہیں ہو گیا ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں دیکھ کر بتایا ہے

اب وہ سمجھیں کہ موتیا بند کوئی آنکھ کی بیماری ہے۔ اب تک تو خیال تھا کہ کوئی بخار کا بھائی ہوگا۔ موتیا بند! اسی لئے انہوں نے خانصاحب کے ہاتھ پیر ٹٹول کر دیکھے تھے۔ انہوں نے غور سے خانصاحب کی آنکھیں دیکھیں مگر کچھ معلوم نہ ہوا، پوچھا موتیا بند ہے کیا بلا:

آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے۔ اور آدمی اندھا ہو جاتا ہے!

خدا نہ کرے جو تم اندھے ہو!

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں ابھی تو نہیں ہے۔ دو سال کے بعد ہو جائیگا۔

خدا نہ کرے"——— انہیں کو ہوگا انشاء اللہ وہی اندھے ہونگے، انہیں کے کوڑھ پھوٹے گا، وہی لولے لنگڑے ہونگے!

کیوں فضول کوس رہی ہو ان کی کیا خطا ہے انہوں نے دوستانہ مشورہ دیا ہے۔ کہ ابھی سے کچھ انتظام ہو جائے مگر سنتی ہو حکیم صاحب کہتے ہیں کچھ نہیں ہے'

چولہے بھاڑ میں جائیں ایسے دوست، خدا موت دے ان دوستوں کو۔ بس حکیم صاحب ہی ٹھیک کہتے ہیں۔ اللہ انہیں زندہ رکھے اور خدا اسے غارت کرے یہ ڈاکٹر تو ایسے ہی واہی تباہی بکا کرتا ہے پرسوں اس نے لونڈے کے لئے بھی تو کہدیا تھا کہ دو گھنٹے کے بعد مر جائیگا۔ رات بھر بیٹھی روتی رہی۔ صبح کو خود ہی کہدیا ——— اچھا ہو گیا اس دیوانے کا اعتبار رہی کیا؟

اچھا لونڈے کو بھی کہدیا تھا مر جائیگا" خانصاحب نے تعجب سے پوچھا'

ہاں پرسوں ہی کا تو ذکر ہے؟ پٹھانی نے جواب دیا۔

اب خانصاحب کو یقین آ گیا کہ انہیں موتیا بند نہیں ہوگا۔ یہ محض ڈاکٹر صاحب کی حماقت ہے۔ کہ شبہ میں ڈال دیا اور یہ حماقت غالباً ان کی عادت میں دخل ہو چکا ہے۔ وہ ڈنڈا لیکر اٹھے دیکھو کہیں رینڈی نہ بیٹھنا۔ پٹھانی نے کہا۔

تم لڑنے کو کہتی ہو میں اسکی جان لئے بغیر نہ چھوڑونگا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن خانصاحب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے، خانصاحب نے جاتے ہی پوچھا۔ کیا کہا تھا تم نے میرے لئے!

"میری رائے میں تم کو دو سال کے بعد موتیا ہو جائیگا اور تم اندھے ہو جاؤ گے اور تمہیں ہیضہ ہو جائیگا تم مرجاؤ گے کل دن نکلنے سے پہلے!"

"حواس بھی درست ہیں آپکے؟

دیکھو جی! ذرا زبان کو قابو میں رکھا کرو نہیں تو ساری ڈاکٹری کرکری کردونگا، جاہل، احمق، بیوقوف، ہم نے تو مارے افسوس کے صبح سے پان تک نہیں کھایا اور تم ہو۔ کہ حقہ کے دم پر دم لگائے چلے جارہے ہو۔ اور پھر کہتا ہوں حواس تو درست ہیں آپ کے؟

خانصاحب خفا ہونے کی بات نہیں میری سمجھ میں جو بات آئی میں نے بتا دی۔

تم کیا اور تمہاری سمجھ کیا، دیکھو آئندہ کسی کیلئے ایسی بات منہ سے مت نکالنا نہیں تو کوئی ایسی مرمت کرینگا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔

اچھا معاف فرمائیے غلطی ہوئی!

کیوں ہوئی؟ تمہیں میرے متعلق غلطی کرنیکا کیا حق ہے؟ غلطی کیا کرو اپنے، اپنی بیوی اور بچہ کیلئے میرے لئے غلطی کرنیکے تم مجاز نہیں ہو!

بہت اچھا اب خیال رکھوں گا۔

مگر اب تو غور سے آنکھ کو دیکھ کر بتاؤ موتیا بند تو نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ آنکھ کو دیکھ کر کہا۔ کچھ شبہ تو ہے مگر پہلے سے کم!

میں اس کو نہیں مانتا صاف کہو، نہیں ہوگا۔ ورنہ یاد رکھو میں ڈاکٹری کرنا بھلا دونگا،

ڈاکٹر صاحب بہت گھبرائے، خانصاحب کے تیور واقعی خراب تھے، اور اندیشہ تھا کہ انہیں مطمئن نہ کیا گیا۔ تو چوٹ کئے بغیر نہ مانیں گے چنانچہ مجبوراً انہیں کہنا پڑا۔

"آنکھ بالکل اچھی ہے، اب کوئی بات نہیں!

قسم کھاؤ۔

آپ کے سر کی قسم!

میرا سر مفت کا نہیں ہے۔

آپ کی جان کی قسم!

کیوں مجھے بے وقوف بناتے جاتے ہو جی، اپنی جان کی قسم کھاؤ!

بھائی خدا کی قسم کھاتا ہوں تمہیں موتیا بند نہ ہوگا۔

پہلے کیوں جھک ماری تھی۔

غلطی ہوگئی تھی۔

اب تو غلطی نہیں ہو رہی، ذرا سوچ سمجھ کر کہو۔ اگر خدانخواستہ کہیں ہو گیا۔ تو جان کی خیر نہیں تمہاری!

واللہ اب بالکل اندیشہ نہیں ہے!

لعنت ہے تمہاری عقل اور سمجھ پر ـــــ خانصاحب نے مطمئن ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا +

پروفیسر سید علی عباس حسینی ایم۔اے۔

سماج کی بھینٹ

(۱)

چودھویں رات کا چاند زمین و آسمان، درخت و سبزہ، پانی اور مٹی، عالم کے ذرے ذرے پر ایک سیمابی چادر ڈالے، رات کو دن بناتا اپنے منازل طے کر رہا تھا، اور ہوا کی دیویاں ننھے ننھے پر پھیلائے کانٹوں سے الجھتی، شاخوں کو چھیڑتی، پھول سونگھتی، اور شمیم چراتی اڑتی پھرتی تھیں۔ میں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا اس تماشے کو دیکھ رہا تھا، کہ ان سبک رَوں میں سے ایک شوخ چمن سے بھٹکتی — میرے گھر کی طرف آنکلی، اور ایک دروازے سے داخل ہوکر میری قمیص کے دامن کو حرکت دیتی، دوسرے دروازے سے نکل گئی۔

اس دلآویز اشارہ پر میں بیتاب ہوگیا۔ اور کرسی اور میز کتابیں، اور لیمپ سب باہر لے آیا۔ اپنے درس کی کتاب "لٹریری ریڈنگس" اٹھائی اور کنگسلے کے "ہیروز" کا انتخاب پڑھنے لگا۔ آرفیوس کا قصہ تھا اور رخائے مغنیات کا بیان۔ اور پھر تذکرہ یہ کہ جمادات و نباتات، شجر و حجر، پرند و چرند سب ہی اسکے گانے پر مدہوش اور متوالے ہوکر جھومنے لگتے، انسان اپنا درد، دکھ بھول جاتا، سودائیوں کا دماغ صحیح ہو جاتا۔ اور مریضوں کو شفائے کامل ہو جاتی، فرشتے تسبیح و تہلیل بھول جاتے اور ان بے نفسوں میں بھی حیات و جذبات کے عناصر نمایاں ہونے لگتے، یہاں تک کہ جب اس سرود و نغمہ کا تموج ساحل جہنم سے جاکر ٹکراتا تو وہاں کے سارے آتشیں شعلے گل ہو جاتے اور خلد بریں کے دروازے خود بخود کھل جاتے! لیکن خود آرفیوس کا زخم لاعلاج، اور درد لادوا رہا۔ پلوٹو کو رام کرنے پر بھی یوریڈیڈ نہ ملی، اور اسلئے اسکے دن ہمیشہ روز غم اور راتیں شب ہجر ہی رہیں!

نہ معلوم شب ماہ، ٹھنڈی ہوا اور آرفیوس کے قصے نے مل جلکر مجھ پر کیا اثر کیا، کہ میں نے ایک انگلی تو اس ورق میں رکھی اور دوسری انگلیوں سے کتاب بند کرکے اٹھائی اور دونوں ہاتھ بغل میں دبائے، کرسی پر آہستہ آہستہ جھوم جھوم کر سوچنے لگا، کہ "یہ عشق کیا بلا ہے، کیسے ہوتا ہے، اور کیوں؟ اور پھر یہ مرض و جنون کی کوئی قسم ہے یا صحت دماغ کی کوئی اعلیٰ ترین منزل! اسکی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ ایک بھلا چنگا آدمی کسی دوسری شخصیت کے لئے اس قدر بے چین ہوکہ عزت و غیرت سب بھول جائے، اپنے آرام اور چین کا، تن بدن کا اسے ہوش نہ رہے، اور کھانا پینا تک حرام کرلے!

آخری بات میرے سن کے لحاظ سے میرے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دقت طلب تھی! بہرحال اسوقت کرسی پر بیٹھے بیٹھے عجیب و غریب طرح کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے، کچھ اچھے کچھ برے لیکن سب حسن و عشق کے

متعلق . . . .

"جی چاہتا تھا کہ کوئی حسینہ ملتی تو دل لگا کر دیکھتا، لیکن سن کا مقتضا یہ تھا کہ وہ بے اعتنا و بے نیاز نہ ہوتی بلکہ اسکی آنکھوں میں حیا کے ساتھ لگاوٹ بھی ہوتی۔ میں روٹھتا، اور وہ مناتی، میں شکوے کرتا، اور وہ خوشامدیں کرتی۔ اور اگر کبھی اسکی متوالی آنکھوں میں موتی جھلکتے تو میں انہیں عطر میں ڈوبے ہوئے ریشمی رومال سے اٹھا لیتا، وہ مجھ سے کوئی بڑا خطرناک کام انجام دینے کو کہتی اور میں اُسے نہایت جانبازی سے کر دکھاتا، اور میری واپسی پر وہ چشمہائے سرگیں میں آنسو بھرے خوش خوش، پیارے انداز اور میٹھے لہجے میں شکریہ ادا کرتی، اور میں اس جان جوکھم کام کو اسکے سامنے اس تیور سے بیان کرتا جیسے وہ میرے لئے بالکل بائیں ہاتھ کا کھیل ہی تھا!

اللہ اللہ خیال کی وسعت کی کہاں سمائی؟ ذرا تخیل کی باگ ڈھیلی کر دیجئے، اور یہ منہ زور نہ معلوم کہاں سے کہاں لے بھاگتی ہے! اس وقت مجھے میری تخیل لے بھاگی تھی اور میں اپنے کو بنارس کے ایک پختہ مکان کے کوٹھے پر بیٹھا دیکھتا تھا، بلکہ میرے سامنے دنیا کی دلہن اپنی ایک ایک ادا میں ہزاروں دلربائیاں چھپائے کھڑی تھی، اور میں فرعون کی طرح جبروت سے اکڑا اکڑا اسکی طرف دیکھتا، اور وہ سر نیاز خم کئے ابروؤں کے ایک ایک اشارے میں شداد کی بہشت سے زیادہ خوبصورت و خوشنما محل کھڑا کر دیتی، اور اس میں شیریں سے زیادہ حسین اور ہیلن سے زیادہ دلربا زلیخائیں بٹھا دیتی۔ جو میری طرف لگاوٹ سے دیکھتیں۔ اور میں نخوت سے منہ پھیر لیتا!

دل میں ان انوکھے جذبات نے آ آ کر مجھے پڑھنے نہ دیا، اور میں کرسی سے اُٹھ کر اسی طرح کتاب اور ہاتھ بغل میں دبائے چھت پر ٹہلنے لگا، واقعات کی لڑی جوڑنے والے نے تصورات کی تصدیق کی یعنی دیکھتے دل کو کراہنے کی آواز سنائی۔ گویا لال لوہے پر چوٹ پڑی، چنگاریاں اڑیں اور قلب و جگر میں پھیل گئیں، استعجاب و تفتیش نے تاک جھانک کی سجھائی آنکھوں نے خالی مکان میں ایک کمسن نوجوان عورت کو صحن میں پلنگ پر تڑپتے اور کراہتے دیکھا، ہاتھوں نے بانس کی سیڑھی دیوار میں لگا دی، اور کانپتے پیروں نے "سندر" کے پاس پہنچا دیا۔

(۲)

ایک کمپاؤنڈر دوست کے ذریعے سندر کا مہینوں میں نے علاج کرایا، اور وہ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کے قابل ہوئی۔ پانچ برس کے سن میں بیاہی گئی اور بارہ برس کی عمر میں جبکہ وہ تعلیم پا رہی تھی بیوہ ہوئی عنفوان شباب میں شوہر کے پیار اور محبت کی جگہ ساس کی جوتیاں تھیں، اور نندوں کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں طبیعت کی برائی نے نہیں بلکہ معاشرت کی خرابیوں اور ہر لمحہ کی تلخ کامیوں نے ایک جوان کہار کی چکنی چپڑی باتیں سننے پر آمادہ کیا، وہ اس ناکردہ کار کو شہر بھگا لایا اور اس خالی مکان میں چھریاں مار کر اپنی دانست میں ہلاک کر کے، زیور و نقد سب لیکر بھاگ نکلا۔

میں نے سندر کی تیمارداری کی اور اسکا قصۂ غم سنا، اور اُسکے حسن خداداد اور دلربایانہ اداؤں کا شکار ہو گیا جتنا اختلاط و ارتباط بڑھا، اتنا ہی اُسکا خلوص اور بھولا پن ظاہر ہوتا گیا۔ اور اسی قدر میرے جذب میں زیادتی ہوتی گئی

خیال صرف اتنا تھا کہ میرے عشق اور کہار کی حرص میں فرق رہے اور کہیں کسی فعل سے سندر کی نگاہ میں ہم دونوں ہم پلہ نہ اتریں۔

لیکن آہستہ آہستہ محبت کی چنگاری نے دل و دماغ میں آگ لگا دی، اور چشم و دہن سے شعلے نکلنے لگے بسکول میں غیر حاضری بڑھی اور کھیل کود ہنسی مذاق سب چھوٹا۔ ہر لمحہ اور ہر سیکنڈ سندر سے علیحدہ رہنا گراں گزرنے لگا۔ اور ہر وقت بدحواس رہنے لگا۔ بزرگ کھٹکے، اور ماتا پتا میں سرگوشیاں ہوئیں، جاسوس بٹھائے گئے۔ تحقیق و تفتیش شروع ہوئی، اور شدہ شدہ میری دیوانگی کے اسباب انہیں بھی معلوم ہو گئے، میں آشفتہ حال تھا۔ مجھے نہ بدنامی کا ڈر، نہ رسوائی کی پروا، ہاں صدمہ اس وقت ہوتا جب لوگ میری پاک اور صاف محبت پر حرف دھرتے اور اُسے گندے ناموں سے پکارتے۔ اگر بزرگ ہوتے تو تھوڑا رو لیتا، لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا، مگر جب ہم عمر اعزا و احباب یہ کہتے کہ خالی مکان، اسمیں ایک خوبصورت عورت، وہ بھی جوان، اور پھر اپنی مرہون منت، اور سر ہلا کر اور مسکرا کر سعدی کا یہ شعر پڑھتے کہ:۔

لمحۂ گرسنہ در خانۂ خالی بر خواں
عقل باور نہ کند کز رمضاں می ترسد!

تو میرا جی چاہتا کہ اپنی جان دے دوں یا انکا گلا گھونٹ دوں لیکن جب اپنے کو بے بس پاتا تو دم گھٹنے لگتا اور بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر فریاد کرتا کہ:۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور پھر گردن جھکائے، آنکھوں میں آنسو بھرے ان کے مجمع سے بھی اُٹھ کر چلا جاتا، وہ بوالہوس بھلا میرے درد کو کیا سمجھتے، اور اُن کو میری روح تکلیف کا کیا احساس ہو سکتا تھا؟ میں انہیں یہ کیونکر سمجھاتا کہ ہم دونوں نے ایک زمانہ تک اس گفتگو ہی سے احتراز کیا، اور اگر اشاروں کنایوں میں کچھ ذکر بھی آیا تو میرے ایک خیال اور سندر کے ایک فقرے نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میرا خیال تو صرف اتنا تھا کہ میں اسے جائز طور پر اپنی بیوی بنا کر اس کا غلام بننا چاہتا تھا۔ لیکن سندر نے ایک جملہ کہا اور اسی پر جمی رہی اور وہ یہ تھا کہ "میں بد نہ سہی لیکن بدنام ہوں، اسلئے میں کسی شریف کی بیوی بننے کے قابل نہیں رہی، اب میں صرف نفس پرستوں کا شکار بن سکتی ہوں، اور محض اسی کے لائق ہوں اور اسی کی مستحق!"

میں اس جواب پر چپ تو ہو رہتا، لیکن میرا دل کہتا کہ "اس غیرت اور حس پر سینکڑوں رسمیں نثار اور ہزاروں نیک نامیاں قربان!" اگر کبھی دبی زبان میں اس کا اظہار کرتا، تو وہ کبھی تیوری سے لیکن غم آلود لہجہ میں کہتی کہ "موہن! دیکھو اپنی اور میری سچی محبت میں داغ نہ لگاؤ۔ ہندو عورت گر کر نہیں ابھرتی، اور نہ میں تمہاری دشمن ہوں کہ اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبوں۔ اے موہن میں اس قابل نہیں رہی ورنہ یہ کہہ دیتی کہ تم مجھے اپنی بہن سمجھ لو!"

ممکن تھا کہ ہماری پاک و صاف نیتیں بدل جائیں اور میں اعصابی کشمکش کا شکار ہو جاتا، لیکن زمانے نے بھی مہلت نہ دی، اور اس آسمان کج رفتار کو ہمارا چار دن کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہنس بول لینا بُرا لگا، اور ہمارے اس لہلہاتے باغ میں جس کی ہم دونوں خون جگر سے خوش خوش آبیاری کر رہے تھے۔ دفعتاً اور اچانک خزاں آگئی۔ اور ع

جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

(۳)

ایک روز میں اپنے کوٹھے پر بیٹھا تھا، اور سندر اپنے صحن میں کھڑی تھی، ہم دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی، اس نے پوچھا "کون؟" آواز آئی موہن کا باپ۔ غریب سندر کی گھبراہٹ، اسکا اضطراب، اسکا خوف دیکھا نہ جاتا تھا وہ اب ہر شریف مرد و عورت کا سامنا کرنے سے بے حد ڈرتی تھی اور پھر خود پتا جی! وہ بھی ایسی حالت میں کہ انہیں یہ یقین کہ اس نے انکے ناکردہ کار صاحبزادے کو اپنے دام تزویر میں پھنسا رکھا ہے اسکا اگر بس چلتا تو وہیں زمین میں گڑ جاتی لیکن ان کو منہ دکھاتی وہ بار بار آنچل سے پیشانی کا عرق پونچھتی اور دونوں ہاتھ بے چینی سے زور زور سے ملتی۔ میری خود حالت ناگفتہ بہ تھی، دل بیٹھا جا رہا تھا، دماغ پریشان، حواس مختل۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سندر کو کیا رائے دوں، کہ اتنے میں کنڈی پھر کھڑکی۔ میں نے دل کڑا کر کے اس سے تو دروازہ کھولنے کو کہا اور خود چھت پر اس طرح سیدھے لیٹ گیا کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں۔

سندر نے بڑا سا گھونگھٹ نکالا۔ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا، پتا جی اندر داخل ہوئے، اور صحن میں پلنگ پر بیٹھ گئے، وہ حسن کی دیوی ایک گنہگار مجرم کی طرح ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہی

باپو جی پہلے اسے سر سے پیر تک بغور دیکھا کئے، اس کے بعد رُک رُک کر بولے "ٹھکرائن۔ یہ کہنا کہ میں تمہاری اور موہن کی حرکتوں سے ناواقف ہوں، بالکل غلط ہوگا۔ میں تمہاری جیسی عورتوں کے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن میں تم سے صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ تمہارے اور موہن کے تعلقات بس اب ختم ہیں دیدہ و دانستہ اپنے بچے کو جہنم میں نہیں پڑا رہنے دونگا۔ تمہیں اگر روپوں کا لالچ ہے، تو مجھ سے سو دو سو روپے لے لو، اور اب یہاں سے چلی جاؤ۔ نہیں تو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں موہن کو بھی گھر سے نکال دونگا۔ اور وہ میری کمائی کا ایک پیسہ نہ پا سکیگا۔"

سندر مار گزیدہ کی طرح پیچ و تاب کھاتی سنا کی۔ اور اسکے بعد گھونگھٹ چہرے سے کھینچ کر تنکے کھڑی ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، چہرہ سُرخ تھا، نتھنے پھڑک رہے تھے۔ باپو جی بولی "بابا میں ابھی اتنی نہیں گری کہ موہن سے آدمی کو خراب کردوں، آپ نے جو کچھ کہا وہ میرے کئے کا بھوگ ہے، نہیں ایسی پاپن ہوتی اور نہ آپ اس طرح کے جھوٹے الزام لگاتے، لیکن باپو جی میرے کرم برے سہی لیکن میرا خون برا نہیں، اور میں یہ کہوں گی کہ میری اور موہن کی محبت اس قابل نہیں کہ آپ اسے اس طرح بدنام کریں، آپ نے شاید میری سی کمینی عورت سے بھی محبت نہیں کی، ورنہ آپ ایسا نہ کہتے!" باپو جی نے سندر کو ایک بار پھر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور اُسکے حسین مگر خشمگیں چہرہ سے مرعوب ہو کر لب و لہجہ بدلکر بولے "ٹھکرائن صاحبہ! مجھے آپ کی شرافت میں شک نہیں، لیکن آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ میں موہن کا باپ ہوں۔ مجھے تو مستقبل کی بھی سوچ ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی اور اس کی محبت دیوانہ پن تک پہنچ چکی ہے، اور اب اسے تو بدنامی تک کا خیال نہیں۔ پھر ایسی حالت میں اگر کہیں آپ دونوں نے شادی بیاہ کی ٹھہرائی تو میں کہیں کا نہ رہونگا، برادری سے نکالدیا جاؤنگا۔ اپنے پرائے سب منہ نہیں گے، اور سب سے زیادہ تو یہ کہ آئندہ نسلوں کو کوئی کبھی پوچھے گا بھی نہیں۔ کیا پریم کے یہی معنی ہیں

کہ آپ موہن کی زندگی اس طرح برباد کردیں ؟ کیا محبت اسی کو کہتے ہیں ؟ اور کیا عشق اسی کا نام ہے ؟"

سندر نے کانپ کر کہا" بابوجی میں آپ سے پہلے کہہ چکی ہوں کہ میرے لئے شادی بیاہ ایک انہونی بات ہے میں تو بیاہی بیاہی چکی ، رانڈ ہو چکی ! اب سوائے کرم کھوٹنے کے اور کیا لکھا ہے ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اور پھر وہ بابوجی سے اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی میں کچھ نہ سن سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ جانے لگے تو اس نے جھک کر بابوجی کے پیر چھو لئے اور بولی" آپ موہن کے پتا ہیں !" اور وہ تھوڑی دیر اسکے سر پر ہاتھ رکھے کھڑے رہے پھر روتے ہوئے گھر سے باہر چلے گئے۔ بابوجی نے جس حقارت جس طعن و تشنیع سے اس مکالمہ کی ابتدا کی تھی، اسکی تکلیف میرے دل کو خون کئے دیتی تھی، لیکن اس وقت مجھے اس درد سے زیادہ سندر کی اس حرکت پر غصہ تھا کہ اس نے خواہ مخواہ آواز نیچی کرکے جو بابوجی سے باتیں کیں، انہیں مجھ سے چھپانا کیوں چاہا ؟ اس لئے انکے جاتے ہی میں نے اس سے پکار کر پوچھا" کیوں جی یا یہ تم سے اور بابوجی سے چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی تھیں ؟" وہ نیچی نظر کئے کچھ عجیب انداز سے بولی کچھ نہیں، انہیں سمجھا رہی تھی۔" میں ذرا ترش ہو کر بولا" آخر کیا سمجھا رہی تھیں ؟ میں بھی تو سنوں !"

اس نے نظر اونچی کی اور میں نے دیکھا کہ گو اسکے لبوں پر مسکراہٹ تھی، لیکن آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ بولی" اور جو تمہارے سننے کی باتیں نہ ہوں تو ؟" تکلیف اور غصہ جب دونوں بیک وقت موجود ہوں، اور پھر جب کم سنی بھی ہو، اور ناتجربہ کاری بھی، پھر انسان کے دل سے صبر کیوں نہ جاتا رہے ؟ میں یکبارگی غصہ سے بھڑک اٹھا، اور خفا ہو کر یہ کہتا وہاں سے چلا" اچھا خیر نہ بتاؤ۔ میں تو غیر ہی ہوں، مجھ سے نہ چھپاؤ گی تو اور کس سے !"

میں دو چار ہی قدم وہاں سے آگے بڑھا تھا کہ سندر نے بڑے درد بھرے لہجے میں پکارا" موہن! موہن!" میں نے پلٹ کر کہا" کیا ہے ؟" میں نے دیکھا کہ وہ آشفتہ مو، دیوانہ وار، دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے، اور اس کی آنکھیں بڑی منت سے مجھے اپنے پاس بلا رہی ہیں۔ میں جلدی جلدی سیڑھی سے اتر کر اسکے پاس پہنچا، وہ زمین پر بیٹھ گئی اور میرے پیر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میں بھی اسکے برابر بیٹھ گیا، اور اسکے گلے میں باہیں ڈالکر گال سے گال ملاکر اس طرح رویا کہ ہم دونوں کے آنسو گنگا جمنا کی طرح دوش بدوش بہنے لگے۔ سندر نے دفعتاً میری طرف دیکھا، کچھ مسکرائی اور اپنی نازک انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ کر بولی" یہ کیا ؟ کہیں مرد بھی آنسو بہاتے ہیں" میں خجالت سے مسکرا کر چپ ہو رہا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لیکر آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولی" موہن خوب یاد رکھو، کہ مرد کی سب سے بڑی یہ ہے کہ وہ کٹھن سے کٹھن مشکل جھیلے مگر اف نہ کرے۔ اگر اس سے یہ نہ ہو سکا تو وہ مرد عورتوں سے بدتر ہے تم سن میں مجھ سے زیادہ سہی لیکن پھر بھی بچے ہو۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو خفا نہ ہو۔ میں سچ کہتی ہوں۔ عورت مرد سے پہلے سیانی ہو جاتی ہے، اور پھر وہ بھی میری سی عورت جس نے اس اتنی سی عمر میں کیسے کیسے دکھ اٹھائے ! میں جانتی ہوں، بابوجی سچ کہتے ہیں۔ ہمارے رواسم جیسے ہوں یا برے، لیکن ہم

تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ میں اپنے ہاتھوں تمہاری ساری زندگی برباد نہیں کر سکتی!"

میں نے کہا "تم نہ معلوم کیا کہہ رہی ہو سندر! تمہیں مجھ سے محبت نہیں، ورنہ ایسا ہرگز نہ کہتیں۔" اس نے میرا چہرہ چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھوں سے میرا پیر چھو کر بولی "تم میرے سوامی ہو، اور میں تمہاری داسی، تم میرے مالک ہو اور میں تمہاری لونڈی!"

میں نے ایک مرتبہ اُسے گود میں سمیٹ لیا اور مردانہ وار بولا "تمہیں بننا پڑے گا!" وہ نرمی سے میرے ہاتھوں کو علیحدہ کرکے کھڑی ہوگئی اور بلائیں لیکر بولی "تم پر سے آبرو، اور جان دونوں قربان! لیکن یہ نہیں ہوسکتا، میں بابوجی سے بات ہار چکی۔ اس گئی گذری حالت پر بھی اپنی زبان، اپنے وعدہ کا اگر خیال نہ کروں تو پھر راجپوتنی کیسی؟"

مجھے بھی کد ہو چلی تھی کہ اقرار لے ہی کر چھوڑونگا کہ اتنے میں میرے کوٹھے سے ماتاجی کے پکارنے کی آواز آئی۔ ہم جلدی سے ایک دوسرے سے دور ہوکر کھڑے ہوگئے۔ وہ وہیں سے کہنے لگیں "کھانا تیار ہے جلد آؤ" واپس چلی گئیں۔ اور سندر نے جلدی سے گلو خلاصی کا پہلو پاکر اصرار کیا کہ "کھانا ٹھنڈا کرنیکا کیا نتیجہ؟ جلدی جاؤ!" میں بھی چپکا واپس ہوا، جب سیڑھی پر چڑھ رہا تھا تو سندر نے کہا "اور موہن دیکھو کھانا کھا کر سکول چلے جانا، بابوجی کو بڑا رنج ہے کہ سکول کا آخری سال اور تمہاری اتنی غیر حاضری!"

میں نے کہا "اچھا! اچھا" جب میں سیڑھی سے اپنے کوٹھے پر چڑھ چکا تو وہ بولی "اور دیکھو سکول کے بعد کھیلنا بھی ضرور۔ وہ کہتے تھے تم نے اس طرف سے بھی بے پروائی کرکے اپنی صحت خراب کر لی ہے۔" میں نے کہا "اونہہ سب بکتا ہے" وہ بولی "میرا ہی خون پیو جو اسکے سوا اور کچھ کرو۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کر ہامی بھرلی، اور کھانا کھانے چلا آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اُن محبت کی تاکیدوں میں کیا راز نہفتہ تھے؟ اور گھر سے شام تک میری غیر حاضری کس لئے ضروری تھی؟ شام کو جب پلٹ کر گھر آیا تو ماتا نے بڑی محبت سے ہاتھ منہ دھلایا، اور تازہ مٹھائیوں کا ایک دونا اور ربڑی کا ایک پیالہ میرے سامنے لاکر رکھا۔ میں نے پوچھا کہ "آج کیا ہے جو مامتا پھٹی پڑتی ہے؟" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "میں یا تمہارے پتا جو کچھ کرتے ہیں وہ مامتا ہی کرواتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور میں نے جلدی سے مٹھائی سے ہاتھ کھینچکر پوچھا "آپکو میری جان کی قسم سچ بتائیے کیا بات ہے؟" وہ بولیں "تمہاری ٹھکرائن آج کہیں چلی گئیں۔"

میں اسی طرح جھوٹا ہاتھ لئے دوڑ کر کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اور وہاں سے سندر کو دیوانہ وار آوازیں دینے لگا، پھر سیڑھی لگاکر نیچے اتر گیا مکان کا کونہ کونہ ڈھونڈھ ڈالا مگر وہ کہیں نہ ملی۔ ہاں ایک جگہ ایک پرچہ ملا، لکھا تھا۔

"پیارے۔ میں جاتی ہوں، میری تلاش نہ کرنا، ایک شریف مرد کی طرح یہ کٹھن جھیلنا۔ ایسا نہ ہو کہ بوڑھے ماں باپ کے دل کو صدمہ پہنچے۔ دیکھو میرا ہی دشمن ہو جو اس کے سوا کچھ اور کرو۔ تمہاری "سندر"!"

میں بدحواس تمام رات شہر میں مارا مارا پھرا، اور کئی بار اسٹیشن تک دوڑا گیا۔ بالآخر میری تلاش میں آدمی نکلے

اور لوگ مجھے زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ گھر پہنچتے ہی مجھے اتنا سخت بخار آیا کہ سرسام ہو گیا، اور لوگ کہتے ہیں کہ پندرہ روز تک میرے بچنے کی بالکل ہی امید نہ تھی

(۴)

بیماری سے اُٹھنے کے تھوڑے دنوں بعد تک دماغ اسطرح بیکار ہو گیا تھا کہ مجھے پچھلی باتیں یاد ہی نہ آئیں، اور جب حافظہ لوٹا بھی تو ضعف کیوجہ سے کد و کاوش کی ہمت نہ پڑی لیکن جب بالکل تندرست ہو گیا تو تھوڑے بہت ہاتھ پیر ہلائے مگر ساری سعی لاحاصل نکلی۔ سندر کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا، بابوجی نے بار بار خوشامد کر کے اِس کو اتنا سنایا کہ وہ کلکتہ جانیوالی گاڑی پر بٹھا دی گئی۔ اب وہ کہاں ہے؟ یا کیا کر رہی ہے؟ اس کا انہیں مطلقاً علم نہیں۔ میں نے کلکتہ اپنے احباب کو خط لکھے۔ اخباروں میں اشتہار دئے لیکن اس گمشدہ کی کوئی خبر، کوئی اطلاع نہ ملی۔

آخر زمانے نے، جو ایسے زخموں کے لئے بہترین مرہم ہے آہستہ آہستہ اپنا کام کرنا شروع کیا اور میں رفتہ رفتہ دنیا کا بُرا بھلا سمجھنے لگا، اور انٹرنس اور ایف اے پاس کر کے گریجویٹ بنا اور پھر قانون پڑھ کر وکیل ہو گیا، ماتا پتا جنت سدھارے اور میرا بڑا لڑکا مدن پیدا ہو چکا تھا کہ ایک رات کو مدن کی ماں سے حُسن و عشق کی نیرنگیوں کا ذکر آ گیا، اور باتوں کا سلسلہ سندر تک پہنچا، وہ سارے قصے سے واقف تھیں، اور اُن کا خیال تھا کہ اس نے مجھ سے خفیہ بھاگ کر محبت کے انتہائی مدارج کا نہایت ہی کامیابی سے امتحان دیا، اور عشق کی سخت ترین جانچ میں پوری اتری، اسی بحث اور اسی خیال میں ہم سو رہے۔ میں کیا خواب دیکھتا ہوں کہ سندر کی لاش میرے سامنے پڑی ہے۔ اُسکا پھول سے زیادہ نازک جسم تختہ کی طرح اکڑا ہوا ہے، اُسکے وہ تلوے جن کا چومنا میں اپنا فخر سمجھتا تھا۔ عجیب طرح اینٹھے سوکھے ہوئے ہیں، اُس کی وہ اُنگلیاں جن کی نزاکت چغتائی کی تصویروں کو شرماتی تھی، سربت کی طرح سخت وسپید ہو گئی ہیں، اور اسکا وہ چہرہ، جس نے بابوجی کے سے آدمی کو بھی رُلا دیا، بھیانک سا معلوم ہوتا تھا، میں روتا ہوا اُسکی طرف بڑھا کہ لوگ اُسے کاندھوں پر اُٹھا کر مرگھٹ کی طرف لے چلے، اور میں بھی اُنکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہائے وہ شام کا وقت، وہ دریا کا کنارا، وہ لکڑی اور چتا کی تیاری میں ردوکد، پھر اس پر سندر کی لاش کا رکھا جانا، اور اُف اُف اُس پر گھی کا چھڑکاؤ، اور شعلوں کا بھڑکنا، میں نے دیکھا کہ اُن جلتی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر پر سندر کھڑی ہو گئی، شعلے بھڑک بھڑک کر اُٹھتے تھے، اور اُسکے گلاب سے گالوں کو شنجرفی بنا دیتے تھے۔ پیٹھ کی طرف جو ساری کا حصہ تھا، وہ یکبارگی جل گیا، اور اسکا صندلی رنگ کندن کی طرح چمکنے لگا اور ہوا کے تھپیڑوں سے اُسکا جوڑا کھل گیا۔ اور اُسکی لٹیں لہرانے لگیں کبھی ناگنوں کی طرح گردن و کمر میں پیچ کھاتی لپٹ جاتیں، کبھی دور تک اُڑتی چلی آتیں، اور پھر رخ و جسم کو چھپا لیتیں، اور سندر گھبرائی ہوئی، ڈری ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی، دفعتاً اس کی نظر مجھ پر پڑی، اور بڑی بےبسی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر پکاری "ارے بیوفا موہن! اب تو مجھے اس جلتی آگ سے بچا لے!" میں بڑے زور سے چیخکر اُس کی جانب چلا تو مجھے مجمع کے لوگوں نے پکڑ لیا۔ میں

تڑپتے اور ان سے اپنے کو چھڑانے ہی کی کوشش میں تھا کہ ایک شعلہ ہوا کے ساتھ چلا اور اس کی ایک لپک میں پیر سے سر تک کی ساری جلکر گر پڑی اور سندر اس کے اندر اس طرح چمک رہی تھی جیسے شیشے کے اندر بجلی کا بلب کے اندر روشنی کے تار! ایک منٹ تو وہ یونہی میری طرف ہاتھ پھیلائے دیکھا کی، اسکے بعد اسکے نازک اور پتلے ہونٹ ہلے اور ان سے ہلکی مہین آواز نکلی "ہا! یوگا!" اور پھر جلتی ہوئی چتا میں خاک کا ڈھیر تھا۔

میں بڑے زور سے تڑپا اور آنکھ کھل گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کمر تک پلنگ کے نیچے لٹک رہا ہوں اور دونوں تھامے مدن کی ماں تھامے رو رہی ہیں۔ میں ان کی گود میں سر رکھ کر دیر تک عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا، اور ان سے خواب دہراتا رہا۔ آخر انہوں نے تسلی اور دلاسا دیکر چپ کرایا، اور کسی طرح پھر نیند آگئی۔

(۵)

دوسرے دن مجھے تار ملا "سندر کو طاعون ہوگیا ہے آنکی تاریخ سے بذریعہ تار اطلاع دو۔ سکرٹری بدھوا آشرم پٹنہ"

تار سے خواب کی تعبیر ملی اور مجھ میں تمام وہ کیفیتیں عود کر آئیں جو سندر کے جانے کے پہلے پائی جاتی تھیں۔ وہی [illegible] وہی مدہوشی وہی دیوانگی [illegible] کہ تار کا جواب دیا "کل ڈاک سے آرہا [illegible] دوسرے دن [illegible] متعلقہ سے سونپ کر گھر پہنچا، اور مدن کی ماں سے حال دہرایا، وہ محبت سے بولیں "فوراً جاؤ۔ نہ معلوم اس بیچاری کی کیا حالت ہو، رام کرے اچھی ہی پاؤ!"

میں پٹنہ کے سفر اور "بدھوا آشرم" تک پہنچنے کی حالت نہیں بیان کرسکتا اسلئے کہ میں اسوقت تک اپنے حواس میں نہ تھا جب تک کہیں سندر کے پلنگ کے پاس نہ پہنچ گیا، اسوقت، وہ میلی کچیلی ساری پہنے، ایک پھٹا سا چادرہ اوڑھے پڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اس طرح مسکرائی کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور میں نے اُسکے گلے میں باہیں ڈالکر کہا "ہائے سندر میں آج تمہیں کہاں اور کس طرح پا رہا ہوں؟"

وہ مسکرا کر بولی "وہ رات بھیگی ہوئی وہ کمرا اپنا میرا، ہر ایک وقت تو ایسا سماں نہیں ہوتا! لیکن صرف تھوڑا ہی فرق ہے۔ کہ جی اس وقت بھی رہی ہوں، ہاں رات نہیں دن ہے، جب تاریکی تھی، سجھائی نہیں دیتا تھا، اب سب کچھ دکھائی دیتا ہے، لیکن بڑا انتظار کرایا، بس تمہارے دیکھنے کو آنکھوں میں جان آگئی تھی!"

یہ کہتے ہی کہتے اعضا شکنی ہونے لگی، اور وہ مجھے پلنگ سے ڈھکیل کر بولی "موہن مجھ سے الگ اس کرسی پر بیٹھو! ہائے رام میں کہتی ہوں تم پھر نہیں مانتے۔ اور مجھے ایسا روگ ہے جو خود مجھے دوسروں کی تیمارداری سے ہوا! لیکن میرے لئے تو یہ دوا بنکر آیا! تم کیوں اس میں پھنسو! بس وہیں کرسی پر بیٹھے رہو! پرماتما کے لئے مجھے نہ چھوو۔ میری ایسی ہزار جانیں تم [illegible] تمہارے دشمنوں کا بال بیکا نہیں دیکھ [illegible] اب اس دنیا سے جا رہی ہوں، رو نہیں، ہائے بھگوان! میں تم کو کیسے سمجھاؤں؟ مرنا سب کے لئے ہے، امیر غریب سب کو یہی دن دیکھنا ہے، بڑے بڑے لوگ جو پیشنور کے اوتار مانے جاتے تھے، جن کی لوگ پوجا کرتے تھے، سب خاک میں مل گئے، یہ دن تو سب کو دیکھنا ہے لیکن میں خوش قسمت ہوں، بھاگوان ہوں، کہ تمہارے سامنے اس

دنیا سے اُٹھتی ہوں۔ اور گو دکھ سہے مصیبتیں جھیلیں، پھیپھو یہ نرم نرم ہاتھ جنہیں تم چوما کرتے تھے، اب کیسے ہو گئے ہیں، ان سے چکیاں پیسیں، سر پر بوجھ ڈھویا، لیکن تمہارے ہی پریم کی سوگند دنیا سے باعصمت جا رہی ہوں، میں، شائد تمہیں اب بھی نہ بلاتی، لیکن موت کے یقین نے آخری دیدار کے لئے دل کو بے قابو کر دیا، اور دوسرے تم سے ایک وعدہ لینا ہے موہن! میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرو، ارے میں بھول گئی، نہیں نہیں تم اپنی جگہ بیٹھے رہو، خالی زبان سے تمہارا کہہ دینا کافی ہے تم ہمیشہ بات کے دھنی رہتے، میرے سوا، تم ہمیشہ کے سچے ہو! ہاں تو تم وعدہ کرو کہ اپنے بس بھر کی کوشش کرو گے اور بدھوا بواہ کے رائج کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دو گے، ہندو ذات میں اس سے زیادہ بُرا کوئی عیب نہیں۔ اور سنتی ہوں مسلمانوں میں بھی اب بیوائیں ہماری طرح بیٹھی رہتی ہیں، اس سے تو ستی کی رسم کہیں اچھی تھی، اگر میں زندگی بھر کے لئے بیوہ نہ بیٹھی جاتی، اور اگر میری سسرال والوں نے تھوڑی بہت بھی ہمدردی کی ہوتی تو آج یہ دن کا ہے کو دیکھتی، لیکن نہیں میں تو خوش قسمت ہوں، مجھے تم سا شریف آدمی مل گیا۔ ان دکھیاریوں کا خیال کرو جو گلیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں جو بڑے گھر کی لڑکیاں ہو کر کمینی سے کمینی حرکتیں کر ڈالتی ہیں ہاں تو تم وعدہ کرو کہ ہندو مسلمانوں میں بدھوا بواہ ضرور رائج کراؤ گے، اور یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ گو میں اس پاپ سے بھرے گندے جسم کو چھوڑے جاتی ہوں، لیکن میری روح، میری آتما تمہارے ساتھ رہے گی، اور اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹائے گی اور میں دیکھوں گی کہ تم نے میرا کہا کہاں تک کیا۔ اس لئے کہ تم مردوں کو تو ہمارے نازک پھول سے جسم ہی کی قدر ہوتی ہے۔ جب یہ خاک میں مل گیا تو پھر کہاں خیال، لیکن اتنا یاد رکھو کہ پھول نہ بھی رہ جائیں تو بھی ان کی مہک رہ جائے گی! بس موہن بس۔ اب دم اکھڑ گیا، ہائے تمہیں کلیجے سے بھی نہ لگا سکی نہیں میرے سر کی قسم نہیں، تم وہیں بیٹھے رہو، اچھا اپنا ہاتھ دو بھگوان بس دو منٹ اور! اچھا اسے میرے سینے پر رکھ دو، ہاں ہاں اسی طرح، اب ذرا تسکین ہوئی . . . . اچھا . . . . . . اچھا . . . . بھگوان . . . . . . پاپن . . . آ . . . . آ . . . . . . آئی!

اور اس نے میرا دوسرا ہاتھ چوم لیا، ایک بار مسکرائی آنکھیں بند کیں، پھر کھولیں اور آنسو کے دو قطرے پلک سے رخسار پر ڈھلک آئے، اور اسی کے ساتھ خاک کے پتلے سے روح کی گرمی ہمیشہ کے لئے جاتی رہی!

(۶)

کئی دن بعد جب میں نے سندر کے کریا کرم سے فراغت پا کر بنارس کی واپسی کا ارادہ کیا، تو سہ پہر کو مرگھٹ گیا۔ اور وہاں کے متعفن سناٹے میں ریت پر لیٹا اپنے ہاں کے رواسم پر غور کر رہا تھا، اور سندر کی زندگی، اس کی عالی ظرفی، اس کی پاکدامنی، اور اس کی قربانیوں کو یاد کر رہا تھا کہ میری نظر گنگا جی کی طرف جا پڑی، میں نے دیکھا کہ سطح آب پر ایک عجیب طرح کی متانت ہے۔ اور وہاں نہ مد ہے، نہ جزر، نہ تلاطم ہے، اور نہ طوفان۔ بلکہ روانیٔ آب کے دلکش مگر مدہم سرود میں ایک خاموش مسرت ہے، جو ساری فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ اور ایک وقار و سکون ہر طرف محیط ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں

دھارے سے بنتی ہیں۔ اور پھر عجیب عشرت سے مٹ مٹ کر اسی میں مل جاتی ہیں، اور نہ ان کے ابھرنے پر کوئی خوشی کا اظہار ہے، اور نہ ان کے مٹنے پر شیون و ماتم! بلکہ جب مدتوں کی بچھڑی ہوئی موج آغوش ساحل سے وداع ہو کر دھارے میں غائب ہو جاتی ہے، تو چھوٹے چھوٹے حباب سروں پر بلوری کٹوریاں لئے ساقیٔ مدہوش کی طرح دور تک ناچتے چلے جاتے ہیں، اور پھر آپ ہی آپ ایک پُر ترنم نغمہ کے ساتھ اپنی شوخی و بے باکی پر شرما کر دریا کے سینے میں جا چھپتے ہیں! میں نے محسوس کیا جیسے سمندر بھی اپنی ماتا گنگا کی آغوش میں میٹھی اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ اور اُسے بیوہ ہونیکا دُکھ، نامرادو ناکام رہنے کا غم، سب کچھ بھول گیا ہے، بلکہ اُسکے دل کا کنول شگفتہ ہو کر حیات سرمدی سے لبریز ہے!

میں یہ نوید مسرت حاصل کر کے لڑکھڑاتا ہوا ساحل کے قریب گیا، دیر تک سمندر کا چہرہ پانی میں دیکھتا رہا۔ پھر میں نے جھک کر چلو بھرا، تھوڑا سا پانی ہوا کے سپرد کیا، کچھ آنکھوں میں لگایا، کچھ سے لب تر کئے، اور چند قطرے محبت کے پیاسے دل کے اوپر مل ڈالے!

عجب نہیں کہ یہ اسی کی تاثیر ہو کہ آج اس قابل ہوا کہ یہ درد کی کہانی اس طرح دُہرا سکا!

حضرتِ عدمؔ

کرشمہ

(دنیا کا مختصر ترین مختصر افسانہ)

کر رہے تھے ریل میں دو آدمی باہم سفر
ایک نے یہ دوسرے ساتھی سے پوچھا سوچکر

"واقعی کیا آپ بھوت اور پریت کے قائل نہیں؟
آپکا ذہن و تخیّل اس طرف مائل نہیں"

اسقدر اُس نے کہا۔ اور آپ غائب ہو گیا
دُوسرا فرطِ تعجب میں یکایک کھو گیا

جناب ماہر القادری

افسانہ اور نفسیات

افسانہ کی سب سے بڑی خصوصیت "نفسیات" ہے، افسانہ نویس جس قدر زیادہ نفسیاتی نزاکتوں سے باخبر ہوگا، اُسی قدر اس کو کامیابی حاصل ہوگی، دوسرے لفظوں میں یوں کہو "افسانوی پیکر" کی روح "نفسیات" ہے۔ افسانہ میں مختلف انسانوں کے کردار پیش کئے جاتے ہیں اور کردار کی یہ ترجمانی اور پیشکش اُسوقت تک مکمل نہیں ہوسکتی، جب تک کہ افسانہ نگار کی نگاہ کے سامنے نفسیات کے ابواب کھلے ہوئے نہ ہوں۔ نفسیاتی جملے قارئین کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی دل کی کتاب کے ورق الٹ رہا ہے۔ برخلاف اسکے جن افسانوں میں بزم و مکان کی تفصیل اور باغ و بہار کی کیفیت پیش کی جاتی ہے، وہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ کو خوش تو کر دیتے ہیں، مگر کوئی خاص اثر مترتب نہیں کر سکتے۔ مثنوی گلزار نسیم سرتاپا "افسانوی نظم" ہے۔ قادر الکلام شاعر نے ایک ایک شعر کو دل کے لہو سے رنگین بنانے کی کوشش کی ہے، مگر اس مثنوی کے وہ چند اشعار، پوری مثنوی پر بھاری ہیں، جن میں بکاؤلی نے پھول کے گم ہوجانے پر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے۔ یہ تمام اشعار نفسیاتی عظمت کے حامل ہیں، اور انکو پڑھتے ہوئے واقعی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے، کہ حسین و جمیل شہزادی ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہے، بے ترتیب زلفیں اُسکے حسین چہرے پر بکھری ہوتی ہیں، پھول کے یکایک غائب ہوجانیکا اُس پر بے حد اثر ہوا ہے۔ اُس کی خمار آلود آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں نکل رہی ہیں، اور نرگس و سنبل اور گل و لالہ سب کے سب اُس کی باتیں کان دھر کر سن رہے ہیں۔ میں نے ان اشعار کو سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہے، اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف محسوس کیا ہے۔ یہ ہے افسانہ کی نفسیاتی تاثیر کا ایک رُخ!

نفسیاتی نزاکتیں

نفسیات کا لٹریچر پڑھنے سے علم النفس کے کتابی اصولوں سے واقفیت ہوجاتی ہے، مگر جہاں تک نفسیاتی نزاکتوں کا تعلق ہے۔ اُنکا ایک گوشہ بھی بے نقاب نہیں ہوتا، جب تک کہ مختلف سوسائٹیوں اور مختلف کردار اور جماعت کے انسانوں سے واقفیت نہ ہو، اور اُن میں گھل مل کر نہ رہا جائے ——— نفسیات پر عبور حاصل کرنے کے لئے ہر شخص کے طور طریق، چال ڈھال اور بول چال کا نہایت گہری اور محتاط نظروں سے مشاہدہ کرنا چاہئے جو شخص نفسیاتی نگاہ سے انسانوں کو پڑھتا ہے، وہ بہت جلد نفسیات کا ماہر ہوجاتا ہے، اور وہ نہایت اچھے طریقہ پر مختلف انسانوں کے خیالات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔

ایک کشمیری پنڈت اور ایک مہاجن (بنیا) دونوں ایک حسین عورت کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔ جو افسانہ نویس پنڈت اور مہاجن کی

نفسیات سے نابلد ہے وہ ان کے جذبات کی ترجمانی میں کوئی امتیازی فرق پیدا نہ کرسکیگا، یہی کمزوری افسانہ کی تاثیر اور عظمت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

کسی خونریز ہنگامہ کی خبر اخباروں میں شائع ہوتی ہو ایک ہی شہر کی مختلف سوسائٹیوں اور حلقوں میں جاکر دیکھئے تو آپ مختلف قسم کی تنقیدیں سنیں گے۔ وکلاء کا طبقہ اس ہنگامہ پر جس عنوان سے تنقید کریگا تانگہ والوں کے گروہ کی تنقید اس سے بالکل مختلف ہوگی، طوائفوں کے یہاں شرفا کی بیٹھنے والی جماعت کا انتقاد کوئی اور کہانی سنائیگا۔

جس طرح ماحول اور گردوپیش کا نفسیات انسانی پر اثر پڑتا ہے، اسی طرح عمر اور انقلاباتِ حیات سے نفسیات انسانی متاثر ہوتی ہے۔ کنواری لڑکی بیاہنے کے بعد کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ شریف خاتون ایکٹرس کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد بالکل بدل جاتی ہے۔ یہی نفسیاتی نزاکتیں، علم النفس کا خلاصہ کہی جاتی ہیں۔

عورت اور نفسیات

اردو افسانے "نسوانی نفسیات" سے بھرے پڑے ہیں قریب قریب تمام افسانہ نگار عورت کے رنگین جذبات کی ترجمانی کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مقامات پر ہمارے افسانہ نگار زبردست ٹھوکر کھاتے ہیں۔ مرد کی طرح عورت آوارہ نگاہ اور آوارہ طبیعت نہیں ہوتی۔ وہ مستقل طور پر محبت کرنیکی متمنی ہوتی ہے۔ عورت مرد کی طرح آنکھیں نہیں سینکتی، اور وہ راہ چلتے مرد پر عاشق و شیدا نہیں بنتی۔ عورت کبھی کسی حسین مرد کو دیکھ کر اس مصرع کو نہیں گنگنائے گی۔ ع

"جوانی کا صدقہ ادھر دیکھ لینا"

اُسکے دل کے اندر محبت کا آتش فشاں چھپا ہوتا ہے۔ مگر اس سے ہر وقت شعلے نہیں نکلتے۔ یورپ کی عورتیں آزاد زندگی اور رنگین ماحول کے باعث بہت کچھ بدنام ہیں۔ مگر ہم روزانہ اس قسم کے واقعات اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں، جن میں عورتوں کی مستقل مزاجی اور مردوں کی بے وفائی کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ لہذا جو افسانہ نگار، راہ چلتے مرد پر عورت کو عاشق کرا دیتے ہیں، وہ نسوانی نفسیات سے بڑی حد تک نابلد ہوتے ہیں، عورت یقیناً جذبات کا سمندر رکھتی ہے، مگر اس سمندر کو متموج میں لانے کے لئے زبردست تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو افسانہ نگار عشق و محبت کے سلسلہ میں نفسیاتی اسباب مہیا نہیں کرتا، اُسکو ہم ناکام افسانہ نگار کہیں گے۔

ہم یورپ کے افسانوں کو پڑھ کر سر دھنتے ہیں اور اُن کی خوبیوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں لیکن ہمکو یہ نہیں معلوم کہ مغربی افسانہ نگار کو افسانہ لکھنے سے پہلے کن مدارج و منازل سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہاں پر مثالاً دو واقعات پیش کئے جاتے ہیں، مغرب کا ایک مشہور افسانہ نگار جیلخانہ کی زندگی پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے دانستہ ایک جرم کا ارتکاب کیا، عدالت سے اس کے لئے سزا تجویز کی گئی۔ اس نے کئی سال جیلخانہ میں رہ کر قیدیوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا۔ دوسرے افسانہ نگار کو مصر کے متعلق کچھ لکھنا تھا۔ وہ مصر آیا اور کئی مہینے وہاں آکر رہا۔ ان لوگوں کے افسانے "سحر حلال" نہ ہونگے تو کیا ہمارے ہونگے جو کسی سوسائٹی کے حالات سے بالکل واقف نہیں ہوتے

لیکن صفحے کے صفحے اُس کی تفصیلات میں سیاہ کئے جاتے ہیں مختلف سوسائٹیوں کے حالات سے واقف ہونے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اُن کی اصطلاحات اور اُنکے افراد کی عقلِ عمومی سے واقفیت ہوجاتی ہے، جو افسانہ نگار کسی سوسائٹی کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہے، وہ فی الحقیقت اُس سوسائٹی کی تفصیل پیش کرکے پڑھنے والوں کے ذوقِ ادبی کیساتھ خوفناک مذاق کرتا ہے۔

بعض افسانہ نگار نفسیاتی ناواقفیت کے باعث کسی مزدور اور ان پڑھ کسان کی بات چیت کو فلسفیانہ اور منطقیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں اور غریب کسان کو الو بکر۔ رازی اور ابن رشد کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتے ہیں علمی اعتبار سے یہ مباحث خواہ کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ایک افسوسناک مضحکہ ہے، جسے وجدان ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کرسکتا۔

جہاں تک میں نے اُردو کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ کیا ہے میں پوری ذمہ داری کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر نذیر احمد کا درجہ بہ حیثیت نفسیاتی افسانہ نگار اور ناول نویس کے سب سے زیادہ بلند ہے۔ بات یہ ہے کہ نذیر احمد نے کسی ایسی سوسائٹی کو اپنا موضوع نہیں بنایا جسکے حالات سے وہ واقف نہ ہوں، نذیر احمد نے دلی کے خوش باش شریف گھرانے میں پرورش پائی تھی، وہ نوجوان مسلمانوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے تو بۃ النصوح میں آفتاب بنکر چمک رہی ہے مراۃ العروس میں نذیر احمد نے سب سے زیادہ مکمل اور بہتر کردار ماما کا پیش کیا ہے۔ نذیر احمد نے ماماؤں اور گھر کی نوکرانیوں کی نفسیات کا یقیناً گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، اسی نفسیاتی مطالعہ نے مراۃ العروس میں چار چاند لگا دئے۔

ہندوستان ہر اعتبار سے انقلابات کی وادیوں سے گزر رہا ہے، اردو ادب میں قابلقدر اضافہ ہو رہا ہے، بہتر سے بہتر افسانے پیش کئے جا رہے ہیں اگر افسانہ نگار حضرات اسی ماحول کی ترجمانی کریں جس کی تفصیلات سے وہ اچھی طرح باخبر ہیں، تو ہمارا ملک بہت سے "چیخوف" اور "آسکر وائلڈ" پیش کرسکتا ہے۔

اشتراکی ادیب حضرت باری (علیگ)

افکارِ زنداں

محترم میرزا صاحب! تسلیم! میں ان دنوں "افکارِ زنداں" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ کتاب ان قیدیوں کے مکتوبات پر مشتمل ہے جنہیں سماج نے ایام اسیری کاٹنے پر مجبور کر رکھا ہے جن کی جبینوں پر ظالم سوسائٹی نے 'مجرم' کا لیبل لگا کر زنداں میں بند کر رکھا ہے کتاب بیس مکتوبات پر مشتمل ہے، ایک خط 'ادب لطیف' کے افسانہ نمبر کے لئے بھیج رہا ہوں۔ مخلص باری۔

مرکزی جیل،
کمرہ ۱۰

پیارے احسان

تمہارا خط ملا، یاد آوری کا شکریہ! میری دنیا بہت مختصر ہے سورج، چاند اور ستاروں کی روشنی مجھ سے چھین لی گئی ہے اگرما سرما، بہار اور خزاں تمہاری دنیا کے موسم ہیں۔ زنداں میں صرف ایک ہی موسم ہے۔ موسم غم۔

"میں نے کیوں چوری کی؟" تم دریافت کرتے ہو سنو!

انٹرنس امتحان پاس کرنے کے بعد تم کلکتہ چلے گئے۔ اور میں لاہور علمی ذوق کی تکمیل کے لئے ہیں ——— کالج میں داخل ہوگیا، ایک شام مالی مشکلات نے مجھے فلسفی بنا کر ہوسٹل کے کمرہ سے باہر نہ نکلنے دیا! اسی شام اکرام میرے ہاں آیا تم اسے جانتے ہو شائد، ہشت بازار میں میرا وہ بہترین دوست تھا، میں اب اکرام کے گھر رہنے لگا۔ اکرام کا گھر شیرانوالہ دروازہ میں واقع تھا۔ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مجھے ہر روز شیرانوالہ دروازہ سے دہلی دروازہ تک بیرونی باغ سے گذرنا پڑتا، پھل والے درختوں اور خوشبو دار پودوں سے کہیں زیادہ تباہ حال زن و مرد اور روتے ہوئے بچے دکھائی دیتے۔ انتہائی ایام سرما میں بھی زمین انکا فرش ہوتی اور آسمان چھت، شمال کی تیز و تند ہوا انکے ہونٹوں کو نیلا اور انکے چہروں کو خزاں کے پتوں کی طرح خشک کر دیتی، وہ سب کے سب انسانوں سے خدا کے نام کا پیسہ مانگتے، لیکن بہت کم انسان انہیں خدا کے نام پر کچھ دینے کو تیار ہوتے۔ انسان، خدا کے نام پر وہاں صرف کرتے ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو انکی سخاوت کا علم ہو سکے، لوگ خاموشی سے ان کے پاس سے گذر جاتے۔ وہ شاید عادی ہو چکے تھے، میں نے بھی ماحول کے تاثرات سے خالی ہو کر گذرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

بے سروسامان انسانوں کی حالت میرے دماغ میں اس قدر ہیجان پیدا کرتی کہ میں کالج کے ابتدائی اوقات میں اپنے فرائض سے یکسر غافل رہتا، رفتہ رفتہ میں "سارے جہاں کے درد" کو دل سے نکال کر صرف ایک مظلوم ہستی میں دلچسپی لینے لگا۔

کالج کے دروازہ کے باہر ایک افغان نے اپنی رہائش کے لئے ایک مختصر سا جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ افلاس نے اس کے چہرہ کو زرد کر رکھا تھا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک باقی تھی۔ میں اسے ہر روز قرآن پڑھتے ہوئے دیکھتا۔ پاس ہی اس کا بچہ نہایت مؤدبانہ انداز میں باپ کی قرأت کو سنتا تھا۔

اکرام کی والدہ اپنی جیب خاص سے مجھے چار روپیہ ماہانہ معمولی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دیتی ہیں۔ اس رقم میں سے ہر روز ایک آنہ اس افغان بچہ کو دیتا۔

ایک دن میں گھر سے دیر سے نکلا۔ افغان تلاوت ختم کر چکا تھا پیشتر اسکے کہ میں اسے سلام کرتا اس نے جلدی سے پشتو زبان میں میرے لئے ایک دعائیہ جملہ کہا۔ میں نے دعائیہ میں جواب دیتے ہوئے اسکی مزاج پرسی کی۔

"خدا کا شکر ہے" اس نے جواب دیا۔

"سماج کا یہ شکار" دن میں اس جملہ کو کئی بار دہراتا ہے" میں نے دل میں کہا۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں ایک طالب علم ہوں"

"آپ عربی جانتے ہیں کیا؟"

"ہاں۔ قرآن پڑھ سکتا ہوں۔ اور یہ کون ہے؟

"یہ میرا بیٹا ہے گل زمان" اور میرا نام سکندر ہے۔"

"الوداع" کہتے ہوئے میں کالج چلا گیا۔

"ایک سکندر نے اپنی ہوس ملک گیری کے لئے سماج کو اپنا شکار کیا اور ایک سکندر کو سماج نے اپنا شکار بنایا۔ ۔ ۔ ۔ وقت کا پھول معاشرت مسموم سے مرجھا رہا ہے" یہ سوچتے ہوئے میں کالج کے دروازہ میں داخل ہوا۔

تین سال گذر گئے۔ اکرام اپنی والدہ سمیت دہلی چلا گیا میں دوبارہ ہوسٹل میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ سکندر سے روزانہ ملاقات کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا تاہم دوسرے چوتھے روز میں اُدھر سے ضرور گذرتا۔

کرسمس کی چھٹیوں کے بعد جب میں واپس گیا تو دو ہفتوں تک سکندر کی صورت تک نہ دیکھ سکا۔ ایک شام میں اُدھر سے گذرا تو سکندر کو بہت زیادہ مغموم پایا۔ میں نے وجہ دریافت کی۔

"گل زمان دو ہفتوں سے بیمار ہے" اس نے کہا۔

"کس کا علاج ہو رہا ہے؟" یہ سوال سکندر کے دل کو زخمی کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔

میں ہوسٹل سے اپنا کمبل، تکیہ، کوئلے اور انگیٹھی لیکر سکندر کے پاس پہنچا۔ اس نے خاموشی سے میری مدد قبول کر لی۔ گل زمان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ میں ایک ڈاکٹر کو لیکر سکندر کے جھونپڑے میں پہنچا۔

ڈاکٹر صاحب! اس بچہ کا آپ کو علاج کرنا ہے تمام اخراجات کا میں ذمہ وار ہوں، میں کالج کا طالب علم ہوں۔ یہ ہے میرا ایڈریس۔" "بہت اچھا" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

تین ہفتوں کے بعد گل زمان اس دنیا سے چل بسا مجھے اسکی موت کی خبر دو دن بعد ملی۔ اسی روز ڈاکٹر نے پرنسپل کی وساطت سے میرے نام ۲۰ روپے کا بل بھیجدیا۔ میرے پاس اتنی رقم کیونکر ہو سکتی تھی؟ میں نے ڈاکٹر سے ایک ہفتہ کے اندر رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

تیسرے دن حالات سازگار ہو گئے۔ دوپہر کو میں نے چوہدری کو ۸۰ روپے کا منی آرڈر وصول کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ رقم ڈاکٹر کو دی جائیگی۔ شام کو میں نے تالا توڑا، چوہدری کے کمرہ میں داخل ہوا۔ بکس سے نوٹ نکالے، کمرے سے باہر آ رہا تھا کہ چور! چور! کی صدائیں میرے کانوں میں پڑیں۔

نوشتہ سالوگب　　مترجمہ حضرت افضل (جالندھری)

آنکھ مچولی

لی لیکا کے کمرہ کی ہر چیز خوبصورت تھی، وہ خود بھی ایک حسین بچی تھی، اور اس کی شیریں اور ترنم ریز آواز اُس کی ماں کے لئے بہت بڑی مسرت کا ذریعہ تھی!

لی لیکا کی ماں الگزنڈرینہ کو یقین کامل تھا کہ ایسا نہ کوئی بچہ ہوا ہے اور نہ ہوگا، اس کی بڑی بڑی اور سیاہ آنکھیں اسکے گلابی رخسار اور ہونٹ صرف چومنے یا ہنسنے کیلئے تھے۔

اُس میں صرف یہی خوبیاں نہیں تھیں جن کی وجہ سے اُسکی ماں اس سے والہانہ محبت کرتی بلکہ وہ اُس کی اکلوتی بیٹی بھی تھی، یہی وجہ تھی کہ لی لیکا کی ہر حرکت الگزنڈرینہ کیلئے ایک خاص دلکشی و رعنائی رکھتی۔ اُسکے لئے سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ وہ اپنی پیاری اور خوبصورت بچی ——— ایک چھوٹے پرندہ جیسی خوبصورت بچی کو سینہ سے لگائے رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ الگزنڈرینہ صرف لی لیکا کے کمرہ میں خوش رہتی اور اپنے خاوند سے دور رہنا ہی پسند کرتی تھی۔

میڈسٹوڈ اور الگزنڈرینہ کی ازدواجی زندگی کی بنا محبت نہ تھی ——— وہ پینتیس سالہ نوجوان اور پچیس سالہ نوجوان عورت! دونوں اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور دونوں کی پرورش بھی احسن طریقہ پر ہوئی تھی۔ الگزنڈرینہ محسوس کرتی کہ اُسکو اپنے ہونے والے خاوند سے لگاؤ سا ہے اسلئے وہ خوش تھی۔ میڈسٹوڈ خوبصورت تھا، اُس کی بھوری آنکھوں سے فراست نمایاں تھی، اور چہرہ سے شرافت مترشح تھی۔

الگزنڈرینہ بھی حسین تھی۔ اسکا قد بلند تھا۔ سیاہ آنکھیں، چمکدار اور سیاہ بال۔ کافی ہوشیار لیکن قدرے شرمیلی تھی۔

میڈسٹوڈ کو جہیز کی خواہش نہ تھی تاہم وہ یہ معلوم کرکے خوش تھا کہ اس کی بیوی کے پاس کچھ ہے۔ وہ بارسوخ آدمی تھا۔ اور اُس کی بیوی کے رشتہ دار بھی بارسوخ تھے۔ مصیبت کیوقت وہ اُنکے رسوخ سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ میڈسٹوڈ نہ اتنا امیر تھا کہ لوگ حسد کریں اور نہ اتنا غریب کہ وہ دوسروں کی دولت سے جلے، وہ متوسط درجہ کا آدمی تھا۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد تک میڈسٹوڈ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا رہا۔ لیکن اسوقت جبکہ اس کی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہونیوالا تھا، اُسنے کہیں دوسری جگہ معمولی سے تعلقات قائم کرلئے۔ الگزنڈرینہ کو اسکا علم تھا، لیکن اُسے اس سے کوئی تکلیف نہ پہنچی، وہ خود حیران تھی کہ ایسا کیوں ہے؟

بچی پیدا ہونے کے بعد وہ ہمہ تن اُس کی پرورش میں مشغول ہوگئی، وہ اپنی ننھی بچی کی بابت اپنے خاوند کو جاکر بتاتی لیکن اُس نے جلد ہی معلوم کرلیا۔ کہ اُسکا خاوند صرف اس خیال سے اُس کی گفتگو سن لیتا ہے کہ وہ شکستہ دل نہ ہوجائے وہ اپنی بچی سے اس طرح محبت کرتی تھی۔ جس طرح دوسری عورتیں

اپنے "بیوفا" شوہروں سے کرتی ہیں۔

"امّی جان! آؤ ہم "آنکھ متولی" کھیلیں۔ لی لیکا "چ" کو "ت"[1] ——— کہتی! ایسی گفتگو انگزنڈرینہ کا دل خوشی سے معمور کر دیتی۔

لی لیکا یہ کہکر دوڑتی اور اپنے آپکو بستر کے نزدیک یا پردوں کے پیچھے چھپا لیتی۔

امّی جان! چی کو[1] ——— چی کو" وہ اپنی شیریں آواز میں کہتی اور یقین دلاتی کہ وہ اُسے نہیں دیکھ سکتی۔

لی لیکا اپنی جگہ ہنستی اور آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگتی۔ اُس کی ماں اُسکے ننھے ننھے کندھوں کو اس طرح پکڑ کر کہتی گویا اُسنے پہلی ہی بار اپنی بچی کو دیکھا ہے۔ "یہ ہے میری لی لیکا!"

"اب امّی جان میں تمہیں تلاش کروں گی" لی لیکا یہ کہتی اور ہنسنا بند کر دیتی انگزنڈرینہ چھپتی اور لی لیکا اُسے کن انکھیوں سے دیکھتی رہتی اور ظاہر کرتی کہ اُسنے بالکل نہیں دیکھا۔

انگزنڈرینہ الماری کے نیچے چھپ جاتی اور کہتی "میری بچی! چی کو ——— چی کو ——— لی لیکا کمرہ میں دوڑتی اور اپنی ماں کی طرح یقین دلاتی ہوئی کہ اُسنے ابھی تک اُسے نہیں دیکھا۔ کونہ کونہ تلاش کرتی۔

"امّی جان کہاں ہیں! وہ یہاں ——— نہیں ہیں! یہاں بھی ——— نہیں" لی لیکا ہر جگہ تلاش کرتی ہوئی یہ الفاظ دہراتی۔

اُس کی ماں سانس روکے دیوار سے سر لگائے کھڑی رہتی۔ اپنے بالوں کو ذرا بکھیر لیتی اور مسکراتی رہتی۔

لی لیکا کی آیا فیدوسیہ نیک طینت اور خوبصورت تھی۔ جب کبھی وہ اپنی مالکہ کو دیکھتی تو مسکرا دیتی۔ وہ اُسے اس طرح کھڑی دیکھتی تو کہتی "ماں بھی بچہ بنی ہوئی ہے ——— دیکھو کیسے خاموش کھڑی ہے"؟

لی لیکا اپنی ماں کے قریب آتی جاتی۔ اُسکے دل کی دھڑکن خوشی کی وجہ سے ذرا تیز ہو جاتی اور وہ اپنے آپکو دیوار کے ساتھ لگائے ہوئے اپنے بالوں کو ذرا اور بکھیر لیتی۔

لی لیکا یک لخت اُسے دیکھتی اور خوش ہو جاتی۔

"میں نے تمہیں پا لیا" لی لیکا اونچی آواز اور خوشی سے الفاظ کا تلفظ اپنے مخصوص طفلانہ انداز میں ادا کرتے ہوئے کہتی۔ اور اس کی ماں کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا۔

وہ اپنی ماں کو ہاتھوں سے کھینچتی ہوئی کمرہ کے وسط میں لے جاتی۔ دونوں خوش ہو جاتیں اور خوب ہنستیں۔ وہ اپنی ماں کے گھٹنوں میں سر چھپا لیتی اور لگاتار ہنستی رہتی میڈ سٹوڈ اُس کمرہ کی طرف نکلتا۔ وہ نصف کھلے ہوئے دروازہ میں سے ہنسنے کی آواز سنتا اور مسکراتا ہوا اندر داخل ہوتا۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوتا تھا۔

انگزنڈرینہ اُسے دیکھتے ہی چپ ہو جاتی ۔ فیدوسیہ حیران کھڑی رہتی ننھی لی لیکا نے بھی ہنسنا بند کر دیتی اور اپنے باپ پر آنکھیں گاڑ دیتی۔

میڈ سٹوڈ کمرہ میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی، وہ ایسے کمرہ میں آنا پسند کرتا تھا۔ جس میں ہر چیز ترتیب

[1] روسی زبان میں اصل لفظ "ٹی او ——— ٹی او نغا" اردو میں کوئی اچھی آواز نہ مل سکی۔ لہٰذا پنجابی زبان کی یہ آواز لکھدی ہے، ہمارے ضلع میں ایسے موقعہ پر یہی کہا جاتا ہے۔ افضل

اور سلیقہ سے رکھی ہو۔

یہ سب الگزنڈرینہ کا ہی کارنامہ تھا، جو چاہتی تھی کہ میری بچی کے اردگرد چیزیں بھی خوبصورت ہوں، وہ خود بھی اچھا لباس پہنتی اور لی لیکا کو بھی صاف ستھرا رکھتی۔ ایک بات جو اسکے خاوند کو پسند تھی، وہ یہی تھی کہ الگزنڈرینہ ہر وقت لی لیکا کے کمرہ میں ہوتی تھی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم اسی کمرہ میں ہوگی۔" وہ مسکراتے ہوئے کہتا۔ جب وہ دونوں کمرہ چھوڑ کر باہر چلے جاتے تو میڈسٹوڈ۔ اپنی بیوی کو بے ساختگی سے کہتا "کیا تم اُسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتیں؟ اب اُسے خود مختار ہو جانا چاہیئے۔"

"وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔" الگزنڈرینہ کہتی۔

"یہ میرا عاجزانہ مشورہ ہے، تم مختار کُل ہو، جیسا جی چاہے کرو۔"

"خیر دیکھا جائیگا۔" اُس کی بیوی ہنستے ہوئے جواب دیتی اسکے بعد وہ دیگر معاملات پر گفتگو کرنے لگتے۔

(۲)

اسی شام آگیتیہ ——— بوڑھی باورچن نے لی لیکا کے متعلق فیدوسیہ سے ذکر کیا۔ "دیکھو وہ کس طرح آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور ہر وقت اپنے آپکو چھپاتی رہتی ہے۔"

"اور بیگم بھی تو اُسکے ساتھ بچہ ہی بن جاتی ہے۔" فیدوسیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آگیتیہ نے افسردہ ہو کر کہا۔ "بیگم بچہ بن جاتی ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن بچی کے لئے ضرور خطرناک ہے۔"

"کیوں" فیدوسیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں، یہ بہت بری بات ہے۔" آگیتیہ نے کہا۔ "بہت بری"

"اچھا" فیدوسیہ کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی۔

"وہ اپنے آپکو ہر وقت چھپائے رکھتی ہے۔ اور چھپکر حسرت انگیز نگاہ سے دروازہ کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" فیدوسیہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے، تم میرے الفاظ یاد رکھو" آگیتیہ نے یقین دلاتے ہوئے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "ہاں یہ بالکل درست نشانی ہے۔"

اس بوڑھی عورت نے یہ نشانی اُسی وقت بنا لی اور وہ اس پر مغرور تھی۔

(۳)

لی لیکا سوئی ہوئی تھی اور الگزنڈرینہ اپنے کمرہ میں بیٹھی لی لیکا کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ وہ اپنے تصور میں لی لیکا ——— اپنی چھوٹی بچی کو دوشیزگی کے درجہ پر دیکھتی لیکن سلسلۂ خیال منقطع ہونے پر لی لیکا پھر وہی اپنی ماں کی ننھی سی بچی رہ جاتی۔

الگزنڈرینہ کو یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ فیدوسیہ اُس کے پاس آئی اور گذر گئی ہے۔ فیدوسیہ کی آنکھوں سے خوف نمایاں تھا۔

"بیگم، بیگم" اُسنے آہستہ اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہے فیدوسیہ؟" اُسنے نہایت متین لہجہ میں پوچھا "لی لیکا کے متعلق؟"

"نہیں بیگم" فیدوسیہ نے اپنے ہاتھوں سے الگزنڈرینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لی لیکا سوئی ہوئی ہے خدا اُسے محفوظ رکھے ——— میں چند باتیں کہنا چاہتی ہوں ———

لی لیکا کے متعلق ـــــ آپ ڈھیتی ہیں بیگم ـــــ لی لیکا ہر وقت اپنے آپ کو چھپائے رکھتی ہے ـــــ چھپنا اچھا نہیں "۔

فیدوسیہ نے اپنی مالکہ پر آنکھیں گاڑے رکھیں۔ اُس کی آنکھیں خوف کی وجہ سے گول ہوگئی تھیں۔

"اچھا کیوں نہیں؟" الگزنڈرینہ نے پوچھا۔

"میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ کتنا بُرا ہے" فیدوسیہ نے فیصلہ کُن آواز میں کہا۔

"ہوش کی باتیں کرو" الگزنڈرینہ نے سرد لہجہ میں کہا۔

"میں آپکا مطلب نہیں سمجھی"

"بیگم ـــــ یہ بدشگونی ہے" فیدوسیہ نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔

"اونہہ بکواس" الگزنڈرینہ بولی۔

وہ اس بدشگونی کے متعلق زیادہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اُسکے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ یہ اُسکے لئے باعثِ شرم بات تھی کہ اُسکے شیریں تخیلات کی دُنیا میں رخنہ ڈالا جائے۔

"ہاں ـــــ میں جانتی ہوں کہ روشن خیال لوگ شگون پر یقین نہیں رکھتے لیکن بیگم ـــــ یہ بدشگونی ہے"۔ فیدوسیہ نے پُرسوز لہجہ میں کہا۔ وہ ہر وقت اپنے آپکو چھپائے ....."

اُس کی آنکھوں سے یکدم آنسو بہنے لگے۔" وہ ہر وقت اپنے آپکو چھپائے رکھتی ہے اور چھپائے گی ـــ قدسی الاصل بچی ـــــ تاریک قبر میں" اُسنے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو قمیص سے پونچھتے ہوئے اور سسکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے؟" الگزنڈرینہ نے آہستہ سے کہا۔

پھر بولی "کیا فضول ہے"! آئندہ میرے پاس ایسی خبریں لیکر نہ آیا کرو۔ اب جاؤ"

فیدوسیہ مجروح جذبات لیکر اپنی مالکہ کے پاس سے رخصت ہوگئی۔

"کیا فضول ہے! گویا لی لیکا مر جائے گی"! الگزنڈرینہ نے لی لیکا کی متوقع موت پر اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہوئے سوچا۔ اُس نے شگون سے متعلق باتیں عورتوں کی لاعلمی پر محمول کیں۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ بچہ کی کھیل کا تعلق اُس کی زندگی سے کیونکر ہو سکتا ہے؟

اُسنے ہزار کوشش کی کہ اپنے خیالات کو دوسری طرف منتقل کرے لیکن ناکام رہی۔ اُسکے خیالات بے اختیارانہ لی لیکا پر مرتکز ہو جاتے۔

جب لی لیکا بچہ ہی تھی تو وہ اپنی ماں اور آیا میں پہچان کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی آیا کی گود میں جا بیٹھتی ـــــ اپنا منہ اُس کے کندھوں پر رکھ کر ہنستی رہتی۔

اُسی وقت مالکہ کی غیر حاضری میں فیدوسیہ اُسے چھپنے کی مشق کراتی رہی۔ جب لی لیکا کی ماں نے اندر آکر یہ دیکھا تو وہ خود بھی اپنی ننھی بچی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں مشغول ہوگئی۔

(۴)

دوسرے روز الگزنڈرینہ پھر لی لیکا کی تربیت میں مشغول ہوگئی اور پہلے روز کے واقعات کو بالکل بھول گئی۔ لیکن جب اُس نے لی لیکا کو چی کو ـ چی کو کہتے ہوئے سُنا تو اگرچہ اُس کے دل سے بدگونی کے خیالات محو ہو چکے تھے۔ تاہم وہ شکستہ دلی ہی سے لی لیکا کی کھیل میں شامل ہو سکی۔

لی لیکا حسین اور فرمانبردار بچی تھی ـــ وہ اپنی ماں کے حکم پر چلتی۔ چونکہ وہ اپنی ماں سے کسی کونے میں چھپ کر چی کو ـــ چی کو کہنے کی عادی تھی، اسلئے اُس روز بھی دو تین دفعہ کھیلی۔

الگزنڈرینہ نے ہزار کوشش کی کہ لی لیکا کو خوش رکھے لیکن یہ کچھ آسان کام نہیں تھا کیونکہ وہ خوفزدہ اور بے چین تھی۔

"لی لیکا چی کو ـــ چی کو کیوں کہتی ہے؟ اسکی طبیعت ایک ہی چیز کو بار بار دہرانے سے اچاٹ کیوں نہیں ہو جاتی؟ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرنے اور چہرہ چھپانے سے۔ شائد" اُس نے سوچا "وہ میرے دوسرے بچوں کی طرح دنیا میں نہیں بھیجی گئی ہے۔ اگر یہ ایسا ہی ہے تو کیا یہ جسمانی کمزوری نہیں ہے؟ کیا یہ زندہ نہ رہنے کی خواہش ہے؟"

الگزنڈرینہ کو خود شرم محسوس ہوتی کہ اس نے فیڈوسیہ کے سامنے لی لیکا کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا بند کیوں کر دیا۔ لیکن یہ کھیل اُسکے لئے نہایت تکلیف دہ ہو گیا تھا کیونکہ لی لیکا کو کھیلنے کی بہت زیادہ خواہش تھی۔ اسے لی لیکا سے چھپنے اور اُسکو تلاش کرنے سے کوئی فوق العادہ طاقت مانع تھی۔ اُس نے خود ہی دو تین دفعہ یہ کھیل شروع کیا لیکن شکستہ دلی کے ساتھ۔ اُسے اس طرح محسوس ہو رہا تھا کہ اُسنے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔

الگزنڈرینہ کے لئے وہ دن نہایت افسردہ دلی سے گذرا۔

(۵)

لی لیکا سونے والی تھی۔ یونہی اُس نے اپنے بستر پر چھلانگ لگائی اُس کی آنکھیں تھکاوٹ کی وجہ سے بند ہو گئیں۔ اُس کی ماں نے اُسے نیلے کمبل سے ڈھانک دیا۔ لی لیکا اپنے پیارے ننھے ہاتھ کمبل سے باہر نکال کر اپنی ماں سے چمٹ گئی۔ الگزنڈرینہ نیچے جھک گئی۔ لی لیکا نے اپنی ماں کا منہ چوما اور اپنے ہاتھ تکیہ پر رکھ دیئے۔ جب اُسکے ہاتھ کمبل کے اندر چلے گئے۔ تو اُسنے آہستہ سے کہا!

"ہاتھ ـــ چی کو ـــ چی کو"

ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ لی لیکا وہاں خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی وہ مسکرائی اور آنکھیں بند کر کے کہا۔

"آنکھیں ـــ چی کو ـــ چی کو"

پھر اور آہستہ سے بولی "ـــ چی کو ـــ چی کو"

یہ کہکر وہ سو گئی۔ وہ کمبل کے نیچے بہت چھوٹی اور لاغر معلوم ہو رہی تھی۔

الگزنڈرینہ لی لیکا کے سرہانے کافی دیر تک کھڑی رہی اور اُسکے چہرہ کو خوف اور اداسی سے دیکھتی رہی۔

"میں ماں ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں اسکو بچا سکوں" اُسنے لی لیکا پر نازل ہونے والی تکالیف پر غور کرتے ہوئے کہا

وہ تمام رات عبادت کرتی رہی لیکن عبادت سے اُسے اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوا۔

(۶)

چند روز گذر گئے۔ لی لیکا کو سردی لگ گئی ـ رات کو بخار ہو گیا۔ جب الگزنڈرینہ نے اسکو متقد مضطرب اور بے چین پایا۔ تو اُسکا خیال فوراً بدشگونی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور وہ ناامید سی ہو گئی۔

ڈاکٹر بلایا گیا۔ اور ہر ممکن تجویز جو ایسے موقعوں پر اختیار کی جاتی ہے کی گئی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

الگزنڈرینہ نے تو تسلی دینے کی کوشش کی کہ لی لیکا

کا بخار رفع ہو جائیگا۔ اور وہ دوبارہ کھیلنے اور ہنسنے لگ جائے گی"
لیکن وہ اِس خوشی کے انجام پر نظر ڈالکر مایوس ہو جاتی۔
لی لیکا کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ سب اپنے چہروں سے بچی کی حالت پر اطمینان ظاہر کرتے تاکہ الگزنڈرینہ خوفزدہ نہ ہو جائے۔ لیکن اُنکے ریاکاری کے نقاب میں چھپے ہوئے چہرے اُسے زیادہ غمگین بنا دیتے۔ فیدوسیہ کے الفاظ "وہ ہر وقت اپنے آپکو چھپائے رکھتی ہے" اُس کو افسردہ کر دیتے!
اُسکے خیالات منتشر تھے اسلئے وہ اپنے ماحول کو سمجھنے سے قاصر تھی۔
لی لیکا بخار کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی اور کبھی کبھی اسپر غشی طاری ہو جاتی لیکن جب وہ ہوش میں آتی تو اپنی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور اپنے آپکو تندرست ظاہر کرنے کی کوشش کرتی۔
تین روز گذر گئے' لی لیکا زیادہ بیمار ہو گئی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مر جائے گی، وہ اپنی ماں کو دیکھتی اور نہایت کمزور آواز میں کہتی "امی جان! چی کو ——— چی کو۔ امی جان! تم بھی چی کو ——— چی کو کہو"
الگزنڈرینہ اپنا منہ لی لیکا کے بستر کے پاس پردہ کے نیچے چھپا لیتی ——— آہ کس قدر دردانگیز منظر!
"امی جان!" لی لیکا نے اپنی کمزور و نحیف آواز میں کہا۔
الگزنڈرینہ اُسکے منہ پر جھک گئی۔ لی لیکا (جسمیں اب زندگی کی رمق باقی تھی) نے اپنی ماں کا افسردہ چہرہ آخری دفعہ دیکھا۔ "افسردہ ماں" لی لیکا نے آہستہ سے کہا۔
ماں کا زرد چہرہ دھندلا سا ہو گیا اور اُسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اُسنے بستر کا کونا پکڑا اور کہا "چی کو ——— چی کو"
اُسے سانس رُک رُک کر آنے لگا۔ لی لیکا نے ایک لمبا سانس لیا اور چل بسی۔
الگزنڈرینہ کی حسرتوں کا خون ہو چکا تھا' اُسنے لی لیکا کو وہیں چھوڑا اور کمرہ سے باہر چلی گئی۔
"لی لیکا مر گئی ہے" اس نے مایوس آواز میں کہا۔
میڈسٹوڈ اُسکے زرد چہرہ کو بیقراری سے دیکھتا رہا۔ وہ اُسکے خوبصورت چہرہ کی فوری تبدیلی کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

(۷)

لی لیکا کو کفن پہنا کر ایک کمرہ میں لے جایا گیا۔ الگزنڈرینہ کفن کے نزدیک کھڑی مردہ بچی کو دیکھ رہی تھی، میڈسٹوڈ اُس کے پاس گیا اور اپنا چہرہ افسردہ بنا کر اُسکو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ الگزنڈرینہ مسکرا دی۔
"آپ چلے جائیں" اُسنے کہا "لی لیکا کھیل رہی ہے' وہ کچھ وقفہ کے بعد اُٹھ کھڑی ہوگی"
"پیاری! اب افسوس کرنے سے کیا حاصل" میڈسٹوڈ نے کہا "تمہیں اپنے آپکو قسمت پر چھوڑ دینا چاہئے"
"وہ ابھی کھڑی ہو گی" الگزنڈرینہ نے اپنی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میڈسٹوڈ بھی یہ الفاظ کہکر چپ ہو گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ اپنی بیوی کے بازو پکڑ کر لاش سے دور لے گیا۔ الگزنڈرینہ نے اس کی بالکل مخالفت نہ کی' اُس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں' وہ لی لیکا کے کمرے میں داخل ہوئی' اور اِدھر اُدھر جہاں لی لیکا چھپا کرتی تھی پھرنا شروع کیا۔ وہ بیزار و بیچارہ پائی نے

نیچے جھک جھک کر دیکھتی اور ہنستے ہوئے کہتی۔

"میری لی لیکا کہاں ہے؟ میری لی لیکا کہاں ہے؟؟"

جب وہ کافی پھر چکی تو آرام لینے کے لئے بیٹھ گئی۔

غمگین فیدوسیہ بھی سہمی ہوئی ایک کونے میں بیٹھ گئی تھوڑی دیر کے بعد وہ پکار اٹھی۔

"وہ ہر وقت اپنے آپکو چھپائے رکھتی ہے —— ہماری لی لیکا —— ہماری قدسی الاصل بچی" الگزنڈرینہ نے فیدوسیہ کی طرف دیکھا اور رونا شروع کر دیا۔

وہ کچھ دیر بعد کمرہ چھوڑ کر چلی گئی۔

(۸)

میڈ سٹوڈ نے لاش کی تجہیز و تکفین میں جلدی سے کام لیا اُسنے دیکھا کہ الگزنڈرینہ کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا ہے۔ اور سوچا کہ لی لیکا کو دفن کرنے کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو حاصل کر سکے گی۔

اگلی صبح الگزنڈرینہ نے لی لیکا کیلئے خاص توجہ کے ساتھ لباس پہنا۔ جب وہ مردانہ میں پہنچی تو اُسنے لی لیکا اور اپنے درمیان بہت سے لوگ پائے۔

وہ لی لیکا کے پاس پہنچی اور مسکرا دی۔ اُس نے اپنا منہ اُسکے تابوت پر رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"ننھی بچی! پی کو —— چی کو"

لی لیکا نے جواب نہ دیا۔ الگزنڈرینہ کے ارد گرد کچھ شور سا ہونے لگا۔ ایک شخص نے اُسکو ہاتھ سے پکڑا —— اور لی لیکا کو کسی دوسری جگہ لے گئے۔

الگزنڈرینہ وہاں کھڑی ہنستی رہی۔ اُسنے بلند آواز سے پکارا "لی لیکا!"

لی لیکا کو باہر لے جایا جا رہا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہو گئی۔ لیکن کسی نے اُسے پکڑ لیا۔

وہ اُس دروازہ میں جہاں سے لی لیکا کو لے جایا جا رہا تھا بیٹھ گئی۔

اُسنے چلمن میں سے اندر دیکھا اور پکار کر کہا۔

"لی لیکا! چی کو —— چی کو" پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

لی لیکا کی لاش اُسکی ماں کے پاس سے جلد ہی اٹھا لی گئی۔ لوگ تابوت اٹھائے چلنے کی بجائے بھاگ رہے تھے۔

نوشتہ ایچ۔ ای بیٹس
مترجمہ جناب تقی محمد صاحب

خوف

(نفسیاتی مطالعہ)

تاریک فضا میں تین مختلف حصوں میں طوفان گرج گرج کر تباہ کن خیالات کر رہے تھے۔ ننھا یہ چیرڈ اور اسکا دادا ایک جھونپڑی میں پناہ گزیں تھے۔ جھونپڑی اس تاریکی میں سرمئی نظر آ رہی تھی۔ اندر کی ہوا تپش انگیز اور گرم تھی۔ باہر آس پاس کے درخت مہیب سرگوشی میں مشغول تھے۔ یہ چیرڈ درختوں کی سائیں سائیں سے خوف زدہ ہو رہا تھا۔ بار بار بڑی بڑی زرد آنکھوں کو اوپر اٹھاتا۔ اور گھبرا کر پوچھتا "دادا اندھیرا کیوں ہو گیا کیا بات ہے؟"

پہلی مرتبہ پوچھنے پر بڈھا کچھ جواب نہ دیتا۔ دوسری بار بڑبڑاتے ہوئے کہتا "پریشان نہ ہو" اور تیسری بار بول اٹھتا "ڈر تو نہیں رہے ہو؟ بڑے لڑکے کو ڈرنا نہیں چاہئے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

لیکن لڑکا مجبور تھا۔ خوف پر قابو پا لینا اُسکے بس کی بات نہ تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جھونپڑی کو دیکھتا۔ اور بےچین ہو کر پہلو بدلتا۔ اپنی ہر حرکت سے اس خوفناک تاریکی، جھونپڑی کے اندر کی تکلیف دہ خاموشی، بادل کی گرج، جو کتوں اور گائیوں کی ڈراؤنی آواز کی یاد تازہ کر رہی تھی، سے خوف زدہ ہو جانے کا مظاہرہ کرتا بار بار یہ سوال "دادا اندھیرا کیوں ہو گیا۔ کیا بات ہے۔" اسکو مہمل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر دفعہ اس سوال کے بعد اُسکو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ طوفان پہلے سے زیادہ دہشت ناک ہو گیا ہے۔ بارش کے خیر مقدم میں درخت اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے ضعیف آدمی کوئی گیت سنانا چاہتا تھا لیکن دو ایک بند سے زیادہ لڑکا کچھ نہ سنتا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس گیت کی آواز ہوا میں لہر نہ پیدا کرتی۔ بڈھا بول اُٹھتا۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو، کوئی بات خوف کی نہیں ہے۔"

"اندھیرا کیوں ہے؟" لڑکے نے ضد کرتے ہوئے پوچھا۔

"بارش ہونے والی ہے۔" اُسکو بتایا گیا۔

یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"کل بارش ہوئی تھی اور آفتاب چمک رہا تھا۔ اِسوقت آفتاب کیوں روشن نہیں ہے"؟

"آفتاب موجود نہیں ہے۔"

"کہاں چلا گیا ہے؟" لڑکے نے سادگی سے پوچھا۔

"پریشان نہ کرو۔"

بادل گرج رہا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ لڑکا بہ مشکل اپنے دادا کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اُسکو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جھونپڑی کی بوسیدہ زمین سے سڑی ہوئی مچھلی کی بو آ رہی ہے۔ وہ ڈر کر رونے لگا۔

آسمان سبز کیوں ہے؟" لڑکے نے سوال کیا۔

"سبز نہیں ہے۔"

"سبز ہی ہے۔ بالکل منیّی کی ٹوپی کی طرح آسمان سبز کیوں ہوگیا؟" لڑکے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بارش ہونے والی ہے۔ بس اسی قدر۔ خاموش رہو۔"

وہ رو رہا تھا۔ اُسنے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ پُرآشوب آنکھوں سے اسکو ایسا دکھائی دیا گویا آسمان درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کر اسکی جھونپڑی پر گرا رہا ہے۔ اور عنقریب وہ اُسکے اندر دب کر مرجائے گا۔

"میں گھر جاؤنگا" اُسنے آہستہ سے کہا۔ لیکن بڈھے نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہر طرف مکمل خاموشی طاری تھی۔ لڑکا پسینہ میں شرابور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دادا سے لپٹ جائے لیکن جگہ سے سرکنے کی اُسکو ہمت نہ ہوئی۔ پہلے پھوار پڑنے لگی۔ پھر سنسناہٹ کی آواز کے ساتھ تیز بارش ہونے لگی۔

"دادا! دادا!" وہ اپنے دادا سے لپٹ کر رونے لگا۔

اور اُسکے جواب میں ایک سونے والے کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز آرہی تھی۔

"اُٹھو! بارش ہورہی ہے۔ میں گھر جاؤنگا" لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

بادل زیادہ زور سے گرج رہا تھا۔ بارش کے قطرے کھڑکی سے گر رہے تھے۔ لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"میں گھر جاؤنگا۔ رات ہوگئی۔ اماں سوگئی ہونگی" لڑکے نے روتے ہوئے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ ابھی رات نہیں ہوئی ہے" بوڑھے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"وقت کیا ہے؟"

تاریکی میں گھڑی سفید آنکھ کی طرح چمکی۔ دیا سلائی کی زرد روشنی پھیل گئی۔ ایک لمحہ کے لئے لڑکے کے دل سے خوف دور ہوگیا۔ وہ کبھی گھڑی اور کبھی جھونپڑی کی چھت اور اپنے دادا کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ طوفان اور خوف کو بھول گیا۔

"ابھی صرف آٹھ بجے ہیں۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

دیا سلائی کی تھرتھراتی روشنی میں کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی نے روشنی کو نگل لیا ہے اور پھر دوسری بار یہ گمان ہوتا تھا کہ اس شعلے نے آسمان پر زرد زخم لگادیا ہے جس کی وجہ سے جھونپڑی کی تاریک زمین اور تختوں پر زرد خون بہ رہا ہے۔ بادل کی گرج اس طرح آرہی تھی گویا ایک درندہ چھت پر بیٹھا ہوا دھاڑ رہا ہے۔ گرم اور صلح پسند ہوا بیمار بچے کی طرح سسکیاں بھرتی محسوس ہورہی تھی۔ درخت بے چین ہوہو کر جھوم رہے تھے۔ اس ہنگامہ خیز فضا نے بچہ کے خوف میں مزید اضافہ کر دیا۔ لڑکا بوڑھے کی ٹانگوں کے درمیان اپنا سر چھپا کر رو رہا تھا۔ چمک اور گرج کی خوفناک ہم آہنگی میں لڑکے کو اپنا گھر، ماں کا راحت افزا چہرہ کھڑکیوں پر بیٹھی ہوئی معصوم تیتریاں یاد آرہی تھیں۔ مگر وہ سمجھ رہا تھا کہ طوفان اُس یاد سے لطف اندوز ہونے میں مانع ہے۔ طوفان کا تصور اُسکے نزدیک سیاہ، چالاک، سال رسیدہ، کھوسٹ بڈھے کا سا تھا جس سے محفوظ رہنا ناممکن ہے۔ اس سے بچنے کی صرف ایک تدبیر اسکے چھوٹے سے ذہن میں آسکتی تھی۔ یعنی اس پر اس تاریکی میں کتے کا تصور کیا جائے اور اس طرح وہ طوفان کی نگاہوں

سے بچ جائے۔ اس خیال سے وہ پاؤں سکیڑ کر خاموش بیٹھ گیا۔

بالکل خاموش گویا وہ اس شور و ہنگامہ کو سُن رہا ہے لیکن توجہ سے نہیں۔

اسی طرح تقریباً ایک گھنٹہ گذر گیا۔ بار بار لڑکے نے چیخنا چاہا لیکن خوف سے اُس کی آواز حلق میں گھُٹ کر رہ گئی۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اُسکے گھٹنے سرد ہو گئے۔ اُسکا ایک پیر سُن ہو گیا تھا۔ صرف اسکا سر گرم تھا۔ اُس کی کنپٹی کی رگیں ایک پرانی گھڑی کی طرح دیوانہ وار پھڑک رہی تھیں۔ ایک بار لکڑی کے جلنے کی سی بُو اُسنے محسوس کی لیکن اس مسئلہ کو کر چو پاتے بھی اسکی طرح خوفزدہ ہیں یا نہیں کے حل کرنے میں وہ باقی چیزیں بھول گیا۔ اتفاقاً اُسکے کان میں دادا کی گھڑی کی خوشگوار ٹِک ٹِک کی آواز آئی۔ اُسکو کچھ سکون ہوا۔

طوفان کا زور تھمتا گیا۔ تاریکی بھی کم ہوتی گئی۔ لڑکے نے آنکھیں کھولدیں۔ اور کھڑا ہو گیا۔ بارش کی آواز بند ہو چکی تھی۔ اور گرج بھی دور ہو گئی تھی۔ ابر کڑی کا جالا موتیوں کے جھالر کی طرح لٹک رہا تھا۔ زمین پر پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں میں تاریکی سایہ فگن تھی ـــ ستاروں کے ننھے بھی چمک رہے تھے۔ بڈھا اپنے پوتے کو گود میں لیکر ان گڑھوں کو پھاندر رہا تھا۔ جنگل کے کنارے سُرمئی رنگیں بادل نظر آ رہے تھے۔

"کوئل کوک رہی ہے" بوڑھے نے کہا۔

لڑکے نے کوئل کی آواز سنی اور اپنے خوف کے آخری اثر کو بھی بھلا دیا۔ اُسنے اپنے پیروں پر چلنا چاہا۔ اس کوشش میں اُسنے محسوس کیا کہ اُسکی ٹانگیں سخت ہو گئی ہیں۔ اُسنے زمین پر پیر رکھنا چاہا تو اُسکو معلوم ہوا کہ اسمیں ہزاروں سویاں چبھ رہی ہیں۔ باوجود اسکے لڑکا ہنس رہا تھا۔

بڈھے نے راستہ آسانی سے کٹ جانے کے خیال سے بچہ کو کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ مگر لڑکا اُس کی طرف متوجہ نہ ہوا بڈھے نے بچہ کی انگلی اپنی کھردری خشک ہتھیلی میں رکھ کر ستاروں کو گننا شروع کر دیا۔ "اکاون۔ باون"

کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی لیکن گرج کی آواز نہ آتی تھی۔ جھلملاتے ہوئے ستاروں کی موجودگی میں بچہ اپنے خوف کو قطعی فراموش کر چکا تھا۔ اسکو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید وہ اس طوفان خیز اوقات میں سو رہا ہے تھوڑی دیر میں اُسکا گاؤں آجائے گا۔ جہاں خوف کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

"میں ڈر نہیں رہا" لڑکے نے بیسوں دفعہ کہا۔

دس بج رہے تھے۔ گھنٹہ کی آواز اس تاریک میدان میں دور تک گونج رہی تھی۔ اسی وقت لڑکے نے ایک شہاب ثاقب کو گرتے ہوئے دیکھا۔

"ایک ستارہ ٹوٹ کر گرا" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ۔۔۔۔

لڑکا جلد اُٹھا۔ وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔

"آہا۔ آہا۔ ایک ستارہ ٹوٹ کر گرا" وہ بے انتہا خوش تھا۔ لیکن اُسکا دادا خاموش رہا۔

وہم پرستوں میں یہ مشہور تھا کہ ستارہ کے ٹوٹنے کے معنی خاندان میں موت کے ہیں۔ اگرچہ وہ اسپر یقین کامل نہ رکھتا تھا۔ تاہم اس خیال کے ذہن میں یکبارگی آجانے کو وہ روک نہ سکا۔ اسکو اپنی بیوی اور اسکی موت کا خیال آیا۔ پھر اپنی عمر اور اپنے نحیف قویٰ کا اندازہ کیا۔ یہاں تک کہ اسکو اپنے مرنے کا خدشہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اسکو یقین ہو گیا کہ پروانہ موت آگیا ہے۔ وہ موت کے خیال سے

پسینہ میں شرابور تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کچھ دیر قبل اسکا ننھا پوتا طوفان کے خوف سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اسکو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تاریک اور دہشت انگیز عنصریت اسکو کچل ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ اسکی بے پناہ طاقت کے سامنے وہ بے بس ہے۔ موت کے اس بھیانک تصور نے اسکے روح کو افسردہ اور اسکے دل کو بے چین کر دیا

کبھی کبھی کسی جھاڑی سے چڑیوں کے چہکنے کی آواز آ جاتی تھی۔

لیکن لڑکا اس سے بے پروا تھا۔ اسکے خیالات کا مرکز صرف وہی گرتا ہوا ستارہ تھا۔ اسکو یاد آگیا اور وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ جھونپڑی کے اندر مچھلی کی سی بو کیوں آرہی تھی۔ اور جانور طوفان سے ڈرتے ہیں یا نہیں۔ اور چڑیاں طوفان میں کہاں چھپ جاتی ہیں، اسنے اپنے دادا کے سنجیدہ چہرے کو جسپر خوف اور اداسی کا اثر نمایاں تھا دیکھا۔ اسکو سوائے اسکے کہ "آپ نے ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تھا؟" اور کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

وہاں جواب ندارد۔ بوڑھا موت کے خوف سے لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھبرا رہا تھا۔ وہ اس ہیجانی کیفیت پر قابو نہ پا سکا۔ لیکن لڑکا صرف تنہا نہیں رہا تھا، وہ دوسرے ستارے کے ٹوٹ کر گرنے کے نظارہ کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اسکو حیرت ہو رہی تھی کہ اسکا دادا خاموش سنجیدہ اور مضمحل کیوں ہے۔ لڑکا گھر پہنچنے کے شوق میں تیزی سے چل رہا تھا گویا پھر بارش ہونیوالی ہے۔ مگر اسکا دادا اکثر پیچھے رہ جاتا تھا۔ اسنے پھر اپنے دادا سے کچھ نہ پوچھا۔

آیورویدک چمتکار
میٹھا پھل
ہندوستانی دماغ کا کمال
جس کو حمل کے تیسرے ماہ کے شروع میں حاملہ کو کھلا دینے سے لڑکا ہی پیدا ہوتا ہے خواہ پہلے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی ہوں اگر
غلط ثابت ہو تو قیمت واپس کر دی جاوے گی قیمت مبلغ دس روپے
میرے محسن عظیم جناب پنڈت صاحب! مالک کی کرپا سے کمترین کے ہاں کل بروز منگل کو فرزند تولد ہوا۔ آپ سے میں نے شروع ماہ جون میں اپنی اہلیہ کیلئے میٹھا پھل لیا تھا۔ میں آپکے اس احسان کا جو نہ صرف میرے واسطے ہے بلکہ کئی دیگر ضرورتمند اصحاب کیواسطے بھی نہایت ادب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مالک آپ کو اس کا اجر عطا فرماوے آمین! (شہاب الدین اجنالوی ملٹری اکونٹنٹ لاہور چھاؤنی)
شریمان پنڈت جی نمستے! بندہ نے اپنے گھر کیواسطے دوائی میٹھا پھل منگوائی تھی حمل کی حالت میں دوسرے اور تیسرے مہینہ کے درمیان حسب ہدایت یہ دوائی استعمال کرائی گئی تھی نہایت خوشی کی بات ہے کہ لڑکا پیدا ہوا ہے بندہ کو امید نہیں تھی کیونکہ بندہ کے گھر لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں۔ یہ فقط آپکی دوائی میٹھا پھل کا کرشمہ ہے میں آپکا از حد مشکور ہوں! (کنور ٹھاکر صاحب سنگھ رئیس مقام سلیم پور ڈاکخانہ داتا گنج ضلع بدایوں)
بہت سے خرچ تکلیف اور تشویش اور اچانک کی امراض و حادثات سے بچنا چاہتے ہو! تو
امرت دھارا سدا پاس رکھو!
امرت دھارا رجسٹرڈ
امرت دھارا مرہم رجسٹرڈ
امرت دھارا لوزنجز
امرت دھارا صابن رجسٹرڈ
امرت دھارا بام رجسٹرڈ
امرت دھارا لوشن رجسٹرڈ
امرت دھارا ہیئر آئل
خط و کتابت و تار کا پتہ: امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون لاہور
المشتہر مینیجر امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

شیخ عباد اللہ بی اے

سلاطین مغلیہ کے باغ

شیخ عباد اللہ صاحب بی اے محکمہ ریلوے میں ایک معزز عہدے پر سرفراز ہیں اور اپنے فرائض با حسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ قارئین یہ سنکر بیحد مسرور ہونگے کہ آپ اچھے مضمون نویس و افسانہ نگار بھی ہیں اور آپ نے ادب لطیف کی مستقل معاونت کا وعدہ فرمایا ہے۔ ذیل میں آپ کے تاریخی مضمون "سلاطین مغلیہ کے باغ" کی پہلی قسط شائع کی جا رہی ہے۔ مضمون کی افادیت کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ امید کہ ناظرین ادب لطیف اسے نہایت شوق سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

(ادارہ)

علم پروری اور فنون نوازی کے لئے سلاطین مغلیہ اپنی نظیر نہیں رکھتے ان کا ذوق رنگ و بو اور مذاق گل و گلشن بے عدیل ہے۔ ان کے ایوان و دیوان بے مثال اور ان کے باغات اپنی نظر فریبی اور دلربائی کے لئے لاثانی ہیں ہندوستان کے خوشنما باغات کا سلسلہ انہی بادشاہوں کی لطافت نوازی کا نتیجہ ہے۔ باغات کی ترتیب اور چمن آرائی ایک فن ہے جو دیگر فنون لطیفہ کی طرح ملک کی فنی روایات اور تاریخی انقلابات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ سلاطین مغلیہ کے باغات پر یہ بات بالخصوص نمایاں ہے۔ گردش ادوار سے ہندوستان میں ایک باغ کے مفہوم و معنی مفقود ہو گئے ہیں۔ بہت کم لوگ ان باتوں سے آشنا ہونگے کہ ایک باغ کا نقشہ، درخت اور پودوں کی ترتیب، چمنوں میں مختلف پھولوں کی آرائش سے کیا مراد ہے۔ نہریں، آبشاریں، فوارے اور چشمے کیا معنے رکھتے ہیں۔ چنار، سرو، شمشاد وغیرہ کی کیا اہمیت ہے۔ بارہ دریاں، دیوان، روشیں اور باغ کے مختلف درجے کس مطلب کے لئے ہیں اور ان کی ترتیب ترکیب اور تعمیر سے صناع کا کیا مقصد ہے۔ یہ چیزیں ایک مشرقی باغ کی ترکیب کے مختلف اجزا ہیں۔ اور ہر ایک ہندوانہ روایت کی فنی علامت کا حامل ہے جس طرح دیگر مشرقی فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے فنی علامات کا پہچاننا اور ان کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ بعینہ شاہان مغلیہ کے باغات کی داد دینے کے لئے ایسی علامات کا پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔

یہاں یہ کہنا ہرگز مقصود نہیں کہ مغلیہ دور سے پہلے ہندوستان میں باغات کا شوق اور رواج نہ تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندوستان "جنت نشان" نہ کہلاتا۔ لیکن جس طرز کے باغات کا یہ موضوع رکھا گیا ہے ان کا انداز تعمیر ایران اور وسط ایشیا سے ہندوستان میں پہنچا۔ چنانچہ ایرانی مصوری کے شاہکار اور ایرانی شعرا کا کلام اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں۔ حافظؒ و سعدیؒ شیرازی کے کلام سے کون واقف نہیں۔ علی ہذا دیگر ایرانی شعرا نے اپنے اپنے "گلستان سخن" میں باغات کی نسبت کیسے کیسے دلکش رنگ و بو کے پر کیف مناظر پیش کئے ہیں۔ خیام کے کلام میں ایرانی باغات صرف علامتیں ہی نہیں بلکہ اعجاز نما ہیں۔ ہندوستان کی سرور آور اقلیم پا کر مغل بادشاہوں سے کیونکر صبر ہو سکتا تھا کہ اس سرزمین میں جا بجا اور ہر ممکن تقریب سے فردوس کے ٹکڑے نہ رکھدیئے جاتے۔ یہ سلاطین مغلیہ کے

باغات ہیں۔

سلاطین مغلیہ کے بعض باغات تفریح ونشاط کی غرض سے تعمیر کئے گئے ہیں اور بعض مقابر رفتگان کے لئے ایک فردوسی فضا پیدا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں انھیں باغات سے کتنی الفت تھی اور یہ اسی شوق کا احترام ہے کہ ان کے مزار کے لئے بھی باغات لگائے گئے۔ اس خاندان کی صرف ایک شہزادی جہاں آرا ایسی خاتون ہے جو درویش منش ہے اور تمنا لکھ کر

"بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است"

اپنے پسماندگان کو اپنے مزار کے لئے گل وگلزار کے تردد سے معذور رکھتی ہے مگر اس ایثار وانکسار کے باوجود قبر پوشی کیلئے "سبزہ" کی آرزو باقی ہے۔ بلکہ ایک حد تک تاکید۔

بابر بادشاہ باغات کا دلدادہ تھا ۱۵۲۶ء میں جب بابر اپنے حریف کو شکست دے چکا تو دلی کی طرف بڑھا۔ دلی سے آگرہ پہنچا اور بالآخر شمالی ہندوستان پر قابض ہوگیا آگرہ میں جمنا کا کنارہ بڑا پُرفضا مقام ہے۔ یہاں بابر نے ایک باغ لگایا جو اس کا ہندوستان میں پہلا باغ اور غالباً رام باغ ہے۔ رام باغ کے پاس بابر کی بیٹی زہرہ کا باغ ہے اور یہاں بیس چینی کا مقبرہ ہے یہ عمارت تباہ اور شکستہ ہوکر کھنڈر رہ گئی ہے۔ مگر اس کا چینی ٹائل کی پچی کاری کا کام نہایت خوبصورت ہے دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر اعتمادالدولہ مرزا غیاث یعنی ملکہ نورجہاں کے باپ کا مقبرہ ہے جسے بیٹی نے باپ کی یادگار کیلئے تعمیر کیا تھا۔

اعتمادالدولہ کا مقبرہ

یہ مقبرہ نادرالوجود اور ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی عمارت ہے جسے ایرانی انداز تعمیر کے مطابق سفید سنگ مرمر کی پچی کاری کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرہ اور اس کا ویران باغ قابل دید مقام ہے۔ اس عمارت میں "تاج" والی الہامی کیفیت کم ہے۔ تاہم نہایت خوشنما اور شاندار ہے۔ ترتیب اور رنگ کے اعتبار سے بیرونی آرائش کیلئے نقش ونگار ایسے نازک اور نفیس ہیں کہ باوجود انتہائی تکلف کے نظر پر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا بار نہیں گزرتا۔ اگر دور سے دیکھا جائے تو اس مرمریں عمارت پر ایک نرم سی شگفتگی اور ایک دھیمی سی مسلسل تنویر کا گمان ہوتا ہے۔

جو باغ فن تعمیر کے اس شاہکار کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے اس کی نہریں اور آبشاریں خشک پڑی ہیں اسکے فواروں کا ترنم ختم ہوچکا ہے گردش افلاک اور انقلاب زمانہ کے ہاتھوں اس کی موجودہ ویرانی اس کی گزشتہ شگفتگی اور شادابی کی تنہا نوحہ خواں ہے ہاں اس لٹی ہوئی بہار میں اگر کوئی چیز دیکھنے والے کی توجہ کیلئے مقناطیسی اثر رکھتی ہے تو وہ اعتمادالدولہ کا مقبرہ ہے جسکے درودیوار پر مرمریں رنگینیاں تمام فضا کو ایک خاموش موسیقی سے معمور کررہی ہیں۔ یہ مقبرہ نورجہاں کے ذوق تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

نورجہاں کا مزار

ہندوستان سے پنجاب۔ آگرہ سے لاہور۔ ساحل جمنا کے

لعد دریائے راوی کا کنارا! دفعتہً مناظر کا یہ تغیر مقامات کا یہ تضاد اس کے لئے یہ عذر ہے کہ باپ کے منور مقبرہ کے ساتھ بیٹی کے بے نور مزار کا ذکر دیا جائے۔ اور کچھ اس مدفن کے متعلق بتا دیا جائے جس میں مرزا غیاث اور جہانگیر کے مقبرے نمونے والی سو رہی ہے۔ نورجہاں کے مرقد کی بے نوری ایک عبرت ناک منظر ہے۔

مہرالنساء، مرزا غیاث کی بیٹی، جہانگیر کی نورمحل بیگم اور ہندوستان کی ملکہ نورجہاں تھی۔ شہنشاہ بابر کی طرح نورجہاں کو باغات کا شوق انتہا سے سوا تھا۔ وہ ملکہ حسن اور حسین و لطیف فنون کی سرپرست آج ایک بے دا اور بے چراغ چھت کے نیچے محوِ خواب ہے یہ ملکہ جدھر سے گزری اور جہاں پہنچی اپنے قیام اور شوق کی یادگار میں فردوس نما باغ چھوڑ گئی۔ جہاں قیام کرتی سرائے بنواتی اور اس کے ساتھ باغ لگواتی۔ بینجور۔ شاہدرہ (لاہور) حسن ابدال۔ بھمبر ویری ناگ اچھابل اور نورمحل میں ایسی پرفضا اور عالی شان سرائیں اب تک موجود ہیں اور ان سراؤں کے باغات اس کے ذوقِ لطیف کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کشمیر کے باغات اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کی تعمیر اور ترکیب اور ان کی پُربہار فضا سے ظاہر ہے۔ کہ پانی کی روانی اور آبشاروں اور فواروں کا ترنم، رنگین پھولوں کی خوشبو، ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکے درختوں پر مرغانِ چمن کی ترانہ آفرینیاں، یہ سب باتیں نورجہاں کو کتنی پیاری اور کس قدر محبوب تھیں۔ آج اس ملکہ ہندوستان کا مقبرہ ببولوں کے گھنے جنگل میں آپ اپنی بے کسی پر مرثیہ خوانی کر رہا ہے۔ اور زاغ و زغن اس کی پاسبانی

جہانگیر اور نورجہاں کشمیر کے شیدائی تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ ہندوستان میں گرمی کا موسم کشمیر میں گزاریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ اور کشمیر کے تیرہ سفر کئے کہتے ہیں کہ شہنشاہ جہانگیر نے کشمیر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور ملکہ نے اپنے شیدائی رفیقِ حیات کو شاہدرہ (لاہور) کی سرائے کے دلکشا باغ میں سپردِ خاک کر دیا۔ اس صدمہ کے بعد کئی سال تک زندہ رہی۔ لیکن امور سلطنت سے کنارہ کش ہو گئی۔ اپنے جہانگیر کے مقبرے کی تعمیر کو اپنی زندگی کا عزیز ترین شغل بنا لیا۔ اور اسے بہت کچھ اپنے باپ اعتمادالدولہ کے مقبرے کے انداز پر پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

جہانگیر کے مقبرے کے قریب ہی نورجہاں کا مزار ہے۔ اس کے آثار بتاتے ہیں۔ کہ یہ بھی کبھی مغلیہ شان کی عمارت تھی۔ اور اس کے ساتھ باغ بھی تھا۔ مگر زمانے کے ظالم اور سفاک ہاتھوں نے اس کی قابلِ احترام شان کو نوچ کھسوٹ ڈالا۔ اور اب وہ ایک عبرت کا موقع ہے۔ نورجہاں نے ایک شعر میں اپنے مزار کے متعلق جو پیشگوئی کی تھی وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ وہ کہتی ہے ؎

برمزارِ ما غریباں نے چراغِ نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے!

اب حکومت وقت ملکہ ہندوستان کے بے نور مقبرے کی محافظ ہے اور سرو شمشاد مصروف فاتحہ نظر آتے ہیں۔

(باقی وارد)

بی اے پاس کرنے کا آسان طریقہ

منشی فاضل پاس کرنیکے بعد صرف انگریزی کا امتحان میٹرک ایف اے اور پھر بی اے کا دیکر بی اے کی پوری ڈگری حاصل کریں اور اُردو کا امتحان ادیب عالم دیکر میٹرک اور ایف اے پاس کر سکتے ہیں مکمل قواعد وضوابط دیکھنے کیلئے علیحدہ فہرست کتب ذیل کے پتہ پر طلب کریں جن کتب کی رعایتی قیمت نہیں دی گئی ہے ان پر ۲؍ فی روپیہ کمیشن ہوگی (علاوہ مطبوعات یونیورسٹی)

منشی فاضل ۱۹۳۸ء

کتاب	قیمت	رعایتی
دبیر عجم	[illegible]	
جواہر البحور حصہ نثر یعنی بی اے کورس	۱۲؍	
شعر العجم چہارم	۴؍	۱۴؍
شعر العجم پنجم	۱۲؍	۱۴؍
چہار مقالہ	۶؍	۳؍
ابو الفضل اول و سوئم	۱۰؍	۹؍
حاجی بابا اصفہانی	[illegible]	۸؍
سیاحت نامہ ابراہیم بیگ دوم	۱۲؍	
وکلائے مرافعہ	۳؍	۲؍
انتخاب قصائد قاآنی	۸؍	۵؍
غزلیات نظیری تا ردیف را	۱۰؍	۶؍
دیوان فرخی حصہ داخل نصاب	عہ	۱۰
منطق الطیر مطبوعہ تاج بکڈپو	۱۲؍	۶؍
رباعیات بابا طاہر معہ ترجمہ و شرح	۴؍	۲؍
رباعیات ابو سعید ابو الخیر معہ حالات	۶؍	۳؍
تاریخ وصاف	عا	
سیر المتاخرین تا باب چہارم	عہ	
اخلاق جلالی مطبوعہ تاج بکڈپو	[illegible]	۱۲؍
رموز حکمت	عا	
درۃ الاخبار مطبوعہ یونیورسٹی	[illegible]	
کشف المحجوب فارسی حصہ داخل نصاب	عا	عہ

(۲) ترجمہ و جواب مضمون

کتاب	قیمت	رعایتی
اختیاری مضمون		
روح الاجتماع	عا	
افادات مہدی	ہے	
انتخاب مخزن دوم نثر	عہ	
رویائے صادقہ	؏	
ادبی خطوط غالب	۱۴؍	
دیوان حالی معہ مقدمہ	۱۴؍	عہ
دیوان غالب	۶؍	
کتب امدادی		
حل دبیر عجم	۱۰؍	۵؍
ترجمہ جواہر البحور حصہ نثر مکمل	؏	
خلاصہ شعر العجم ۴	۴؍	۲؍
" " ۵	۳؍	۱؍
ترجمہ چہار مقالہ	۸؍	
ترجمہ ابو الفضل اول	عہ	۸؍
" " سوم	؏	۱۲؍
ترجمہ وکلائے مرافعہ	۳؍	۱؍
فرہنگ حاجی بابا	؏	
فرہنگ سیاحت نامہ	۸؍	۴؍
ترجمہ قصائد قاآنی	عہ	۸؍
ترجمہ سیر المتاخرین	؏	۱۲؍

خلاصہ سیر المتاخرین

کتاب	قیمت	رعایتی
خلاصہ سیر المتاخرین	۸؍	۴؍
" سوالاً جواباً	۸؍	
ترجمہ ابو سعید ابو الخیر	۶؍	۳؍
ترجمہ تاریخ وصاف	؏	۱۲؍
ترجمہ دیوان فرخی	؏	۱۲؍
خلاصہ وصاف سوالاً جواباً	۳؍	۱؍
ترجمہ اخلاق جلالی	عسہ	
چار شرح اخلاق جلالی	۴؍	۲؍
ترجمہ کشف المحجوب	عا	عہ
خلاصہ اخلاق جلالی سوالاً جواباً	عہ	۸؍
معنی مطلب خلاصہ کشف المحجوب	۸؍	۴؍
اسرار فلسفہ خلاصہ رموز حکمت	۸؍	۴؍
شرح منطق الطیر	؏	۱۲؍
شرح غزلیات نظیری	تا	عہ
ضمیمہ اتالیق عجم قسم اول	۴؍	۲؍
پرشین کمپوزیشن	عسہ	
در مکنون یعنی مجموعہ مضامین فارسی	عسہ	
پرچہ جات منشی فاضل ۲۳ تا ۲۷	۹؍	۵؍
مخزن فضیلت	۱۰؍	۵؍
حل پرچہ جات ۳۲	۴؍	۲؍
" ۳۳	۴؍	۲؍
" ۳۴	۴؍	۲؍
" ۳۵	۴؍	۲؍
" ۳۶	۴؍	۲؍
ترجمہ سیاحت نامہ دوم	؏	۱۰؍
ترجمہ مکمل حاجی بابا اصفہانی	عا	

ادیب عالم ۱۹۳۸ء

کتاب	قیمت	رعایتی
مصباح القواعد نحو	؏	
نکات سخن کامل ہر سہ حصہ	عہ	
(۲) آب حیات	ہے	
(۳) مجموعہ نظم آزاد	۸؍	
انتخاب مخزن اول نظم	عہ	
قصاید ذوق	۴؍	۲؍
گلزار نسیم یعنی یادگار نسیم	؏	۱۲؍
(۴) عود ہندی غالب	۸؍	۵؍
یادگار غالب	؏	۱۲؍
(۵) دربار اکبری	عہ	
زندگی	؏	
کتب امدادی		
خلاصہ مصباح القواعد نحو	۳؍	۲؍
خلاصہ آبحیات	۶؍	۳؍
شرح قصاید ذوق	؏	
فرہنگ عود ہندی	۴؍	۲؍
خلاصہ یادگار غالب	۴؍	۲؍
خلاصہ دربار اکبری	عسہ	۸؍
مجموعہ مضامین اردو	۸؍	
پرچہ جات ادیب عالم ۲۷ تا ۳۴	۸؍	۵؍
" ۳۵ تا ۳۶	۲؍	
علمی و ادبی بہترین کتابیں	[illegible]	
سلاسل تقسیم از حکومت [illegible]	[illegible]	
[illegible] مجلد	عا	
طوفان [illegible]	عا	
خطوط [illegible] از مرزا [illegible]	۱۲؍	

پتہ ملنے کا: ملک نذیر احمد تاجر کتب و مالک تاج بکڈپو موہن لال روڈ بیرون موری گیٹ لاہور

تین پیسے کی چھوکری

اور دیگر افسانے

مصنفہ قاضی عبدالغفار خاں

اُردو داں پبلک قاضی عبدالغفار خاں مصنّف ”لیلیٰ کے خطوط“ اور ”مجنوں کی ڈائری“ سے بخوبی آشنا ہے۔ یہ افسانے قاضی صاحب کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ہیں۔ یقین واثق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانے اُردو کے حق میں ایک نہایت حسین اضافہ ثابت ہونگے جو حضرات افسانہ نگاری کے شائق ہیں اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنا چاہتے ہیں انھیں جلد از جلد قاضی صاحب کے ان افسانوں کے لئے آرڈر بھیجنا چاہیئے۔

کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب **قیمت عمر**

مکتبہ اردو ۱۵ اسر کلر روڈ لاہور

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب لاہور بموجب لیٹر نمبر ۱۱۳۲۱ سی مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۳۵ء
منظور کردہ محکمۂ تعلیم حیدر آباد دکن ۲۴۲۰ سنہ ۱۳۴۴ ف مثل نمبر ۱۳ ۰ / ۴۴ ف

علم و ادب کا ماہوار مرقع

ادبِ لطیف لاہور

ماہِ اگست ۱۹۳۶ء

ادارۂ تحریر

چوہدری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقامِ اشاعت

مکتبۂ اردو لاہور

ممالک غیر سے ← ابو الاصغر محمد شریف عباسی کاتب ادارۂ ادب لطیف لاہور ساڑھے چھ شلنگ

فہرست مضامین

جلد ۵ | بابت ماہ اگست ۱۹۳۷ء | نمبر ۶

نذرِ اولیں

ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی ہے کہ "افسانہ نمبر" گذشتہ افسانہ نمبر سے بہت زیادہ کامیاب رہا ہے۔ ملک کے ادبی حلقوں نے اسے اردو رسائل کے نہایت کامیاب افسانہ نمبروں میں جگہ دی ہے۔ "اردو" کے چند اخبارات و رسائل اور مقتدر اہلِ قلم حضرات کی گرانمایہ رایوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

اخبار احسان لاہور۔ ادب لطیف۔ افسانہ نمبر۔

ممتاز ادبی مجلہ "ادب لطیف" کا افسانہ نمبر اسی مہینے شائع ہوا ہے، جسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ادارہ نے اس کی ترتیب و تدوین میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اسکے مختصر افسانے طویل افسانے منظوم افسانے۔ انگریزی افسانوں کے تراجم نظمیں اور فن افسانہ نویسی کے متعلق مضامین جن کی مجموعی تعداد تیس کے قریب ہے رسالہ میں خاص شان تنوع پیدا کر رہے ہیں، اکثر افسانے کامیاب و دلچسپ ہیں، رنگین تصاویر کی ایک تعداد بھی شامل کر دی گئی ہے۔ اور رسالہ بحیثیت مجموعی بہت کامیاب رہا ہے۔ قیمت فی پرچہ بارہ آنے۔

اخبار پرتاپ لاہور۔ ادب لطیف کا افسانہ نمبر

رسالہ ادب لطیف کا افسانہ نمبر بغرضِ ریویو آیا ہے۔

جس میں تمام افسانے معیاری اور دلچسپ ہیں، منظوم افسانے بھی کافی جاذب توجہ ہیں۔ ادب لطیف کے مدیر میرزا ادیب بی۔ اے کا افسانہ "صحرانورد کا چوتھا خط" بہت ہی عجیب و غریب ہے، اور دیگر حضرات کے افسانے اور منظومات بھی ہیں — جو بہت اچھے ہیں۔ ہم اس کامیابی پر جناب چوہدری برکت علی بی۔ اے اور میرزا ادیب بی۔ اے کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں لکھائی چھپائی عمدہ۔ ٹائیٹل پیج خوبصورت قیمت بارہ آنے۔

سید اختر احمد اورینوی ایم۔ اے فرماتے ہیں

"ادب لطیف" کا افسانہ نمبر ملا۔ شکریہ!

صحرانورد کے چوتھے خط پر میں آپکو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ آپنے تشبیہہ کی جزئیات میں بھی ہیبتناکی اور اعجوبگی کا پہلو اختیار کیا ہے۔ غالباً فطرت آپکو اردو کا "ایڈگر ایلن پو" بنانے والی ہے۔

آل انڈیا براڈکاسٹنگ دہلی

جب سے دہلی میں براڈکاسٹنگ کا محکمہ قائم ہوا ہے۔ ہندوستانیوں نے ریڈیو میں نہایت دلچسپی لینی شروع کر دی ہے جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے، کہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ریڈیو سٹیشن قائم کئے گئے ہیں، اور قائم کئے جا رہے ہیں آل انڈیا براڈکاسٹنگ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر گورنمنٹ کالج

لاہور کے سابق پروفیسر مسٹر احمد شاہ بخاری ہیں جو تعلیمی حلقوں میں خاص شہرت کے مالک ہیں اور اردو کے مشہور مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں کامل امید تھی کہ آپ اسقدر ذمہ دارانہ حیثیت اختیار کرتے ہی اپنے فرائض بھی ذمہ داری کیساتھ انجام دیں گے مگر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ آپ نے اپنی شخصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے محدود حلقہ احباب کو نوازنا شروع کر دیا ہے۔ ایک اتنی ذمہ دار شخصیت کا یہ وطیرہ حیرتناک ہونے کے علاوہ افسوسناک بھی ہے۔ ملک کے متعدد اخبارات نے آپکے اس افسوسناک عمل کے خلاف متعدد بار صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اور کر رہے ہیں۔ مگر بخاری صاحب نے اپنے عمل میں ذرہ بھر تغیر پیدا نہیں کیا۔ آل انڈیا براڈکاسٹنگ بخاری صاحب کی ذاتی جائداد نہیں۔ کہ آپکو اس پر پورا حق حاصل ہو۔ اور اسکے تمام انتظامی امور آپ کی ذاتی رائے پر منحصر ہوں بلکہ یہ ایک تعلیمی شعبہ ہے۔ تبادلہ خیالات کا ایک زریں موقعہ، نشر و اشاعت کا ایک قابلِ قدر ذریعہ۔ اس لئے ہر قابل شخص کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ بخاری صاحب اسے اغراض شخصیہ کے حصول کا ذریعہ کبھی نہیں بنا سکتے۔ غور کیجئے دہلی براڈکاسٹنگ کے انچارج کے عہدہ جلیلہ پر آپ نے اپنے برادر اصغر ذوالفقار علی صاحب کو فائز کر دیا ہے اس طرح شملے کی شاخ کا انچارج آپ نے اپنے برادر نسبتی کو بنا دیا ہے۔ درآنحالیکہ دونوں حضرات اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی صلاحیت و قابلیت سے محروم ہیں۔ کیا اس سے زیادہ غرض پرستی کا کوئی اور مظاہرہ ہو سکتا ہے؟؟

ریڈیو پر بولنے کا موقعہ آپ نے اپنے اصحاب ہی کے سپرد کر رکھا ہے۔ اس طرح جہاں ملک کے جلیل القدر اہل قلم کے حقوق تلف کئے جا رہے ہیں، وہاں عامۃ الناس کو بھی ان حضرات کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا جا رہا۔ بخاری صاحب کی خدمت میں کئی بار اس رویے کے خلاف کہا گیا مگر آپ نے ستم ظریفی سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا فرما دیا کہ ملک میں "ریڈیو" پر بولنے والے حضرات کی بہت زیادہ کمی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے آل انڈیا براڈکاسٹنگ کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر اس سے بڑھکر کسی اور غیر ذمہ دارانہ روش کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے بخاری صاحب بحیثیت مصنف ایک ظرافت نگار ہیں۔ اور بحیثیت عملی انسان ——— ایک ستم ظریف ——— !

مصیبت یہ ہے کہ آل انڈیا براڈکاسٹنگ کا ڈائرکٹر ایک یوریپین ہے، جو اردو کے اہلِ قلم سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا، اور اگر واقف ہو سکتا ہے تو بخاری صاحب کی وساطت سے۔ اس طرح بخاری صاحب کو موقعہ ملا ہے کہ جو چاہیں کریں۔!

بہرحال ہم بخاری صاحب کے اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ڈائرکٹر صاحب کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

کیا ہم امید رکھیں کہ بخاری صاحب ہماری گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

اردو کو ترقی دینے کے چند ذرائع

ہمارے محترم مضمون نگار جناب سید راحت مولائی بی۔ اے دعا گو۔

اپنے مکتوب میں اردو کو ترقی دینے کے لئے چند ذریعے بتاتے ہیں۔ یہ ذرائع ایسے ہیں جن پر فوراً عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔

"فی زمانا ہندی کے پرچار اور پروپیگنڈہ سے یہ خوف محسوس ہو رہا ہے کہ دس پندرہ برس کے اندر ہی اندر کہیں اردو بالکل ہی ختم ہو جائے۔ اسلئے ہر اردو نواز انسان اور ہر ہم عصر اردو اخبار ورسالہ کا فرض ہے کہ وہ بھی زبان اردو کے احیاء میں بیش و بیش حصہ لے۔ ہمارے خیال میں ذیل کے چند طریقے اردو کو زندہ ہی رہنے میں کامیاب ثابت نہ ہونگے بلکہ اردو کو وسیع سے وسیع تر بھی کر دینگے۔ کاش اردو دان حضرات ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔

(۱) ہر اردو پرست کا فرض ہے کہ وہ خطوط کا پتہ صرف اردو میں لکھے۔ کسی دوسری زبان میں لکھنے کی ضرورت نہیں آپ اپنے احباب کو ہزار ہا خطوط لکھتے ہیں، مگر نہ معلوم کس خیال سے پتہ ہمیشہ انگریزی میں لکھتے ہیں۔ کیوں؟؟ کیا آپ کی کوئی زبان نہیں۔ اور اگر ہے تو کیا اسمیں پتہ لکھنے کا کوئی طریقہ نہیں غور کیجئے اور آنسو بہائیے۔

(۲) تجارت پیشہ اصحاب جب کسی دوسری جگہ لین دین یا کسی اور قسم کے خطوط لکھیں تو ہمیشہ اردو میں لکھیں۔ دوسری فرمیں مجبور ہوں گی کہ وہ اپنے یہاں ایک اردو دان کلرک کا بھی اضافہ کریں۔ وہ کلرک چاہے ہندو ہو یا مسلمان ہمیں اس سے بحث نہیں مگر اردو دان ضرور ہوگا۔ اگر نہیں رکھیں گی تو آپ کا کیا جائیگا۔ انکے کاروبار میں نقصان ہوگا۔ دو چار سال اس پر عمل کر کے دیکھئے نتیجہ خود بخود معلوم ہو جائیگا۔

(۳) تاجرین اپنے اشتہارات زیادہ سے زیادہ اردو میں شائع کرائیں۔ سائن بورڈ صرف اردو میں لکھوائیں، اپنے یہاں وہ ملازم رکھیں جو اردو دان بھی ہوں، اپنے یہاں کے حساب کتاب اردو میں لکھوائیں، اور ہر دوسری زبانوں سے بہت کم کام لیں۔

موقعہ ملنے پر میں ایک بسیط مضمون اس پر سپرد قلم کرونگا اس وقت ان ہی دو تین باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ قلم برداشتہ لکھدیا ہے۔"

مکتبہ اردو کی علمی سرگرمیاں

(مکتبہ اردو) نہایت خلوص دیانتداری اور محنت شاقہ کے ساتھ علمی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس مہینے کے آواخر تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو جائیں گی۔

(۱) "پیغمبر صحرا" جو علامہ خالد لطیف گابا کی مشہور عالم کتاب دی پرافٹ آف دی ڈیزرٹ کا بہت کامیاب اردو ترجمہ ہے

(۲) "تین پیسے کی چھوکری اور دیگر افسانے" یہ افسانے اردو کے جلیل القدر مصنف قاضی عبدالغفار خاں کے نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) "چاند کا گناہ اور دوسرے افسانے" یہ افسانے دنیا کے مشہور مصنفوں کے قلم سے ہیں جنہیں نوجوان انشاپرداز راجہ مہدی علی خانصاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب پریس میں ہے۔ انکے علاوہ چند ایک کتابیں کتابت کی منزل طے کر رہی ہیں۔ امید واثق ہے اس سال کے اختتام تک مکتبہ اردو کی متعدد کامیاب کتابیں اردو میں اضافہ کر دیں گی! اہل قلم سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تصنیف وتالیف کی اشاعت

کے لئے منیجر مکتبۂ اردو سے خط و کتابت فرمائیں۔

دو روح فرسا واقعات۔ نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ اردو زبان کے ممتاز ترین فلمی رسالے کے ایڈیٹر جناب بشیر ہندی کی والدہ ماجدہ کا ۲ جون کو انتقال ہو گیا ہے۔ ہمیں اس غم انگیز حادثے میں بشیر صاحب سے ہمدردی ہے۔ خداوند تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اسی مہینے ہمارے کرم فرما جناب محمد امین صاحب کے صاحبزادے کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ دعا ہے خدا امین صاحب کو صبرِ جمیل دے۔!

فنِ افسانہ نگاری۔ افسانہ نمبر میں جناب یزدانی کا ایک مقالہ فنِ افسانہ نگاری کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جسکے بعض مقامات اردو کے مشہور نقاد حضرت اختر اورینوی ایم۔ اے کے مضمون "افسانہ نگاری" سے ماخوذ ہیں۔ یزدانی صاحب نے ہر منقول سطر کو واوین میں لکھا تھا مگر کاتب کی غلطی سے

آغا حشر کی یادگار اور انکے ڈرامے کتنی بار لکھا جا چکا ہے کہ آغا حشر کی یادگار اور انکے ڈراموں کی طرف ملک و ملت کو بہت جلد توجہ دینی چاہیئے۔ مگر کوئی اثر نہیں ہوا اور اسی سلسلے میں ایسے ہمت شکن واقعات سے دوچار ہونا پڑا جن کی کبھی توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ مخالفت کوئی نئی چیز نہیں اہلِ ہمت کے راستے میں یہ ایک معمولی سا روڑا ہے، جسے پاؤں کی ایک ہلکی سی ٹھوکر دور پھینک سکتی ہے۔ ہر نیک کام کی مخالفت کرنا ابنائے زمانہ کا وطیرہ ہے۔ ہمیں مخالفوں کی مخالفت کا شکوہ نہیں۔ مگر اپنے دوستوں کا ہمت شکن و حوصلہ فرسا بے حسی سے ضرور شکایت

ہے۔ ہماری صحافت میں یہ کتنا ماتم طلب، رنجدہ، اور قابلِ نفرت رویہ ہے۔ کہ اخبارات و رسائل کے مطالعہ کرنے والے حضرات، مدیرانِ رسائل و جرائد کی کسی رائے، کسی اعلان، کسی پیغام، کسی تجویز سے ذرہ بھر دلچسپی نہیں لیتے۔ ایڈیٹر ایک سکیم اخبار و رسالہ کے اوراق میں پیش کرتا ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کی نگاہیں اسپر پڑتی ہیں۔ مگر کوئی اثر، کوئی تغیر ان میں پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس سکیم کو امتدادِ زمانہ اخبار و رسالہ کے اوراق کے آغوش میں موت کی نیند سلا دیتی ہے۔ حیف وصد حیف۔!!

حیرت ہوتی ہے کہ کیوں پڑھنے والے صحافت کے ساتھ تعاون نہیں کرتے؟ کیا اپنی رائے کا وہ اظہار نہیں کر سکتے؟ کیا انہیں اس کے لئے وقت نہیں ملتا، اور کیا وہ اس روش کو قابلِ نفرت روش سمجھتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت نہیں سمجھتے۔ انکے پاس وقت بھی کافی ہے۔ پھر وہ کیوں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کرنا نہیں چاہتے دلائل و براہین سے انہیں قائل کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ وہ ایسا نہیں کرینگے۔ کیونکہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے۔!

آغا حشر کے متعلق لکھا جا رہا ہے، مگر چند اصحاب کے سوا کسی نے اس پر اظہارِ خیال نہیں فرمایا۔ چند رسالوں نے ضرور اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے، مگر چند رسالوں کے اظہارِ رائے سے کیا بنتا ہے۔ یہ تجویز تو عالمگیر تائید کی مستحق ہے! خط پر خط بھیجا مگر انجمنِ اردو پنجاب کے کان پر جوں تک نہیں رینگی!!!

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ ہر تجویز، ہر سکیم ہر پیغام جو ان اوراق میں ظاہر ہوتا ہے، آپکے غور کا مستحق ہے آپ اس پر غور فرمائیں، قابلِ تائید ہے۔ تو تائید فرما کر اسے

تقویت دیں، اگر وہ یہ حق نہیں رکھتا تو تردید کیجئے ——!

مگر بے حسی ——! آہ یہ ایک سخت دلشکن رویہ ہے ——!!

کیا آغا حشر اردو کا ممتاز ترین ڈراما نویس نہیں، پھر یہ جمود، یہ بے حسی ؟؟

مصورِ ہند کی سرگرمیاں ۔ ہندوستان کے مشہور ترین مصور، جناب خان بہادر عبدالرحمن چغتائی سے کون شخص ہے، جو واقف نہیں، دیوان غالب کو مصور کرکے آپ نے شہرت جاوید حاصل کر لی ہے۔ آج کل آپ یورپ میں ہیں جہاں عمر خیام کی رباعیات کو مصور کرنے کے سلسلے میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ امید ہے آپ کا یہ کارنامہ دنیائے مصوری کا عدیم النظیر کارنامہ ہوگا! ایک ہفتہ ہوا آپ لاہور تشریف لے آئے ہیں۔

شمارہ حاضرہ کے مضامین ۔ "جوان امنگ والوں سے" ہمارے محترم و مخلص دوست جناب سید راحت مولائی بی۔ اے (علیگ) نے یہ مضمون نہایت محنت و کاوش سے لکھا ہے۔ اور افادی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب! اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مقالات ہماری رائے میں قابل اعتراض ہیں۔ مگر . . . .

ایڈیٹر کا مضمون نگار کی ہر ایک رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

مضمون نصف سے کچھ کم باقی ہے۔ جو آئندہ شائع ہوگا۔

استفسارات ۔ نظم ہے جناب راجہ مہدی علی خانصاحب کی۔ راجہ صاحب ایک کہنہ مشق صحافی ہیں۔ ہم آپکی عنایت کے ممنون ہیں۔

ہماری زبان کا نام ۔ اس مقالے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ٹھوس دلائل و بحث سے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام "اردو" کی بجائے "ہندوستانی" ہونا چاہئے۔

فی الحال ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں ادبا کرام اور ناظرین رسالہ کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں، اور اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ یہ مسئلہ وقت کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے۔ اسلئے اس پر توجہ دینا وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ ہم امید رکھیں کہ ہمارے محترم معاونین ہماری گذارش کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ اس سلسلے میں "ادب لطیف" کے اوراق حاضر ہیں۔

بہار کے دن ۔ اردو کے جوان افکار شاعر جناب عدم کی بہاریہ زمین نظم ہے۔ معلوم ہوتا ہے آجکل آپ بہت مصروف ہیں، کہ خط کا جواب بھی نہیں دیتے۔

سالنامہ ۱۹۳۷ء ۔ ہماری آرزو ہے کہ ادب لطیف کا سالنامہ ۳۷ء نہ صرف گذشتہ سالناموں سے ہر لحاظ و ہر صورت ممتاز ہو بلکہ ایک ایسا کامیاب سالنامہ ہو جسے ہم یورپ کے بہتر سے بہتر سالنامے کے مقابلے میں پیش کر سکیں۔

ادبا کرام سے درخواست ۔ چونکہ یہ سالنامہ دسمبر سے پیشتر شائع ہوگا۔ اور اسکے ساتھ ہی بہت ضخیم بھی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ کتابت کا کام ابھی سے شروع کرا دیا جائے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے محترم قلمی معاونین اس طرف توجہ فرمائیں۔ سالنامے میں بعض مضامین مصور کئے جائینگے اسلئے مضامین کا جلد موصول ہونا اور بھی ضروری ہے۔!

رسالہ ادبی دنیا کا نیا ادارہ تحریر ۔ ہمیں یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ رسالہ ادبی دنیا کے ادارہ تحریر میں ملک کے مشہور و معروف فسانہ نگار حضرت عاشق بٹالوی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی، اور نوبہار شاعر حضرت حفیظ ایم۔ اے کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں، امید ہے ان حضرات کی ادارت میں ادبی دنیا ترقی کریگا۔

جناب راز یزدانی صاحب

زندگی

بار جو سینۂ حق کوش سے ہو جاتا ہے مرگ اس تیر کی نخچیر ہوا کرتی ہے
اس حقیقت کو حسینؑ ابن علیؑ سے پوچھو زندگی موت سے تعمیر ہوا کرتی ہے

زندگی

بے جا ہے انتظارِ سکونِ ہوا و بحر طوفاں میں جو رواں ہوں وہ بیڑے ہیں زندگی
ساحل نہیں حقائقِ دریا کا راز دار موجوں سے کھیل جنکے تھپیڑے ہیں زندگی

"موت"

جو ہو ضمیر کا مقصد وہ برملا کیجے جو ہو ضمیر کا مطلب وہ برملا کہیے
یہ اختیار جہاں سے حیات میں کم ہے وہیں حیات نہ کہیے اسے قضا کہیے

(ابو الخیال) سید راحت مولائی مرادآبادی۔ بی۔ اے (علیگ)

جوان امنگ والوں سے

دُنیا میں ایسے محبت کرنے والوں کی، جن پر کسی قسم اور کسی شخص کی نصیحت کارگر نہیں ہوسکتی، دو اقسام کی جاتی ہیں۔ ایک وہ لوگ جو جذبات کے غلام ہوتے ہیں، اور وقتی جذبہ کے تاثرات اُن کے دل و دماغ کو فہم و شعور سے خالی کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگوں پر ایسے وقت میں سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے، کہ یا تو کوئی بھوت سوار ہوتا ہے یا کسی مخصوص قسم کے پاگل پن کا ان پر دورہ پڑتا ہے۔ نہ تو مجھے اور نہ کسی ذی فہم انسان کو اُن حقائق سے انکار ہوسکتا ہے۔ جو محبت و شباب کے ادنےٰ کرشمے ہیں۔ مرد اور عورت میں ان دو چیزوں کا اجتماع کیا کیا ظلم ڈھاتا ہے۔ اور محبت میں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن درحقیقت میں اپنی ہنسی بھی ضبط نہیں کر سکتا۔ جب یہ دیکھتا ہوں کہ مرد وقتی تخیل کے زیر اثر کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ عمر کے سولہویں اور بائیسویں یا پچیسویں حصہ کے درمیان مرد کو کن کن حماقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کتنی مرتبہ کسی کی ایک نظرِ کرم اور تبسم عاجز نواز نے دلیل و برہان کے قلعوں کو ہوا میں اڑا دیا ہے۔ اور کتنی بار کسی کی ایک "نگاہِ غلط انداز" نے غم و اندوہ کے اندھیرے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے۔ کیا دنیا کی تاریخ ایسی مثالیں پیش کرنے سے اپنے اوراق کو چھپائے گی۔ جہاں دیکھتے دیکھتے مرد نے محبت میں خود اپنی جان گنوا دی ہو

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہادرانہ بزدلی اور بزدلانہ جوانمردی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایسے خیال و ارادہ والے شخص سے عقل و تمیز کی بات کرنا، یا کسی دلیل کو سامنے رکھ کر قائل ہونے کا موقعہ دینا دراصل کج فہمی ہے۔ آپ موقعہ و محل کے مطابق بحث کر سکتے ہیں مگر یہی کوشش اگر اس شخص کی بجائے ہوا کی موجوں یا دریا کی لہروں کے ساتھ کی جائے تو شاید بہتر ہو۔ ایک تلاطم خیز پانی کے دھارے پر بندھ باندھ کر جس طرح اسکا زور بے پایاں کر دیا جاتا ہے اسی طرح ایسے بے وقوف انسان کو نصیحت کر کے اس کی حماقتوں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اُسکے خیالات کی رو بہر حال بہے گی۔ چاہے نتیجہ کچھ ہی ہو۔ اس حال میں علاج صرف یہ ہوسکتا ہے کہ یا تو محبوب و محب دونوں میں دائمی جدائی کر دی جائے یا اسکو حسین عورتوں کی صحبت میں بٹھایا جائے یا ترنم ریز موسیقاروں کے گانے سنوائے جائیں۔ تاکہ وہ دوسرے کی نہیں تو اپنی ہی زندگی پر رحم کرنے کے قابل ہوسکے۔ مگر یہ علاج مقامی ہے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس جگہ ایک نئی مصیبت آتی ہے۔ غیر شادی شدہ عورتیں ہی نہیں بلکہ شادی شدہ بھی جہاں اس حقیقت سے بے انتہا مسرت محسوس کرتی ہیں کہ اُن کی "مانگ" اب بھی کوئی

ہے۔ وہاں یہ تمنا بھی رکھتی ہیں کہ وہ مانگ والا کم از کم مجنوں کا
چھوٹا بھائی تو ہو۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر وہ عمل جو ہر وقت بیشتر
ایسے پاگل کو وحشت وجنوں کے مہیب خیز ویرانے میں جانے سے
روکے۔۔ گویا ایک پیام مبارزت ہے۔ عورتوں کے مفتونِ شانہ
ہے۔ ایک عورت کو اس وقت دیکھئے جبکہ اس کے محبت کرنیوالے
سے طرح طرح کی احمقانہ حرکات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اور محبوبہ اس یقین
کو لئے ہوئے ہو کہ یہ سب کچھ صرف اسی کی وجہ سے ہے ——
کامل اطمینان، احساسِ مسرت اور ایک مسرورانہ درگذر ——
یعنی تبسم کی ملی جلی بہت سی چیزیں ایک وقت میں ایک جگہ پر
دیکھیں گی۔

یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ بالعموم خاندانوں
کی پرورش و تربیت فکر و مصائب کے ہجوم ہی میں ہوتی ہے
جس نے [illegible] سے ایسے ہی جذبات و احساسات
کی تخلیق ہو جاتی ہے جن کے مقابلہ و مجادلہ کے لئے سوائے اس
اہم ترین اور تیز جذبہ کے کوئی اور نہیں ہو سکتا جو شباب سے
بھرپور ہو —— اور مرد اور عورت —— دو ہستیوں کو کہیں
نہ کہیں سے لا کر ایک جگہ بٹھا دے، اور یہی ایک جذبہ اُنکے
ارضی و سماوی تفکرات، مصائب، مشکلات اور رنج و آلام کا
صحیح نعم البدل بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ اگر شادیاں
حسب خواہش، اور کسی مخصوص اصول و مقصد کے ماتحت ہونے
لگیں تو دو ہی دن میں دنیا تمام فیاضانہ و ایثارانہ جذبات و
خیالات سے محروم ہو جائے۔

دوسرا گروہ ان محبت کرنے والوں کا ہے، جو محبت
بھی ریاضی کے اصول کے مطابق کرنے اور منزلی زندگی کی مسرتوں
اور امیدوں کو بھی جریب اور گٹھے سے ناپنے کی کوشش میں
مصروف رہتے ہیں۔ ان کی ان حرکتوں کو نہ تو محبت ہی کے
عنوان کے تحت میں لایا جا سکتا ہے، اور نہ شادی ہی کے۔
بلکہ یہ ایک طرح کی خرید و فروخت ہے۔ فطرتاً اور ضرورتاً،
ایک نوعمر انسان، سماج میں سے اپنی ہم رتبہ عورت کو شادی
کے لئے پسند کریگا اس لئے کہ وہ اسی سے بہ نسبت کسی
دوسرے طبقہ کی عورت کے، زیادہ واقف ہو سکتا ہے لیکن
اگر اس انتخاب کے وقت مرد کی نظر کسی عورت کی دولت پر
ہو، —— یا کسی عورت کے خیال میں مرد کا
موجودہ یا آئیندہ روپیہ ہو، اور دونوں شادی کی کوشش کریں
تو یہ ایک قسم کا سودا ہو گا۔ بادشاہ و شہزادے اور شہزادیاں تو
خیر شادی کے معاملہ میں قانون کی پابند ہوتی ہیں، مگر عمائد و امرا
اگر قانون نہیں تو اپنے مراتب اور اپنی برابری کا خیال ضرور
رکھتے ہیں۔ اور یہ حقیقت، جہاں تک شادی اور منزلی زندگی
کے سچے لطف و انبساط کا تعلق ہے، انتہائی نقصان دہ اور
خطرناک ہے (اور خطرناک کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے
تخت تک کو چھوڑ دے اور عامیانہ زندگی کو شاہانہ زندگی پر ترجیح
دے۔ آفریں!) اس لئے کہ اس لعنت کا شکار صرف ایک
یا دو ہی ذاتیں نہیں ہوتیں بلکہ ساری قوم پر اسکا اثر پڑتا ہے۔
شادی کے بعد اکثر دولت و عظمت میں ایک قسم کا گھن لگنا
شروع ہو جاتا ہے۔ اور میاں بیوی ان کے بعد ان کی اولاد
اور پھر اولاد کے بعد اولاد دولت کو بیدریغ لٹاتی اور مرتبہ کو
جا و بیجا طور پر استعمال کرتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اس جگہ
پہنچ جاتی ہے۔ جہاں "دست خود دہان خود" کا مضمون صادق

آتا ہے۔ آئے دن دیکھنے میں آتا ہے کہ دولت کے کتے اور جاہ و عظمت کے بھوکے اپنے مقاصد و مطالب کے لئے جانی و مالی قربانی کرتے ہیں۔ اور اپنے اس عجب و نخوت کی پرورش میں کچھ سکون و طمانیتِ قلب کا سامان جمع کرنا تو کجا، اپنی زندگی کو اجیرن کر لیتے اور خود ہی برباد ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ کہ وہ محبت کی شادی پر دولت یا فائدہ کی شادی کو ترجیح دیکر افلاس کے بھوت کے مقابلہ کے لئے ایک ناقابلِ شکست فوج تیار کرلیں گے لیکن ان اندھوں سے کوئی پوچھے کہ اگر افلاس ہی آجائے۔ اور اسکا آجانا کوئی تعجب خیز امر نہیں کیونکہ ہر کمانے والے کے لئے ایک دن ایسا ضرور ہوتا ہے، تو اس وقت تمہارے پاس محبت و ہمدردی اور اعتماد کی وہ بے بہا دولت بھی ہوگی جو ایسی حالتوں میں جبکہ تفکرات اور مصائب و آلام ہر طرف اپنے ڈیرے ڈالدیں، روز بروز بڑھتی نہیں بلکہ روبہ انحطاط ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور باوجود بے انتہا مشکلات و مصائب کے اُنکے ضمیر سے یہی کہتی رہتی ہے کہ اب بھی تمہارے پاس ایک بے داغ دولت چھوڑ دی گئی ہے جسکو تم چھوڑ گیا ہے، نہ چھیڑا گیا ہے اور جو بجنسہٖ محفوظ ہے — !

اگر دولت کی خاطر شادی کرنا کسی وجہ سے بے حیائی نہیں بلکہ صرف مذموم ہے۔ اگر یہ قانوناً جائز طور الف بازی اور ان حرکات سے کچھ ہی کم حیا سوز ہے جن کی بہت سی حکومتیں صرف اسلئے اجازت دیتی ہیں کہ وہ اس ذریعہ سے کافی ٹیکس وصول کرسکیں گی تو اس نوجوان کو کیا کہو گے۔ جس نے شباب کے تمنا انگیز زمانہ میں ایک ایسی مالدار عورت سے شادی کرلی ہے۔ جو بجائے بیوی ہونے کے اگر اسکی دادی ہوتی تو بہتر تھا، اور جو انتہائی بدشکل بھی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں؟ صرف اس عورت کی دولت کی خاطر — حقیقۃً ایسا شخص قوم اور ملک کے نام کو بٹہ لگاتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ ذلیل اور کمینہ کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے۔ ہماری اخلاق ایسے نامعقول جوڑے کو ایک ٹھوکر سے ایک پرِکاہ کی طرح اڑا دے گا۔ اور خدا کے انصاف کا چھپا ہوا ہاتھ کرۂ ارض سے اُنکے نام تک کو نیست و نابود کر دے گا۔

آؤ! اے میرے گمراہ ساتھیو!! — بھٹکے ہوئے دوستو! دیکھو نپولین اعظم جیسے پرجلال و باجبروت شہنشاہ کی زندگی چیخ چیخ کر تم کو کیا سبق دے رہی ہے۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو اور نصیحت و عبرت کے کانوں سے سنو۔ دولت، عظمت یا کسی اور ایسے ہی مقصد کے لئے کوئی غیر موزوں شادی کرنا دراصل شہرت، مسرت، اور طمانیت کے شاہراہ پر چلنا نہیں بلکہ بربادی، گمنامی اور مذلت کے گڑھے میں گرنا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں گروہوں کو ان ہی کی حالت پر چھوڑ کر میں اُس گروہ کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو اعتدال پر ہے، جو ہر نصیحت کو بغور سنتا اور اگر قابلِ عمل ہو تو اس پر عمل کرتا ہے اور نہ ٹھکرا دیتا ہے۔ جو سچی محبت کا دلدادہ اور حقیقی مسرت کا جویاں ہے ہمیشہ یاد رکھو کہ شادی دو ہستیوں میں ایک مقدس اور پاک معاہدہ ہے جس کو تمام زندگی [illegible] و پاک رہنا چاہیئے جیسا کہ وہ ادلین ساعتوں میں تھا۔ [illegible] سبب سے اُس پر زندگی کی ہر خوشی اور ہر طمانیت کا دار و مدار ہے لاریب شادی انسانی تفکرات میں بے حد اضافہ کر دیتی ہے مگر ساتھ ہی وہ ان تمام کا ایک مسرت، ایک خوشی ہے جسکے

ساتھ کونین کی ہر بخشش بہا چیز ہیچ ہے۔ نعم البدل بھی دیدتی
ہے۔ اور واقعہ ہے کہ کسی صحیح اور نیک بیوی کا ملجانا انسانی
خوش بختی پر دال ہے۔ نسبت شادی کے معاملہ میں ایک ایسا
جزو لاینفک ہے جس کے بغیر کسی مخصوص فیصلہ پر یقین نہیں ہو
لئے دلیل و برہان کی روشنی چاہئے۔ پھر آپ اپنی زندگی کے
ایک اہم ترین واقعہ کو اپنے لئے جتنا چاہیں اتنا ہی خوش آئند
مفید اور مسرت انگیز کیوں نہ بنالیں میرے نوجوان دوستو!
ذیل کی چند سطور کا گہرا مطالعہ آپ کی مسرتوں۔ آپ کے آرام
آپ کی طمانیت میں بے انتہا اضافہ کر دیگا۔ اسکو غور سے پڑھو
اور پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرو۔

وہ چیزیں جو آپ کو ہر اُس عورت میں تلاش کرنی چاہئیں
جسے آپ رفیقۂ حیات بنانا چاہتے ہوں۔ صرف آٹھ ہیں۔

(۱) وفاشعاری (۲) اعتماد و سنجیدگی (۳) مستعدی
(۴) کفایت شعاری (۵) صفائی (۶) امور خانہ داری سے
واقفیت (۷) خوش مزاجی اور (۸) حُسن۔

۱۔ وفاشعاری :۔ موجودہ تہذیب کی بے راہ روی
اور تملق نے اس چیز کو اگر فنا نہیں تو کم از کم مسخ ضرور کر دیا ہے
وفاشعاری دراصل الفاظ کی معصومیت، خیالات کی عفت اور
اعمال کی پاکیزگی کا نام ہے۔ جس انسان میں عصمت و عفت
اور حیا و معصومیت کا احساس نہیں وہ وفاشعاری کو قیامت
تک نہیں سمجھ سکتا۔ اور چونکہ ایک رفیق حیات کا وفاشعار ہونا
انتہائی ضروری ہے۔ اس لئے جب تک اس میں یہ صفت نہ
نہ ہو وہ ہرگز اس مرتبہ کے لائق نہیں۔ صرف اتنا ہی کافی نہیں
کہ ایک نوجوان عورت مردوں سے ملنے جلنے میں احتیاط سے
کام لیتی اور اُنکے سامنے اپنی نگاہیں جھکا لیتی یا حجاب
نسوانی کے منافی کوئی لفظ سنکر ایک ہلکے سے تبسم کے
ساتھ اپنا منہ پھیر لیتی ہے۔ بلکہ اسمیں یہ بات ہونی چاہئے۔
کہ گویا وہ ان باتوں کو سمجھتی ہی نہیں اور اگر سمجھتی ہو تو اسپر حرف اتنے نقوش
قائم ہو سکتے ہیں جتنے ایک چاند جسم پر۔ ایک حیا باختہ عورت
دنیا میں بدترین دوست ہے۔ پھر وہ بیوی بنکر انسانی زندگی
میں کیا دلچسپی پیدا کر سکتی ہے؟ محبت اندھی ہوتی ہے اسلئے
محبت میں محبت کرنے والے کے اندر اتنی صلاحیت نہیں رہتی
کہ وہ محبوبہ کے کردار کو غیر متعصبانہ طور پر سمجھ سکے یا روشن دماغی
کے ساتھ اُس کا محاسبہ کر سکے۔ اور اگر ابتدا ہی میں یہ چیز قائم
ہوگئی تو آپکو یقین رکھنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کے
اس مرض کو دور نہیں کر سکتی۔ اگر بناوٹی سنجیدگی کسی جھوٹی عفت
کی خاطر ہے تو واقعی یہ قابل نفرین چیز ہے لیکن اگر اس سے
انتہائی بلند عصمت مراد ہے تو یہ دل سے لگا کر رکھنے کی شئے
ہے۔ حقیقۃً میں ہی نہیں بلکہ شاذ ہر دل والا انسان آزاد اور
حسین عورتوں سے گفت و شنید اور اختلاط و ارتباط پسند کرتا
ہے۔ لیکن ایسی عورتوں کو بیوی بنانا بھی میں مصلحت و عقلمندی
کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ شادی ایک ایسا عمل ہے
جس کا اثر چند روزہ نہیں بلکہ تمام زندگی میں جاری و ساری
رہتا ہے۔ اور چونکہ مصائب و آلام کا توازن قائم رکھنے کی ذمہ
داری بڑی حد تک شادی ہی پر ہوتی ہے۔ اس لئے جہانتک
ہو سکے اسکو مکمل ہونا چاہئے ورنہ اس ہونے سے نہ ہونا بہتر
ہے۔ رشک وحسد کو دل میں پرورش کرنا وہ حماقت ہے کہ اگر
کوئی شخص اس کا شکار بن چکا ہے تو وہ قابل رحم ہے۔ بلکہ انسانی

کوشش ایسے جذبات کی بیخ و بن نہ اکھیڑ سکے تو کم سے کم اُنکے شروع ہونے والے عناصر سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ لا علاج ہے وہ بدنصیب اور بدبخت ہے۔ وہ لالچی جو کسی عورت کے کردار پر پورا پورا محاکمہ کرنے کے بعد اسکو خراب پاکر بھی، پیام شادی دے اور شادی بھی کرلے۔ ان اہم معاملات میں مرد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ کبھی ظاہری باتوں پر نہ جائے اور اسکے ساتھ ہی جب تک کوئی قابلِ اعتماد یا عینی ثبوت نہ ہو اسوقت تک عورت کی عفت و پاکبازی میں کسی قسم کا بھی شک اپنے دل میں پیدا نہ کرے۔

تمام آئیوالے مصائب سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ آنکھیں کھول کر کام کیا جائے۔ شادی کے معاملے میں آپ ہر انتخاب کے لئے خود کو آزاد سمجھئے اور کسی دوسرے پر بھروسہ مت کیجئے۔ اسلئے کہ شادی آپ کرتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ اگر ابتدا ہی میں عورت کی آزادی اور ذاتی رشک و حسد کو اہمیت نہ دی جائے۔ تو بہت کچھ علاج درد ممکن ہے لیکن اگر آپ کی ابتدا ہی کسی جذبۂ حرص کے ماتحت ہوئی اور آپ نے شادی کسی ایسی عورت سے کرلی ہے جس سے ظاہر اور خفیہ ملاقاتوں کا موقعہ اکثر آپکو ملتا رہا ہو تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ آپ خود ہی مصیبتوں کو بلا رہے ہیں۔ کیا آپکو یقین ہے کہ جس طرح وہ عورت آپ سے ملنے جلنے میں آزادی اور بے تکلفی سے کام لیتی تھی، یا جس طرح آپ اُس سے بہت کشادہ ہوکر اور ہر تکلف وحجاب کو بالائے طاق رکھ کر۔ ملتے تھے۔ اسی طرح وہ کسی اور مرد کو دعوت یا جرأت اختلاط نہ دے سکتی یا نہ دیتی ہوگی؟ اور پھر بھی اگر شادی کرلی اور نتائج مابعد کچھ امید کے خلاف ہی نکلے تو پھر آپکو کوئی حق نہ ہوگا کہ آپ اپنی بیوی کے شاکی ہوں۔ یا اگر شکایت نہ کرسکتے ہوں تو اندر ہی اندر کڑھیں۔ اسلئے کہ قصور آپ ہی کا ہے۔ اور آپ اُسے خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ اگر آپ واقعۃً اُسکے چال چلن سے ناواقف بھی ہوتے تو آپ کی شکایت بجا تھی۔ خود ٹھوکر کھائی اور خود چوٹ کھائے۔ بیوی یا بچوں پر کسی قسم کی تکلیف کا بوجھ ڈالنا خود کو اخلاقی مجرم بنانا ہے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کی ناخوشگواری اور تعلقات میں کشیدگی پائی جاتی ہے۔ وہاں اگر سو نہیں تو نوّے فیصدی مرد کا قصور ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اندھے کیوں بنتے ہیں؟ ہر چیز آپکے قبضے میں ہوتی ہے۔ جو چاہیئے فیصلہ کیجئے۔

۲۔ اعتماد و سنجیدگی:۔ اعتماد و سنجیدگی بہت وسیع المعانی اصطلاحیں ہیں۔ جہاں ان سے مردانہ زندگی میں مختلف مرادیں ہوتی ہیں وہاں حیاتِ نسوانی میں انکے مطالب کچھ اور ہی ہوجاتے ہیں۔ یہ صفات وقتی نہیں، بلکہ نسوانی کردار میں اس طرح پیوست ہونی چاہئیں جس طرح گوشت اور ہڈیاں مستقل مزاجی۔ حزم واحتیاط۔ اور رکھ رکھاؤ یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک عورت کو معمولی درجہ سے اٹھا کر نہائت بلند جگہ پر بٹھا دیتی ہیں۔ اور جس عورت میں یہ صفات پائی جاتی ہوں میں نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ کوئی اور عورت بھی بیوی بننے کی اہل ہوسکتی ہے۔ پارہ کی طرح بے چین، قینچی کی طرح زبان چلانے والی، پیاری پیاری ہیجان انگیز باتیں کرنیوالی کبھی نہ ٹھہرنے والی، واقعی ایسی عورت ہوتی ہے جس پر خواہ مخواہ

ایک نوجوان دل لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ مگر کیا کشمکش حیات میں یہ چیزیں کچھ کام دے سکتی ہیں؟ ہاں جن کی زندگی تیتری کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں وہ شائد اس حالت کو پسند کریں اور اُنکے لئے موزوں بھی ہے۔ لیکن جو جانتے ہیں کہ زندگی کے بحر ذخار میں کشتی ڈالدینے کے بعد کن کن گردابوں سے واسطہ اور کون کون سی موجوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ وہ اس چیز کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ ایسی سیماب وش زندگی اسی وقت تک مناسب معلوم ہوتی ہے جب تک لڑکپن اور بچپن کے زمانہ میں لوریاں ملتی ہوں لیکن جب وہ وقت آجائے۔ جب ایسی لڑکیوں کے تخیلات بھی اس دلفریب منظر کیطرف رجوع ہوتے ہوں۔ جس جگہ زندگی کا دائمی معاہدہ لکھا جاتا ہے اور جب اُن کے دل میں بھی یہ گدگدی پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی کسی گھر میں حاکمہ بنکر بیٹھیں۔ تو پھر یہ بچپن کی حرکات زیب نہیں دیتیں۔ بلکہ ان کو خیرباد کہدینا ہی بہترین عقلمندی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگرکسی کو ایسی بیوی نہ ملے جو بیک وقت مستقل مزاج بھی ہو سنجیدہ بھی محتاط بھی ہو معتمد بھی۔ اور اپنے رکھ رکھاؤ میں حزم و شعور سے بھی کام لیتی ہو۔ اس مرد کو تمام زندگی مجرد رہنا چاہئے کیونکہ زندگی کو ناخوشگوار بنادینے والی شادی سے احتراز و گریز ہی لازمی ہے۔

اعتماد:۔ اگر آپکو اپنی بیوی کا سچا اعتماد حاصل ہوجائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو دنیا میں بہت کچھ مل گیا۔ اس سے زیادہ بے بہا چیز دنیا میں کوئی نہیں۔ اس شخص سے اس کے روحانی آلام کا تذکرہ سنئے جو مکان کی چوکھٹ چھوڑتے وقت ہزارہا شکوک دل میں لیکر نکلا ہے میرا ادھر بیوی کی عفت و عصمت پر شکوک سے نہیں، بلکہ ان شکوک سے ہے جو ایک بدنصیب مرد کو بیوی کی بد احتیاطی، بے توجہی، فضول خرچی اور بچوں کی طرف سے لاپروائی وغیرہ پر ہونگے۔ پھر اس بدبخت سے ملئے۔ جو اپنی کوئی چیز بغیر تالے کے میز پر المار ی میں تکئے کے نیچے کہیں نہیں چھوڑسکتا۔ اور پھر بھی جس کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس کی ہر چیز قفل میں بھی صحیح وسلامت موجود ہوگی۔ اس سے ہر روز کے تفکرات کا شمار کرائیے۔ واللہ آپکو اس پر رحم آنے لگیگا۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ شوہر جو صرف ایک ثانیہ کی اطلاع پر گھر کو، جیسا بھی ہے، چھوڑ کر چلاجائے اور اسکو ذرہ بھر فکر نہ ہو۔ اور پھر جب وہ واپس آئے تو تمام چیزوں کو نہایت تہذیب سے لگا ہوا، قلم دوات، کاغذ نہایت تمیز سے میز پر پڑا ہوا، جوتا، موزا اپنی جگہ پر رکھا ہوا، چھڑی، ٹوپی، ہیٹ، کھونٹی میں لٹکے ہوئے، اور کمرہ نہایت صاف ستھرا پائے۔ ایسے انسان کو دنیا کی کوئی فکر اور نہ زندگی میں کوئی مصیبت،——جو شخص بیوی بچوں کی ہر مسرت سے ہم کنار بھی ہوتا ہے اور خانگی تفکرات سے ایسا ہی آزاد ہے جیسا مجرد زندگی میں تھا، اُس کی خوشی کچھ نہ پوچھئے۔ دنیا صرف اسی کے لئے ہے مشکل سے مشکل کام میں اُسکو خوشی ہوگی اور سخت سے سخت محنت اُسکا روزانہ مشغلہ۔

اگر آپ اپنی زندگی کو اس ہر درجا ودانی میں غرق کرنیا چاہتے ہیں۔ تو رفیق حیات کے انتخاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیجئے۔ اگر کوئی عورت اپنی ذات میں محو رہتی ہے —— لباس کی بہت شائق ہے۔ خوشامد پر سب کچھ لٹا دینے کو تیار رہتی ہے۔ کام کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت

گذار دیتی ہے اور ہمیشہ خوش آیند چیزوں میں مشغول رہنا
چاہتی ہے۔ اس میں آپ کو کبھی بھی اعتماد کی لازوال دولت
نہیں مل سکتی۔ اپنی طبیعت کو بدل دینا اُسکے امکان سے باہر ہے
اور اگر یہ جانتے ہوئے بھی اس سے شادی کر لی تو یہ امید
انصاف سے بعید ہوگی کہ وہ کسی وقت بھی آپ کی معتمد
بن سکتی ہے۔ اور اگر اتفاق سے یا آپ کی خوش قسمتی سے
ایسی عورت میں کسی وقت بھی اعتماد کے آثار پائے جائیں۔
پھر آپ آنکھیں میچ کر اس پر اعتماد کیجئے۔ اسلئے کہ اگر آپ نے
اس اعتماد کا جواب ایسے ہی اعتماد سے نہ دیا تو یہ آثار فوراً
ہی فنا ہو جائینگے۔ اور آپ کی زندگی ایک ویرانہ بن جائے گی۔
بھیانک اور ہیبت انگیز ——— ایک عورت کو معتمد بنانے
کے لئے پہلے ہی دن سے آپ اُس پر اس امر کے اظہار
کی کوشش شروع کر دیں کہ آپ کو اُس پر کوئی شک نہیں
کوئی خوف نہیں۔ اور اُس کی طرف سے دل میں کسی طرح کا وہم
نہیں۔ بہت سے مردوں نے اپنی جھگڑالو طبیعت کی وجہ
سے خود کو بربادی کے غار میں گرا لیا ہے۔ اور بیوی کی ذلیل
ٹھوکریں کھا کھا کر دائرۂ زندگی کو اپنے اوپر تنگ کر لیا ہے۔
ہر عورت ایسے شخص سے نفرت کرتی ہے جس میں رشک و
رقابت کا مادہ ہو۔ اسلئے اگر زندگی کی بنیاد آپس کے اعتماد
و اتحاد پر رکھی جائے تو کیا کہنے۔

انیسویں صدی کا مفکر ولیم کوبٹ اپنی زندگی کے
حالات لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایک لڑکی سے ملا جسکی
عمر صرف ۱۳ سال کی تھی۔ اسکے دل میں اسی وقت اس بات کی
تمنا پیدا ہو گئی کہ کاش وہ لڑکی اُس کی بیوی بنتی۔ اتفاق سے
اُس لڑکی کا باپ جو کہ ایک فوجی افسر تھا، دوسرے مقام پر منتقل
کر دیا گیا۔ اور ولیم کوبٹ بھی کسی دور دراز مقام کو بھیج دیا گیا۔ اس
وقت اس نے اس لڑکی کو تحفتہً کچھ روپیہ بھیجا۔ اور یہ خواہش
ظاہر کی کہ وہ اس روپیہ کو اپنا روپیہ سمجھے اور لباس اور کتابوں
پر اُس کو صرف کر دے۔ مگر پانچ برس کے بعد جب کوبٹ دوبارہ
اُس لڑکی سے شادی کی تکمیل کے لئے ملا، لڑکی نے وہ روپیہ
بجنسہٖ اسکو واپس دیدیا اور اُسکا شکریہ ادا کیا ——— حقیقتہً
اعتماد و اطمینان کی اس سے بڑھکر اور کوئی مثال نہیں ہو سکتی
جبکہ اُس لڑکی کے اردگرد ایسی فضا موجود ہو کہ اُس روپیہ سے
کہیں زنانہ روپیہ صرف آرائشات ہی ——— خریدنے میں
کھڑے کھڑے "چھو" ہو جائے۔

بہت سے مرد چاہتے ہیں کہ عورت میں اس اعتماد کے
ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی فراوانی کے ساتھ ہونی چاہئے۔ مگر میرے
نزدیک ایک مخصوص حد سے نکلکر سنجیدگی ایک قسم کا غم بنجاتی
ہے۔ ایسی عورت سے جو خاموش سنجیدہ یا بالفاظ دیگر ہر وقت
منہ بگڑی (بوری) رہے۔ محبت نہیں نفرت ہوتی ہے۔ ایسے
انسان کے ساتھ زندگی تو درکنار ایک ہفتہ بھی گذارنا دوبھر ہو
جاتا ہے۔ ہاں دوسروں کے سامنے سنجیدگی، اور شوہر کے سامنے
ہر وقت ہنستے رہنا۔ شرارت کرنا۔ اُسکا دل بہلانا اچھا ہے۔
ایک عورت کی ہر قسم کی شوخی زندگی، اپنے شوہر کے لئے ہی
وقف ہونی چاہئے۔ اور وہ بھی اس وقت جب وہ تھکا ماندہ
دن بھر محنت کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر لوٹے اور اس بات
کا متمنی ہو کہ کسی کا نازک ہاتھ اُسکے دھڑکتے دل کو کسی کے میٹھے
میٹھے بول اُسکے ترستے کانوں کو [illegible]

جھکتے دماغ کو ایک سکون بخش دیں۔ ابدی ایک کیف دیدیں۔
سرمدی اور ایک خواب لادیں نیریں۔ ایک وقت اُسکے دلنواز
قہقہوں میں غم خود اپنی ہستی کو بھی بھول جائے اور دوسرے
وقت اُس کی آہوں کے زیر و بم میں دنیا ہچکولے کھانے لگے۔

—— یہ ہے جذبہ —— اور یہ ہے زندگی ——
ترنم ریز نغمہ —— بے پناہ موسیقی —— خوش نصیب
ہے وہ ماں جو مسرت سے بے خود ہو ہو کر اپنے ننھے سے
تندرست بچے کو سینہ سے لگائے میٹھی میٹھی لوریاں دیتی اور
والہانہ طور پر طرح طرح کے گیت گاتی پھرتی ہو —— گھر کے
ذرہ ذرہ سے خوشی —— مسرت کی گونج اٹھتی ہے ——
اور سارا مکان ملکوتی نغمات کی بارش سے تر ابور ہو جاتا ہے
—— یہ ہے وہ حسین نغمہ جو محبت کی غذا ہے ——
جس پر محبت پلتی ہے —— جس سے محبت کی پرورش
ہوتی ہے —— وہ شور نہیں، وہ شغب نہیں جو دکھاوے
کی محبت کا مرہونِ منت ہو —— جو دماغی کاوش کا نتیجہ ہو
—— دل کی آواز تو کسی اور ہی لطف کی حامل ہوتی ہے
سوچ کر پیدا کی ہوئی آواز میں وہ لوچ کہاں —— وہ اثر کدھر
جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز میں ہوتا ہے ——
دن بھر محنت کے بعد شام کو تھکاوٹ سے چور ہو جانیوالے
انسان کی محبت پدرانہ کا کبھی آپ نے نظارہ کیا ہے ——
واللہ آپکو رشک ہوا ہوگا۔ اس غریب کی حالت پر۔ اُسکی بے لوث
مسرت پر۔ اُس کی محبت پر —— اُن ماؤں اور باپوں کو
دیکھئے جو اپنے بچوں کی خاطر اچھا کھانا، اچھا پہننا اپنے اوپر
حرام کر لیتے ہیں۔ پھر ذرا ان [illegible] ہم، ذرا نظر ڈالئے جو دادِ عیش میں
مصروف ..... دولت کے نشے میں چور دنیا و مافیہا
سے بے خبر ہی نہیں، بلکہ اپنے وجود سے بھی آزاد ہیں۔
شائد آپکو ان دولت پرستوں کی زندگی سے ان بیکسوں کی
زندگی بدرجہا بہتر معلوم ہو —— افلاس کی حقیقت دراصل
کچھ نہیں۔ افلاس سے ڈرنے والا دولت کا لالچی ہوتا ہے
اور دولت کا لالچی کبھی اپنے اخلاق و کردار کا تحفظ نہیں کرسکتا
یا تو وہ خود ہی ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ یا افلاس ہی کے بھوت
کو اپنے اوپر قابض بناکر ایک روز اپنی جان بھی اس کی نذر
کر دیتا ہے۔ افلاس و امارت سے بے نیاز حقیقی انسان
ہوتا ہے۔ وہ اس کی بیوی اور بچے، گویا مختصر سے خاندان
کا ہر فرد، فردوس کی ایک روح، مسرت کا ایک پیکر، اور آزادی
کا ایک مجسمہ ہوتا ہے، اور اس تمام مسرت، اس تمام خوشی
کا سہرا، اگر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ عورت اور صرف عورت
کے نیک تدبّر اور خوش انتظامی کے سر ہے، اور ان کی تخلیق ذاتی
اعتماد کے خیال ہی سے ہوتی ہے۔

رومان پرست طبائع شائد میرے مرقومہ بالا الفاظ
کو اپنے خلاف کوئی بغاوت سمجھیں اور اس اعتماد و سنجیدگی کو
جسکے لئے میں اتنا اصرار کر رہا ہوں۔ اس جوش محبت کا فقدان
تصور کریں۔ جن کی وہ ایک عورت سے متمنی ہوتی ہیں۔ لیکن
اپنے مشاہدہ اور تجربہ پر مجھے دعوےٰ ہے کہ لائیے جس
جوش کے آپ متمنی ہیں۔ صرف وہی مجھے دیدیجئے۔ اور میں
اپنی زندگی کی ہر دلچسپ چیز آپ کی نذر کر دونگا۔ مگر دوستو!
یقین جانو کہ دنیا اب اس محبت سے خالی ہے۔ جو آپ کو
فرہاد و مجنوں کی داستانوں اور ادیبوں کے موجودہ افسانوں

میں دستیاب ہوتی یا ہوسکتی ہے۔اب تو محبت بھی مطلب
پرستی کا دوسرا نام ہوگیا ہے۔ محبت میں وہ ایثار، وہ قربانی، اور
وہ خود فروشی، جو کبھی محبت کرنے والے کا طرّۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی
اب محبوب کیلئے ایک مذاق ہے۔اور دنیا والوں کے لئے ایک
حماقت۔ محبت کا جذبہ جتنا تیز ہوتا ہے اتنا ہی اس میں ہلکے پن
کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔طوائفیں کس جوش کے ساتھ آپ
سے ملتی ہیں۔مگر کیا کبھی انہوں نے کسی سے سچی محبت کی ہے
اور کیا وہ کبھی کسی سے سچی محبت کرسکتی ہیں؟؟ اس ذریعہ سے
صرف ان کے حیوانی جذبات کی طمانیت کا سامان مہیا ہوتا
رہتا ہے اور بس مستقل مزاجی ان کو چھوکر نہیں گذری۔ تغیر و تبدل
ان کی زندگی کا پہلا اصول ہوتا ہے۔اور اس میں جتنی بھی ممکن
ہوسکتی ہے وہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔کیا آپ اپنے محبوب کو کسی
دوسرے شخص کے محبوب سے بدل لیں گے؟ کیا آپکا دل یہ گوارا
کرلیگا؟ ؟ کیا دوسرا شخص اجازت دے سکیگا؟ ؟ مگر ان کی دنیا
میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔اور ضروری ہے سطحی دماغ اور اُتھلے
دل کی عورتیں کسی گہرے جذبہ سے قطعاً محروم ہوتی ہیں۔محبت
اس وقت تک صرف ایک جذبہ کا نام ہی تو ہے۔جب تک
کوئی مرکز نہ ہو۔کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے محبت ہو لیکن وہ
عورتیں، جن کی زندگی میں ہلکے پن اور چھچھورے پن کا پہلو نمایاں ہوتا
ہے کبھی ایک مرد پر قانع نہیں رہ سکتیں۔ان کی فطرت ہی
ان سے بغاوت کرتی ہے۔اور وہ ہر روز ایک نئی آغوش کی
زینت ہوتی رہتی ہیں۔صرف اسلئے کہ وہ جذبات کی گرمی اور
تندی سے محبت کرتی ہیں۔آپکو بہرحال عورت کی جسمانی بناوٹ
اُس کی قدرتی خواہشات، فطری افتاد اور ملکی رسومات کا لحاظ
ضرور رکھنا پڑیگا۔ایک فرانسیسی حسینہ میں چھچھورا پن جتنی افراط سے
پایا جاسکتا ہے کسی اور میں نہیں۔ایک مرتبہ مجھے ایک فرانسیسی
لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔میں حیرت میں پڑا ہوا تھا کہ وہ
کس بیباکی کے ساتھ اپنے تبسمات کی اچھوتی دنیا کو لٹانے پر
تلی ہوئی ہے۔ہماری تمام گفتگو کے بعد اس کی ایک عجیب حرکت۔
ایک ہاتھ اوپر کو اٹھائے، دوسرا نیچے کئے ہوئے جسم کو ایک
طرف جھکا کر، دوسرا پاؤں پیچھے کی طرف اوپر کو اٹھائے ہوئے
گویا وہ حالت پرواز میں ہو، مجھے آج تک نہیں بھولی ہے
اور پھر اس کا رسیلی آواز میں گنگنانا" اگر محبت میں قوت پرواز
ہے تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کی خوب خوب تعریف
کی جائے" اور سونے پر سہاگہ تھا۔اس وقت میری بذلہ سنج
طبیعت، میری حاضر جوابی، میرے دلائل اور ایک حد تک
تہذیب و آداب بھی مجھے جواب دے چکے تھے۔اور میں مجبور
ہوگیا کہ ———— مگر یہ حالت ہر جگہ نہیں ہوسکتی۔یہ تو صرف
فرانس ہی کے لئے مخصوص ہے۔

۳۔مستعدی: مستعدی سے مراد وہ جسمانی محنت
شاقہ نہیں جو دولت کمانے یا روپیہ جمع کرنے کے لئے ضروری ہے،
یہ چیز وہاں بھی ضروری ہے جہاں اتنی دولت ہے کہ اس کا
صحیح مصرف بھی نہیں معلوم لیکن اسکے ساتھ ساتھ ممکن ہے
کہ محنت و مشقت کرنیوالوں کی بیویاں سست اور کاہل ہوں۔
زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی موقعہ ایسا نہیں۔جہاں بیوی کا تندرست
اور چاق و چوبند ہونا اس خاندان کی فلاح و بہبودی اور خوشنمائی
کے لئے ضروری نہ ہو، جس کی وہ ایک خاص رکن ہونے کی ذمہ دار
ہے۔اگر وہ کاہل ہوگی تو اندر سے باہر تک نتیجے نوکر ہونگے

بھی سست ہونگے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بدتر یہ کہ اسکی اولاد بھی کاہل وجود ہوگی۔ ہر کام کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا کر رکھدیا جائیگا اور وقت پر بھی انتہائی عجلت میں بڑی بدسلیقگی، اور بیہودگی کے ساتھ کیا جائیگا۔ اور بہت سی حالتوں میں تو شائد اسکو چھوا بھی نہ جائے۔ شوہر کو کبھی وقت پر کھانا نہیں مل سکے گا۔ اس کا سفر کبھی دلچسپ نہیں ہوسکے گا۔ اور اور ہر وقت طرح طرح کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ گھر کے تمام کام اندر سے باہر تک، نامکمل اور ادھورے پڑے رہیں گے۔ یہ چیز دولتمند گھروں میں اور زیادہ تکلیف دہ ہوجاتی ہے۔ اسلیئے ان میں جو نوکر چاکر ہوتے ہیں۔ اور ان کو کسی ضرورت سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جب بھی وہ صرف ورزش ہی کی خاطر کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کچھ نہ کریں تو اعضا معطل ہوکر رہ جائینگے۔ اور ایک وقت وہ آئیگا جب ان کو جینا تک برا معلوم ہونے لگے گا۔ اس لئے ایک عورت، چاہے وہ کتنے ہی بلند رتبہ ہو۔ اگر کاہل ہے تو خود کے لئے، شوہر کے لئے، آنیوالی نسل کے لئے، غرضکہ سارے گھر کے لئے ایک مصیبت سے کم نہیں۔

شادی کے وقت یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں عورت مستعد اور کام میں قابل ہے۔ ہاں اس شخص کو تو جس کو کسی کی شراب ریز آنکھوں، خون آشام ہونٹوں، دلنشیں عشووں اور سریلی آوازوں نے اگر پورا نہیں تو آدھا ضرور دیوانہ بنا دیا ہے اپنی محبوبہ کی ہر برائی بھلائی اور ہر بدی صفت نظر آئے گی۔ اس معاملہ میں دلائل اتنے کارآمد ثابت نہیں ہوسکتے جتنے ظاہری آثار۔ان ظاہری آثار سے اخذ نتیجہ میں ایک شخص اپنی قوت استدلال کو کام میں لاکر صحیح فیصلہ پر پہنچ سکتا ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کسی کمزوری اور برائی کو چھپانے کی کوشش خود ہی نہیں کرتی، بلکہ اس میں اسکا سارا گھر شریک ہوتا ہے اور اس وجہ سے اکثر فیصلہ قائم کرنے میں مرد دھوکے میں پڑ جاتا ہے لیکن اگر اس کی نظر نکتہ نشین اور اسکا دماغ نکتہ رس ہے تو وہ اپنے مطلب میں ناکام نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ عورت اپنی زندگی کی داستان گو ہوتی ہے۔ اور جو چیز ظاہر ہے۔ وہ بہر حال ظاہر ہے۔

سب سے پہلے عورت کے طرز گفتگو کو دیکھئے۔ اگر اسکی زبان کو آہستہ آہستہ جنبش ہوتی ہے۔ اور اس کے ہونٹ کاہلانہ طرز سے ہلتے ہیں۔ آواز بھی مری مری اور بڑی آہستہ سے نکلتی ہے۔ اور ادائی الفاظ میں تیزی نہیں پائی جاتی ہے۔ تو وہ عورت کبھی مستعد کار نہیں ہوسکتی۔ آواز میں تیزی، صفائی اور جھنکار کا پایا جانا مستعد عورت میں ضروری ہے۔

پھر دانتوں پر غور کیجئے۔ اگر دانت اپنا کام صحیح طور پر انجام دیتے ہیں تو جسم کا ہر عضو اور دماغ بھی اپنے وظیفۂ عمل کو صحیح طور پر پورا کرے گا۔ "زود خور، تیز گام" لیکن اکثر اس جگہ آداب محفل سد راہ ہوتے ہیں اور ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ ہم محفل میں کبھی جلدی جلدی نوالہ نہ چبائیں۔ یا جلد کھانا نہ کھائیں جتنے ہو کہ جب تک ایک شخص بھی کھاتا رہے، دسترخوان سے جنبش تک نہ کریں لیکن ایک عورت، چاہے وہ آخری وقت تک دسترخوان پر بیٹھی اور اس رسم کی تکمیل کے لئے آخری لمحہ تک باقیماندوں کا ساتھ دیتی رہے مگر اپنے دانتوں کی کیفیت کو نہیں بدل سکتی۔ وہ یا تو ایک ہی نوالہ دیر تک خواہ مخواہ چباتی

رہے گی۔ یا چھوٹے چھوٹے نوالے کھائیگی: تاکہ وقت پورا کرسکے لیکن وہ جب بھی نوالہ چبائے گی اُس چیز کو نہیں چھپا سکتی جو فطرت نے اس میں ودیعت کر دی ہے۔ اور آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آیا اسکے جبڑے ہی سستی کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ یا وہ عمداً آہستہ آہستہ کھا رہی ہے۔ اسکی مسکراہٹ، اُسکے ہاتھ کے کاڑھے ہوئے پھول اور کشیدہ کئے ہوئے نقشے اس امر میں ممد ثابت نہیں ہوسکتے۔ اس کی بجائے اگر ممکن ہوسکے تو یہ دیکھئے یا معلوم کیجئے کہ وہ کھانے پکانے اور گھر کا کام کاج کرنے میں سستی سے کام لیتی ہے یا انتہائی پھرتی اور مستعدی سے۔ اگر وہ کاہل ہے تو اس سے توبہ ہی بھلی یہی نہیں۔ بلکہ اگر آپ میں روح اور زندگی ہے تو شاید آپ کو جتنی ایک کاہل عورت سے محبت ہوگی اگر اس سے زیادہ نہیں تو حقیقت معلوم ہونے پر اتنی ہی نفرت بھی ہوجائیگی۔

مستعدی کی دوسری پہچان تیز گامی ہے۔ تیز قدم اور بھاری چاپ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فلاں عورت کو کام کرنے سے کچھ نہ کچھ خوشی ہوتی ہے۔ اور وہ ہر کام برضا و رغبت کرتی ہے جسم کا تھوڑا سا آگے کو جھکا ہونا نظروں کا کسی مخصوص کام کی طرف جما رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں وہ کام کرنے کی خواہش موجزن ہے۔

علی الصبح اُٹھنا بھی مستعدی کی نشانی ہے لاگرچہ بڑے گھروں میں علی الصبح اُٹھنا محنت اور کام کرنے کے سلسلے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اور لحاظ سے اس کی اہمیت نظرانداز بھی نہیں کی جاسکتی۔ میرا خیال ہے کہ ایسی عورت سے جو صبح اُٹھکر درختوں کے نازک پتوں پر اوس کے قطرے تک نہ پا سکے۔ آسمان کے شفق گوں کناروں پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کو نہ دیکھ سکے، اور بستر پر سے اُٹھکر سیدھی ناشتہ کی میز پر آبیٹھے، زیادہ عرصہ تک محبت قائم رہنا قطعی ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس حالت کو ایک شخص ایک ماہ دو ماہ، چار ماہ، زیادہ سے زیادہ ایک سال تک برداشت کرسکتا ہے۔ یہ وقت بھی بعض اوقات ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں جہاں بچوں کی بسر اوقات اور اپنے خورد و نوش کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرنا ضروری ہے، عورت کا دیر میں اُٹھنا بربادی و تباہی کے مترادف ہے۔ آپ کبھی علی الصبح اُٹھنے والی بیوی نہیں پا سکتے۔ اگر وہ دیر میں اُٹھنے والی لڑکی رہی ہو۔ ہمیشہ دیر میں سوکر اُٹھنے سے اُسکو ایک قسم کا آرام ملنے لگتا ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ اسی آرام کی عادی ہوجاتی ہے۔ پھر اس کو کوئی بھی اس عادت سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اگر اس معاملے میں اسپر ذرا بھی سختی کی جائے تو وہ اسکا باعث محبت کی کمی سمجھنے لگتی ہے۔ اسکا نتیجہ یا تو جھگڑا ہوتا ہے یا بربادی کے آگے ہتھیار ڈالدینا۔ مرد کی علی الصبح اُٹھنے کی تاکید نہ سختی ہے، نہ جھڑکی اور نہ محبت کی کمی بلکہ ایک تمنا ہے خوشی کو بڑھانے اور عورت کے جنسی اقتدار میں اضافہ کرنے کی، جو ایک محبت کرنے والے دل ہی میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اس دل میں نہیں جس میں محبت کم ہوجائے۔ اس امر کی سخت سے سخت تنبیہہ عورت کو تندرست رکھنے۔ اس کی خوبصورتی کو قائم اور پائیدار بنانے، اور آپس کی محبت کو دائمی استحکام دینے کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس طرح عورت، بذاتہ شوہر اور بچے سب کے سب اُن لعنت سے محفوظ رہتے ہیں جو سستی اور کاہلی ...

وجہ سے خاندان کے خاندان برباد کر ڈالتی ہے۔

کفایت شعاری:۔ فضول خرچی کے متضاد چیز کفایت شعاری ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ بخل اور کنجوسی سے کام لیا جائے۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹا جائے جسم پر چیتھڑے لپیٹ لئے جائیں، اور دنیا کی نظروں میں ذلیل وخوار بنکر زندگی گذاری جائے۔ دراصل ہر غیر ضروری خرچ اور ہر غیر ضروری چیز سے خود کو محفوظ رکھنے کا نام کفایت شعاری ہے۔ اور یہ صفت ہر انسان میں چاہے وہ امیر ہو یا غریب قابل ستائش اور نہایت اہم ہے بعض لوگوں کے پاس روپیہ اور دنیا کے ہر آرام و آسائش کی چیز اتنی افراط سے ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کے نزدیک اسکا استعمال مالک کے لئے ایک مستقل مصیبت ہوجاتا ہے لیکن ان لوگوں کے لئے بھی فضول خرچ عورت ایک آسمانی بلا سے کم نہیں جو ایک نہ ایک دن یا تو در در کی ٹھوکریں، یا بے کرایہ کے گھر کی ہوا کھلاتی ہے۔ اور پھر بھی کسی غلطی کا اعتراف اس سے ناممکن ہی سا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مالدار اور روپیہ والے دیکھتے دیکھتے اپنی نالائق بیویوں کی فضول خرچی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اس میں بعض اوقات ذاتی فضول خرچیاں بھی بروئے کار رہتی ہیں۔ مگر زیادہ تر اس بربادی کا باعث وہی ہستی ہوتی ہے جسکا فرض ہے کہ وہ ایک نئے گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس گھر کی عزت، عظمت اور شہرت کی واحد محافظ وضامن بنے۔

اگر فضول خرچی کی ستم ظریفیاں مالدار طبقہ ہی تک محدود رہیں تو بھی انکا نعم البدل ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ لیکن [illegible] طبقہ [illegible]

سے بچنے کی پھر کوئی صورت نہیں۔ اور اگر اتفاق سے کوئی بیوی ایسی ہو جسکا شوہر روپیہ پیسہ اسی کے پاس رکھتا ہو۔ اور اُسے فضول خرچی کی چاٹ لگ جائے تو پھر تباہی اتنی ہی لازمی ہوجاتی ہے جتنی کہ پیری۔ اسلئے ضروری ہے کہ محبت کرنیوالا بالکل اندھا ہو جائے اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے کوئی تدبیر سوچے۔ اس وقت میری رائے میں عورت کے اختیار سے تمام چیزیں لے لینی چاہئیں۔ اور صرف اسکا لباس اور مکان کے غیر اہم اور معمولی معمولی امور اسکی سپردگی میں چھوڑ دینے چاہئیں۔ اگر وہ ان چیزوں میں بھی روپیہ زیادہ صرف کرتی ہے اگر وہ اپنے معمولی معمولی امور میں بھی اپنی حیثیت سے زیادہ نمائش چاہتی ہے، اگر وہ ہر قیمتی چیز کو مفید و عمدہ چیز پر ترجیح دیتی ہے، اگر وہ اپنی خواہشات کو مطمئن کرنے کیلئے دیگر ذرائع میں مصروف ہوجاتی ہے یا تلاش بھی کرلیتی ہے، اگر وہ رئیس اور امیر لوگوں کی نقل کرنے میں سب سے پہلا قدم اُٹھانے پر تیار رہتی ہے۔ تو یقین رکھئے کہ جس وقت بھی اُسکو موقعہ ملیگا وہ آپکو ایک ایک پیسہ کی محتاج کردے گی۔ ایسی حالت میں ایک عقلمند آدمی کا فرض ہے کہ ایسی عورت کے حسن وغمزہ کے جال سے جہاں تک ہوسکے جلد از جلد آزاد ہوجائے۔

فضول خرچی کی موٹی موٹی اور ظاہر و باہر نشانیاں ضرورت سے زیادہ زیورات ہیں جسم کو خواہ مخواہ غیر ضروری زیورات سے ڈھانپ کر اعضا کی قدرتی دلفریبی کو فنا کردینا، کونسی عقلمندی ہے؟ یہ چیزیں محلات یا اُنکے متوازی مکانات میں [illegible] معمولی طبقہ کے لوگوں میں نہیں حقیقی

حُسن، مصنوعی زیبائش سے ملیامیٹ اور قدرتی سادگی سے
انتہائی دلفریب ہو جاتا ہے۔ آپ کو جو چیز گاؤں کی ایک
اَلھڑ کنیا میں ملے گی وہ زیورات سے لدی ہوئی کسی محل کی رانی
میں نہیں مل سکتی۔ معمولی طبقہ کے لوگوں میں شوقین لڑکیوں
کا وجود بدبختی کی نشانی ہے، اور ایسی لڑکیوں سے شادی کا ارادہ
تباہی کا پیش خیمہ۔ اگر اتفاق سے آپنے ایسی ہی لڑکی بیوی
بنالی تو یاد رکھئے کہ نہ تو آپکو سکون مل سکیگا اور نہ ہی آپ کے
پاس کوئی دولت رہے گی۔ روزانہ ایک نئی فرمائش آپ کے
سامنے رکھدی جائے گی۔ اور روزانہ آپکو اس کی تعمیل کرنی ہوگی
اور پھر یہ سلسلہ اسوقت تک جاری رہیگا جب تک کہ یا تو آپ
نہ ختم ہو جائیں یا وہ نہ ختم ہو جائے۔ دلیل اور سمجھ اور ظاہری
آرائش ایک دوسرے کی دشمن ہیں۔ جہاں ایک چیز ہوگی وہاں
دوسری نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا آپکو کسی ایسی عورت سے جو ظاہری
آرائش پر اپنی جان ہی نہیں بلکہ آپکو بھی قربان کرنے پر تیار
ہو جائے، اس بات کی امید ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی کسی دلیل
پر کان دھرے گی۔ یا خود ہی کوئی مفید بات سوچ سکے گی۔ اور
ایسی عورت جو محض کپڑوں کی زیبائش کو حقیر سمجھ کر زیورات کی
دھن میں پڑی ہوتی ہے۔ کیا اس قابل ہے کہ اُسے روپیہ
پیسہ کا مالک بنادیا جائے؟

۵۔ صفائی:- نہایت اہم چیز ہے۔ آپ کبھی کسی مرد
میں ایک ایسی عورت کے لئے جو میلی کچیلی رہتی ہو سچی اور دائمی
محبت نہیں پا سکتے۔ یہاں مرا تخاطب ان لوگوں سے نہیں ہے
جو صفائی کی اہمیت ہی کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان لوگوں سے ہے
جو حد درجہ غریب ہونے کے باوجود انتہائی صفائی پسند اور اسلئے
ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ غریبی اور صفائی، ایسی چیزیں نہیں جو
ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں، آپ ہی انصاف سے بتلائیے کہ کیا آپ
ایسی عورت کے لئے کسی سچی محبت کا جذبہ دل میں پائینگے جو
خود ہی میلی کچیلی نہ رہے۔ بلکہ اپنے امور متعلقہ میں بھی صفائی سے
کام نہ لے۔ مرد اپنی ذات سے بے نیاز ہو سکتا ہے، یا ممکن ہے
کہ اس کا پیشہ ہی ایسا ہو جس میں اسکو زیادہ دیر تک صاف
ستھرا رہنے کا موقعہ نہ ملے لیکن وہ اس چیز کو اپنی بیوی میں گوارا
نہیں کرسکتا۔ عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی دلچسپی و
دلجوئی کے لئے اپنے حسن کو قائم رکھے۔ اور شائد آپ مانیں
کہ حسن اور میلا پن ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

عمدہ لباس صفائی کے لئے ضروری نہیں۔ صفائی تو
کچھ چیز ہی اور ہے۔ اور پھر کسی مخصوص وقت پر صفائی اختیار کرلینا
بھی کوئی کارآمد شے نہیں۔ شوہر دل کی صفائی چاہتا ہے۔
اگر کوئی انسان دل سے صاف ہے تو آپ اسکو کسی وقت بھی
میلا نہیں دیکھ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی
پر صفائی کے معاملہ میں زیادہ خرچ کرنے سے ناراض ہوتا ہے
تو وہ شائد اس سے بھی زیادہ اس وقت ناراض ہوگا۔ جب
صفائی نہیں دیکھے گا۔ اسلئے شوہر کی ناراضگی کا خیال عورت
کو یہاں کبھی نہیں ہونا چاہئے۔

صفائی کی سب سے پہلی نشانی بدن کی صفائی ہے۔ ہاتھ
اور منہ کا صاف رکھنا، چہرہ پر، کانوں پر یا کانوں کے پیچھے
کن پٹیوں پر میل کا نہ پایا جانا۔ پاؤں اور پاؤں کی انگلیوں
کی گھاٹیوں کا صاف ہونا، جلد کی صفائی میں داخل ہے۔

دوسری نشانی لباس ہے۔ مالدار طبقہ کو میرے بتانے کی

نظر انداز کرتا ہوں۔ اسلئے کہ جس طرح اسکا لباس فضول خرچی کا ثبوت
ہوتا ہے۔ اسی طرح اس لباس کے پہننے اور رکھنے میں بھی وہ کبھی
اپنے اعضاء کو تکلیف نہیں دیتا۔ بلکہ دوسرے ہی لوگ پہناتے
اتارتے اور رکھتے ہیں لیکن عام طبقہ میں یہ نہیں ہو سکتا۔ لباس
کا اندازہ دو چیزوں سے کیا جاتا ہے۔ پہلا رنگ۔ اس سے کسی
عورت کی ذاتی خوبی ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ مرد کو سفید اور
بے داغ کپڑا پہنا دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی
بیوی ضرور کوئی باسلیقہ اور تمیز دار عورت ہے لیکن اگر وہ اپنے
ہی لباس پر کوئی توجہ نہ دے تو کیا آپ کا لباس اُسکی توجہ کا
مرہون کرم ہو سکتا ہے۔ دوسرا لباس کو پہننے کا طریقہ ـــــ
اس سے بحث نہیں کہ وہ کپڑا قیمتی ہے یا بہت ہی معمولی۔
دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کٹا کس طرح ہے، سلا کس طرح ہے
اور پھر پہنا کس طرح گیا ہے۔ اور اگر اس میں کہیں بے قاعدگی ہے
تو عورت کی ہر چیز میں بے قاعدگی اور بدسلیقگی ہوگی۔

پھر عورت کے جوتوں پر توجہ دیجئے۔ ایک طرف سے اُدھڑا
ہوا، دوسری طرف سے پچکا ہوا، کسی طرف کو مڑا ہوا، کہیں دبا
ہوا، کہیں ڈھیلا ـــــ خود ہی سوچئے جس عورت کا جوتا ایسا ہو
اس کی چال کیسی معقول ہوگی؟ اور جس کی چال ایسی ہو کیا اُس میں
کوئی صفت پائی جا سکتی ہے؟ پھر اس حالت سے کیا اُسکی صفائی
اور احتیاط پر کوئی روشنی پڑتی ہے؟ آپکا ضمیر خود ہی اُسکا جواب
دے گا۔ مجھے کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ عورتیں کبھی ان
چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور نہیں کرتیں، اور میرا خیال ہے کہ وہ
میرے ان بیانات سے ضرور آتش زیر پا ہوں گی، اور مجھے
انہیں [illegible] صرف حقیقت بیان
کر رہا ہوں۔ یا ان خیالات کا اظہار جو عموماً مرد کے دماغ میں
پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے مجھے امید ہے کہ وہ ان سے برافروختہ
ہونے کی بجائے کوئی سبق حاصل کریں گی۔ اور اگر ان بیانات
کے مطابق ان میں کوئی عیب یا کمزوری ہوگی تو وہ اُسکو جلد از
جلد دور کرنے کی کوشش کرینگی۔

مرد بالعموم چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق اپنی بیویوں سے
زبانی کچھ نہیں کہتے، لیکن وہ ان پر سوچتے ضرور ہیں۔ یہی نہیں
بلکہ اکثر اپنے ان خوش قسمت پڑوسیوں پر رشک بھی کرتے
ہیں۔ جو ان فکروں سے آزاد ہیں۔ اور بالآخر یہی معمولی معمولی
باتیں بڑی بڑی اہم نکلتی ہیں۔ صورت کا حسن واقعی قابل قدر
چیز ہے، اور دو ہستیوں کے درمیان ایک بندش اور دائمی
بندش کا سلسلہ بھی، لیکن پیری میں یہ انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا
ہے۔ صفائی کا حسن اور اس کی دلفریبیاں شائد زندگی بھر ختم نہ
ہوں۔ یہ انسان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتیں۔ عطر آگیں پھول
سوکھ جانے پر تکلیف کا باعث بنجاتے ہیں ـــــ درحقیقت
ایک بے سلیقہ پھوہڑ عورت کا وجود دنیا میں ایک مصیبت ہے۔

۶- خانگی امور سے واقفیت ۔ بغیر خانگی
امور کی واقفیت کے ایک عورت، اور شائد ایک نواب زادی
بھی، دنیا ایک بوجھ ہے۔ وہ زمانے گذر گئے اور جو ہیں وہ بھی گذرتے
جارہے ہیں۔ جب لڑکی کی اولین تعلیم صرف ان ہی امور کے سیکھنے
پر مشتمل ہوتی تھی جنکا تعلق گھریلو زندگی سے ہوتا ہے۔ اور میں
شائد اسکو یقین نہ کر سکوں۔ جو عورت ان باتوں سے کُلّی واقفیت
رکھتی ہو اُسکے شوہر کو سماج میں کوئی عزت و عظمت حاصل نہ ہو۔

(باقی آئندہ)

استاذ السلطان حضرت جلیل

غزل

پھر ترے تیر نظر آئیں گے　　زخمِ دل جب مرے بھر آئیں گے

داغ اُبھرے تو پڑینگے چھالے　　پھول آئے تو ثمر آئیں گے

سلسلہ اشکِ رواں کا تا کے　　بہ کے اب لختِ جگر آئیں گے

تا فلک آج گئے ہیں نالے　　لیکے دامن میں اثر آئیں گے

شمع ساں اشک مرے دامن میں　　شام سے تا بہ سحر آئیں گے

قبر پر حشر کا ساماں کرنے　　وہ لئے دیدۂ تر آئیں گے

ہوش یہ کہکے اُڑے آج جلیل!
اب پلٹ کر نہ اِدھر آئیں گے

نوشتہ روسی ادیب طالسطائی　　مترجمہ حضرت علی احمد فرزند حضرت جلیل مدظلہ

"ریچھ کا شکار"

ہم ریچھ کے شکار کو نکلے میرے دوست نے ایک ریچھ پر فیر کیا۔ لیکن وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ سفید گالے کے مانند برف پر خون کے سرخ نشانات نظر آ رہے تھے مگر ریچھ روپوش تھا۔

ہم سب ایک جگہ اس تصفیہ کے لئے جمع ہوئے کہ فوراً ہی زخمی ریچھ کا تعاقب کیا جائے یا دو تین دن تک انتظار کیا جائے چنانچہ ایک کسان سے ہم نے دریافت کیا کہ کیا اسی روز ریچھ کے تعاقب میں روانہ ہونا مناسب ہوگا؟

"نہیں۔ یہ نا ممکن ہے" اُس بوڑھے تجربہ کار کسان نے کہا" زخمی ریچھ کو کچھ دنوں کے لئے یونہی چھوڑ دینا چاہیئے چار پانچ دن کے بعد اسکو گھیر لینا آسان ہوگا۔ ورنہ وہ خوف کھا کر دوسرے مقام پر بھاگ جائیگا۔"

"لیکن" نوجوان ڈمیمن نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا" ایسی نرم و لدی برف پر ریچھ دور تک نہیں جا سکتا۔ اسلئے کہ وہ کافی موٹا ہے۔ شام ہونے سے پہلے تک ہم اُسکو پا سکتے ہیں۔"

میرا دوست جو میرے ساتھ تھا ریچھ کا اسیوقت تعاقب کرنیکا مخالف تھا اور مجھے کچھ دنوں انتظار کرنے پر مجبور کر رہا تھا "مگر" میں نے کہا" ہم کو مزید بحث نہ کرنی چاہیئے۔ تمہارا جی چاہے کرو میں ڈمیمن کے ساتھ ریچھ کے تعاقب میں جا رہا ہوں اگر وہ مل گیا تو خیر اور نہ ملا تب بھی کوئی ہرج نہیں۔"

بہر حال یہ مسئلہ طے پا گیا اور سب گاؤں کو واپس ہو گئے صرف میں اور "ڈمیمن" جنگل میں تنہا رہ گئے۔ ہم دونوں نے کچھ کھانا کھایا پھر گرم کوٹ پہنا اور بندوق لیکر نکل کھڑے ہوئے ہوا خوشگوار اور فضا دھندلی تھی۔ نرم برف سے پٹے ہوئے راستہ پر چلنا نہایت دشوار تھا۔ ہمارے جوتے چھ چھ انچ تک برف میں دھنس جاتے تھے۔ ریچھ کے فرار ہونیکا راستہ ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خون کے سرخ دھبے ہماری رہبری کر رہے تھے۔ علاوہ اسکے ریچھ کے قدم کے نشانات بھی واضح تھے۔ چند گنجان درختوں کے پاس جا کر ہم ٹھہر گئے۔

"اب اس راستہ کو ہمیں چھوڑ دینا چاہیئے" ڈمیمن نے کہا" انہیں گنجان جھاڑیوں میں وہ روپوش ہے۔ ہم کو اب چکر لگا کر جانا ہوگا۔ لیکن جلد اور خاموشی کے ساتھ۔ اگر ہم نے آواز کی یا کھانسا تو پھر وہ ہاتھ نہ آئے گا۔"

چنانچہ اُس راستہ کو چھوڑ کر ہم بائیں طرف مڑ گئے اور سو گز چلنے کے بعد ہمیں پھر وہی راستہ ملا جس طرف سے ریچھ گزرا تھا اسلئے کہ اُسکے پیروں کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔

ایک میل تک ہم ان نشانات کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر ہم نے دیکھا کہ اُسکا راستہ گاؤں کو جانیوالی سڑک کی طرف مڑ گیا

اور کچھ دور چلکر پھر جنگل کی طرف۔ ۔ ۔ ۔ پھر سڑک پر آ سکے بعد نشانات
غائب ہو گئے۔

"یہ کوئی دوسرا ریچھ ہوگا" میں نے کہا۔ ڈیمین نشانات کو
غور سے دیکھتا اور سوچتا رہا۔

"نہیں" اُس نے کہا "یہ وہی ریچھ ہے۔ اور بے حد چالاک ہے
اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ سڑک کو چھوڑ کر اُلٹے پاؤں جنگل
کی طرف چلا گیا ہے" ہم نشانات کے پیچھے پیچھے گئے۔ اور ہمیں
معلوم ہؤا کہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ ریچھ دس قدم پیچھے ہٹکر
اور ایک درخت کے پیچھے سے مڑکر سیدھا جنگل کی طرف
چلا گیا تھا۔ ڈیمین چلتے چلتے رک گیا اور کہنے لگا۔

"اب ہمیں اس کا پتہ آسانی سے ملجائیگا۔ ہمارے سامنے
ایک دلدل ہے۔ اسکے قریب ہی وہ ہوگا۔ ہمیں دوسرا راستہ
اختیار کرنا چاہیئے" ہم نے اپنا تعاقب جاری رکھا۔ میں اسوقت
بہت تھک گیا تھا اور چلنا بہت تکلیف دہ معلوم ہو رہا تھا
قدم آہستہ آہستہ اُٹھتے تھے جسم پسینہ سے تربتر ہو رہا تھا چنانچہ
میں نے اپنا گرم کوٹ اتار دیا۔ ہمارا یہ سفر طویل تھا۔ دو میل چلنے
کے بعد ہم دلدل کی دوسری سمت پہنچے۔ ڈیمین یہاں رُک گیا
اور اُس نے کہا "ریچھ یقیناً یہیں کہیں ہے"

میں نے ٹوپی اتار لی اور کپڑوں کے بٹن کھولدئے۔ میرا
سارا جسم بھیگے ہوتے چوہے کی مانند پسینے سے شرابور ہو گیا تھا
ڈیمین تھک گیا تھا۔

"اچھا جناب" اُس نے کہا "ہم نے اپنا کام ختم کر دیا ہے
اب ہمیں کچھ دیر آرام لینا چاہیئے" آفتاب غروب ہو رہا تھا۔
اور اُس کی آخری کرنوں سے سارا جنگل سُرخ ہو رہا تھا۔ برف
پر چلنے والے جوتے جو ہم نے پہن رکھے تھے اتار ڈالے۔ اور زمین
پر بیٹھ گئے۔ اپنی تھیلیوں میں سے روٹیاں نکالیں۔ پہلے میں نے
کچھ برف کھائی پھر روٹی ——— پھر ہم دیر تک بیٹھے گفتگو
کرتے رہے۔ ڈیمین نے مجھے بتایا کہ وہاں سے گاؤں آٹھ
میل کے فاصلہ پر ہے۔ دو گھنٹے آرام لینے کے بعد ہم نے پھر برف
پر چلنے والے جوتے پہنے اور روانہ ہو گئے۔ سارے جنگل میں
بھیانک خاموشی تھی۔ صرف ہمارے جوتوں کی آواز آ رہی تھی۔
برف مسلسل گر رہی تھی۔ اب ہم گاؤں کی سڑک پر آ گئے تھے۔
اور آسانی سے چل سکتے تھے۔ کچھ رات گئے ہم اپنے مقام
پر پہنچ گئے۔ میرا دوست سو رہا تھا۔ میں نے اُسے بیدار کیا۔
اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ پھر ہم سو گئے۔

میں اس قدر تھکا ہؤا تھا کہ اگر میرا دوست مجھے نہ جگاتا
تو میں دوپہر تک سوتا رہتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تیار ہو چکا ہے
اور بندوق کو درست کر رہا ہے۔

"ڈیمین کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ بہت سویرے اُٹھ چکا ہے" میرے دوست نے
کہا "اور ہانکا کرنیوالوں کو لیکر جنگل کو گیا ہے"

میں نے منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور دوست کو لیکر جنگل
کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو میل چلنے کے بعد ہم جنگل کے قریب پہنچے
ہانکا کرنیوالوں کا ایک مجمع جسمیں مرد اور عورتیں تھیں آگ روشن
کئے اُسکے گرد بیٹھا تھا۔ ڈیمین بھی وہیں موجود تھا۔ وہ لوگ
کھڑے ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈیمین اُن سبکو لیکر جنگل
کی طرف روانہ ہؤا اور ہم لوگ اُنکے پیچھے چلنے لگے۔ برف اب
بھی اُسی طرح گر رہی تھی۔ پاؤں گھٹنے تک نرم برف میں دھنس

جاتے تھے اور چلنا بہت دشوار تھا۔ نصف میل تک ہم چلے تھے
کہ ڈیمین یکایک رک گیا۔ اور ہم کو اپنے پاس آنیکا اشارہ کیا۔
ہم لوگ پہنچے تو اُس نے مجھے بتایا کہ مجھے کہاں کھڑے ہونا چاہیئے
میں اپنے متعینہ مقام پر کھڑا ہوگیا۔ اور اپنے ارد گرد نظر دوڑائی
میری بائیں طرف لانبے لانبے درخت کھڑے تھے۔ سامنے گنجان
جھاڑیوں کی ایک قطار تھی جو آدمی کے قد کے برابر تھی۔ یہ سلسلہ
جہاں ختم ہوتا تھا اُس طرف میرا دوست کھڑا تھا۔ میں نے اپنی
دونوں بندوقوں کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا۔ ایک بندوق کو
درخت کے سہارے کھڑا کر دیا جو مجھ سے صرف چار قدم پیچھے
تھا اور دوسری بندوق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ہانکا کرنیوالے سب جنگل کا احاطہ کئے کھڑے تھے۔ دفعتاً
میں نے ڈیمین کی آواز سنی۔ وہ چلا رہا تھا "ہوشیار! ہوشیار!"
ہانکا کرنیوالے مختلف آوازوں میں اُسکا جواب دے رہے تھے۔

"او! او! او!" مردوں نے چلایا "ای! ای! ای!" عورتوں
نے گھبرائی ہوئی آواز میں شور کیا۔ ریچھ احاطہ کے اندر تھا سب
ہانکا کرنے والے شور و غل کر رہے تھے میں اور میرا دوست دونوں
خاموش۔ بالکل خاموش کھڑے ریچھ کے اسطرف آنیکا انتظار
کر رہے تھے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اور میں نے بندوق کی
گرفت کو مضبوط کر لیا تھا۔

"اب! اب!" میں نے سوچا "ریچھ آتا ہی ہوگا میں فائر
کرونگا اور وہ گر جائیگا۔"

یکایک میرے بائیں طرف ایسی آواز آئی جیسے کوئی چیز برف
پر گر پڑی ہو۔ پچاس قدم کے فاصلہ پر میں نے درختوں کے
درمیان سے کوئی بڑی اور سیاہ چیز دیکھی۔ اپنی بندوق کی نالی
کا رُخ اس کی طرف کر کے میں کے قریب آنیکا انتظار کرنے
لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جنگلی ریچھ میرے سامنے آگیا ہے۔ میں نے
فیر کیا لیکن نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا گولی "سن" کرتی ہوئی گذر گئی
ریچھ پلٹا اور درختوں میں غائب ہوگیا۔

"افسوس" میں نے دل میں کہا "موقعہ ہاتھ سے گیا۔
اب وہ ادھر نہ آئیگا۔ یا تو میرے دوست کے ہاتھوں سے مارا جائیگا
یا ہانکا کرنیوالوں کی صفوں کو منتشر کرتا ہوا فرار ہو جائیگا۔"

میں نے پھر اپنی بندوق کو بھرا اور انتظار کرنے لگا۔
ہانکا کرنے والے سب اسی طرح چلا رہے تھے۔ یکایک ایک
عورت چلائی "وہ یہاں ہے۔ وہ یہاں ہے۔ ادھر آؤ! ادھر آؤ!"
اس دفعہ اُس کا رُخ میرے دوست کی طرف تھا۔ میں نے دیکھا
کہ اُس نے بندوق اٹھائی اور جھاڑیوں میں ریچھ کی طرف فیر کیا
میں سمجھا کہ ریچھ مر گیا لیکن میرا دوست وہیں کھڑا تھا۔ ریچھ کی
طرف نہیں دوڑا۔ غالباً اُسکا نشانہ بھی خطا کر گیا تھا میں ابھی
یہی سوچ رہا تھا کہ سامنے کی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی۔ اور
میں نے دیکھا کہ ریچھ میری —— سیدھا میری طرف تیزی
سے چلا آرہا ہے۔ چھ یا سات فٹ کا فاصلہ تھا۔ جب میں
نے بندوق اٹھائی اور فیر کیا۔ وہ بالکل میرے قریب تھا
میں نے دیکھا کہ میرا نشانہ خطا کر گیا ہے۔ میں نے دوسرا
فیر کیا گولی اُسکے سر کو زخمی کرتی ہوئی گذر گئی۔ اب میں جلدی
سے دوسری بندوق کی طرف بڑھا جس کو میں نے درخت کے
سہارے کھڑا کر دیا تھا۔ مگر قبل اسکے کہ میں بندوق کو لے سکوں
ریچھ مجھ کو گراتا ہوا میرے اوپر سے گذر گیا۔

"شکر ہے خدا کا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا" میں نے

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

لیکن ابھی میں اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُسکے بوجھ سے میں برف میں دھنسا جا رہا ہوں۔ میرے منہ پر کوئی چیز گرم معلوم ہوئی میں سمجھ گیا کہ اب ریچھ میرے چہرے کو چبا جائیگا۔ میری ناک اُسکے منہ میں تھی۔ اور میں اُس کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے قوی پنجوں سے میرے شانوں کو نیچے کی طرف دبا رہا تھا تاکہ میں حرکت نہ کر سکوں۔ اُسکے تیز دانت میری پیشانی اور آنکھ کے نیچے کے گوشت میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چاقو سے میرے چہرے کو کاٹ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُسے اپنے اوپر سے پھینک دوں لیکن وہ مجھ سے بہت زیادہ قوی تھا۔

"اب" میں نے خیال کیا "میرا آخری وقت آگیا ہے۔"

پھر دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے اوپر کا بوجھ کم ہو گیا ہے۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ ریچھ مجھ کو چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔

جب میرے دوست نے اور ڈیمین نے دیکھا کہ ریچھ مجھ پر چڑھ گیا ہے تو وہ میری طرف دوڑے۔ میرا دوست جلدی میں جھاڑیوں کی طرف سے جو بھاگا تو نرم برف میں پھنس کر گر پڑا اور ڈیمین جس کے ہاتھ میں صرف ایک لکڑی تھی چلاتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ ریچھ مجھ کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

جب میں اُٹھا تو دیکھا کہ میرے اردگرد اس قدر خون ہے جتنا کہ ایک ذبح کئے ہوئے بکرے کا ہوتا ہے میرا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میرے دوست اور دوسرے لوگ سب جمع ہو گئے۔ میں نے اپنی تکلیف کا خیال نہ کرتے ہوئے پوچھا "ریچھ کہاں ہے۔ وہ کس طرف بھاگا؟"

اتنے میں آواز آئی "یہاں ہے! یہاں ہے" ہم نے جو دیکھا تو وہ سیدھا ہماری طرف آ رہا ہے۔ لیکن زیادہ آدمیوں کو دیکھ کر لوٹ گیا۔ اُسکے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم نے اُس کا تعاقب کرنا چاہا لیکن میرے زخم اب بہت تکلیف دہ ہو گئے تھے۔ اور ہم بجائے گاؤں واپس ہونے کے ڈاکٹر کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر نے فوراً میرے زخموں پر پٹی باندھی اور مجھے آرام ہو گیا۔

ایک ماہ کے بعد ہم پھر اُسی ریچھ کے شکار کو گئے لیکن مجھے اُسکے مارنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ڈیمین کے ہاتھ سے وہ مارا گیا۔ اس کا نیچے کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا اور میری بندوق کی گولی سے اُسکا ایک دانت بھی گر گیا تھا۔ اُسکی کھال میں اپنے ساتھ لیتا آیا اور اب وہ میرے کمرے میں بچھی ہوئی ہے۔ میرے چہرے کے زخم مندمل ہو چکے ہیں لیکن اُنکے نشانات اب تک باقی ہیں۔

جناب راجہ مہدی علی خانصاحب ۔ رکن ادارہ "زمیندار" لاہور

استفسارات

ایک خط کے جواب میں

سُرخ کلیوں کی حیاؤں سے بنے ہیں تیرے گال؟
کتنی شرمیلی اداؤں سے بنے ہیں تیرے گال؟

یاسمیں کے پھول سی پیاری ہی کیا تیری جبیں؟
صبح کے تارے کو نظروں سے گرا دیتی نہیں؟

دیکھ لیتا ہوں تصور ہی میں اسکی آب و تاب!
بن گیا ہے اک کنول کا پھول جس میں آفتاب!

سُرمئی آنکھیں تری کیا نرگسِ شہلا نہیں؟
رشکِ چشمانِ سیاہِ آہوئے صحرا نہیں؟

یا یہ وہ روشن ستارے ہیں جواب ملتے نہیں؛
باغِ جنت کے فلک سے کھو گئے تھے جو کہیں!

لعل لب پر کیا نہیں تیرے بہاروں کا ہجوم؟
کیا لگا رہتا نہیں ان پہ نظاروں کا ہجوم؟

نشۂ صہبا ہیں ان کلیوں کی شیریں گرمیاں
لاجونتی سے بھی شرمیلی ہیں ان کی سُرخیاں؟

تیرا پیکر منظرِ قوسِ قزح کی ہے جھلک؛
ہر ادا اک برقِ شوخ و شنگ کی چنچل چمک

باغِ جنت میں ہزاروں یاسمیں کے پھول تھے
جن کے سینوں میں پیکروں کی جانِ شیریں چھین کے؟

مرضیٔ یزداں نے جاں تیرے بدن میں ڈالدی
تیرے پیکر پر لطافت اور صباحت آ گئی

آ گئیں گالوں پہ یوں تیرے حیا کی سُرخیاں
چھپ گئیں مخمور آنکھوں میں فسوں کی بجلیاں!

یوں چمک اٹھا ترا چہرہ بدن گدرا گیا
حُسن تیرا دیکھ کر خود حُسن بھی شرما گیا

ہماری زبان کا نام

علامہ سید سلیمان ندوی
نے

یہ تقریر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کے شعبۂ اردو میں ۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو بوقت شب اسٹریچی ہال میں کی

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی اسکا خمیر اٹھتے۔ مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے "ہندوستان" کہدیتے ہیں اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحر شور کے ساحل تک علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے مسلمانوں کی آمد سے پہلے اسکا نہ یہ نام تھا۔ اور نہ یہ اسکی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہوکر بنگال، مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جاکر ختم ہوتا ہے بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے آج اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم بنا لیا ہے۔ کوئی ایک نام نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں "س" اور "ہ" کا باہم مبادلہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح سندھو ہندو ہوا۔ اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، السند والہند، کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سندھ کے کناروں تک کو وہ سندھ اور گجرات اور لار سے باقی اندرونی ملک کو وہ ہند کہتے تھے اس ہند نے یورپ جاکر اِنڈ کی اور انڈ نے انڈیا کی صورت اختیار کرلی ہند والوں کو عرب "ہندی" اور خراسانی "ہندو" کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع "ہنود" اور خراسانی "ہندوستان" بناتے تھے۔

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہل عرب نے اس ملک کو ہند کا، اور اہل خراسان نے ہندوستان کا نام دیا۔ لفظ ستان، جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں، اس لئے ہندوستان ہندو استھان بھی ہوسکتا تھا۔

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی۔ ہر صوبہ کی بولی الگ الگ تھی، لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا یعنی ہندی یا ہندیہ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کے ایک ملک کا ایک نام ہند، یا ہندوستان، اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو، اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے [illegible]

ذہانت تھی، جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک، اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا۔

اس ملک میں عرب، عربی، ایرانی، فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تتلا تتلا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے لگے، جسکا نام انہوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی۔ اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس کو گوجری، دکھن میں دکھنی، اور اودھ میں اودھی کہنے لگے، لیکن صوبہ وار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا، میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا، اسمیں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کئے ہیں،

شاہجہان کے زمانہ میں جب دہلی شاہجہان آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلیٰ کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا، اور صوبہ وار نئی دیسی بولیوں کے لئے اس اردوئی معلیٰ کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کے ساتھ "زبانِ اردوئی معلیٰ" کہنے لگے۔ اور آج سے کوئی سو ڈیڑھ سو برس پہلے زبانِ اردوئی معلیٰ کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبانِ اردو" یعنی اردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر "اردو"

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے۔ دوربینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھی، جسکا تمدن، جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی۔ اسکو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کیئے جانے کے لئے کوششیں شروع کیں، اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو دو زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لیے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر لیا، ابھی اٹھارھویں صدی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بنکر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے۔

ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہیئے، اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اسکا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی، اور بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اردو خط عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے کہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں کبھی لکھی تھیں وہی پورے ملک کی زبان بنا دی جائے۔

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو

اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دیس کی زبان ہو، اور جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو۔

بہرحال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جسکو ہم بولتے ہیں' اور جسکو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے، ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے اور اس نام کو اس زبان کے معنی میں اتنا انہوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہوگئی' اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیرت برتی، اور خوشی سے یہ نام اُنکے حوالہ کردیا، اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے، اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑکر صرف اردوی معلی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا "اردو" کے بجائے جو اٹھارہویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوی معلی کے صحن و ایوان میں محدود ہوگئی تھی، اسکو واقعی طور سے اُس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے' جو اس وقت کا نام ہے، جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی تاکہ یہ زبان پورے ملک کی مملکت کا دعوے کر سکے،

مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ اُنکو دھوکا دینے کے لئے سازش کی جارہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے۔

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے، جسکے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی' اور اُسکے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے۔ اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہئے، جسکو اب غلطی سے عام طور سے "اردو" کہنے لگے ہیں۔

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور رہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے۔ جس میں وہ بولی جاتی ہے، اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہئے،

۳۔ ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے جسکو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اسکے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے جس

سے اسکے حجم ہجوم کی کہانی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم
کی کوئی مدد ذہنِ انسانی کو نہیں ملتی، اس لئے اس کی جگہ اس کے
اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہئے۔

۴۔ ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہیئے جس کے
سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے
لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس
کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے
بغیر، صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اندر، اور ہر سننے والے
کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔ اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے
سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے
ویسی زبان بھی ہوگی۔ اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے
کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نقص
ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے۔

۶۔ ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہیئے جس
سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی نسبت ہو تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے
وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کر سکے، لفظ اردو
میں یہ بات نہیں، ہندوستانی کو حاصل ہے جس کی بنا پر صرف لکھنؤ
اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور
سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس سے
یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے اور کسی صوبہ میں وہ
اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دی جاسکتی ہے۔

۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی
تاریخ چھپی ہوتی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت
کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے
اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل
میں وطنی محبت کا جذبہ ابھریگا۔

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے
بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور
اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لئے
اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے تاکہ تاریخی مناسبت
کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو
ہمیشہ یاد رہے۔

۹۔ لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان
وخراسان سے کوئی بولی لیکر یہاں آئے تھے، جسکو وہ ترکی میں
اردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں
کی زبانیں اور تھیں، اور اردو یہ بولی ہے جسکو انہوں نے ہندوستان میں
آکر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور
صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا
ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین
اس کی صرف ونحو کو عربی فارسی کی صرف ونحو سے جانچکر اس کے
اصول بنانے لگے، اور انہوں نے اس غلط طریق وروش کی بنا پر
بہت سی غلطیاں کیں، اور اسکے جوڑوں کو عربی وفارسی قاعدوں
سے جوڑنے لگے گویا یہ ہماری زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو
ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے
نیچے نہیں اتری ہے اب اسکو عام طور سے ہندوستانی کہکر
پکارنے سے اس زبان کی صرفی ونحوی اور لغوی تحقیقات کا رُخ

ایران وخراسان وترکستان کی طرف سے مڑ کر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائیگا۔ اور اس سے زبان کی اصولی و لغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعوے ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعوے کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اُسکے دعوے کی کی بنیا دکھوکھلی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی یا اسپینی یا اور انگلے یورپین یہاں آئے۔ بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہیں، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ "تابہ ہندوستانی متکلم نمی شد" شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے "نغمہ سرایان ہندوستانی زبان" تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس سے یہ شبہ دور ہو جانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہیئے۔

۱۳۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے لیکر سرسید، بلکہ آزاد مرحوم تک جو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری۔ جیسا کہ میر امن کا بیان

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سنکر حضور میں جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔"

جب حضرت شاہجہان صاحب قِران نے ...

شہر دہلی کو اپنا دار الخلافت بنایا ..... اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلی خطاب دیا۔

سرسید نے یہی حکایت شاہجہان کے عہد کی نسبت لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اسکو زبان اردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے، اسلئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے، اور اس کی اصلی تاریخ کو جواب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے۔

۱۴۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپوٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں "ہندوستانی زبان" کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی تجویز منظور ہوئی ہے اور ان سب سے مراد "ہندی" ہے، اسلئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں۔ اسلئے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہئے۔ میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبد القادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام "ہندی متعارف" تھا" اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اردو کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندو ر[illegible]

تھے، ہندی والوں نے اس پر ایسا قبضہ کیا کہ آپکو اس نام پر سے ملکیت کا دعوی اٹھا لینا پڑا۔ اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا۔ جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اسکو بھی چھوڑ دینگے تو دوسروں کے قبضہ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا۔ یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں، اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لئے رکھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے غلط طور سے سیاسی بنایا جا رہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور وہ قدم اٹھانا چاہئے۔ جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کیجا رہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں، "اردو" کا نام اردو کس ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا؟ یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا، پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا یہاں تک کہ سب پر چھا گیا۔ غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے، آپ کے درمیان پیش کیا گیا، اور کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارے کئے گئے، اتنے پر یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا۔ اور کہیں کہیں اسکا چرچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی۔ غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے۔ کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اسکا استعمال شروع کر دیں اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر کر سکتے ہیں، امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کریں گے، اور ثابت کرینگے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ موزوں ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی لسانی کشمکش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جہاں ساہتیہ پریشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا۔ آج سے چھبیس ۲۶ برس پہلے ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا عزیز مرزا مرحوم نے بعینہ یہی تحریک پیش کی تھی، اور اسکے بعد ساہتیہ پریشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کریں جس سے وہ ہندی، یا ہندی کے قریب بنجائے۔ حاشا و کلا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ بعینہٖ اسی اردو اسی زبان

اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اسکے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بنایا تھا، جو عام بول چال کی زبان تھی۔ ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اُسکے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے، خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھئے اس میں کچھ ہرج نہیں، مگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اسکو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے اور اسکا یہی نام اُسکے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دیدینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائینگی گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے۔ جسکے گھوماتے ہی ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اُسکے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں۔ تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اُٹھو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اُس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے اور پورے ملک کی اسکے اندر سمائی ہوتی ہے، اور یہ ثابت ہو کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اسکا یہی نام ہونا چاہئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کرینگے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے، بلا اُسکے رواج دینے کی کوشش کرینگے تاکہ یہ کلام جو صرف خواص کو معلوم ہے وہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپکے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انہوں نے پیش کئے ہیں۔ آپ نے خیال کیا ہو گا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں تاجروں، کمپنی کے حاکموں، اور لکھے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ اس کا اصلی نام پہلے یہی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے۔ ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے ؛

ضروری گذارش

ہم بارہا لکھ چکے ہیں۔ کہ جو خریدار اصحاب جواب طلب امور کے لئے خط و کتابت کرتے ہیں انہیں خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے۔ مگر پھر بھی متعدد خطوط ایسے موصول ہوتے ہیں جنپر خریداری نمبر بالکل نہیں ہوتا۔ آئندہ ایسے کسی خط کا جواب نہیں دیا جائیگا اطلاعاً عرض ہے۔ (مینیجر)

حضرت عدمؔ

بہار کے دن

ہجومِ رنگ و ضیا ہے بہار کے دن ہیں
نکھر رہی ہیں بہاریں نکھار کے دن ہیں

یہ دیکھتے نہیں رنگوں کا اجتماعِ عظیم
یہ مجھ سے پوچھنے کیا ہو "بہار کے دن ہیں"؟

یہ مسکراتی ہوئی نطق کوش سی آنکھیں
بتا نہیں رہیں تم کو، بہار کے دن ہیں؟

یہ لہلہاتے ہوئے وجد آفریں چہرے
دکھا نہیں رہے تم کو، بہار کے دن ہیں؟

یہ رقص کرتی ہوئی مست و عنبریں زلفیں
سنا نہیں رہیں تم کو، بہار کے دن ہیں؟

لطیف و ہوش رُبا آنچلوں میں اڑتے ہیں
شبابِ ملتہب و شعلہ بار کے دن ہیں

مچل رہی ہیں امنگیں، اُمڈ رہا ہے جنوں
بہار و گرمیٔ جوشِ بہار کے دن ہیں

ہر اک شعور میں ہے امتزاجِ کیف و سرور
ہر اک دماغ پہ طاری بہار کے دن ہیں

نشاط کوشیٔ صد رنگ کا زمانہ ہے
شراب نوشیٔ دیوانہ وار کے دن ہیں

اُٹھو! کہ عشرتِ بے انتہا کا موسم ہے
چلو! کہ سر خوشیٔ بے شمار کے دن ہیں

نشاط و کیف و مسرت کی جانفزائی ہے
خرام و مستی و عیش و بہار کے دن ہیں

عجیب خوبیٔ تقدیر کا زمانہ ہے
عجب موافقتِ روزگار کے دن ہیں

بھگو کے پھول نکومے میں اڑاؤ جانبِ چرخ
کہ آسماں کو خبر ہو بہار کے دن ہیں

خوشا نصیب کہ گستاخیوں کا موسم ہے
میں آ رہا ہوں ترے گھر کہ پیار کے دن ہیں

جناب قیسی رامپوری　　(افسانہ)

ریاضؔ کی رُوح

"شادی طے ہو چکی ہے۔ کل کلکتہ روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے سسرال والے تم کو دیکھنا چاہتے ہیں" اپنے والد کے ان الفاظ سے ریاض مسرت و پریشانی کی درمیانی حالت میں کھڑا رہ گیا کہاں مظفر پور کی مختصر سی بستی اور کہاں کلکتہ جیسا عظیم الشان شہر ریاض نے آج تک دہلی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہمیشہ قصبہ میں رہا اور دیہاتی آب و ہوا میں پلا وہ شہر کی ہما ہمی سے مطلق ناآشنا تھا۔ آج تک کبھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ تہذیب یافتہ بستیوں میں اسکا کبھی گذر بھی نہیں نہ ہوا تھا۔ اور فیشن ایبل سوسائٹیوں کی اسکو ہوا بھی نہ لگی تھی۔ بے چارہ سیدھا سادھا نوجوان تھا۔ کلکتہ کے سفر کے خیال سے اُسکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ کتنا بڑا شہر ہو گا۔ وہاں کے لوگ کیسے ہوتے ہیں پھر اُسکے سسرال والے اس کی سادہ اطواری اور معمولی لباس کو دیکھ کر اسکا کس قدر مذاق اڑائیں گے۔ کاش اُس نے اپنی عمر کا کچھ حصہ بڑے شہروں کی سیر و سیاحت میں صرف کیا ہوتا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اسکا کوئی دوست موجودہ شہری سوسائٹیوں کے اصول سے باخبر ہوتا اور اس وقت اس کی رہبری کر سکتا!

خیر حسن تقدیر وہ اپنے بہترین کپڑے ... [illegible] اعلیٰ ترین ساز و سامان سے مزین ہو کر کلکتہ روانہ ہو گیا۔ اُس کی تپلون ٹخنوں سے اونچی تھی کوٹ گھٹنوں تک لمبا تھا۔ کالر اس قدر چوڑا تھا کہ گرہ کے باوجود ٹائی کا دو طرفہ حصہ اس میں چھپ نہ سکا تھا۔ ویسٹ کوٹ کی جیب میں ایک قیمتی گھڑی تھی جس کی سنہری زنجیر کو اس نے احتیاط سے ابھار رکھا تھا۔ انگلی میں زمرد کی انگشتری تھی جس کے اوپر اس نے ایک چاندی کا چھلا بھی ڈال لیا تھا تاکہ انگوٹھی انگلی میں سے کہیں نکل نہ جائے سگریٹ کا اسکو شوق نہ تھا لیکن راہ میں مسافروں پر رعب جمانے کے لئے اس نے پاسنگ شو کا ایک ٹن خرید لیا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ سب سے قیمتی سگریٹ یہی ہے۔

[illegible] دولت مند والدین [illegible] کہا سسرال [illegible] وہ تھرڈ کلاس میں بیٹھکر جاتا ہے [illegible] سفر [illegible] کی اس کی دیرینہ آرزو تھی۔ اپنے ابا کو مجبور کر کے وہ سیکنڈ کلاس کا کرایہ وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ غرض اپنی دانست میں وہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اپنے سسرال جا رہا تھا۔

دہلی تک اُسکے ڈبہ میں کوئی نہ آیا۔ دہلی سے ایک وجیہ جنٹلمین اس کی گاڑی میں آ بیٹھا۔ اپنا پر تکلف اسباب [illegible] سے سگریٹ جلا کر دھواں اڑانے لگا۔ غریب ریاض اسکو

انگریز سمجھا۔ کیونکہ اسکا رنگ نہایت گورا تھا۔ پھر لباس مکمل دپر تکلف تھا۔ نہ تو اس کی پتلون ٹخنوں تک اونچی تھی۔ نہ اُس کا کوٹ گھٹنوں تک نیچا تھا۔ بلکہ وہ ایک نہایت عمدہ سلا ہوا سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اسکی ٹائی کی گرہ کھجور کی گٹھلی کی طرح پتلی تھی اور عمدگی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے پیر میں نہایت صاف چمکدار جوتا تھا۔ اس کی کلائی پر ایک نہایت حسین اور قیمتی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے ذہانت عیاں تھی۔ سیکنڈ کلاس میں وہ اس طرح آکر بیٹھا گویا وہ اس کا گھر ہے۔ اس نے ریاض کی طرح ڈبہ کی ایک ایک چیز کو حیرت سے نہیں دیکھا۔

ریاض اس نوجوان کو مرعوبیت و حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا جس کی ایک ایک حرکت سے بے فکری پختہ کاری آزادی وجہاں دیدگی عیاں تھی۔

"آپ کہاں جائیںگے؟" آخر نوجوان نے ریاض سے دریافت کیا۔ ریاض اپنے تخیل میں انگریز سمجھے ہوئے انسان کے منہ سے صاف اردو کا جملہ سنکر محو حیرت رہ گیا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ نوجوان نے جب اپنا سوال دہرایا۔ تو اسکو ہوش آیا۔ سنبھلکر بولا "میں۔۔۔۔۔۔ میں کلکتہ جا رہا ہوں"

"کلکتہ خوب! یہ عجیب حسن اتفاق ہے میں بھی کلکتہ کا عازم ہوں"

"واللہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیا میں آپ کا نام دریافت کرسکتا ہوں" ریاض نے دریافت کیا۔

"نام معلوم کرنے سے آپکا غالباً یہ مقصد بھی ہوگا کہ آپکو میرا مذہب و قومیت بھی معلوم ہوجائے۔ کیوں جناب؟" تجربہ کار نوجوان نے ہنسکر کہا۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔ جی نہیں میں نے تو نام ویسے ہی پوچھا تھا"

"میرا نام نیاز ہے۔ نیاز احمد۔ میرے خیال میں اب یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی" نوجوان نے مسکراکر کہا۔

"ہاں اب تو ضرورت یہ معلوم کرنے کی ہے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں؟" ریاض نے دریافت کیا۔

"ابھی ہم ذرا اجنبی ہیں۔ یہ سوال آپکا قبل از وقت ہے لیکن اگر آپ کو اصرار ہی ہے تو بتائے دیتا ہوں۔ میں دلی میں وہ کام کرتا ہوں جس کو آپ جیسے معزز لوگ از راہ حقارت چوری سے نامزد کرتے ہیں"

"جی کیا فرمایا؟ میں سمجھا نہیں" غریب ریاض نے اس معزز نوجوان کے منہ سے چوری کا نام سنکر گھبراکر دریافت کیا۔

"چوری" نوجوان نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا؟ وہ کس طرح؟" ریاض نے سادگی سے دریافت کیا۔

"اس طرح" یہ کہہ کر اس نے ریاض کے گلے پر ہاتھ رکھا۔ "یوں تو میں لوگوں کے گلے دباتا ہوں اور چلتی ہوئی ریل پر سے کود کر فرار ہوجاتا ہوں"

"ارے مرا" ریاض نے نوجوان کی ڈھیلی گرفت سے تڑپ کر کہا۔ اور ڈر کر دور جا بیٹھا۔

"تم بہت بیوقوف انسان معلوم ہوتے ہو۔ کہاں کے

رہنے والے ہو؟" نیاز نے ریاض کی سادہ اطواری سے متاثر ہوکر دریافت کیا۔

"مظفر پور کا رہنے والا ہوں۔ میں نے آج تک کوئی بڑا شہر نہیں دیکھا نہ تم جیسے لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا۔"

"کیا میں تم کو شکل سے چور معلوم ہوتا ہوں؟" نیاز نے مسکراکر پوچھا۔

"نہیں۔ نہایت بھلے آدمی نظر آتے ہو۔ کیا تم واقعی بھلے ہو؟" ریاض نے پوچھا۔

"میرے عزیز دوست! تم کلکتہ جیسی بہت بڑی بستی میں ایسا کم سمجھ دماغ اور اسقدر کچو نکلے سے اطوار لیکر جارہے ہو۔ وہاں کے لوگ تو تم کو اُلّو بناکر رکھدیں گے۔"

"تو میں کیا کردں؟" غریب ریاض نے کھسیانے ہوکر دریافت کیا۔

نیاز جس قدر اسکو موجودہ آداب واطوار سے آگاہ کرسکتا کرتا رہا۔ ریاض ہر بات کو دلچسپی سے سنتا رہا۔ جس قدر وہ عصرِ حاضرہ کے آداب سے آگاہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کی الجھن میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سادہ زندگی بھی کس قدر نعمت ہے؟

ریاض نے اپنے کلکتہ جانے کا مقصد بھی نیاز کو بتادیا تھا۔ وہ اس امر میں بھی اس کی استعانت کا متوقع تھا۔ غرض شام کو دونوں کلکتہ پہنچ گئے اور ایک نہایت شاندار ہوٹل میں مقیم ہوگئے۔ ریاض کی خواہش تھی۔ کہ سفر کی تکان سے آسودہ ہوکر وہ صبح اپنے سسرال جائے۔ نیاز نے ہوٹل پہنچتے ہی ایک ہنگامہ بپا کردیا۔ ملازم اُسکے اشارے پر دوڑے پھرتے تھے۔ منیجر اُسکے حکم کی تعمیل میں دیگر فرائض بھول جاتا تھا۔ ریاض ان تمام باتوں کو نہایت حیرت سے دیکھ رہا تھا وہ موجودہ آداب وقوانین سے کس قدر باخبر تھا! اسکا تجربہ کس قدر وسیع تھا!!

شام کو کھانے پر بڑا اہتمام برتا گیا۔ نیاز نے عمدہ عمدہ غذائیں تیار کرائیں۔ مُرغ سالم خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ غریب ریاض نے پہلے یہ چیز کبھی چکھی بھی نہ تھی وہ انتہا سے انتہا درفرط حرص میں دو مرغ ڈکار گیا۔

کھانے سے فارغ ہوکر دونوں اپنے اپنے کمرے میں سونے کو چلے گئے۔ ریاض بستر پر لیٹا ہی تھا کہ مُرغ نے اُسکے پیٹ میں اذان دینی شروع کردی۔ اسکو نفخ ہوگیا اور تھوڑی دیر میں وہ ہلکا ہلکا درد پیٹ میں محسوس کرنے لگا۔ دو چار کروٹیں لیں اُٹھ کر ٹہلا لیکن درد آہستہ آہستہ بڑھتا ہی گیا۔ اور آدھ گھنٹہ میں تو ناقابل برداشت ہوگیا۔ وہ فرط کرب و بےچینی سے مرغ بسمل کی طرح بستر پر تڑپنے لگا۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹر طلب کیا گیا۔ لیکن اس کی حالت خراب ہی ہوتی گئی۔

رات کے گیارہ بجے ہونگے کہ کسی نے آکر نیاز کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سورہا تھا چونک کے اٹھا اور باہر نکلا۔ دیکھا کہ ایک بھلا آدمی پریشانی کی حالت میں باہر کھڑا ہے۔

"کیا ریاض نامی نوجوان کے آپ کوئی رشتہ دار ہیں؟"

"کیوں خیرت ہے؟" نیاز نے حیرت سے دریافت کیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔ اس کی حالت مایوس کن ہے۔ بمشکل وہ صبح تک جی سکے گا۔"

"افسوس میں نے منع کیا تھا کہ مرغ زیادہ نہ کھاؤ کیا میں

اُسکے پاس جا سکتا ہوں"۔ ڈاکٹر کی اجازت سے وہ ریاض کے کمرے میں داخل ہوا۔ درد سے چیخ چیخ کر اسکا گلا بیٹھ گیا تھا اور اسوقت غشی کی سی حالت میں تھا۔ نیاز نے بمشکل اسکو ہوشیار کیا۔ ہوش آنے ہی اُسنے مردہ آواز میں نیاز سے کہا "نیاز! میری حالت بہت خراب ہے۔ کیا تم صبح احمد میاں دلہا کے ہونیوالے خسر کے مکان پر جاکر میری علالت کی اطلاع کرنے کی زحمت کر سکتے ہو؟" اسکے بعد اُسنے اسکو اُنکے مکان اور محلہ کا پتہ بتا دیا۔ نیاز نے اسکو مستعدی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دینے کا یقین دلایا اور اُسکے سرہانے بیٹھ گیا۔ صبح ہوتے ہوتے غریب الوطن ریاض اس جہان سے کوچ کر گیا۔

نیاز جیسا جہاں دیدہ نوجوان بھی اس غیر متوقع افتاد سے پہلے تو گھبرا گیا۔ لیکن جلد اپنے حواس پر قابو پاکر اُس نے منیجر ہوٹل کو ہدایات کر دیں کہ تجہیز و تکفین کا تمام انتظام کر دیا جائے لیکن میت کو رات کے سات بجے جب وہ متوفی کے چند اعزا و اقربا کو لے آئے دفن کیا جائے۔

صبح اُس نے غسل بھی نہیں کیا۔ سفری کپڑے پہنے اور احمد میاں کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی مسافت کے بعد گاڑی ایک عالیشان مکان کے سامنے جاکر رُکی۔ نیاز اتر پڑا اور دروازہ پر پہنچکر گھنٹی بجائی۔ معاً دروازہ کھلا اور ایک نوجوان ملازمہ نمودار ہوئی" احمد میاں کا مکان یہی ہے ——"؟

"جی سرکار یہی ہے۔ ہاں میرے میاں یہی ہے" اُس نے ہنسکر نیاز کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔ اور بے اختیار اندر بھاگ گئی "سرکار وہ آگئے دولہا میاں آگئے" اُس نے ملازمہ کی ہانپتی ہوئی آواز میں یہ الفاظ سنے۔

"ارےبھئی ذرا سُن تو سہی ——" "لیکن سنتا کون؟" ملازمہ تو نئے دولہا کی آمد کی خوشی میں دیوانی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک معزز عمر رسیدہ گول مول سا آدمی باہر آیا۔ اُسکے چہرے سے آثارِ مسرت نمایاں تھے۔ آتے ہی اُس نے غریب نیاز کو اپنی توند سے لگا کر بھینچ لیا۔ اور اسکی پیشانی چوم کر اپنی گرجدار آواز میں بولا" واللہ تصویر سے کس قدر اختلاف ہے۔ کس قدر وجیہ نوجوان ہو تم میرے فرزند! چلو اندر چلو تمہاری ساس اور تمام عزیز و اقارب تمہارے انتظار میں مرے جا رہے ہیں"۔ یہ کہکر احمد میاں نے غریب نیاز کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"مگر سنئے تو سہی قبلہ! میں وہ ——"

"اچھا گاڑی والے کو کرایہ دیکر آؤ۔ اسکو ایک اٹھنی انعام بھی دیدینا۔ وہ بھی کیا یاد کریگا"۔ جب واقعات نے یوں پلٹا کھایا تو غریب نیاز نے بھی اپنے کو تقدیر کے حوالہ کر دیا۔ قضا و قدر کو جب یہی منظور تھا کہ وہ متوفی کی قائم مقامی کرے تو وہ کیا کر سکتا تھا؟ اور اندر پہنچتے ہی نوجوان لڑکیوں نے نیاز کو دیکھ کر اپنے آنچل پلو درست کر لئے۔ عمر رسیدہ عورتوں نے اسکو پیار کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور بچے حیرت و مسرت کے ساتھ اس سے لپٹنے لگے۔

نیاز سینہ تانے پر سکون بشرے کے ساتھ گھرانے کے افراد کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عورتوں نے فخریہ اُس کے وجیہ چہرے کو دیکھا اتنے میں احمد میاں بولے "بنجو کی اماں اُٹھو اپنے داماد کی بلائیں لو میں نے نہیں کہا تھا۔ کہ وہ ایک کڑیل

نوجوان ہے؟ اللہ نے بڑا اچھا جوڑا ملایا ہے"!

عورتوں کے مجمع میں سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت اٹھی اور پیار سے چٹا چٹ نیاز کی بلائیں لینے لگی۔

"بیٹا یہ تمہاری ساس ہیں۔ اور یہ تمہاری ممیا ساس ہیں۔ اور یہ تمہاری نانی ساس ہیں تمہاری سالیاں ہیں یہ بڑی سالی ہے" احمد میاں نے سب سے نیاز کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

ایک نوجوان جو خاموشی اور حقارت سے نیاز کو بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اب تک غیر متعارف تھا۔ اُسنے فوجی لباس پہن رکھا تھا اور اسکی حرکات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے متعلق کسی بڑے مغالطہ میں مبتلا ہے۔ جب سب سے تعارف ہو چکا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور نیاز سے بولا "میں احمد میاں کا بھتیجا ہوں"۔

ہاں "یہ تمہارے سالے ہیں میں بھول گیا۔ ان سے تمہارا تعارف کرانا تھا"۔

"میں ابھی کسی کا سالا نہیں ہوں۔ پہلے نکاح ہو جانے دیجئے۔ جب یہ رشتہ قائم ہوگا" اُس نے ایک انداز استہزا کے ساتھ نیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نیاز اب تک اس شخص کی حرکات کو سمجھ نہیں رہا تھا۔ وہ حیران تھا یہ شخص کیوں مجھ سے بیزار ہے؟

گھنٹہ بھر کے بعد نیاز غسل کرنے اوپر چلا گیا۔ غسل خانہ میں پہنچنے سے قبل وہ ایک مختصر سے خوشنما کمرے میں سے گذرا لیکن برآمدے میں پہنچکر ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک حسین دوشیزہ آرام کرسی پر دراز تھی۔ اور نہایت محویت کے عالم میں کچھ بُن رہی تھی۔ نیاز کے پیروں کی آواز نے اُسکو چونکا دیا۔ اُس نے [illegible]

اجنبی کو حیرت سے دیکھا۔ دفعتاً حقیقت حال اس پر منکشف ہوئی اور وہ اُٹھکر بھاگی لیکن نوجوان نیاز سامنے آکھڑا ہوا" خاتون! ایک منٹ"۔

"میرے سامنے سے ہٹ جائیے" نازنین نے غصہ سے کہا۔

"کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ مجھ خوش نصیب کی ہونے والی بیوی آپ ہی ہیں؟" نوجوان نے حسینہ کے غصہ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیوی؟ اگر جاہل اقوام کی طرح لڑکی کو کسی مرد کے سپرد کر دینے کے معنی شادی ہو سکتے ہیں۔ تو آپ مجھے اس نامبارک لفظ سے نامزد کر سکتے ہیں" حسینہ نے اسی غصہ سے کہا۔

"خاتون! آپ مجھ پر بہت ظلم کر رہی ہیں"۔

"ظالم و بے درد آپ لوگ ہیں جو دوسروں کے جذبات کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ میرا خیال تھا کہ ....."

"ہاں آپکا کیا خیال تھا؟" لیکن نیاز کے اس سوال پر نازنین خاموش رہی۔

"کیا خاتون! میں تمہاری حسین توجہ حاصل کرنے میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہوں [illegible] نوجوانوں کی طرح [illegible] میں اپنے سینے میں ایک پُرایثار دل رکھتا ہوں۔ جو شب و روز تمہاری نازبرداری و محبت پر مٹا رہے گا"۔

حسینہ کے چہرے پر نفرت و غصہ کے آثار آہستہ آہستہ کم ہونے لگے۔ انکے بجائے ترحم و سنجیدگی کے آثار نمایاں ہوگئے [illegible]

وجاہت کی تعریف کی اور اُسکے مردانہ اطوار کو سراہا۔ آخر نازک لب کھلے اور بہت آہستہ سے یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلے "افسوس خدائے محبت کا آپ پر بہت دیر میں الہام ہوا"

"کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ مجھ سے پیشتر وہ کسی اور پر ہو چکا ہے؟" نیاز نے غصہ سے دریافت کیا۔

"جی" نازنین نے اس کی شعلہ ریز آنکھوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا؟ وہ کون ہے؟ کیا وہ فوجی چوہا؟"

"شرافت سے متجاوز نہ ہو جائیے۔"

"خوب۔ دیدہ خواہد شد" یہ کہہ کر وہ غصہ سے کپکپاتا ہوا غسل خانہ میں چلا گیا۔ نہا کر جب وہ باہر نکلا تو اس کا رقیب حالتِ انتظار میں اُسکو باہر ملا۔ نیاز کو دیکھتے ہی وہ اُس کی طرف بڑھا اور حقارت ریز تبسم سے بولا "کیوں صاحبزادہ! تم کو شمشیر آزمائی کا بھی کچھ شوق ہے؟"

"شمشیر آزمائی! پچاس سال پہلے کے ہتھیار کا اب کیا ذکر تے ہو؟ نہ بابا میں نے تو کبھی تلوار چھوئی بھی نہیں۔"

"بزدل انسان۔ اسی برتے پر تو میری محبوبہ کو مجھ سے چھیننے آیا ہے۔ یاد رکھ پہلے محمود کی لاش گرے گی، تب کوئی حسینہ کو ہاتھ لگا سکے گا۔ اچھا پانچ بجے پائیں باغ میں ملو۔ میں وہاں تمہارا منتظر رہونگا" یہ کہہ کر محمود فوجی شان سے غریب نیاز کو حیرت و افسردگی میں چھوڑ کر چلا گیا۔

نیاز سر پکڑ کر رہ گیا۔ "یا خدا! یہ کس مصیبت میں آ پھنسا [illegible]

شش و پنج کی حالت میں وہ اپنے کمرے میں گیا۔ کپڑے پہنے اور پریشانی میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چند منٹ بعد ملازمہ کھانے کے لئے بلانے آئی ڈرائنگ روم میں تمام افراد جمع تھے۔ اسکا رقیب بھی سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا جسکو دیکھ کر اُسکا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ پاس والے کمرے میں حسینہ تھی۔ جو چھپکر نوجوان نیاز کو دیکھ رہی تھی۔

نیاز چند منٹ تک تو افسردہ و پریشان سا رہا لیکن جلد اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ وہ نہایت خوش تقریر و شیریں بیان انسان تھا۔ دوران طعام میں اسکی وسیع معلومات، پرمزاح فقرے اور خوش بیانی سے سب دنگ تھے۔ احمد میاں اور اُن کی بیوی اپنے لائق داماد کو نہایت فخر و مباہات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اور محمود بیٹھا ہوا جل رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر نیاز اپنے کمرے میں گیا تنہائی میں پھر اُسکو خوفِ شمشیر زنی نے آدبایا۔ تھوڑی دیر تک کچھ پڑھتا رہا پھر سو گیا۔ دفعۃً کسی نے آکر اسکو جگایا۔ نوکر سرہانے کھڑا تھا اور اسکے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ یہ محمود کا رقعہ تھا "ارے کیا پانچ بج گئے۔ افوہ میں کس قدر سویا ہوں" نیاز نے جھٹ پٹ ہاتھ دھوئے۔ کپڑے پہنے اور پائیں باغ میں پہنچا۔ محمود اسکا منتظر تھا۔ اُسکے ہاتھ میں دو تلواریں تھیں ایک تلوار نیاز کو دیکر بولا "ذرا ہوشیاری سے مقابلہ کرنا میری شمشیر زنی زبان زد خلائق ہے۔"

نیاز: "کیوں نہ ہو ماشاءاللہ آپ فوجی آدمی ہیں۔ [illegible] خاکسار تو ریاست کا رہنے والا ہے۔ اچھا اب استعفا دیتے [illegible]

دو بجلیاں چمکیں اور وار ہونے شروع ہوئے۔ محمود نے پے در پے نیاز پر حملے کئے۔ مگر اسکو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ نیاز ایک آہنی دیوار ہے۔ وہ اسکو محض ایک ناتجربہ کار اور بزدل انسان سمجھتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت اسپر جلد منکشف ہو گئی کہ اسکا مقابل شمشیر زنی میں اس سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ دیر تک محمود کا مقابلہ ہوتا رہا حتےٰ کہ محمود بری طرح ہانپنے لگا۔ آخر ایک بے پناہ حملہ کے ساتھ اپنی جگہ سے ہلا۔ محمود کے سر پر بجلی سی چمکی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ نیاز چاہتا تو بہت آسانی سے اسکو جان سے مار سکتا تھا لیکن اس نے ایک ٹھوکی دی جس سے محمود کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر دور جا گری۔ نیاز نے لپک کر اسکو اٹھا لیا۔ اور مسکراتا ہوا اس سے بولا "مجھے افسوس ہے سکندر سطوت لفٹیننٹ صاحب کی قسمت نے آپکا ساتھ نہیں دیا۔ میرے کمزور بازو آپکے قوی بازو پر غالب آگئے" محمود غصہ و شرم کے عالم میں کھڑا تھا۔ آخر آہستہ سے بولا "اچھا میری تلوار تو دیدو"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اسکو نہیں دے سکتا۔ کم از کم آپکو نہیں دونگا" یہ کہکر نیاز سینہ تانتا ہوا مکان کی طرف چلدیا۔ دروازہ کے باہر ہی اس کی حسینہ سے مڈبھیڑ ہو گئی حسینہ کو لقین تھا کہ اب محمود نیاز کو شکست دیکر آتا ہوگا۔ لیکن وہ نیاز کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ نیاز اسکے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہوا اور نہایت عجز سے تلوار حسینہ کو پیش کر کے بولا "یہ حقیر تحفہ آپ کی خدمت نازمیں پیش کرتا ہوں۔ اور خود اجازت چاہتا ہوں"

"محمود کہاں ہیں" حسینہ نے پوچھا۔

"مطمئن رہیئے وہ زندہ و سلامت ہیں۔ افسوس شمشیر آزمائی میں اُن کو شکست ہوئی۔ آپ کے ہزیمت خوردہ عاشق صاحب ابھی تشریف لاتے ہی ہونگے۔ آپ اُن سے ٹھاٹھ کیساتھ شادی کیجئے۔ یہ خاکسار آپ کے راستہ سے ہٹا جاتا ہے" یہ کہہ کر نیاز چلدیا۔

"نیاز صاحب میں آپ سے محبت ۔۔۔۔۔" حسینہ نے بے قرار ہو کر کہا۔ نیاز نے مڑکر دیکھا اور بولا "افسوس حسینہ! اب کچھ نہیں ہو سکتا" یہ کہہ کر وہ ہال میں سے گذرا۔ اس کو تیزی سے جاتے دیکھ کر احمد میاں لپکے اور بولے "کیوں فرزند خیریت ہے کہاں چلے!"

"حضرت مجھے اجازت دیجئے مجھے سات بجے اپنے جنازے میں شریک ہونا ہے"

"کیا، اپنے جنازے میں؟ کہیں خدانخواستہ تمہارا دماغ ۔۔۔"

"جی دماغ تو سالم ہے۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ گرانڈ ہوٹل میں جا کر تحقیق کر سکتے ہیں کہ میرا جنازہ سات بجے شام کو دفن ہوا یا نہیں" یہ کہہ کر نیاز تیزی سے باہر نکل گیا۔ احمد میاں جب تک دروازے پر پہنچیں وہ غائب ہو گیا۔

رات کو آٹھ بجے احمد میاں گرانڈ ہوٹل میں گئے اور یہ معلوم کر کے کہ واقعی ریاض نامی نوجوان کی نعش سات بجے دفن کر دی گئی ہے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی گھبراتے ہوئے گھر پر آئے اور سب معاملہ بیان کیا۔

محمود صاحب بولے "اوہو تو یوں کہئے کہ وہ اس کی روح تھی جو آج ہمارے گھر آئی تھی تب ہی تو میں کہتا ہوں کہ مجھ سے شمشیر آزمائی میں وہ کیسے جیت گیا۔ یہ انسان کا تو کام تھا نہیں"

لِسان العصر حضرت احسان دانش

خانہ بدوش

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور | ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں

چہرہ پہ گرد، سینہ پہ انفاس تیز تیز | آلام نے نگاہ کو بخشی ہوئی زباں

سنگین فطرتوں کے شرارے دبے ہوئے | اجسامِ آہنی سے شلوکے ہیں دھجیاں

زلفیں گندھی گندھی ہیں تو چہرے سُتے سُتے | بازو بھرے بھرے ہیں ارادے جواں جواں

ٹوٹے ہوئے کھٹولوں پہ بوریے بچھے ہوئے | چولہے سے کمنا کے نکلتا ہوا دھواں

کچھ فاصلہ پہ کھیت میں چرتے ہوئے گدھے | بیٹھی ہوئیں چٹائی کے کونے پہ بکریاں

اِن کا کسی کو شہر میں رہنا نہیں پسند | دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں

تاریخِ ہند کے یہ پریشان سے ورق | بیمار سی ضعیف تمدن کی داستاں

برباد ہیں، ذلیل ہیں، رسوا ہیں، خوار ہیں، | القصہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں

دیکھ اے نگاہِ دیدۂ خودبین و خودپسند | تارا ہے اب کنوئیں کا جو تھا مہرِ آسماں

اللہ رے انقلابِ زمانہ کہ بھیل قوم | ہے کس قدر زبون و حزیں رواں دواں

جنکے مکاں پہ فتح کے پرچم تھے موج ریز

وہ پھر رہے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں

میرزا ادیب (افسانہ)

زرینہ

رات دم توڑ رہی تھی۔ صبح کا دیوتا مشرق کے دریچے سے نکل کر اپنی شعاؤں کی نورانی انگلیوں سے سازِ ہستی کے تاروں کو چھیڑ کر، دنیا کو نغمۂ بیداری سنا رہا تھا۔ زرینہ، ہجوم خیالات میں غرق بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نگاہیں سامنے، دیوار پر جمی تھیں اور ٹھوڈی کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ گذرے ہوئے واقعات ماضی کے دھندلکے میں سے ابھر ابھر کر، روشن نقوش کی صورت میں اُسکے حافظے کی نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ پھر محسوس کر رہی تھی کہ وہ دوشیزہ ہے۔ مسرور و خرّم دوشیزہ۔ اس کی زندگی ایک نغمہ ہے، — نغمۂ مسرت، ایک قہقہہ ہے، قہقہۂ معصوم۔ روح کی پاکیزگی نے جبینِ حیات کو اس قدر روشن و منور کر رکھا ہے کہ وہ اپنے اردگرد روشنی ہی روشنی —— نور ہی نور دیکھ رہی ہے۔ کائنات کے ہر ایک گوشے میں، زندگی کے ہر ایک پہلو میں اسکے لئے مسرتوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ گناہ، بدی، تلخی و سوزش سے وہ یکسر ناآشنا ہے۔ اور کیونکر نہ ہو؟ اُسکی زندگی عبادت ہے پاکیزگی و معصومیت سے، مجموعہ ہے لطافتوں اور مسکراہٹوں کا۔ شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ سینے میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کرتی ہے۔ اسکا دماغ ایک عجیب و غریب الجھن سے دوچار ہوتا ہے۔ اپنی عزیز ترین سہیلی گلنار سے اُسنے کئی بار 'محبّت' کا لفظ سنا ہے مگر اسکا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ وہ نہیں جانتی —— وہ نہیں جان سکتی۔ کتابوں میں اُس نے یہ لفظ ہزاروں دفعہ پڑھا ہے مگر وہ حیران ہے کہ ایک شخص کیوں عورت کے لئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ ایک عورت کس لئے مرد پر اپنی جان فدا کر دیتی ہے۔ دونوں میں کیا چیز ہے۔ جو انہیں ہر گھڑی، ہر لمحہ ایک دوسرے کے قریب رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب وہ گلنار سے محبت کا لفظ سنتی ہے تو جھنجھلا کر کہتی ہے۔

"محبت —— میں نہیں جانتی محبت کیا چیز ہے؟"

"تو مجھ پر کیوں خفا ہوتی ہو ——؟ صبر کرو ایک دن خود بخود جان لو گی" گلنار مسکرا کر جواب دیتی ہے۔

"میں جانتی تو ہوں محبت کیا ہے لیکن جس قسم کی محبت کا تذکرہ تم کرتی ہو، اُس سے میں واقف نہیں!"

"پھر تم کونسی محبت سے واقف ہو؟"

"یہی جو والدین اور اولاد میں ہوتی ہے —— بھائی، بہنوں میں ہوتی ہے"

"اونہہ —— تم تو سب کچھ جانتی ہو۔"

زرینہ اس طنز آمیز لہجے پر جھنجھلا جاتی ہے۔ اس کے بعد موضوع گفتگو بدل جاتا ہے۔

ایک دن زرینہ گلنار کے ہاں جاتی ہے۔ اور حسب معمول بے تکلفی سے اُسکے کمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ کرسی پر گلنار کا بھائی سَرفراز بیٹھا ہوا ہے۔

"گلنار کو ڈھونڈ رہی ہو زرینہ؟"

"ہاں بھائی جان! کہاں ہے وہ؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔!"

"تو پھر کہاں ہے؟"

"جالندھر میں اپنے ماموں کے ہاں۔"

"آئے گی کب؟"

"تار بھیج کر معلوم کر لو۔"

آپ یونہی باتیں بنا رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ سرفراز کے چہرے کو دیکھتی ہے۔ سرفراز کی آنکھوں میں مسکراہٹ رقص کر رہی ہے۔

"میں نے کہا اگر تم تار نہیں بھیج سکتیں تو ــــــ"

"تو میں چلی جاتی ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ دو چار دن بعد وہ پھر سرفراز کو دیکھتی ہے اس کی نگاہیں زرینہ کی نگاہوں سے کچھ کہتی ہیں۔ اور وہ اپنے سینے میں ایک عجیب لذت انگیز خلش محسوس کرتی ہے۔ دن گذرتے جاتے ہیں، سرفراز کی نظریں موقعہ پاکر معصوم حسینہ کی نگاہوں کو پیغام محبت سناتی رہتی ہیں یہاں تک کہ محبت کے مفہوم سے ناآشنا حسینہ محبت کے سنہری جال میں گرفتار ہو جاتی ہے

جنگل کے ایک گوشے میں معمولی سی چنگاری سلگتی ہے آگ بڑھتی ہے۔ اور پھر خوفناک آتشیں شعلے، ہوا کی لہروں کا دامن پکڑ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے، منٹوں میں ہرے بھرے جنگل کو جلا کر خاکستر بنا دیتے ہیں۔

یہی حال زرینہ کی محبت کا ہوتا ہے، محبت کا جذبہ خاموشی کے ساتھ پیدا ہوکر، اس کی زندگی کو بدل دیتا ہے۔ اب محبت کے دلگداز شعلے ہیں، اور وہ عشق کا سنہری جال ہے! اور اسکا دل و دماغ کائنات کے گوشے گوشے میں مسرتوں کی دنیا آباد، محسوس کرنے والی لڑکی اپنے محبوب کی جدائی میں دنیا کو دارالمحن سمجھتی ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں نئی نئی خوشبوں کا یقین رکھنے والی نوجوان حسینہ سرفراز سے دور رہ کر، زندگی کو ایک خواب پریشاں سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اب اس کی زندگی، اُس کی کائنات دو ستاروں کی روشنی سے منور ہے۔ یہ دو ستارے کیا ہیں؟ سرفراز کی محبت انگیز، سحر طراز اور غزالیں آنکھیں۔ اپنی محبت کے راستے میں رکاوٹ دیکھ کر وہ کہیں دور چلے جانا چاہتے ہیں۔ دیوانی لڑکی مستقبل اور بدنامی سے بالکل بے نیاز ہوکر، نہایت مسرت کے ساتھ اس تجویز کو خوش آمدید، کہتی ہے، چند دن کے بعد چشم فلک دیکھتی ہے، کہ ایک تاریک رات کے آغوش میں، دو محبت کرنے والے انسان، محبت کے ہاتھوں مجبور کر، گھر سے نکل جاتے ہیں ــــ

دونوں بمبئی پہنچ جاتے ہیں، اور وہ خواب جمیل جوان کی آرزوئے محبت اکثر دیکھا کرتی تھی، اب شرمندہ تعبیر ہے۔ مرد محبت کرتا ہے۔ مگر بالکل محبت کا نہیں ہو جاتا۔ اسکے برعکس عورت محبت کرتی ہے۔ اور اپنے آپکو محبت ہی کے حوالے کر دیتی ہے۔ سرفراز، محبت کا پیغام دیکر، اپنے مستقبل سے بالکل غافل نہیں ہو جاتا، لیکن زرینہ پیغام محبت سنکر سب کچھ بھول جاتی ہے۔ آہ کمزور فطرت عورت۔

اس کے بعد سرفراز اکتا جاتا ہے، اور زرینہ اور چار سالہ بچی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ دلآویز نغمہ، جسے زرینہ سراپا گوش بنکر سن رہی تھی ـــــ موت تک سننے کی متمنی تھی یک لخت ایک بھیانک، خوفناک آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کی آرزوؤں کا منتہا، اس کی تمناؤں کا مرکز، اسکا محبوب اسے، اس کی محبت کو ٹھکرا کر، کہیں چلا جاتا ہے۔ وہ اب کہاں جا سکتی ہے؟ گھر نہیں جا سکتی۔ سوسائٹی اس کا قصور معاف کر دے گی، اسکا اُسے یقین نہیں۔ وہ ہر وقت ظالم سرفراز کا انتظار کرتی رہتی ہے ـــــ اس کی نگاہیں ہر لمحہ سرفراز ہی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں اور پھر پہلا گاؤں میں آ جاتی ہے۔

یہاں پہنچکر اُسکے خیالات کی رو ختم گئی۔ اُس نے تکئے کے نیچے سے ایک ملفوف کاغذ نکالا اور چہرے کے قریب لاکر اُسے پڑھنے لگی۔ اس تحریر کو وہ تین بار پیشتر بھی پڑھ چکی تھی۔ اور ہر بار دورانِ مطالعہ میں ایک نیا خیال اُسکے ذہن میں، ایک نیا جذبہ اُسکے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اب بھی اُس کا دل و دماغ ایک تازہ جذبہ و خیال سے ہمکنار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آہستہ پڑھ رہی تھی۔

عزیز سہیلی!

مجھے اطلاع دیئے بغیر تمہارا اس طرح چلے جانا عارضی مصلحت کے لحاظ سے درست ہو تو ہو مگر اقتضائے محبت کے ضرور خلاف ہے۔ تم نے کبھی مجھے اپنی داستانِ درد سنانے کی کوشش نہیں کی، اور نہ اس کی ضرورت سمجھی ہے۔ تاہم میں تمہاری زندگی کا ایک راز ضرور جانتی ہوں، اور وہی راز شاید تمہارا سب سے بڑا راز ہے ـــــ تمہاری داستانِ درد کا اہم ترین حصہ۔ تمہاری مصیبت کا اصلی سبب! عورت کا دل خدا نے کس چیز سے بنایا ہے کہ غیر شخص کی مصیبت کا حال سنکر بھی تڑپ جاتا ہے۔ میں بھی تڑپ رہی ہوں۔ کیونکہ میری سہیلی۔ میری زرینہ، مصیبت میں مبتلا ہے یہ مانا کہ تم گاؤں میں ہو، اور جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے۔ شہر کے مقابلے میں تمہیں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ تاہم تم زندگی کی اہم ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں میری آرزو ہے کہ اپنی زرینہ کی مدد کروں۔ کاش میری سہیلی میری درخواست کو قبول کر لے۔ پیاری زرینہ! دنیا میں ہمدردی کی ہمیشہ کمی رہی ہے لیکن بے رحمی کی کبھی کمی نہیں ہوئی۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو اب اِس زمانہ کی ٹھوکروں کے سپرد نہ کر دو میرے ہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے پھر کیوں میری زرینہ دنیا کی ٹھوکریں کھائے؟ میں تم سے تین چار بار ملی ہوں۔ مگر ان سرسری ملاقاتوں نے مجھ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ میں نے تمہیں ڈھونڈھ نکالا ہے

یہ رقعہ میں اپنے ایک عزیز کے ہاتھ تمہیں بھیج رہی ہوں ... سمجھتی ہو تو ... کے

ساتھ چلی آؤ۔ میں منتظر ہوں۔

"تمہاری "زمرد"

تحریر کو شروع سے لیکر آخر تک پڑھنے کے بعد کاغذ انگلیوں میں پھڑ پھڑاتے آنکھیں تکنے پر جمائے وہ خیالات میں غرق ہوگئی۔ یہ تحریر ایک ایسی عورت کی طرف سے تھی جو اسے پہلے پہل، قیام شہر کے دوران میں، شام کے وقت راوی ساحل پر ملی تھی۔ زرینہ تنہا بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ عورت بھی اُسکے پاس آ بیٹھی۔ رسمی تکلف کا مظاہرہ ہوا۔ چند باتیں ہوئیں۔ دوسرے دن بھی ملاقات ہوئی۔ ایک زیادہ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ تیسری بار جب زمرد، اسکے ہاں آئی، اسوقت ظالم سرفراز، بیکس عورت کو چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا۔ اور وہ آنسو بہا رہی تھی۔ زمرد، کو دیکھ کر اُس نے آنسو پونچھے۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ نسوانی فطرت اظہار ہمدردی و محبت سے بے حد متاثر ہوتی ہے۔ اسلئے جب زمرد نے اُس سے مردوں کے مظالم کی باتیں کہیں۔ تو اُسکے دل پر بڑا اثر ہوا، وہ سمجھنے لگی کہ زمرد بھی کسی مرد، کے مظالم کا نشانہ بنی ہے۔ اگرچہ اُس نے اپنے گذشتہ واقعات زمرد، کو سنانے کی کوشش نہیں کی تاہم چالاک عورت اُسکے لہجہ گفتگو اور اُسکے چہرے کی علامتوں سے سب کچھ سمجھ گئی۔

چند دن بعد ایک نہایت دردانگیز و روح فرسا واقعہ کی خبر اُسکے کانوں میں پہنچی۔ اُس نے سنا کہ سرفراز موٹروں کے تصادم سے ہلاک ہوگیا ہے۔ دفور رنج و غم سے اُس کا بُرا حال ہوا۔ سرفراز نے اُسے دھوکا دیا تھا۔ مگر جب اُس نے

دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ اُسکے بعد وہ اپنی بچی کو ساتھ لیکر جلد گاؤں میں پہنچ گئی۔ اُسکے پاس تھوڑی سی رقم تھی اسی پر گذر اوقات ہونے لگی۔ یہ حقیر رقم کب تک انکا ساتھ دیتی۔ مفلسی نے بھیانک چہرہ دکھایا۔ اپنی تو اسے پروا نہیں تھی۔ مگر بیچاری لڑکی کے غم انگیز مستقبل کا اندازہ کرکے وہ لرز اٹھی زندگی سے اُسکا دل اُکتا چکا تھا۔ مگر وہ کیا کرتی اُس کی بیکسانہ زندگی کے ساتھ ایک معصوم زندگی بھی وابستہ تھی۔ اسلئے وہ زندہ تھی ــــ اسی لئے وہ زندہ رہنا چاہتی تھی اسی اثنا میں زمرد، کی طرف سے یہ تحریر ملی۔ اظہار ہمدردی سے اُسکے دل کی ڈھارس تو بندھی، تاہم جب اس نے شہر میں جانے کا ارادہ کیا تو ایک قسم کا مبہم خوف اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ وہ شہر میں جانا بھی چاہتی تھی اور وہاں جانے سے ڈرتی بھی تھی۔ جانا کیوں چاہتی تھی اسکی وجہ ظاہر ہے اور جانے سے ڈرتی کیوں تھی۔ اسکی وجہ اُسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔

بوڑھے آدمی کو، جو رقعہ لے کر آیا تھا، اُسنے یہ کہکر بھیج دیا کہ میں خود آجاؤں گی۔"

بوڑھے کو گئے ہوئے تین دن گذر چکے تھے۔ اور ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اسوقت بھی وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی۔ لڑکی جاگی۔ زرینہ نے اسے مادرانہ شفقت سے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اسکا ہاتھ منہ دھلایا۔ اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ رضیہ نے جاکر دروازہ کھولدیا، اور بھاگی ہوئی اندر آئی۔

خوبصورت ہیں!"

زرینہ کے دل میں فوراً خیال پیدا ہوا کہ وہ عورت سوائے زمرد کے اور کوئی نہیں! اور واقعی، چند لمحوں کے بعد اُسکے سامنے 'زمرد' موجود تھی۔

"یہ تکلیف کیوں کی؟"

زرینہ نے اُسکے آگے مونڈھا رکھتے ہوئے کہا۔

"تکلیف کے سوال کو چھوڑ دیجئے — آپ کی آرزو تو پوری کر دی ہے نا؟"

"میری آرزو — کیا؟"

"یہی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، اور چلنے کی درخواست کر دوں!"

"میں نے آپکو یہ کب کہا؟"

"تم نے تو نہیں کہا۔ مگر تمہاری باتوں سے یہی ظاہر ہوا — زرینہ! کیا تمہارا خیال تھا کہ میں تمہیں بھول گئی ہوں؟"

"یہ آپ کی مہربانی ہے۔ کہ آپ مجھے نہیں بھولیں۔"

"تو پھر چلو"

گویا آپ مجھے لینے آئی ہیں؟"

"سہیلی ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے خدا کے لئے مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو۔"

زرینہ انکار کرتی رہی — مگر کافی اصرار کے بعد چلنے پر رضامند ہو گئی۔

(۲)

راہ میں 'زمرد' نے طرح طرح کی باتیں سنا سنا کر، بار بار اپنی مخلصانہ محبت کا اظہار کر کر کے، اسکے دل پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اور 'یہ زمرد' کی اطمینان بخش باتوں کا اثر تھا کہ مبہم خوف کے وہ اثرات، جو مکان کو چھوڑتے وقت، گاڑی میں بیٹھتے وقت اُسکے دل پر چھائے ہوئے تھے بہت حد تک دور ہو گئے! اسکی گفتگو کا بیشتر حصہ عورتوں کی مظلومیت اور مردوں کی سفاکانہ سردمہری کے واقعات پر مشتمل تھا۔ آخر کار ان کا تانگہ ایک عالیشان مکان کے سامنے رکا۔ 'زمرد' نے مسکرا کر اُسے اترنے کے لئے کہا اور دونوں چلنے لگیں پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی 'زرینہ' کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک ناخوشگوار احساس اُسکے رگ و پے پر طاری ہو گیا — 'زمرد' نے اُسکا بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ اب وہ ایک عالیشان آراستہ و پیراستہ کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنی سہیلی کے حسن سلوک اور مخلصانہ ہمدردی پر اظہار تشکر کر رہی تھی۔ آہ! اس محبت، اس مخلصانہ خاطر مدارات پر خوش ہونے والی، خوش ہو ہو کر اپنی سہیلی پر ناز کرنے والی بھولی بھالی عورت کو کیا معلوم تھا کہ جس کمرے میں وہ بیٹھی ہوئی ہے اُسکے ذرے ذرے کے سینے میں گناہوں کی دنیا آباد ہے۔ اس بے چاری کو کیا خبر تھی کہ اس شاندار کمرے میں حسن کی قیمت لی جاتی ہے۔ عصمت کو بیچا جاتا ہے اور گناہوں کا سودا ہوتا ہے۔ دو دن تک تو اُسکے دل میں یہ خیال تک بھی پیدا نہ ہوا کہ وہ ایسی ذلیل جگہ پہنچ گئی ہے تیسرے دن شام کے وقت اسے اپنی موجودہ حالت کا اندازہ ہوا جبکہ وہ آراستہ و پیراستہ کمرے میں گناہ کے مہیب و آہنی پنجے میں گرفتار تڑپ رہی تھی۔ سائیں سائیں کی آواز اُسکے کانوں میں آ رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ وہ ذلت کے غار کی گہرائیوں میں گر پڑی ہے۔ بجلی کی رو کی مانند تلخ، روح کش، دماغ

خواہش احساس اسکے دل و دماغ میں پیدا ہوا۔ وہ غضبناک
شیرنی کی مانند جھنجھلائی، بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح تڑپی
لیکن آہستہ آہستہ اس جھنجھلاہٹ اس غضبناکی نے اس کی
نسوانی کمزوری کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

"میری سہیلی! عورت مرد کے دل بہلانے کا ایک
کھلونا سمجھی جاتی ہے۔ وہ اسے جس وقت چاہے توڑ ڈالے
جب چاہے پرے پھینکدے۔ تمہارے ساتھ مرد نے
کیا کیا؟ یہی کہ گھر سے کوسوں دور لاکر پھر بیکسی نہ حالت میں
چھوڑ کر چلا گیا۔ مرد اسی طرح ظلم کرتے رہے ہیں ۔۔۔ اسی طرح
ظلم کرتے رہینگے ۔۔۔ پھر کیوں ہم اس سے انتقام نہ لیں
کیوں ہم بھی اسے کھلونا نہ سمجھیں"

زمرد دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتی رہی۔ گناہ کی بھیانک
تصویر، رنگین و دلآویز نقوش میں تبدیل ہونے لگی چند مہینے
کے بعد بمبئی کی حسن پرست فضاؤں میں "زرینہ" کا نام بھی گونجنے
لگا۔ اسکے حسن و جاذبیت کا شہرہ پھیلنے لگا۔ حسن پرست
لوگ اس کی دہلیز پر سجدے کرنے لگے۔ ہزاروں دھڑکتے
ہوئے دلوں کی آرزوئیں اسکا طواف کرنے لگیں۔ اسکی رنگین
اداؤں کے حضور میں محبت بھرے دل، اور محبت بھری جبین
پیش ہونے لگیں، اپنے حسن کی اس مقبولیت پر اپنے اس
دورِ عیش و مسرت میں گذشتہ واقعات اسے فراموش ہونے
لگے تاہم جب ۔۔۔ وہ خلوت میں ہوتی تو اپنی لڑکی کو سینے سے
بھینچ لیتی، اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اسکے رخساروں
پر بہنے لگتے۔

اسی اثنا میں رضیہ بیمار ہوگئی۔ اور روز بروز اس کی
بیماری خطرناک صورت اختیار کرنے لگی۔ زرینہ کے پاس
اتنا وقت کہاں کہ وہ بیمار لڑکی کے پاس بیٹھی رہے۔ اسلئے
لڑکی کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ اسکا معمول تھا کہ ہر روز
دو وقت ہسپتال میں جاتی اسکی تیمارداری کرتی مگر یہ قیمتی وقت
کا اس طرح ضائع جانا، اسکے چاہنے والوں کی آنکھوں میں
کھٹکنے لگا۔ اتفاق سے وہ دو دن ہسپتال نہ جاسکی۔ تیسرے
دن اسے خبر ملی کہ لڑکی فوت ہوگئی ہے۔ اور اُسے دفن
بھی کر دیا گیا ہے۔

یہ سنکر اُسے بہت صدمہ ہوا ۔۔۔ حسن فروش
ہونے کے باوجود وہ ماں تھی مہرِ مادری سے لبریز سینہ رکھنے
والی ماں ۔۔۔ آخر کار غم، قہقہوں کے آغوش میں کروٹ
لیتا ہوا، اُسکے دل کی گہرائیوں میں سوگیا۔ وقت گذرتا گیا
اور زرینہ اپنے حسن کی قیمت وصول کرتی رہی۔ اُسکی بارگاہ
میں یوں تو سینکڑوں عاشق اپنے عشق کا ثبوت مال و
زر سے بھری ہوئی جیبوں کی صورت میں لیکر آتے تھے۔
مگر چند دن سے ایک شخص فیروز نامی خاص طور پر دولت لٹا رہا
تھا، اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے چاہنے والوں کے مقابلے
میں، اُسے خاص امتیاز حاصل تھا، آج بھی وہ زرینہ
کے پہلو میں بیٹھا ہوا، نہایت قیمتی زیورات اُس کے حضور
میں پیش کر رہا تھا۔ زرینہ اپنے حسن کی خوش نصیبی پر مسکرا
رہی تھی۔ اور اپنے عاشق صادق کی طرف پیار بھری نظروں
سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں سیڑھیوں پر دھم دھم کی آواز
آنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد تین شخص اوپر آئے جن میں سے
ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ اور باقی دو سپاہی۔ وہ آتے ہی فیروز

پر ٹوٹ پڑے۔ وجیہ نوجوان نے زیورات اُسکے ہاتھ سے چھین لئے۔ اور خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"کم بخت! چوری کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ ایک فاحشہ عورت کے لئے اتنا ذلیل کام؟" اتنا کہتے ہوئے اُس نے زور سے لات اس کی پشت پر ماری۔

"یہ الزام ——" فیروز کے منہ سے نکلا۔

"الزام؟ یہ لفظ کہتے ہوئے تجھے شرم تو نہیں آئی ہوگی"۔ نوجوان نے ایک اور لات اس کی پشت پر ماری۔

اپنی محبوبہ کے سامنے اپنے ساتھ یہ ذلت انگیز سلوک دیکھ کر، فیروز شرم سے پانی پانی ہوگیا جھنجھلا کر اٹھا اور نوجوان کی طرف بڑھا۔ مگر سپاہیوں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور سیڑھیوں کی طرف لے گئے۔

(۳)

دن کا اجالا آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا تھا۔ افسردہ رو آفتاب، پہاڑ کی چوٹی پر پگھلتے ہوئے برف کے تودے کی مانند مغرب کی خونیں وادی میں غائب ہوتا جارہا تھا۔ 'بالا بار ہل' پر لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ ہر ایک شخص شاداں و فرحاں نظر آرہا تھا۔ ہر ایک چہرہ مسرور و خرم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رنگین و معطر فضا قہقہوں کے سیلاب میں تیر رہی ہے۔

آہستہ آہستہ لوگوں کی تعداد میں کمی ہونے لگی، یہاں تک کہ بہت کم آدمی وہاں رہ گئے۔ اور جو وہاں نظر آرہے تھے وہ بھی جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

سورج غروب ہوچکا تھا اور چاند کی سیمیں کرنیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

—— —— —— —— —— ——

—— —— —— —— ——

—— —— —— —— —— ——

ایک گوشے میں 'زرینہ' تنہا بینچ پر بیٹھی ہوئی اپنے خیالات میں محو تھی۔ وہ کیا تھی، پھر واقعات کے ظالم ہاتھ نے کس طرح دھکیل کر اسے ذلت کے غار میں گرا دیا۔ یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اپنی بچی کا خیال آتے ہی وہ تڑپ گئی۔ آنکھوں سے دو آنسو گر کر نوکِ مژگاں پر لرزنے لگے۔ اتنے میں اس کے قریب ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اُسنے اُس طرف نظر ڈالی۔ چند قدموں کے فاصلے پر دائیں طرف، دوسرے بینچ کے اوپر ایک خوبصورت نوجوان جوڑا بیٹھا ہوا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ نوجوان عورت کی گود میں ایک ننھی بچی اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ماں کے بالوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی، ادھر دیکھتے ہی 'زرینہ' کے سامنے ایک بجلی سی لہرائی اور اسے محسوس ہوا گویا وہ عالمِ خواب میں ہے۔ اسکی رگ رگ، ریشے ریشے میں حیرت اندوز مسرت، مسرت انگیز حیرت موجزن ہوگئی۔ اس کی معصوم بیٹی جو ماضی کی تاریکیوں سے نکلکر" اس کی دلدوز آہوں کے دھوئیں میں سے جھانکتی ہوئی، دلخراش آنسوؤں کا دامن پکڑے غائب ہوجاتی تھی۔ اب ایک خوبصورت نوجوان عورت کی صورت میں، چند فٹ کے فاصلے پر اُسکے سامنے موجود تھی۔

"رضیہ، تم بعض اوقات بڑی ضدی بن جاتی ہو۔!"

نوجوان مرد نے کہا۔

"رضیہ" کا لفظ روشنی کی ایک لہر بنکر اُسکے ذہن سے ٹکرایا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت وہ چاہتی تھی ـــــ بے اختیار چاہتی تھی کہ اپنی لڑکی سے لپٹ جائے۔ اسے سینے سے لگاکر کہے "بیٹی! میں تیری ـــــ ماں ـــــ تیری ماں ـــــ ہوں"! مگر یہ الفاظ اُس کی لبوں تک آکر رُک گئے شرم سے پسینہ پسینہ ہوکر اسنے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ اپنا منہ ـــــ ایک قابلِ نفرت طوائف کا منہ اپنی معصوم بیٹی کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

"میں نے کب ضد کی ہے؟" رضیہ نے شیریں آواز میں کہا۔

"کہہ جو رہی ہو کہ باپ اپنی اولاد کے لئے بالکل قربانی نہیں کرسکتا"۔ نوجوان مرد نے کہا۔

"میں نے تو یہ بالکل نہیں کہا"۔

"تو پھر کیا کہتی ہو؟"

"میں نے تو صرف یہی کہا اور یہی کہتی ہوں کہ باپ بھی اولاد کے لئے قربانیاں کرتا ہے مگر جو قربانیاں ماں کرسکتی ہے وہ باپ سے ممکن نہیں"۔

"یہ ضد نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تم اسے ضد کہو مگر دنیا اسے حقیقت سمجھتی ہے!"

"رضیہ! تم عورت ہو اسلئے عورتوں کو فوقیت دیتی ہو ـــــ یہ فطری کمزوری ہے!"

"اور تم مرد ہو اسلئے مردوں کو عورتوں سے ممتاز سمجھتے ہو!"

زرینہ کا دل تڑپ رہا تھا۔ اپنے سامنے صرف چند قدموں کے فاصلے پر اپنی محبوب بیٹی کو دیکھتے ہوئے بھی بیٹی سے محروم تھی۔ اسکے دل میں بیتابی بڑھتی جاتی تھی۔ سینہ پھٹا جاتا تھا۔

نوجوان مرد کہہ رہا تھا "تاریخ کی زبان بھی میری رائے کی تائید کررہی ہے۔ بابر کی قربانی سے تو تم ناواقف نہ ہوگی؟ کیا نسوانی دنیا ایسی مثال پیش کرسکتی ہے؟"

"ہزاروں اور اس سے بدرجہا بڑھکر"۔

"مثلاً ـ"

"مثلاً ایک دفعہ ایک بادشاہ کا بیٹا شکار کرتا ہوا ایک دریا کے کنارے پہنچا۔ وہاں اُس نے ایک نہایت خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ وہ دیکھتے ہی اسپر عاشق ہوگیا۔ اور اُسے اپنے ساتھ گھوڑے کی پشت پر بٹھاکر محل میں لے گیا۔"

"مزیدار کہانی معلوم ہوتی ہے"۔ نوجوان مرد نے مسکراکر کہا۔

"سنتے ہو یا خاموش رہوں"؟

"ساتھ ساتھ تعریف بھی کرتا جاؤں تو بہتر ہوگا"

"نہیں خاموشی سے سنو"۔

زرینہ ایک ناقابلِ برداشت دورِ ابتلا میں سے گذر رہی تھی، اپنے جگر کے ٹکڑے کو پاس دیکھ کر بھی اسے سینے سے نہیں لگاسکتی تھی

کس قدر ظلم؟ کس درجہ ستم؟؟

رضیہ کہنے لگی "خبر دینے والوں نے بادشاہ کو بتایا کہ شہزادے کی محبوبہ ـــــ اور ہونے والی بیوی ایک طوائف کی بیٹی ہے"!

طوائف کا لفظ سنتے ہی زرینہ کو محسوس ہوا کہ طوفان کی سہمگیں موجیں اس سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ابھی اسے بہا کر لے جائیں گی!

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لئے۔ رضیہ کہے جا رہی تھی۔

"اتنا سنتے ہی بادشاہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ شہزادے نے لاکھ سمجھایا کہ یہ خبر میرے دشمنوں نے اڑائی ہے۔ مگر بادشاہ کب اس کی سنتا تھا؟ اسی وقت خبر دینے والوں کو ساتھ لیکر بادشاہ اس لڑکی کے گھر کی طرف چلا۔ لڑکی کی ماں جو طوائف تھی، ان واقعات سے بالکل بے خبر گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب بادشاہ نے اسکے مکان کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو اس نے کھڑکی میں سے ایک شخص کو کہتے سنا "کہ شہزادے کی محبوبہ کی طوائف ماں کا مکان یہی ہے۔" اتنا سنتے ہی وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس وقت وہ کیا کر سکتی تھی؟ گھر میں اس کی موجودگی۔ اس کی بیٹی کے حق میں ایک بہت بڑے ظلم کا حکم رکھتی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ آخری کمرے میں پہنچکر، کھڑکی میں سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔"

'خوب، واقعی اچھی کہانی ہے۔' نوجوان مرد نے کہا اور مسکرانے لگا۔

زرینہ کا دل زیادہ بیتاب ہوتا جا رہا تھا۔ اضطراب اپنے نقطہ کمال کو پہنچ چکا تھا۔

"یہ زرینہ طوائف ہے!" نوجوان مرد نے بظاہر آہستہ کہا مگر اس کی آواز زرینہ کے کانوں میں پہنچ گئی۔

"طوائف زرینہ" رضیہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہکر زرینہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ رضیہ نے حقارت و نفرت سے منہ دوسری دوسری طرف پھیر لیا۔ "میری حقیقی بیٹی اپنی ماں سے اتنی نفرت کرے۔ لیکن میں کون ہوں، ایک ذلیل طوائف۔ اور کیا؟" زرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ اٹھی اور ایکطرف چلنے لگی۔ اس وقت وہ ایک ایسے قیدی کیطرح تھی جسکے پاؤں میں بھاری زنجیریں ہوں۔ مگر جو اس حالت میں بھی چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو ــــ آہستہ آہستہ!

کچھ دور جاکر، درخت کی اوٹ میں سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی۔ چاندنی میں اس کی بیٹی کا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ زرینہ نے جیب سے ایک فوٹو نکالا یہ رضیہ کی اسوقت کی فوٹو تھی جب وہ چھ سال کی تھی۔ فوٹو کو اس نے سینے سے لگا لیا۔ اور رضیہ کو دیکھنے لگی۔ اسکے لب تھرتھرانے لگے۔

رضیہ! میری بیٹی ــــ بیٹی!! یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں سے سیل گریہ جاری ہو گیا۔ "میری بیٹی رضیہ! تو میرے پاس ہے۔ مگر بیٹی میں تجھے کیونکر بتاؤں میں تیری ماں ہوں ــــ تیری ماں ــــ میری رضیہ تیری ماں ہے" اسکی سسکیوں کی آواز فضا میں لرزنے لگی۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اُسنے مڑ کر دیکھا۔ فیروز اسکے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ نمودار تھی۔

"اسوقت یہاں سے چلے جاؤ فیروز!" زرینہ نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اب تو میں اپنا فرض ادا کر کے جاؤنگا!" یہ کہتے ہوئے اُس نے زرینہ کے ہاتھ سے فوٹو چھین لی۔ اور پیچھے ہٹکر

اسے دیکھنے لگا۔ زرینہ اس پر جھپٹی مگر بے سود۔

"فیروز!"

"بائی جی! معاف کرنا ذرا گستاخی سے پیش آرہا ہوں۔"

"فیروز تصویر دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

فیروز نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے تماشوں کو ہٹا کر رضیہ کی طرف دیکھا۔ اسکے لبوں پر شرارت انگیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ قدرت نے آج مجھے انتقام لینے کا موقعہ دیا ہے۔ کیا تمہارا خیال ہے، میں اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھاؤنگا۔؟"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں کیا کہہ رہا ہوں ـــ تم نے نہیں سمجھا خیر اب سمجھ لو۔ وہ شخص جو تمہاری بیٹی کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ تمہاری بیٹی کا خاوند ہے۔ اس دن اس نے مجھے ذلیل کیا تھا۔ مجھے کہا تھا کہ میں نے ایک فاحشہ عورت کو خوش کرنے کے لئے ذلیل کام کیا اور آج اسی فاحشہ عورت کی بیٹی اس کی بیوی ہے

ـــ آہاہاہا ـــ ہاہا ـــ ہاہا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی زرینہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اسکی پشت پر ایک پہاڑ آگرا ہے کانوں میں کسی نے تیزاب ڈالدیا ہے۔

"فیروز" اسکے لبوں سے باریک سی آواز میں نکلا۔

"فاحشہ عورت کی بیٹی ـــ اور اس کی بیوی کتنا عجیب واقعہ۔ کتنا عجیب!!"

"فیروز خدا کے لئے خاموش رہو۔"

"اب خاموشی کا وقت ہے؟؟"

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟؟"

"کیا کرنا چاہتا ہوں یہ تم ابھی دیکھ لوگی۔ اس بدمعاش نے اس دن مجھے ذلیل کیا تھا اب میں اسے ذلیل کروں گا۔ میں نے ایک فاحشہ عورت کو خوش کرنا چاہا تھا۔ اور وہ فاحشہ عورت کی بیٹی کو بیوی بنائے ہوئے ہے۔ آہاہا جب اُسے معلوم ہوگا کہ اس کی بیوی فاحشہ عورت کی بیٹی ہے تو ـــ"

"تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ تم یہ ہرگز نہیں کہہ سکوگے" زرینہ نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے جس سے اُسکے صمیمانہ جوش کا اظہار ہوتا تھا۔

"مجھے روکنے والا کون ہے؟"

"میں"

"تم۔ اوہ" فیروز آگے بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو تم آگے نہیں بڑھ سکتے" یہ کہتے ہوئے زرینہ نے پھر جھپٹا مارا مگر فوٹو حاصل نہ کر سکی۔

"زرینہ! دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنی آرزو پوری کرنے سے نہیں روک سکتی۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"فیروز! سنو، تمہیں میرے سر کی قسم ہے۔ اس ارادے کو چھوڑ دو ـــ میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جاؤں گی تصویر دو اور چلے جاؤ۔"

"میں اس وقت تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"کیا تم میری التجا کو رد کر دوگے ـــ مجھے ٹھکرا دوگے" زرینہ نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"اپنی تمنا پوری کرنے کے لئے میں تمام دنیا کی التجا کو

ٹھکرادونگا - ہٹ جاؤ۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے - میں تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دونگی"

"تو مجبوراً مجھے سختی سے کام لینا پڑیگا۔"

"تم جو چاہو کرو۔"

"اب بھی موقعہ ہے، میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ"

——— فیروز کے ہاتھ میں پستول چمکنے لگی -

"نہیں، ہزار بار نہیں۔"

"میرے راستے سے نہیں ہٹو گی ؟؟"

"نہیں - نہیں۔"

فیروز کی انگلیوں کو جنبش ہوئی - گولی زرینہ کے سینے پر لگی اور وہ لڑھکا کر گر پڑی - فیروز آگے بڑھنے لگا - یکایک زرینہ خون میں لت پت ایک زخمی شیرنی کی طرح اٹھی اور فیروز سے لپٹ گئی - معلوم نہیں اسوقت اس کے بدن میں کہاں سے اتنی طاقت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ فیروز کو پیچھے دھکیلتی جا رہی تھی - قوی اعضا شخص سنبھلنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے پاؤں جمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے - یہاں تک کہ دونوں چوٹی کے کنارے پہنچ گئے اور چشم زدن میں دونوں نیچے گر پڑے -

گولی کی آواز معمولی سا واقعہ نہیں تھا - لوگ بھاگم بھاگ وہاں آرہے تھے ان میں رضیہ اور اسکا شوہر بھی تھا - ہر ایک شخص عجیب عجیب تاویل کر رہا تھا ——— چند منٹ کے بعد رضیہ اور اس کا شوہر لوٹنے لگے -

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری بات حقیقت پر مبنی ہے ماں باپ کے مقابلے میں زیادہ قربانیاں کر سکتی ہے۔"

اس کے شوہر نے کہا -

"تمہارا خیال اتنی جلدی کیوں بدل گیا ؟"

معلوم نہیں کیوں، مگر میرے دل میں یہ یقین ہوگیا ہے -

"درست۔"

رضیہ نے پیار بھری نظروں سے اپنی بچی کو دیکھا - اور فرطِ محبت سے اسے سینے کے ساتھ بھینچ لیا -
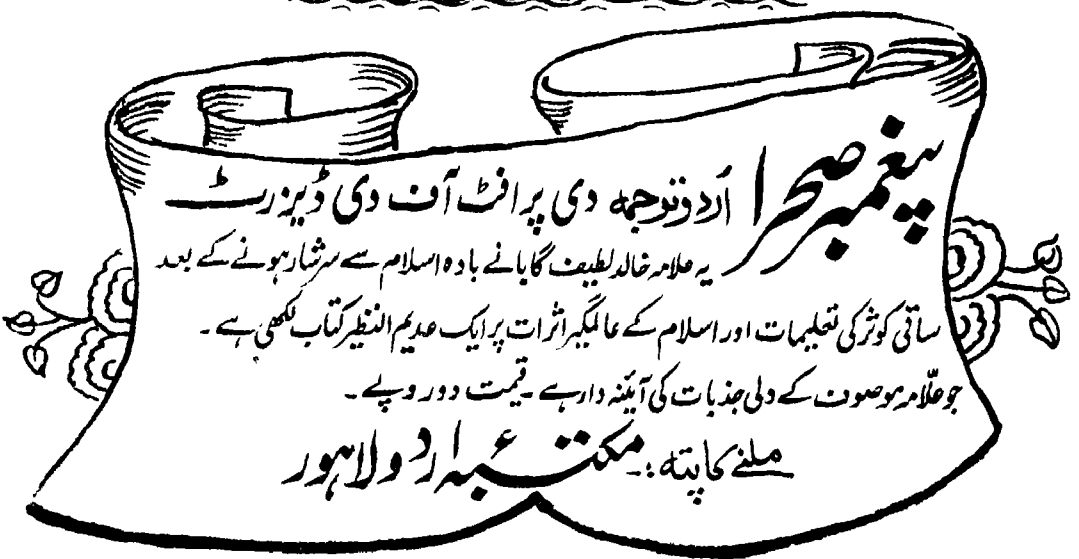
جناب ابوالاعجاز سیف اکبرآبادی

سوزِ ناتمام

صحبتِ پیرِ میکدہ عمر ہوئی حرام ہے
میرے لبوں پہ آجتک پھر بھی حدیثِ جام ہے

ہائے یہ نامرادیاں ہائے یہ تیرہ بختیاں
صبحِ امید بھی مری ہجر کی ایک شام ہے

مجھ کو بلائیں گے کبھی آپ وہ آئیں گے کبھی
وہ بھی خیالِ خام تھا یہ بھی خیالِ خام ہے

خواب وخیال ہوگئیں اہلِ وطن کی صحبتیں
اب نہ سحر ہے وہ سحر شام نہ اب وہ شام ہے

ہجر کی ہے ہر ایک سانس دعوتِ وصل کا پیام
اور ذرا سی دیر میں قصہ غم تمام ہے

طولِ شبِ فراق میں زیست سے بدگمان نہ ہو
اپنی قضا سے کھیلنا اہلِ وفا کا کام ہے

آج نہیں توکل سہی، زادِ سفر کی فکر کر
کسکو یہاں ثبات ہے کسکو یہاں قیام ہے

سیف یہ تیری بےرخی اچھی نہیں ہے یار سے
تیرے لئے تو لازمی حسن کا احترام ہے

جناب خلیل بی۔اے

دیوتا اور انسان

منظر ایک بوڑھا دیوتا اپنی ہی بستی کے "اندرونی کمرے" میں بیٹھا ہے اور حیاتِ گرم روکی جادو سامانیوں سے اپنی زندگی کو قوت بخش رہا ہے۔ رسم و رواج کے لحاظ سے بظاہر اس میں کوئی دیوتاؤں کی نشانی نہیں۔ اس پر مکمل سکوت طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کڑکتے ہوئے طوفان اسکے اردگرد سے گزر چکے ہیں لیکن اس کی پیشانی پر مطلق بل نہیں آیا۔ ایک تماشائی کی حیثیت سے اس نے عقل و دانش کا بے پایاں سمندر اپنے سینے کے اندر بند کرلیا ہے اور محنتِ شاقہ سے ایک غیر فانی تجربۂ حیات اسے حاصل ہو چکا ہے وہ اپنی ہی تجلی میں "کتابِ زندگی" کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جب ورق الٹتا ہے تو ایک دھندلی سی روشنی صفحات میں سے نکل کر اس کے پُرسکون، مطمئن اور متین چہرے پر پڑتی ہے، چہرے کی ہلکی سی جھریاں اس کی ضعیف العمری کا پتہ بتا رہی ہیں، ایک سپید روشنی کا کرہ اس کے ایک ہاتھ کے نیچے ہے جس میں کبھی کبھی مختلف رنگ حرکت کرتے ہیں۔ فضا کے ماحول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی دنیا میں اطمینان سے بیٹھا ہے۔

ایک دروازہ جو بادلوں کی دھندلی آمیزش سے بنا ہوا ہے نظر آتا ہے۔ دروازے پر ایک دستک جو وقفے کے بعد دہرائی جاتی ہے "خاموش دیوتا" (اسکے مطمئن اور پرسکون اطوار سے اسے خاموش دیوتا ہی کہنا مناسب ہوگا) آواز سنتا ہے لیکن چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ اسکے سکون کا سلسلہ برہم نہیں ہوا۔ وہ ورق الٹ رہا ہے اور ساتھ ہی نہایت تسکین آمیز لہجہ میں کہتا ہے۔)

خاموش دیوتا ۔ اندر آجاؤ۔

(وہ شخص اندر آتا ہے بالکل مختلف کردار ہے سپاہی بھی معلوم ہوتا ہے اور پجاری بھی۔ دیوتاؤں کا امتیازی نشان اسکی شخصیت سے نمایاں ہے۔ سینکڑوں برس سے وہ دیوتاؤں کا روپ دھارن کئے ہوئے ہے اور وہ لوگ جو اسکے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اسکی ظاہری تمکنت اور جلال سے خوفزدہ ہو سکتے ہیں۔ ایک وقفہ کے لئے نیچے نگاہیں کئے ہوئے وہ اسکی طرف دیکھتا ہے۔ اور اسے دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو جاتا ہے غالباً اس خیال سے کہ اسکا استقبال اس قدر گہری خاموشی کے ساتھ ہوا ہے، نووارد دیوتا مہرِ سکوت توڑتا ہے)

خاموش ۔ کہئے! کیا حال ہے؟

نووارد ۔ (مسرت کے ساتھ) اوہ! بہت اچھا ہوں

خاموش۔ بوڑھا ہوتا جا رہا ہو۔

نووارد۔ بوڑھے ہوتے جا رہے ہو؛ لیکن دیوتا تو بوڑھے نہیں ہوا کرتے، وہ تو لافانی ہوتے ہیں۔

خاموش۔ ہاں میں بھی ایسا ہی خیال کیا کرتا تھا لیکن میں غلطی پر تھا۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ آج بہت سے دیوتا بالکل بوڑھے ہو چکے ہیں، انسانوں نے انہیں بھلا دیا تو اُن کی ہستی بھی نابود ہوگئی۔

نووارد۔ ہاں! وہ دیوتا جھوٹے ہوتے ہیں۔

خاموش۔ لیکن اپنے وقت میں وہ سچے دیوتا تھے انسان ان کی پوجا کیا کرتا تھا، جب اس نے پوجا کرنا ترک کردی تو وہ دیوتا بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

نووارد۔ دیوتا کی زندگی کا انحصار انسان کے اعتقاد پر منحصر نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دیوتا صحیح معنوں میں دیوتا ہو۔

خاموش۔ لیکن تمہارے اس اصول پر مجھے شبہ ہوگیا ہے اپنی زندگی کا وہ زمانہ میرے ذہن سے مٹ چکا ہے جبکہ میرے پجاری دُنیا میں نہ تھے!

نووارد۔ لیکن تم نے اپنی دُنیا انسان کی آفرینش سے پہلے بنائی تھی اور میں نے بھی۔

خاموش۔ ہاں! اس وقت میں نیم شعوری حالت میں تھا۔ شعورِ مطلق کا احساس مجھے اس وقت ہُوا جب انسان دُنیا میں آیا۔ اسکی پیدائش سے پہلے تمہیں یاد ہے دُنیا میں کیا ہوتا تھا؟

نووارد۔ ہاں! بلاخیز طُوفان، آندھیاں، سمندروں کا غضب کا شور، عقاب اور بھیڑیوں کی چیخیں، شیروں کی گرج، بادلوں کی کڑک، بجلی کی چمک، اندھیرا ـــ دُور تک اندھیرا ـــ موت کا سایہ اور قدرت کی ہنگامہ خیزیاں ـــ ہماری پیدا کی ہوئی طاقتیں۔

خاموش۔ لیکن ان کے سوا کچھ اور بھی تھا؟ جب تک انسان نہ آیا تھا ہم کیا تھے؟ انہیں طاقتوں کے شور و غل میں سرگرداں یہ طاقتیں ہماری ہی آوازیں تھیں یا صدائے بازگشت، کیا ہمیں اس وقت یہ احساس تھا کہ ہم دیوتا ہیں؟ تم اپنی طاقت کا اظہار کسی پر کرنا چاہتے تھے لیکن تم یہ نہ سمجھ سکے کہ تمہارا عتاب کون برداشت کریگا، ایک بھوکے شیر کی طرح ہوا سے جھپٹتے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، لیکن تم نہیں جانتے تھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟

نووارد۔ کیا کوئی دیوتا اس چیز کی بھی خواہش کرتا ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو؟

خاموش۔ بالکل! میری طرف نگاہ ڈالو! میں آج اس چیز کے لئے تڑپ رہا ہوں جو انسان نے مجھے ابھی تک نہیں دی اور ممکن ہے میں اس چیز کی آرزو ہی میں مرجاؤں، لیکن امید پر بیٹھا ہوں اور آخری لمحوں تک انتظار کرونگا۔

نووارد۔ اور اسی انتظار میں تم بوڑھے ہو رہے ہو، میں بوڑھا نہیں ہو سکتا،

خاموش۔ تم کیا کرتے ہو؟

نووارد۔ حکومت، شاہنشاہی، میں اپنی مرضی سے دُنیا کو اپنے اشاروں پر چلا رہا ہوں،

خاموش۔ کیا دنیا والے ہمیشہ تمہارا کہنا مانتے ہیں؟

نووارد۔ جب وہ آسمانی حکم کی تعمیل نہیں کرتے تو میں انہیں سزا دیتا ہوں۔

خاموش۔ کیا سزا کے بعد وہ تعمیل نہیں کرتے؟

نووارد۔ کبھی کرتے ہیں کبھی نہیں کرتے!

خاموش۔ اور اگر نہ کریں تو؟

نووارد۔ تو پھر دوبارہ سزا دیتا ہوں۔

خاموش۔ اسکا مطلب ہے کہ تمہاری سزا کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا؟

نووارد۔ ہاں اسکے بغیر نظامِ کائنات کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

خاموش۔ میں اب انسانوں کو سزا نہیں دیا کرتا۔

نووارد۔ اسی لئے تو بوڑھے ہوتے جا رہے ہو؟

خاموش۔ ہاں ایک مدتِ مدید کے بعد میں نے اس راز کو پایا ہے، جب انسان گناہ کرتا ہے تو میں اس لئے اُسے چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ خود اپنے آپ کو سزا دے۔

نووارد۔ (بے اعتنائی سے) اس کا انجام؟

خاموش۔ نہایت خوفناک انسان جب اپنے آپ کو سزا دیتا ہے وہ اس قدر کڑی ہوتی ہے کہ ہماری سزائیں اس کے مقابلے میں خاک بھی حیثیت نہیں رکھتیں، اور ہماری سزائیں تو انہیں مغرور اور باغی کر دیتی ہیں انسان اپنی سزا ہی سے انسان بن سکتا ہے۔

نووارد۔ اس طرح وہ کیا حاصل کرتے ہیں؟

خاموش۔ اپنی غلطی کا احساس، انسان کو سزا دو لیکن اسکے بعد وہ اپنی رائے پر اڑا رہیگا، اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے اسے رہا کر دو، وہ اپنی فراست سے اپنی غلطی کا اعتراف کرے گا۔

نووارد۔ تم بھی عجیب دیوتا ہو!

خاموش۔ ہاں میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میں عجیب ہوں۔ میں باخبر ہو رہا ہوں۔

نووارد۔ کیا تم اپنے آپ کو سزا دے رہے ہو؟

خاموش۔ یونہی سمجھ لو، میں اس بات سے آگاہ ہو رہا ہوں کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی۔

نووارد۔ دیوتا کبھی غلطی نہیں کیا کرتے۔

خاموش۔ یہ بات صرف تمہارے پجاری کہا کرتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت دیوتا بھی غلطی کرتے ہیں۔ تم انسانوں کو سزا دیکر اپنے آپکو جوان اور لافانی بنا رہے ہو۔ اور میں . . . میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں

نووارد۔ کیا تم نے بوڑھے ہونے کا ارادہ کر لیا ہے؟

خاموش۔ ہاں!

نووارد۔ لیکن جب تم اتنے بوڑھے ہو گئے کہ اس سے زیادہ بوڑھے نہ ہو سکو گے تو پھر کیا کرو گے؟

خاموش۔ پھر میں مر جاؤنگا۔

نووارد۔ لیکن دیوتا تو نہیں مرا کرتے۔

خاموش۔ یہ بھی تمہارا غلط بیان ہے [illegible] دیوتا [illegible] بالکل مر چکے ہیں اور [illegible] اپنے وقت [illegible] کرتے تھے۔ وہ جھوٹے دیوتا تھے [illegible] تھے لیکن انسان انہیں فراموش کر چکا ہے۔ [illegible] وہ مر چکے ہیں، غور کرو ہماری پرستش [illegible]

ہستیاں کس کام کی ہیں۔ ہم تو سراسر انسان کے رحم
پر جی رہے ہیں۔ انسان چاہے تو ہمیں زندہ رکھے اور
اگر نہ چاہے تو نیست و نابود کر دے، وہ ہمارے بھائی
وہ باجبروت دیوتا تو نہیں بھولے نہ ہوں گے۔!

نووارد۔ تو کیا تم بھی انہیں کی طرح مٹ جانا چاہتے ہو؟

خاموش۔ ان کی طرح تو نہیں، وہ بیچارے کہاں مٹنا چاہتے
تھے، ان کو مٹانیوالا انسان تھا!

نووارد۔ اسکا مطلب ہے کہ تم ارادتاً مرجانا چاہتے ہو۔

خاموش۔ بالکل اپنی مرضی سے۔

نووارد۔ تم سے باتیں کرنے میں بھی ایک مزہ ہے تم اپنی مرضی
سے کس طرح مرو گے؟ اگر دیوتا مرجائے تو اسکا مطلب ہے
کہ انسان اس کی ضرورت محسوس کرنا بھول جائیگا۔

خاموش۔ بالکل۔

نووارد۔ پھر وہ دیوتا دیوتا نہیں رہیگا۔

خاموش۔ یہ بھی میں مانتا ہوں۔

دیوتا۔ پھر دیوتا کی ہستی کا کیا مقصد ہوا؟

خاموش۔ انجام کا ایک آلہ کار، وہ انسان کو اپنا آپ پہچاننے
میں مدد دیتا ہے اور جب انسان نے اپنے آپکو پہچان
لیا تو پھر سے دیوتا اور انسان ایک ہی ہستی میں سما جاتے
ہیں۔ میں ایک دن کا منتظر ہوں۔

نووارد۔ تو کیا تم اسی لئے بڑھاپا محسوس کر رہے ہو؟

خاموش۔ ہاں میرا خیال یہی ہے!

نووارد۔ کیا انسان کو اب تمہاری ضرورت نہیں رہی؟

خاموش۔ ابھی تک تو نہیں میری ضرورت ہے کیونکہ
میں ابھی موت کے دامن میں نہیں آیا۔ لیکن ایک وقت
آئیگا کہ وہ مجھ سے بالکل بے نیاز ہو جائیں گے جب
اس نے مجھ سے محبت کے سبق کی تکمیل کر لی تو اسکے
بعد میرا کام ختم ہو جائیگا۔

نووارد۔ لیکن سچ کہنا۔ کیا تم اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے؟ کیا
تم اپنی تسکین کے لئے ہمیشہ معبود نہیں بننا چاہتے؟

خاموش۔ جب تک وہ میری عبادت کرتے جائیں گے
میں قبول کرونگا۔ لیکن میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا!

نووارد۔ تو فیصلہ ہوا؟

خاموش۔ ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم دونوں کچھ سمجھوتہ
کر سکیں تو بہتر ہوگا۔

نووارد۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم نے اپنے
آپ کو بالکل گرا لیا ہے۔ مجھ سے ایسے نہیں ہو سکیگا
اگر انہیں کی مرضی پر چھوڑ دیں تو وہ ہمیں خاک دینگے
میں تو ان سے وہ چیز بھینٹ لیا کرتا ہوں جو وہ
نہ دینا چاہیں،

خاموش۔ مثلاً۔

نووارد۔ یہ کہ میں انسانوں سے بھینٹ کے لئے وہ چیز طلب
کرتا ہوں جو انکو عزیز ترین ہو۔ بعض اوقات انکے
بچے بھی!

خاموش۔ لیکن یہ قربانیاں ان کی رضا پر ہی منحصر ہیں۔ اگر
ان کی مرضی نہ ہو تو وہ نہ دینگے، ہم تو بالکل ان کے
ہاتھوں میں ہیں اور وہ بیچارے یہ خیال کرتے ہیں
کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔

نووارد۔ خیال نہیں بلکہ یہ ان کا اعتقاد ہے۔

خاموش۔ لیکن میں اس کے خلاف ہوں، بڑھاپے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے، ان قربانیوں کی اہمیت کا راز بھی مجھ پر منکشف ہو چکا ہے، انسان صرف اپنے ذاتی مفاد کو مدِنظر رکھ کر قربانی کیا کرتا ہے۔

نووارد۔ تم آج کل ان سے کون سی قربانی طلب کیا کرتے ہو؟

خاموش۔ محبت

نووارد۔ محبت؟ وہ تو ہمیشہ سے کیا کرتے تھے۔

خاموش۔ یہ غلط ہے۔ پہلے وہ مجھ سے خوفزدہ ہو کر خون اور گوشت کی قربانی دیا کرتے تھے، وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی میں ان سے کرتا تھا۔

نووارد۔ تم کیا کرتے تھے؟ ان سے خوف نہیں کھاتے تھے؟

خاموش۔ نہیں میں ان سے کبھی بھی خوفزدہ نہ ہوا، لیکن میں یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کس لئے، بہت عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ اگر میں ان سے خوف کھاتا تو اس راز کو بہت جلد پا لیتے۔

نووارد۔ وہ کیونکر؟

خاموش۔ اس طرح میں انسانوں کے نزدیک تر ہو جاتا۔

نووارد۔ نزدیک تر؟

خاموش۔ ہاں! دیوتا اور انسان میں یکسانیت نہایت ضروری ہے، صحیح عبادت کا عظیم ترین مقصد یہی ہے کہ معبود اپنے بندے کو فوراً جواب دے۔ کیونکہ عبد اور معبود کا صحیح رشتہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جبکہ انسان عبادت کرے اور معبود اسکو فوراً جواب دے۔

خوف اور ہیبت انسان کو دیوتا سے جدا کرتے ہیں جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں تو میں سخت پشیمان ہوا افسوس کہ وہ مجھے نہ سمجھ سکے!

نووارد۔ کس طرح؟

خاموش۔ میں نے انہیں نقصان پہنچانے کی کبھی خواہش نہیں کی اگرچہ مجھے ان پر ترس آتا تھا لیکن میں کچھ کہہ نہ سکتا تھا کیونکہ اس راز کو معلوم کرنا انکا اپنا فرض تھا ایک مدتِ دراز کے بعد ان پر یہ بھید کھلا،

نووارد۔ پھر؟

خاموش۔ اس طویل وقفہ میں وہ میرے حضور میں قربانیاں کرتے رہے اور میں دیکھتا رہا کہ ان کی یہ عقیدتمندیاں ان کی خودی پر ایک پردہ ڈالے ہوئی ہیں۔ جو چیز انکے لئے باعثِ نجات نہ ہو وہ میرے لئے بھی نہیں ہو سکتی، میں خون اور جسم کی قربانیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگا، مجھے ان سے خون کی بو آنے لگی میری بے اعتنائی پر انہوں نے قربانیاں کرنا بند کر دیں، میں اس موقع کی تلاش میں تھا، وہ اسوقت بھی میری پوجا کرتے تھے لیکن کسی اور رنگ میں،

نووارد۔ کس رنگ میں؟

خاموش۔ وہ عمل میں نہیں بلکہ وجد میں میری پرستش کرنے لگے میں تجسسانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان میں ایک انقلاب سا ہو رہا تھا، ایک دن [illegible] دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ میری طرح دیوتا بننے کی کوشش میں [illegible] تھے۔

نووارد۔ اف! اتنا کفر! کیا وہ کامیاب ہو گئے؟

خاموش۔ افسوس! وہ کامیاب نہ ہوئے۔ یہ سب میری غلطی کا نتیجہ تھا، جس طرح وہ مجھ سے خوف کھاتے تھے اس طرح وہ دنیا پر اپنی ہیبت پھیلانے لگے۔ گذشتہ تعلق سے انہوں نے یہ سبق حاصل کیا کہ دیوتاؤں سے ہمیشہ خوفزدہ رہنا چاہئے، حالانکہ میرا ارادہ یہ نہیں تھا ان پر ہیبت طاری کرنے کی میری آرزو کبھی نہ ہوئی تھی لیکن ہم دیوتاؤں کے اصول ہی اس قسم کے ہیں کہ انسان صرف خوف کی وجہ سے ہمارے ساتھ تعلق قائم رکھتا ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے!

نووارد۔ میں خوف اور وحشت میں کوئی عیب نہیں سمجھتا، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں صرف انہیں دو چیزوں سے آج دنیا پر حکومت کر رہا ہوں اور تمہاری طرح بڑھاپا محسوس نہیں کر رہا، ایک دفعہ پھر آزماؤ اپنی بے پناہ طاقتوں کو سرد نہ پڑنے دو۔

خاموش۔ نہیں نہیں!! جو راستہ میں پامال کر آیا ہوں اس پر واپس نہیں جانا چاہتا البتہ میرے دل میں بھی انسانوں کا سا ہراس پیدا ہو جائے تو میں کامرانی تصور کروں گا۔

نووارد۔ اپنی پیدا کی ہوئی چیز انسان سے دیوتا کبھی خوفزدہ نہیں ہو سکتے

خاموش۔ آخر اسکے دل میں موت کا خوف پیدا ہو جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے

نووارد۔ موت؟

خاموش۔ ہاں! موت سے دیوتا کو کبھی نہیں خوفزدہ ہونا چاہئے میں اس راز کو پا چکا ہوں کہ جب دیوتا موت سے نہ ڈرے تو انسان بھی اس سے ڈرنا چھوڑ دے بلکہ اس کی محبت میں مخمور ہو جائے۔ اس حالت میں دیوتا اپنے پجاریوں کے دلوں میں جاگزیں اور حقیقی معنوں میں لافانی ہو جاتا ہے۔

نووارد۔ میں نہیں سمجھ سکا!

خاموش۔ میں بھی اس وقت تک نہیں سمجھ سکا تھا جب تک کہ میں نے اپنا زوال محسوس نہ کیا!

نووارد۔ لیکن تم نے ابھی کہا تھا کہ تم بالکل نیست و نابود نہیں ہونا چاہتے۔

خاموش۔ ابھی تک انسان ایک اور رنگ میں میری پرستش کر رہے ہیں۔ جب میں دیکھوں گا کہ انہوں نے میری پوجا بالکل ترک کر دی ہے۔ تو اس وقت میں نہایت مسرت سے نابود ہو جاؤں گا۔

نووارد۔ تم انہیں مجبور کرو کہ وہ ہمیشہ تمہاری پوجا کرتے رہیں

خاموش۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

نووارد۔ لیکن مجھے تو یہ ایک ذلت آمیز انجام محسوس ہو رہا ہے۔

خاموش۔ میرا بھی یہی خیال تھا لیکن میں نے ایک دن اپنے پجاریوں کو کہتے سنا کہ "خدا محبت کا دوسرا نام ہے" پہلے تو میں حیران ہی رہ گیا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان الفاظ میں کس قدر صداقت تھی! میں اپنے پجاریوں سے محبت کرنے لگا! میں عشق کے بے پایاں سمندر میں بہتا جا رہا تھا! میں اپنے دوست اور دشمن سے محبت کرنے لگا، جس دن مجھے یہ محسوس ہوگا۔ کہ میری اور انسان کی محبت بالکل ہم پلہ اور یکساں ہے اور جس دن میں نے یہ سن لیا کہ "انسان محبت کا دوسرا نام ہے" انہیں میری ضرورت نہ رہے گی! میں منتظر ہوں

سے پرے ہٹ جاؤ نگا جب انہیں یہ محسوس ہوگیا کہ انسان محبت کا دوسرا نام ہے۔ تو وہ تمام دیوتاؤں سے بے نیاز ہو جائینگے لیکن ابھی اُس کے لئے ایک طویل مدت کی ضرورت ہے۔!

نووارد۔ اور اسی لئے تم بوڑھے ہو رہے ہو؟

خاموش۔ ہاں! مجھے تو بوڑھے ہونے کا مطلق غم نہیں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے۔ جب انسان میری ذات سے بے نیاز ہو جائے گا۔ ابھی تک تو اُسے میری ضرورت ہے اور اسی انتظار میں میں نے ایک ایسا راز معلوم کیا ہے جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

نووارد۔ وہ کیا ہے؟

خاموش۔ ایک حسین و جمیل راز جس سے میرے بڑھاپے کو ایک گونہ تسکین ہو رہی ہے۔

نووارد۔ وہ ہے کیا؟

خاموش۔ وہ دیوتا جنہیں انسان محبت کرتا ہے ــــ بہت بوڑھے ہو کر مرتے ہیں، مجھ سے انسان محبت کرتا ہے۔ اس لئے میں بہت ہی بوڑھا ہو کر مرونگا ــــــ کتنا زریں مستقبل!

(ترجمہ)

نقد و نظر:-

سالنامہ شاعر۔ (مرتبہ حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی، کتابت و طباعت جاذب نظر، ضخامت پانچسو چوبیس صفحات، قیمت عہ مقام اشاعت قصر الادب آگرہ)

اردو کے موجودہ ممتاز لسانی مراکز میں قصر الادب آگرہ کو جو حیثیت حاصل ہے وہ دنیائے اردو سے پوشیدہ نہیں۔ اپنے قابل احترام بانی مولانا سیماب اکبرآبادی کی زیر قیادت اس مرکز ادب نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ہزاروں اس سرچشمے سے سیراب ہو چکے ہیں اور ہزاروں ہو رہے ہیں۔ قارئین کرام جانتے ہیں کہ کچھ عرصہ پیشتر "شاعر" کا آگرہ نمبر شائع ہوا تھا جسمیں قدیم و جدید آگرہ کے شعرا و مصنفین کے حالات زندگی اور اُن کی دماغی کاوشوں پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اور اب "شاعر" کا حسین و جمیل اور اسکے ساتھ ہی ضخیم سالنامہ بغرض تبصرہ دفتر میں موصول ہوا ہے۔ یہ سالنامہ تین حصوں پر مشتمل ہے!

پہلا حصہ۔ اس میں اردو کے ممتاز اہل قلم کے مضامین نظم و نثر شائع ہوئے ہیں مولانا سیماب کی نظم "تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں" نہایت وجد آور اور پُر کیف نظم ہے۔ اسمیں ایڈورڈ ہشتم اور اُنکی محبوبہ کے افسانۂ عشق کو بہت رنگین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ نثر اکی شاعری حضرت سعادت حسن منٹو کا ایک کامیاب مضمون ہے اور مرد و عورت محترمہ حجاب امتیاز علی کا دلچسپ افسانہ ہے حصہ نظم خاص طور پر بلند و ممتاز ہے۔

دوسرا حصہ۔ اس میں آگرہ سکول کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، بالخصوص مولانا سیماب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو

معرضِ بحث میں لا کر ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ۔ اس میں مولانا کے اکیس بارہ شاگردانِ رشید کے مختصر حالاتِ زندگی، انکے کلام کا انتخاب اور بہتوں کے فوٹو بھی دئیے گئے ہیں۔ آغاز میں مولانا مرحوم کے قلم سے اپنے "کارواں" کے نام ایک پیام ہے۔ جسکے بعض فقرات تو کئی کئی لیکچروں پر حاوی ہیں۔

شاعر کا یہ ضخیم سالنامہ اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ امید ہے ملک جناب اعجاز صدیقی کی جانفشانیوں کی قدر کرے گا۔ واقعی ان کی یہ کوشش ان کی اعجاز طرازی پر شاہد ہے۔ ______ (م - ا)

ساقی کا افسانہ نمبر

(مرتبہ حضرت شاہد احمد بی اے (آنرز) کتابت و طباعت حسین و جاذبِ دل ضخامت ۲۶۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ مقامِ اشاعت دفتر ساقی، دہلی)

ماہنامہ "ساقی" اردو کے ان رسالوں میں شمار ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جناب شاہد احمد صاحب بی اے (آنرز) ایڈیٹر ساقی ایک مخلص و سرگرم نوجوان ہیں اور خود بھی نہایت اچھے مترجم ہیں۔ نقاد اعظم دستوفسکی کا ترجمہ جو ساقی کے تین نمبروں میں بالاقساط شائع ہوا ہے، انکی مترجمانہ صلاحیت و قابلیت کا بدرجۂ اتم شاہد ہے۔ افسانہ نمبر آپ نے بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے اور ساقی کے دیگر خاص نمبروں کی طرح شاندار!

افسانہ نمبر میں جناب میرزا محمد سعید ام اے، آئی ای ایس، جناب ایم اسلم، جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی، جناب صادق الخیری ام اے، محترمہ حجاب امتیاز علی، جناب اثر رائے پوری، جناب ل احمد، جناب احمد علی ام اے، جناب سید بادشاہ حسن اور محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کے مضامین و افسانے خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں منظوم افسانے بھی بہت بلند اور دلچسپ ہیں۔!

بیسویں صدی

(مرتبہ حضرت خوشتر گرامی صفحات ۶۰۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ فی پرچہ تین آنے۔ مقام اشاعت دفتر بیسویں صدی پرانی میوہ منڈی لاہور)

حضرت خوشتر گرامی ایک کہنہ مشق، تجربہ کار صحافی ہیں ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں آپ مدیرانہ فرائض نہایت خوش اسلوبی کیساتھ انجام دے چکے ہیں اب آپ نے "بیسویں صدی" کے نام سے ایک بلند پایہ رسالہ نکالا ہے اسوقت ہمارے پیشِ نظر اسکا چوتھا نمبر ہے جسمیں بہت دلچسپ رنگین اور اسکے ساتھ ہی کارآمد مضامینِ نظم و نثر موجود ہیں "نمکدان" کے عنوان سے خوشتر صاحب نے چند ایک واقعات کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا ہے مضمون کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشتر صاحب جہاں سنجیدہ مضامین لکھنے میں خاص دسترس رکھتے ہیں وہاں مزاحیہ مضامین میں بھی انہیں ید طولےٰ حاصل ہے "پریم بھرے گیت" پنڈت اندرجیت شرما کا ایک پیارا البیت ہے "کالج گرل" مشہور مزاح نگار حضرت لق لق کا دلچسپ افسانہ ہے "مقدس گناہگار" کے نام سے جذباتی شاعر حضرت اختر انصاری کا ایک رنگین افسانہ ہے، ان حضرات کے علاوہ حضرت اختر شیرانی، مولانا حسرت موہانی، غیر معروف جرنلسٹ، حامد اللہ افسر، خان اصغر حسین صاحب نظیر کے مضامینِ نظم و نثر موجود ہیں۔ رسالے میں علمی مضامین بھی موجود ہیں، جنکا مطالعہ بہت مفید ہے!!

امید ہے رسالہ ہمارے عزیز دوست حضرت خوشتر گرامی کی ادارت میں برابر ترقی کرتا جائے گا۔"

(م - ا)

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب لاہور بموجب لیٹر نمبر ۱۱۳۲۳ سی مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۳۶ء
منظور کردہ محکمۂ تعلیم حیدر آباد دکن ۲۴۲۰ سنہ ۱۳۴۴ ف مثل نمبر د ۱۱۲۳ [illegible]

مکتبۂ اردو لاہور کا
کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی۔اے
میرزا ادیب بی۔اے

مقامِ اشاعت
مکتبۂ اردو لاہور

منیجنگ پروپرائٹر
چودھری نذیر احمد

[illegible]

[illegible]

سالانہ چندہ بمعہ ضخیم سالنامہ وافسانہ نمبر ہے

ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرس

جلد ۶ | بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۱

الاسرایہ

نذرِ اولین

اس نمبر میں ڈرامہ شہنشاہِ حبشہ کا پہلا ایکٹ شائع کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما چار ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اور تین اقساط میں ختم ہو جائیگا۔

ڈراما کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ اردو کے مشہور نقاد اور صاحب قلم حضرت اختر اورینوی ایم اے کے قلم سے ہے۔ اختر صاحب نے کافی تحقیق و تفتیش اور غور و تفکر کے بعد ان ہوشربا واقعات کو سپرد قلم کیا ہے۔ جو ابھی ابھی دنیا کی نظروں کے سامنے پیش ہوئے ہیں۔ میسولینی کے جارحانہ اقدامات، اہل حبشہ کی وطن پروری، شہنشاہ حبشہ کی بیچارگی، بیکسی، جمعیتِ اقوام کی پیماں شکنی، الغرض جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اُسے دلآویز پیرائے میں آپ نے قلم بند کر دیا ہے۔ ڈرامائی نقطہ نظر سے بہت کامیاب ہے۔

حضرت مولانا روش صدیقی پہلی دفعہ "ادب لطیف" کی محفل میں تشریف لائے ہیں۔ روش صاحب جیسا کہ قارئین جانتے ہیں، اردو کے ان کامیاب شعرا میں سے ہیں جن پر اردو کو فخر ہے۔ روش صاحب کی اور نظمیں بھی دفتر میں موصول ہو چکی ہیں۔ جو ادب لطیف میں شائع ہونگی۔

میراجی بھی پہلی دفعہ تشریف لائے ہیں۔ آپکی نظم نئی قسم کی شاعری کا قابلِ قدر و تحسین نمونہ ہے "میراجی" جدید شاعری کے علمبرداروں میں شمار ہوتے ہیں۔

شمارہ حاضرہ میں ایک ڈراما "صولت کی موت" ایڈیٹر کے قلم سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ڈراما "موریس میترلنک کے ایک ڈرامے سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ آج سے چار پانچ سال پیشتر میں نے بلجیم کے اس مفکرِ اعظم کا ایک ڈراما پڑھا تھا۔ اسی کے تاثرات اس ڈرامے کے تخلیق کے باعث ہوئے ہیں۔

گوپال متل بی اے کا طرز تحریر خوب ہے۔ اگرچہ پلاٹ کے انتخاب میں آپ کی کوشش زیادہ قابلِ تحسین نہیں۔

اس نمبر میں جناب کنور چرنی لال کاوش کا ایک "گیت" بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ کاوش صاحب ایک نہایت متین، سنجیدہ اور محنتی نوجوان ہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی پیکرِ خلوص بھی ممکن نہیں کہ آپ ایک بار اُن سے ملیں اور ان کے مخلصانہ برتاؤ سے متاثر نہ ہوں۔ گیت میں کوئی خاص چیز نہیں۔ آئندہ آپکے جو مضامین شائع ہونگے وہ کامیاب ہونگے!

احمد ندیم قاسمی اردو کے نوجوان انشا پردازوں میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ افسانہ دلچسپ ہونیکے علاوہ سبق آموز بھی ہے۔

افسانہ نمبر پر ریویو اور حکیم یوسف حسن صاحب

اجرا سے لیکر اب تک ہم نے ریویو اور تنقید کے سلسلے میں ذاتی منافشت سے متاثر ہو کر یا تجارتی امور کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی کتاب یا رسالے کے خلاف نہیں لکھا۔ تنقید اور تبصرے کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ منتقمانہ جذبات کے زیر اثر کسی کتاب یا رسالے کیخلاف لکھنا صحیح معنوں میں صحافتی بد دیانتی ہے۔

ہمارے دیرینہ کرمفرما حکیم یوسف حسن صاحب نے نیرنگِ خیال کے اگست نمبر میں "ادب لطیف" کے افسانہ نمبر پر "حسن حکیمانہ شان" سے ریویو کیا ہے۔ جو بیک وقت "منتقمانہ" بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی۔ حکیم صاحب سے کبھی یہ امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ آپ اس قسم کا رویہ اختیار کریں گے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ مالکان "ادب لطیف" نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر "ادب لطیف" کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی "حسن کا یہ مقدار تھا"۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ موجودہ کساد بازاری میں ہر ایک رسالے کو یہ شکایت ہے۔ خود نیرنگ خیال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں مگر جس طنزیہ رنگ میں آپ نے یہ سطور رقم فرمائی ہیں۔ وہ صرف آپ کی ذاتِ گرامی ہی سے مخصوص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی رسالے کی کامیابی حکیم صاحب کی طبع نازک پر "زرا گراں" گزرتی ہے۔ اور تو بس نہیں چلتا کسی نہ کسی بہانے سے اسکے خلاف لکھ کر طبیعت کے لئے سامانِ تسکین پیدا کرنیکی کوشش کر لیتے ہیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ آپ ادب لطیف کی کامیابی کو دیکھتے اور چپکے بیٹھے رہتے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ ایڈیٹر ادب لطیف نے نیرنگِ خیال کے خلاف کبھی زہر چکانی کی تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسی زہر چکانی تھی۔ جسکے اثر سے ہمارے محترم حکیم صاحب ابھی تک تڑپ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نیرنگِ خیال کے ایک سالنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ حکیم صاحب نے تصاویر کی پشت پر اشتہارات بھی دیئے ہیں۔ یہ بات اردو (اورنگ آباد) نے بھی لکھی تھی۔ اتنی سی بات تھی جسے حکیم صاحب نے "افسانہ" بنا دیا ہمیں حکیم صاحب کی "اردو خدمات" کا اعتراف ہے۔ اور ہم نے معاصرانہ تعلقات کو بگاڑنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب اپنی "عادت" سے مجبور ہیں۔ بہر حال ہم آپ کی "نیرنگ سازیوں" کے ممنون ہیں ——!

آغا حشر کی یادگار اور اُن کے ڈرامے۔

چھ اشاعتوں سے "آغا حشر" ان کی یادگار کے قیام اور ان کے ڈراموں کی اشاعت کے متعلق لکھا جا رہا ہے۔ خدا خدا کر کے ملکی صحافت نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اور بعض رسائل و جرائد میں آغا حشر کی یادگار کے قیام اور ان کی تصانیف کی نشر و اشاعت سے متعلق متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مگر یہ سوال تو عالمگیر تائید کا مستحق ہے صرف چند سطریں لکھ دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ ملک کو اس طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔ سنا ہے۔ آغا حشر کا ڈرامہ "بھیشم" جسے آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں تمثیل کرنا شروع کیا تھا اور جو آپکی مرگِ ناگہانی کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ اب فرانٹیر فلم کمپنی کے زیر انتظام مکمل ہو گیا ہے۔ یہ خبر مسرت افزا ہے کہ اسی کمپنی نے آغا حشر کی یادگار کے قیام کے سلسلے میں بھی توجہ دینی شروع کی ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو۔

مکتبہ اُردو کی ادبی سرگرمیاں۔

مکتبہ اردو کی دو جدید مطبوعات "تین پیسے کی چھوکری اور دیگر افسانے" اور "پیغمبر صحرا" بالکل تیار ہو گئی ہیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہے۔ "چاند کا گناہ اور دیگر افسانے" ایک ہفتہ تک شائع ہو جائیں گے۔ مولانا کوثر چاندپوری کے افسانوں کے دو مجموعے "دنیا کی حور اور دیگر افسانے" اور "عورتوں کے افسانے" بھی پریس میں ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی ستمبر کے وسط تک شائع ہو جائینگی۔

سالنامہ ادب لطیف ۱۹۳۷ء

ہمارے گذشتہ سالنامے بہت مقبول ہوئے ہیں۔ نہ صرف معنوی محاسن کے لحاظ سے بلکہ ظاہری خوبیاں کے لحاظ سے بھی انہوں نے دنیائے اردو میں ایک شاندار اضافہ کیا ہے۔ ابکے ہمارا ارادہ ہے کہ سالنامہ ۳۷ء حقیقی معنوں میں اردو کا

جناب سید راحت مولائی بی۔ اے۔ (علیگ)

جوان امنگ والے سے

ایک بڑے خاندان کے معاملات کا انتظام کبھی نوکروں چاکروں سے تکمیل نہیں پا سکتا، اور بہت سے معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں شوہر کا دخل دینا صد درجہ کی حماقت یا بدتمیزی شمار کیا جاتا ہے۔ جب تک ایک عورت اپنے گرد کی خادماؤں کے چال چلن اور ایمانداری و بے ایمانی کی حقیقت و اصلیت سے واقف نہ ہو کوئی بلند رتبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ ان کی نگہداشت خود کرنی چاہیئے۔ اور تو اور بڑے بڑے آدمیوں کی طبائع اور تمامیت قلب ان لوگوں کے اثر سے نہیں بچ سکتی۔ جو ان کے چاروں طرف رہتے ہیں۔ وہ لوگ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کرتے اور رتبہ میں بالکل ان ہی لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جن سے وہ متعلق کر دئے گئے ہیں

ایک "قنوطیت پرست" انسان کے لئے پرانے زمانے گذر گئے اور ان کے واپس آنے کی بھی اب کوئی امید نہیں لیکن ایک امید پر جینے والے کے لئے اب بھی عورتوں کے ہاتھ میں وہ سب کچھ ہے جس سے وہ اخلاق و ادب کی حفاظت اور نوجوانوں کو ہر طرف پھیلتی ہوئی اور بڑھتی ہوئی طوائفوں کی تعداد سے بچا سکتی ہیں۔

یہاں مرا تخاطب دراصل درمیانی طبقہ سے ہے۔ جہاں عورتوں کے لئے خانگی امور پر پورا پورا عبور ہونا ازبس لابد و لازم ہے۔ اور وہ عبور اس طرح کا ہو کہ عورت صرف یہی نہ جانے کہ فلاں کام کس طرح ہونا چاہیئے یا فلاں فلاں چیز کیسے تیار ہو سکتی ہے، بلکہ وہ اس کام کو خود کرے اور اور اس چیز کو اپنے ہاتھ سے بنا دے۔ آخر اس درمیانی طبقہ میں نوکروں کا کام بھی کیا۔ کیا وہ منہ میں نوالہ دینگے یا حلق میں پانی ٹپکائیں گے۔ یا لوری دے دیکر سلائینگے ہاں اگر کسی کے بچے ہوں اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے تو ضرور نوکر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب بچے بڑے ہو جائیں تو نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ نوکر رکھنے والا اپنے ہی آرام و آسائش کے لئے صد درجہ محنت کرتا ہو۔

اس لحاظ سے ایک محبت کرنے والے کے لئے، اگر وہ واقعتہً اپنی محبت میں اندھا نہیں ہے، سخت ضروری ہے، کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کی ہونے والی بیوی، یا موجودہ محبوبہ گھر کے کام کیسے انجام دیتی ہے، اس وقت غور و فکر کی ضرورت نہیں جب مرد اس حالت میں ہو کہ اپنی بیوی کو خوب ٹھاٹ باٹ سے رکھ سکتا ہے۔ کھانا اور پینا زندگی کے اجزائے لاینفک ہیں، نفیس غذائیں اور انکو بہترین طریقہ سے پکانا چاہے آپ کی توجہ کو کتنا ہی جذب کرے۔ مگر

بہرحال ثقیل غذا اور جلا بھنا کھانا اچیرن معلوم ہونے لگتا ہے
آپ یہ چیز ایک مرتبہ یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ برداشت
کر سکتے ہیں لیکن اگر تیسری مرتبہ بھی دستر خوان پر ایسی ہی اشیا
نظر آویں تو کیا آپ اس وقت کی کوفت کا تجزیہ کر سکیں گے؟
اور اگر یہی حالت بدستور رہے تو آپ کی اندرونی خلش
کو شاں لذت شباب کے چند عشرتی لمحات بھی دور نہ کر سکیں۔
اور بالآخر ایک کشاکش دوام اور ایک اضطراب پیہم ہوتا ہے
اور آپ کی مصروف و بے کیف زندگی۔ نتیجہ آخری ——!
وقت گذر جانے پر آپکو صحیح طور پر احساس ہوتا ہے کہ آپ کی
رفیقۂ زندگی آپ کی طبیعت کے موافق نہیں، اور وہ غیر فانی
محبت، جو ایک انتہائی تعلیم یافتہ بیوی میں ملتی یا ملنے کی امید
ہوتی ہے، اور جس تلاش و آرزو میں آپ اپنے نیاز مندانہ
ہاتھ بیقرارانہ بڑھا دیتے ہیں، آپ کی خوش آئند و طرب انگیز
زندگی کو ایک مصیبت بنا دیتی ہے۔ شوہر چاہے کتنا ہی سمجھدار
اور خاموش طبیعت انسان ہو، وہ ایسی بیوی کی ذرہ برابر قدر
نہیں کر سکتا جو تیز و طرار تو ہو مگر تکمیل فرائض میں کوتاہ اور انتہائی
لاپروا بھی۔

پیشہ ور لوگوں کو (مثلاً وکیل۔ ڈاکٹر۔ سوداگر وغیرہ)
ایسی بیوی نہیں چاہیئے جو امور خانہ داری میں صرف دستی
مہارت رکھتی ہو۔ دراصل ان کو اپنے گھروں میں ایسی
بیوی کی ضرورت ہے جو زبانی ہدایات بھی دے سکتی ہو،
عقلی تدابیر سے بھی مالامال ہو، اور یہ بھی دیکھ سکتی ہو کہ فلاں کام
ہوگیا یا نہیں۔ کھانے کا عمدہ طور پر تیار کرانا، پانی کا صفائی کے
ساتھ انتظام رکھنا۔ گھر میں ہر چیز کی کافی مقدار کا موجود رہنا

چیزوں کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانا اور اسکے زیر انتظام
مکان میں کسی ایسی چیز اور ایسی بات کا کسی وقت نہ پایا جانا
جو —— شوہر کے عزو وقار اور شان کے خلاف ہو ——
وغیرہ وغیرہ —— ایسے فرائض ہیں جو ہر نیک اور صالح
بیوی میں پائے جانے ضروری ہیں۔ ایک مصروف شوہر یہ
تمام چیزیں اپنی بیوی کی واحد ذات پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور
صرف اتنی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے کہ ان تمام چیزوں کے
لئے خرچ کی تعداد وہ خود متعین کرے اور بیوی کو دیدے۔

اسکے برخلاف ایک مزدور کے یا ایک چھوٹے گھر میں
عورت کے لئے ہر کام کی دستی مہارت ضروری ہے۔ کیا آپ
اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے انسان کو کوئی کام اس طرح
سکھانا: جیسے کہ ایک شخص جانے ہوتے ہوتا ہے جو خود وہ
کام کرتا یا کر سکتا ہو، کتنا مشکل ہے؟ ایسے موقعہ پر مرد کا فرض
ہے کہ وہ یہ حکم دیدے کہ اسکے گھر میں ایسی چیز نہ پائی جائے
جو اس کی بیوی نہ تیار کر سکتی ہو۔ ممکن ہے اس طرح عورت
کم از کم ان چیزوں کا تیار کرنا جلد ہی سیکھ جائے جنکے لئے
اس کی خواہش ہوتی ہے، مگر وہ بتانا نہیں جانتی۔ آپ
عورت کی محنت سے کبھی نہ ڈریں، اسلئے کہ محنت و مشق سے
عورت کی تندرستی منسلک ہے، اور تندرستی سے اسکا حسن۔
"بیمار حسن" آپکے اندر رحم کا مادہ پیدا کر سکتا ہے جو عارضی
چیز ہے۔ "تندرست حسن" بعض اوقات آپکو خود سے محبت
کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو ایک مستقل صورت ہے۔ بھرپور
شباب تندرستی کی نشانی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ شباب
سے بھرپور دوشیزائیں بغیر کسی رنگ و حسن کے امتیاز کے خواہ

خواہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ بیمار عورت کی طرف آپ دیکھنا
بھی بینائی کے لیئے ایک سزا سمجھتے ہیں۔ آپکو ہزاروں ایسی
عورتیں ملیں گی جو صرف ایک رات کی اس میٹھی نیند کے لئے
اپنا نصف اندوختہ نذر کرسکتی ہیں۔ جس سے ایک محنت کرنے
والی عورت اتفاقیہ ہی محروم رہ جاتی ہے۔

لیکن اگر کوئی نوعمر مزدور اور درمیانی طبقہ کا کوئی نوجوان
ایسی عورت سے شادی کر ہی لیتا ہے جو گانے بجانے کی
انتہائی شوقین ہو۔ کاغذ، قلم اور روشنائی کا جو طول طویل
رومانی خطوط لکھنے میں خون کرتی ہو کھیل تماشہ سے جس کا
دل بہلتا ہو۔ ناول خوانی جسکا واحد مشغلہ ہو ــــ اگر کوئی
پُرشباب دل ایسی بدنصیب عورت پر ریجھ ہی جائے۔ تو
اسکے نتائج بھی برداشت کرنے کے لیئے تیار رہنا چاہیئے
انصاف خود ایسے شخص کو نیک برتاؤ سکھادیگا۔ وہ قدرتاً ایسی
کوشش کے لئے مجبور ہوگا۔ جس سے وہ عورت بحیثیت
ایک بیوی کے اپنے فرائض سمجھے۔ اس کو مجبوراً صابر بننا پڑیگا
اور آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ حقیقتاً ظاہری نمائش اور
فضول آرائش نے اسکے دل کو وقتی خوشی دے رکھی تھی۔ اس
حالت میں اپنے نفس حیوانیہ کو سکون پذیر کرلینے کے بعد وہ
شخص انتہائی جابر ظالم اور حیوان ہے جو ایسی عورت سے
ان باتوں کی امید کرے۔ جنکے متعلق وہ پہلے سے دیکھتا تھا
کہ اسمیں نہیں ہوں گی اور پھر نہ پاکر اسکو ملزم ٹھہرادے۔
یا اسپر کسی قسم کی سختی کرے پہلے تو اس کی اصلاح ہی کرنی
چاہیئے اگر سدھر جائے تو زہے نصیب ورنہ پھر مجبوری کا نام
شکر ہی ہوا کرتا ہے۔

میرے نزدیک اس عورت سے زیادہ کوئی اور بدنصیب
نہیں جو بے انتہا تعلیمیافتہ ہو جسکے پاس شادی کے وقت
لاانتہا دولت ہو۔ مگر جس کو اپنی حیثیت و کردار کا ذرا پاس
نہ ہو۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اسکے کارنامے اسکے گانے بجانے
اس کے رومانی خطوط، اس کے دلگداز افسانے کسی کام کے
اگر وہ اپنے شوہر کو سچی خوشی نہ پہنچا سکے۔ اگر کوئی عورت اپنی
فطرت پر قائم اور ایک صحیح عورت ہے تو ایک معصوم نوزائیدہ
ہستی کی پہلی آواز پر جو اولین مرتبہ اس دنیا میں داخل ہوکر نکالتی
ہے۔ اسکا ہر کارنامہ اسکا ہر گانا اس کی ہر تحریر اس کی ہر تصویر
اس کے لئے ایک خواب ہی نہیں ہوجاتی۔ بلکہ اسکے دماغ کو بھی
خیرباد کہدیتی ہے۔ حُسن چاہے وہ کسی انسان میں اصل سے کتنا
ہی زائد کیوں نہ ہو کھانے اور پینے کی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔
جب تک اس کے مصرف کو رائیگاں نہ کرلیا جائے۔ اور اس کی
عظمت کو تباہ نہ کردیا جائے۔ ایک مرتبہ ایک ایسی عورت کے
شوہر کو، جو سوائے گانے بجانے اور دیگر وقتی دلچسپیوں کے
دنیا کی کسی دوسری چیز کا نام بھی نہیں جانتی تھی، قید ہوگئی لیکن
قیدخانہ میں اس عورت کو مع ایک ننھے سے حسین بچہ کے اس
قیدی کا سچا سہارا اور اس بچہ کی پیاری ماں پایا گیا۔ اس کی
ہر گزشتہ دلچسپی ہوا میں اڑ چکی تھی، قیدخانہ میں اس کو اپنے شوہر سے
سچی محبت و ہمدردی دکھانے کا ایک ایسا موقعہ بن گیا تھا۔
جسکو دوسرے لوگ دیکھ کر قیدی کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔
لیکن ایسی مثالیں شاذ ہی ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں جو کمیاں
تھیں انکو محبت کے جذبہ نے پورا کردیا تھا۔ اور ان کے لئے کوئی
تکلیف، نقصان، کوئی قربانی [illegible]

نوٹس چارلس ڈکنس کی بیوی سے جب پوچھا گیا کہ اسکا پیارا نونہال
ہے۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے اس بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔
جسکو وہ اپنی گود میں لئے کھلا رہی تھی۔ اس احساس فرض
کا ہر جگہ پایا جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ عام لوگوں میں چونکہ
محنت ہی سے یہ پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے بیوی کو اس
بات کا احساس ہونا چاہئے کہ وہ ہر وقت شوہر کی امداد کے لئے
تیار رہے اور وہ امداد اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس کی ہر قسم کی ملکیت
کو اپنی ملکیت سمجھکر اس کی حفاظت کرے۔ روپیہ زیادہ سے زیادہ
فائدہ مدنظر رکھتے ہوئے خرچ کرے۔ کوئی چیز ضائع نہ ہونے
دے۔ شوہر کو ہر وقت مسرور رکھنے کی کوشش میں مصروف رہے
گھر کے کسی کام اور کسی انتظام میں شوہر کو کوئی فکر دامنگیر نہ ہونے
دے، وغیرہ وغیرہ اور یہ کام وہ عورت کبھی نہیں کر سکتی۔ جس کو
ابتدا ہی سے ان امور کیطرف توجہ نہ دلائی گئی ہو۔ اور جس نے
ان تمام فرائض کو صرف اتنی اہمیت دے رکھی ہو کہ ان پر غور
کرنا اس سے کسی پست درجہ والی عورت کا کام ہے، اُس کا
نہیں۔

جاہلیت، واقفیت کی اس کمی کا نام ہے۔ جو دراصل آپ
سے متعلقہ کام میں یا امور کے سلسلے میں آپکو ہوتی ہے، ایک
ہل چلانے والا، ان معنوں میں کبھی "جاہل" نہیں کہلایا جا سکتا جو
عام طور سے رائج ہیں۔ اس لئے کہ لکھنا پڑھنا اسکا کام ہی نہیں
ہے۔ وہ اپنا کام (ہل چلانا) خوب جانتا ہے۔ اس لئے جاہل
نہیں۔ اس طرح وہ عورت دراصل جاہل ہے۔ جو تعلیمیافتہ ہونے
کے باوصف یہ نہیں جانتی کہ شوہر کے لئے کھانا کیا اور کیسا تیار
[illegible] اچھا

گاتی ہے یا خوب لکھتی ہے۔ شاید اسکا پیٹ نہ بھر سکے۔ محبت
کرنے والے، ممکن ہے، ہوائی غذاؤں پر زندہ رہ سکیں، مگر
شوہر کو ٹھوس غذا کی ضرورت ہوتی ہے، دوسرے گھر جانیوالی
بچیوں اور بہنوں کو میرے خیال سے اتنی نصیحت کافی ہوگی
کہ مستقل صفائی، عمدہ کھانا، باترتیب مکان، منتظم گھر، تبسم ریز
چہرہ اور میٹھے میٹھے دو بول، لازوال دولتیں اور ایسا پیارا حسن
ہیں جنکے آگے سولہ سنگار اور دنیا کی تمام آرائشیں بھی شوہر کا دل
موہ لینے کے لئے ہیچ ہیں۔

خوش مزاجی۔ خوش مزاجی کی کسی انسان میں قبل از
وقت تصدیق کر لینا ذرا مشکل ہے۔ فی زمانا تبسمات حد درجہ
ارزاں ہیں۔ ان کا استعمال ہر موقعہ پر (جا و بے جا سب) جائز ہے
لیکن فوراً ہی تیوری کی بل، جبین کی شکنیں، عاشقوں کے لئے
خدا جانے کس چیز کے ترجمان بن جاتی ہیں۔ خوش مزاجی سے
نہ تو وہ بے تکلفی مراد ہے جو ہمہ شما کے لئے عام ہوتی ہے اور
نہ ہی وہ سنجیدگی مراد ہے جس سے طبیعت کے غرور کا پتہ چلتا ہے
ایسی خاموش طبیعت سے جو قریب قریب "غمگینی" کی مظہر ہو
جہانتک احتراز کیا جائے بہتر ہے۔ خاموش مرد ہی وبال جان
ہوتا ہے۔ پھر کسی ایسی ہستی کا، جس سے مرد کی تمنائیں وابستہ ہوں
جو ہر وقت کی رفیق ہو اور رات دن کی ہمدرد بنائی جاتے۔
کہنا ہی کیا ہے کیا وہ خوشی دراصل خوشی ہوگی کہ ایک جگہ رہو سہو۔
ایک جگہ کھاؤ پیو، اور ایک جگہ سو جاؤ، مگر گفتگو ایک لمحہ بھی
نہ ہو اور جو ہو بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر ہو۔ اگر آپ ذرا بھی
غور سے کام لیں اور انصاف کا کسی وقت خون نہ کریں تو اس
حد کے آثار سے آپکو اسی طبائع کا اندازہ کرا سکتے ہیں۔ اگر کسی

عورت کی طبیعت واقعی ایسی ہی ہے تو کسی نہ کسی وقت وہ اسکو یا تو اپنے کسی خاندان والے کے ساتھ ہی بروئے کار لائے گی اور یا ممکن ہے کہ کسی وقت آپ پر بھی اس ہتھیار کا حملہ کر بیٹھے۔ اور اس صورت میں کہ یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے شاید شادی کے بعد اسکا رویہ بدل جائے خاموشی و مایوسی کی یہ عمارت صرف بے وجہ ناخوشی پر کھڑی ہوتی ہے جسکے علل و اسباب کا پتہ کبھی نہیں چل سکتا۔ عورت کسی واہمہ سے قطعاً غلط طور پر برا مان جاتی ہے اور چونکہ وہ اظہار شکایت کا کوئی ذریعہ نہیں پاتی، اسلئے سوائے خاموش ہو کر کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اور کڑھنے کا علاج تو یہی ہے کہ اسکو معراج کمال تک یا تو پہنچا دو یا خود ہی پہنچ جانے دو لیکن بہر حال یہ بہتر ہے کہ ایسے مریض کو اپنے گھر ہی میں داخل مت ہونے دو۔ در اصل ایسی عورت سے شادی کرنا اگر مکمل نہیں، تو نصف دیوانہ پن ضرور ہے۔

جھگڑالو عورت بھی جہنم کی آگ سے کم نہیں۔ ہر وقت کا جھگڑا۔ اٹھتے بیٹھتے یہ شکایات کہ تم دیر سے کیوں آئے۔ تم بیوفا ہو۔ تم ہماری پرواہ نہیں کرتے۔ تم فلاں کے ساتھ اتنا کیوں رہتے ہو۔ یہ رات کے بارہ بارہ بجے تک کہاں کی تفریحیں ہوتی ہیں۔ گھر کے فلاں شخص نے آج مجھے ایسی بات کہدی، وغیرہ وغیرہ۔ اگر اتفاقیہ ہوں تو خیر حق بجانب ہیں۔ لیکن اگر روزانہ ان کا دفتر آپکے سامنے دھرا جانے لگے تو ایک وقت آپ کو اس اعادہ سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ اور شاید کوفت بھی، اگر بظاہر نہیں تو بباطن آپ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ اس عورت میں صبر و استقلال اور عقل و فہم کی کمی ہے، اور ایسے نتیجہ کے بعد آپکے اور بیوی کے درمیان سخت ناخوشگواری ہوگی ظاہر ہے۔ آپ بھی بیوی سے کھنچے کھنچے رہنے لگتے ہیں، اور وہ بھی آپ سے کشیدہ خاطر ہو جاتی ہے کیا یہی لطف زندگی ہے؟ کیا آپ ایسی عورت کو اس عورت پر ترجیح دے سکتے ہیں جو آسمانی مسکراہٹوں سے آپ کے نفس نفس کو جگمگا دے۔ جو آپ کی تمناؤں کو بالیدگی بخشدے جو آپکے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرے۔ جو آپکے آرام و تکلیف کا ہر وقت خیال رکھے۔ جب آپ گھر سے جائیں تو اس پر وہ ہی ملکوتی مسرت طاری ہو جو آپ کے گھر میں داخل ہوتے وقت اسکے چہرے پر دیکھتے ہیں۔

ضد کا مادہ ہر انسان میں بری چیز ہے۔ اور بالخصوص بیوی میں۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر فریقین میں سے کسی میں بھی یہ چیز موجود ہے۔ تو علاوہ اسکے کہ وہ آئے دن دلوں میں نفاق ڈالے۔ روز بروز بڑھتی بھی جائے گی۔ اور پھر کسی نہ کسی دن اپنا پورا پورا رنگ دکھائے گی۔ ضد سے کسی کو خاموش کر دینا کوئی نمایاں فتح نہیں بلکہ ایک قسم کی ذہنی بیماری ہے۔ بیوی میں اسکا موجود ہونا شوہر کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہو رہا ہے۔

یہاں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اگر گھر کی کسی خادمہ میں ضد کا مادہ ¼ ہے تو اس کی مالکہ میں اس کی مقدار بلا مبالغہ ½ ہوگی۔ آپ ایک خادمہ سے بھی کسی گھر کی مالکہ اور مالکہ کی اولاد کی طبیعتوں کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

بعض عورتوں میں فریب دینے کا مادہ ہوتا ہے۔ خواہ

مخواہ بات بات پر مچلتی ہیں ۔ اور کچھ نہیں تو غمگین صورت ہی بناکر اپنا اُلو سیدھا کرلیتی ہیں ۔ آہستہ آہستہ ان کی یہ حرکت ایک روز فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے ۔ ایسی عورتوں کا اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہ کہ ان کی گود اور ان کے ہاتھ کسی وقت بھی بچوں سے خالی نہ ہوں ۔ لیکن اگر اس طرح بھی حالت سدھرتی نظر نہ آئے تو پھر ایسی عورت کو تھوڑی بہت سزا دینا سخت ضروری ہے ۔

۸۔ حُسن ۔ اس چیز کا سب سے آخر میں تذکرہ کرنے سے یہ مراد نہیں کہ یہ سب سے کم ضروری ہے ۔ میرے خیال میں عورت میں اس کا ہونا سب سے مقدم ہے ۔ اس لئے کہ عورت محبت کی چیز ہے ۔ اور محبت حُسن ہی سے ہوسکتی ہے ۔ لیکن بہرحال بدصورت عورتیں اس لئے بھی ضروری ہیں کہ آخر بدصورت مرد کو کیا حق ہے کہ وہ کسی حسین عورت کو تحفۂ محبت دے ۔ بدصورت عورت اور بدصورت مرد، دونوں کا اجتماع ٹھیک، بالکل ٹھیک ——

ہاں تو بیوی کے اندر صرف صورت ہی کا حُسن نہ ہو، بلکہ اس کی سیرت میں بھی ہو ۔ یہ صحیح ہے کہ ہم حسین تصویر چاہتے ہیں ۔ حالانکہ اس کی اصلیت کاغذ اور پنسل کے چند خطوط سے زیادہ کچھ نہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ بیوی حسین وہی ہے جو بظاہر حسین ہونے کے ساتھ اپنا ہر عمل بھی حسین رکھتی ہو ۔ صرف جسمانی حسن سے وفا شعاری کی امید، نسوانی خوبیوں کا خیال، کرداری بلندیوں کا یقین اکثر ایک وہم و خواب سے زیادہ نہیں ۔ اور وجہ صرف اتنی ہے کہ ایک حسین چیز خواہ مخواہ آپ کی توجہات کا انجذاب اس چیز سے بدرجہا زیادہ کرلیتی ہے ۔ جو حسین نہ ہو ۔ اور اسلئے انتہائی حسین لئے کا زوال اگر ضروری نہیں تو کم از کم مشکوک ضرور رہتا ہے ۔

مرد اپنی طمانیتِ نفس کے لئے اپنی بیوی سے زیادہ حسین کوئی اور عورت تلاش کرلیتا ہے ۔ حالانکہ یہ نہایت قابلِ نفرت فعل ہے ۔ کیونکہ اس نے خود ہی اپنی بیوی سے پورے ایمان و ایقان کے ساتھ ایجاب و قبول کی تکمیل کی تھی ۔ اگر اسکے اندر اس کی طبیعت کے موافق حسن نہیں تھا ۔ تو اسکو پہلے ہی کوئی اور عورت تلاش کرنی چاہئے تھی ۔ اور اگر اس نے دولت و عزت کو حسن پر ترجیح دی ہے تو وہ شوہر انتہائی بے اصول انسان ہے، جو دولت و عزت دلانے والی ہستی کو کسی وقت بھی کوئی تکلیف پہنچائے یا پہنچنے دے ۔

لباس کے معاملہ میں حسین بیوی، بدصورت بیوی سے کم خرچ کرے گی ۔ مشاہدہ اور تجربہ بتلاتا ہے کہ وہ عورتیں جو حسین نہیں ہیں، لباس میں حد درجہ محتاط ہوتی ہیں ۔ اور اگر آپ کو کبھی اس بات کا تجربہ نہ بھی ہوا ہو تب بھی عقلِ سلیم اس بات کو ضرور قبول کرے گی، بہت کم حسین عورتیں ایسی ملیں گی جو یہ نہ جانتی ہوں کہ وہ واقعی حسین ہیں اور حسن کا یقین ہونے کے بعد بھی کیا وہ کبھی اس امر کی کوشش کرینگی کہ خواہ مخواہ بناؤ سنگھار کرکے وہ اپنے حُسن کو مصنوعی بنالیں یا چمکیلے زیورات اور قیمتی لباس میں اپنے قدرتی حُسن کو محدود کردیں ۔

آداب و فطرت کے لحاظ سے بہت کم حسین عورتیں ہوں گی جو ضدی اور ناسمجھ ہوں ۔ اور چونکہ ایسی حسین عورتیں ہر طور سے خود کو خوش رکھنا چاہتی ہیں ۔ اس لئے وہ آپ کے واسطے بھی ہر وہ سامانِ تفریح مہیا کریں گی ۔ جو آپ کے دل کو از حد مرغوب ہو ۔ اور یہ سامان تفریح و رغبت شادی شدہ حالت میں کیا تاثرات پیدا کرسکتے ہیں ۔ اسکا اندازہ انہی لوگوں

کو ہوگا۔ جو اس خود ساختہ فردوس میں سانس لے رہے ہیں بعض حسین عورتیں بے جان، سست اور بے روح ہوتی ہیں ——— بالکل موم کی گڑیوں کی طرح ——— حالانکہ حُسن وہی ہے جو صرف صورت ہی میں نہ ہو بلکہ ہر حرکت میں بھی ہو اور جس کی فطرت حسین اشیا ہی میں نہیں بلکہ بدصورت چیزوں میں ایک مستقل روح پھونک سکے۔ مہذب شرارتیں، دلفریب شوخیاں، لطف انگیز بے باکیاں، اور باادب گستاخیاں وہی دماغ سوچ سکتا ہے جو ایک حسین عورت کے پاس ہو۔

نسوانی حُسن کا منزلی زندگی میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شوہر کا یہ احساس کہ اس کی بیوی انتہائی حسین ہے اسکو ایک بے پایاں مگر پنہاں مسرت دیتا رہتا ہے جس سے وہ ہر روز جوان اور ہر وقت تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی محنت اور کوئی مصیبت اسکو افسردہ نہیں بنا سکتی۔

جب بڑھاپا آتا ہے اور فریقین کی باہمی محبت، آپس کی ہمدردیوں اور دُکھ درد کی شرکتوں سے انتہائی مستحکم ہوجاتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے حُسن اکثر بالذات ہوتا ہے۔ آپ کو ایک چیز انتہائی حسین معلوم ہوتی ہے، دوسرا اُس سے نفرت کرتا ہے۔ اور واقعتہً یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ قدرت نے پسندیدگی و ناپسندیدگی کے معاملے میں ہماری فطرتوں کے اندر یہ تفاوت پیدا کر دی ہے پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکو ہم یکساں طور پر بیک وقت پسند کرتے ہیں۔ اور ایک شوہر ہمیشہ اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ انہی چیزوں میں سے ایک چیز بالکل کامل جزو اسکے قبضے میں بھی ہے۔

انسانی زندگی میں ہزار ہا نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ جنکا خیال و شمار قطعی ناممکن ہے بعض حالتوں میں اکثر مرد پریشان ہوجاتے ہیں، ایسی حالتوں میں محبت کرنیوالی حسین بیوی ہر زخم کا مرہم بنتی اور ہر درد کی دوا معلوم ہوتی ہے۔ ایک حسین بیوی اپنے شوہر سے جس قسم کی محبت کرتی ہے وہ اس محبت سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے، جو ایک غیر حسین عورت کو اپنے شوہر سے ہو حسین عورت کا جذبۂ محبت اس لئے تیز ہوتا ہے کہ اُسے خود مرد کی طرف سے بے پایاں محبت ملنے کا یقین ہوتا ہے۔ مگر بدصورت عورت جانتی ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ مرد اسے اپنے جذبات کو تمام قوت و صلاحیت کے ساتھ چاہے۔ اس لحاظ سے حسین عورت اور حسین مرد کی محبت کا شعلہ روز بروز تیز ہوتا رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے تیز ہوتا ہے۔ اس کی روشنی بھی بڑھتی رہتی ہے

ایک مرد کسی وجہ سے ایک عورت سے شادی کرتا ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اسکے لب ان حروف سے آشنا ہوتے ہیں کہ "میری بیوی حسین نہیں"۔ ایسے مرد کو میں نہیں سمجھ سکتا کہ کونسی سزا دینی چاہئے، اور اس سے بڑھ کر اگر وہ بیوی کے ساتھ برتاؤ بھی سخت کرے تو حقیقتہً قابل نفریں ہے۔ ایسی حالتوں میں مردوں کو کوئی راستہ بنانے اور کوئی صحیح رویہ پیدا کرنے میں غیر معمولی غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے جس میں اکثر ان باتوں کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔ جن کی تکمیل بھی ان کے فرائض میں سے ہے۔ اسلئے بہتر یہی ہے کہ حتے الوسع کسی ایسی وجہ کو انکے التفات میں در خور نہ ملے جو آخر میں یا تو ان سے انصاف کا خون کرائے

یا فرائض کی طرف سے لاپروا بناتے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب آپ ایسی عورت سے شادی ہی نہ کریں جو آپ کی نظروں میں حسین نہ ہو۔ اس کے لئے آپکو اپنی نظروں کے استفسار کی بڑی ضرورت ہوگی۔

اپنے اس بیان کے اختتام پر اگرچہ میں اور موضوعات پر بھی روشنی ڈالنی چاہتا تھا۔ مگر محسوس کر رہا ہوں کہ باوجود اسکے کہ وہ افعال شنیعہ جن پر میں کچھ قلم فرسائی کرنا چاہتا تھا۔ مہذب طبقے میں نظر آئے ہیں لیکن اُن کے اظہار و بیان کے لئے زبان کا دامن تہی مایہ ہے۔ کیا یہ حقیقت قابل افسوس نہیں کہ ہمارے مہذب نوجوانوں میں وہ حرکات رائج ہوں جنکے لئے ان کی زبان اپنی بے بضاعتی کا افسانہ بیان کرنے لگے۔ بہر حال چونکہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہاں تذکرۃً ان کا بیان بھی کر دوں اسلئے زبان اور مہذب زبان مجھے جتنی بھی اجازت دے سکے گی میں اظہار مطلب کی کوشش کروں گا۔

میں مانتا ہوں کہ ۹۹ فیصدی واقعات میں جہاں نفس کو حیوانی طریقوں پر محظوظ کیا جاتا ہے، عورت کو فریب دینے کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ ہوس، نیکی کا فقدان اجرم کا ارتکاب اور اس سے ملتی جلتی چیزیں بسا اوقات بعض مردوں بلکہ اکثر مردوں کو حرامکاری کی طرف لے جاتی ہیں۔ دیگر حالتوں میں ایک مرد ایک عورت تک پہنچتا ہے، اور اظہار محبت سے اس مقصد کی تکمیل کی درپردہ کوشش کرتا ہے جو اس کیلئے اپنے اندر چاہے کتنی ہی لذتیں رکھتا ہو، مگر عورت کو بلا شک و شبہ بربادی کے غار میں گرا کر اس کی تمام زندگی کو ایک مستقل مصیبت بنا دیتا ہے۔ مرد کو ہم گالیاں بھی دے سکتے اور دیتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان نہیں، لیکن کیا عورت کی طرف سے ایسی غلطیوں کے ارتکاب میں کوئی درپردہ سامان جرأت نہیں ملتا۔ کیا وہ مرد کی برابر کی شریک نہیں ہوتی۔ اس لئے کیا مرد کے مقابلہ میں عورت کا فرض نہیں ہے کہ وہ خود بھی اپنی حفاظت کرے۔ اور ایسے مرد کو کبھی اتنی جرأت نہ ہونے دے کہ وہ اس کی عصمت و عفت پر حملہ کرنا تو درکنار حملہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاسکے۔ حتےٰ کہ وہ کسی وقت نگاہ بھر کر دیکھ لینے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ ان کو یہ احساس واقعی ہونا چاہئے کہ ان کا کردار صرف ان ہی کی ذات تک محدود نہیں۔ بلکہ اس میں ان کا خاندان، گھر والے اور تمام جنس بھی شامل ہے۔ زلیخا نے جو کچھ کیا لوگوں کی نظر اب اُس پر نہیں بلکہ زلیخا نے عورت کی جس کمزور فطرتی کا مظاہرہ کرایا اُس سے مرد آج بھی ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔

کسی مرد کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ عورت کے جذبات کے ساتھ کھیلے۔ اور اُس کو ایسے وعدے کے جال میں پھنسا دے جو گویا بقول اس کے کبھی ٹوٹنا ہی نہ جانتے ہوں۔ یہ خام خیالی کہ فلاں عورت آپ سے محبت کرتی ہے۔ اسی وقت جائز ہوسکتی ہے جب آپ بھی اسکو اسی طرح چاہیں۔ اگر آپ کے دل میں یہ تمنا کسی وقت بھی جڑ پکڑ گئی کہ کوئی عورت آپ سے بہ طور محبت کرے تو یقین جانئے کہ آپ کی انسانیت کا خاتمہ ہوگیا۔ آپ اگر کسی عورت سے ملتے ہیں تو آپ واقعی دھوکا دیتے ہیں شادی کا کسی وقت بھی وعدہ نہ کریں۔ لیکن کم از کم عورت کے خیال میں آپ کا ہر عمل اس حقیقت کا ترجمان ہوگا کہ آپ اسکو واقعی دل کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اسے دھوکا دے

رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے تعلقات زیادہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی ملاقاتوں کا نتیجہ اس عورت کے لئے سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں اور آپ اپنے سابقہ تعلقات جو دوسری جگہ قائم ہیں۔ اس عورت سے بصیغۂ راز رکھتے ہیں تو آپ اس عورت پر ظلم اس کے ساتھ نا انصافی اور اپنے ضمیر کو سیاہ و تاریک کر رہے ہیں آپ خدا کی اُن نعمتوں کا کفران کر رہے ہیں جن کی وجہ سے آپ کو اتنا موقعہ ملا کہ آپ کسی معصوم ہستی کی عفت پر ڈاکہ ڈالیں اور خود کو فتحمند تصوّر کریں۔ ہر دل رکھنے والا انسان آپ کو ذلالت و ملامت کی نظروں سے دیکھے گا۔ عورت کی ان کمزوریوں کا لحاظ بہر حال مرد کو رکھنا چاہئے۔ اگر تھوڑی دیر کو یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت جب آپ کسی عورت کی محبت میں سرشار تھے۔ نوشتۂ تقدیر سے یا کسی اور وجہ سے آپ کی کسی دوسری عورت سے ملاقات ہو گئی، اور اس دوسری عورت پر بھی آپ نے یا تو خود یا جواباً محبت کا اظہار کر دیا، تو کیا آپ انصاف سے بتلا سکتے ہیں کہ آپکا یہ فعل مستحسن ہے۔ اور آپ کے اس عمل میں کسی غلطی کا امکان نہیں۔ میرے نزدیک تو یہ گناہِ عظیم ہے۔

داستان بہت طویل ہو گئی، اور اب بھی محسوس کر رہا ہوں کہ جو کچھ چاہتا تھا وہ سب نہیں کہہ سکا لیکن یہ چیز کچھ تسکینِ قلب کر رہی ہے کہ

یار زندہ ــــــــ صحبت باقی

(ماخوذ)

جناب نسیم حجازی

غزل

کہتے ہیں جس کو وقت گزرتا چلا گیا　　اک سایہ تھا جو آپ ہی ڈھلتا چلا گیا

سمجھے تھے جس کو زندگیٔ دلفریب ہم　　ایسا خمار تھا جو اترتا چلا گیا

فرصت نہ انقلاب سے پائی کہ سوچتا　　بنتا چلا گیا کہ بگڑتا چلا گیا

دنیا کے رنگ تھے کہ بدلتے گئے نسیم　　اپنا نصیب تھا کہ بگڑتا چلا گیا

جناب عزیز احمد عزیز متعلم بی۔اے

نظم

التجا

"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"

ایک مدت سے ہے خاموش رباب ہستی

کروٹیں لیتا ہے سو رہ کے شباب ہستی

حامل قصۂ غمگیں ہے کتاب ہستی

آلگا دامن ساحل سے حباب ہستی

"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"

جلوۂ ہوش کو بیگانہ بنانے والے

زندگانی کو اک افسانہ بنانے والے

حسن کی شمع کو پروانہ بنانے والے

مطرب روح کو مستانہ بنانے والے

"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"

نغمے بے چین ہیں مدہوش بنانے کے لئے

بزم کی بزم کو بیہوش بنانے کے لئے

شاخ امید کو گلپوش بنانے کے لئے

منظر ہوش کو بیہوش بنانے کے لئے

"اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز"

جناب نذیر میرزا برلاس بی۔ اے

"منثورات"

موسم بہار کے آوارہ پرندے دریچہ میں آکر مجھے گیت سناتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ اور خزاں زدہ زرد زرد پتے جو نغمے نہیں رکھتے اک آہ کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے وہاں گرتے ہیں اور ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

صبح کا سہانا وقت ہے۔ میں دریچہ سے لگا کھڑا ہوں، دنیا ایک نو وارد کی طرح سامنے سے گزرتی ہے۔ دم بھر کو ٹھہرتی ہے۔ اور واقف کارانہ انداز سے تسلیم کو جھکتے ہوئے اپنی راہ لیتی ہے۔

میری آرزوئیں دیوانی ہیں۔ میرے آقا! وہ تیرے نغموں کے دوران میں چلا اٹھتی ہیں۔ مجھے صرف سننے کی توفیق دے۔

"لڑکھڑاتے پتوں کی سرسراہٹ طوفان کا جواب ہے۔ لیکن تم اتنے خاموش۔ اتنے بے حس و حرکت کیوں ہو؟"

"میں صرف ایک پھول ہوں"

میرے دل کی لہریں دنیا کے ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ اور آنسوؤں کے قطروں سے یہ الفاظ لکھ دیتی ہیں "ہم تمہیں چاہتے ہیں"۔

پرندے کی آرزو ہے کاش میں ابر ہوتا۔
ابر چاہتا ہے وہ اک پرندہ ہوتا۔

آبشار گا رہا ہے۔
"مجھے آزادی ملتے ہی نغمے دے دئے جاتے ہیں"

میرا دن بیت چکا۔ میں اُس ناؤ کی طرح ہوں جو شام کے دھندلکے میں خلیج کے کنارے سے لگی لہروں کا نغمۂ رقص غور سے سن رہی ہے۔

ننھی کلی چٹکنے میں چلائی "پیاری دنیا! مرجھا نہ مت۔"

زندگی ایسی حسین بنایئے جیسے بہار کا پھول اور موت جیسے اک خزاں زدہ زرد پتہ۔

طاقت نے تنتے ہوئے دنیا سے کہا "تم میری ہو"
دنیا اسے فریب دے کر اپنے تخت کے قریب لائی اور زنجیروں سے جکڑ دیا۔
محبت نے دنیا سے کہا "میں آپ کی ہوں"
دنیا نے اس کی پیشانی چومی اور گھر کی رانی بنا لیا۔

راہ چلتے چلتے ٹھہر ٹھہر کر پھول نہ توڑیئے۔ گزرتے جایئے۔ پھول آپکے لئے اپنی تازگی راستہ بھر قائم رکھیں گے۔

اندھیری رات! میں تیرے حُسن کو اُس محبوبہ کے حُسن کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کے ہاتھوں میں ابھی کافوری شمع گل ہوئی ہے۔

میں اپنے دل کی غمناک تاریکیوں کی اوٹ میں اک آہٹ سی سن رہا ہوں ——— لیکن کوئی نظر نہیں آرہا۔

یاسمین کے پھول سے بارش کے قطرے نے سرگوشی کی "مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں رکھ لیجئے"۔
پھول نے اک آہ کی اور مرجھا کر زمین پہ آرہا۔

(ٹیگور)

افسانہ

صاحبزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔اے

گناہ کے پجاری

ابھی تک وہ اُن فریبوں سے ناآشنا تھا جن کی گود میں اُسے پرورش دی گئی تھی۔ اُسکا خمیر جھوٹ۔ فریب اور ریا کاری کا ایک ایسا غلیظ مرکب تھا۔ کہ اکثر رات کو اس کے چھوٹے سے سینے سے ایک چیخ بلند ہوتی۔ جو اُسے کسی کا گلا کاٹنے کسی معصوم لڑکی کو ورغلانے یا کسی پرہیزگار کا تقویٰ توڑنے پر آمادہ کرتی۔ مگر یہ صرف احساس تھا۔ ابھی تک وہ اس سیڑھی تک نہیں پہنچا تھا۔ جہاں اُسے یہ کام روزمرہ کی ضروریات معلوم ہوسکیں۔ وہ ان کے تصوّر سے بھی ہچکچاتا تھا۔ وہ اِن خیالات کے طولانی سلسلے کو منقطع کرنے کی ازحد کوشش کرتا۔ کروٹیں لے لیکر دھندلے مکانوں کی چھنیوں پر نگاہیں گاڑ دیتا کہ شائد وہ اِس دھن میں سو جائے۔ وہ گاتا کہ شائد اس سے روح کو چین نصیب ہو، اُٹھ اُٹھ کر اِدھر اُدھر دوڑتا۔ کودتا۔ پھاندتا۔ مگر دماغ میں جیسے اُن تصورات نے پنجے گاڑ دئے تھے، اور اُن پنجوں کی نکیلی شاخیں اُس کی کھوپری کی ہڈی ہڈی کھرچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُسکا لرزتا ہوا دل لمحہ بھر کے لئے رُک جاتا، مگر پھر اُس کی روح سے پھر وہی فریاد بلند ہوتی۔ ایک ٹیس سی۔ اور جس چیز پر نگاہ ڈالتا۔ وہ روح کی آواز کو دہراتی ہوئی معلوم ہوتی۔ ایک دن تو اُسے خود اپنے تصور [illegible]

خون سے دھوؤ!"—— اور پھر یہ تمام تصورات اچانک اُسکے دماغ سے غائب ہوجاتے اور وہ کالج کی مسرور فضاؤں میں کھو جاتا، آدھی رات گئے اُسے نیند آتی اور دن چڑھے اُٹھ بیٹھتا۔ اُسکا باپ ڈاکو تھا۔ اور اُس کی ماں اُن "مقدس" خواتین میں شامل تھی۔ جو معزز گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو ہوس پرستوں کے آستانوں پر جبہ سائی کرنے پر مجبور کرتی ہیں اُسکا گھر گناہ اور ریا کی درسگاہ تھا۔ رات اُسکا باپ اکثر دو بجے واپس آتا تھا۔ اُس کی ماں اُس سے کوئی سرگوشی کرتی، الماری کے کھلنے کی آواز آتی۔ اور پھر اُس کا باپ مصنوعی طور پر کھانستا اور ایک مخصوص انداز سے جس میں سکون واطمینان کو مجتمع کرنے کی کوشش کی ہوتی پوچھتا۔

"کیوں بیگم۔ اصغر تو سوگیا ہے نا؟"

اور پھر اصغر کو احساس ہوتا۔ کہ اس کے باپ کی زندگی کتنی اچھی ہے، سکون واطمینان جوان روح کے لئے گناہ ہے مہم پسند طبیعتیں اور مضطرب روحیں اس دنیا میں ایک ایسا بے نام سا سکون حاصل کرلیتی ہیں۔ جن کی تعریف کرنا ایسا مشکل ہے جیسے روح کی حقیقت تک پہنچنا۔

پھر وہ رات کو اپنے کمرے کے دروازے کے پاس [illegible]

اس کی ماں آتی ہوئی نظر آتی۔ اس کے پیچھے کوئی برقعہ والی عورت ہوتی اور جب وہ نزدیک آتے تو نوجوان بے تابی سے بڑھ کر برقعہ والی کا برقعہ دور کر دیتا۔ لڑکی سہمی ہوئی نظریں زمین پر گاڑے کھڑی رہتی۔ وہ حیران ہوتا کہ اس لڑکی نے کیا قصور کیا ہے۔ اور اس لڑکے کا کیا حق ہے کہ ایک پردہ والی عورت کی اس طرح بے آبروئی کرے ــــــ؟

سب کچھ وہ دیکھتا۔ مگر نہ اُسے باپ سے نفرت تھی، نہ ماں سے اجتناب، وہ ان دونوں کی پوجا کرتا تھا۔

ایک دفعہ اُسے کالج گیلری میں ایک سوا پڑا ملا تھا۔ اور اس نے تلاش کے بعد سوا اس کے حقیقی مالک کو دیدیا تھا اور جب اس کے والدین نے یہ واقعہ اس کی زبانی سنا تو اُسے "کمزور عورت کی طرح بزدل۔ گیدڑ" کا لقب دیا گیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُسے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کاموں میں والدین کا ہاتھ بٹائے۔ مگر پھر اس کی روح میں وہی جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ جس سے آدھی آدھی رات تک اُس کی آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ اسکا دل لرزتا رہتا تھا۔ اُس کی رگیں کانپتی رہتی تھیں!

ایک شب وہ نشاط سے "دیوداس" دیکھ کر آرہا تھا کہ راستے میں اُسے اپنا باپ ملا۔ سیاہ عبا میں چھپا ہوا سر پر ایرانی ٹوپی۔ ہاتھ میں عصا۔ اصغر حیران رہ گیا۔ بڑھ کر پوچھا۔

"ابا کہاں جا رہے ہو؟"

"چلو آج میرے ساتھ آؤ" اصغر کے باپ نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اصغر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ اُس کے دل میں کئی عجیب [illegible]

کسی کو قتل کرنے؟ کسی کا گلا گھونٹنے؟ کسی کا خون کرنے؟ کسی کو دھوکا دینے؟ کہاں جا رہا ہے؟ ان کاموں کے سوا اور اُس کا مقصد ہو ہی کیا سکتا ہے! اور میں؟ میں کیا کروں؟ میں کیا کرونگا؟ مجھے تو کلیجے میں کانٹے سے چبھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک جلن سی ہے، جو ہڈیوں کے گودے تک کو بھونتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایک خلش سی ہے جو جسم کے روئیں روئیں کو چھلنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ ابا۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟" ــــــ

آخری الفاظ اس نے ذرا اونچی آواز میں کہہ ڈالے۔ بوڑھے ڈاکو نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا "چلو۔ آج تمہیں اپنے پیشے کا پہلا سبق دوں" ــــــ اور اصغر کا دماغ چکرا گیا۔ اُس نے باپ کو روکتے ہوئے کہا "ابا! مجھے چھوڑ دو۔ میں جاکر کیا کرونگا؟"

باپ مسکرایا۔ اور اصغر کو بازو سے کھینچتے ہوئے بولا۔

"یہ آثار اچھے نہیں اصغر بیٹا! چلو۔ دُنیا شرافت کی دشمن ہے پاکیزگی اخلاق زہر ہے، جو انسان کا جینا محال کر دیتی ہے۔ میں بھی اپنی جوانی کے دنوں میں شریف رہ چکا ہوں۔ میں نے بھی زندگی کو زہد اور اتقا کے رنگ میں رنگنا چاہا، مگر بے شرمی بے حیائی نفس پرستی اور بد اخلاقی کی بارش نے آن کی آن میں اس رنگ کو دھو دیا۔ اور نیچے سے وہی دنیا والوں کی زبان میں ناپاک، غلیظ۔ ہوس پرست زندگی نکل آئی۔ مسکراتی ہوئی انسان کی موہوم امیدوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی ــــــ میں نے دیکھا۔ کہ یہ زہد کے دیوتا۔ شرافت کے پجاری، مذہب کے علمبردار [illegible]

نیتریوں کے لباس میں شعلے، خدائی فوجدار ــــــ اور پھر اصغر بیٹا! میں نے ان سب سے بڑھ کر اس میدان میں قدم رکھا۔ سینکڑوں کی جانیں تباہ کیں۔ ان گنت معصوم لڑکیوں کی عصمتوں پر ڈاکے ڈالے۔ بیشمار گھر گھروندے بنا ڈالے۔ چوریاں کیں۔ راہزنی کی۔ اب مزے سے گزران ہو رہی ہے کوئی فکر نہیں۔ ہزاروں روپے بنک میں جمع ہیں۔ لاہور کی سوسائٹی کا جزو لاینفک ہوں، میرے بغیر ہر جلسہ، ہر میٹنگ ہر پارٹی سنسان سی معلوم ہوتی ہے۔ صرف اس لئے کہ میں مجرم ہوں، چلتا پرزہ ہوں، اگر میں شریف ہوتا۔ تمہاری طرح اگر میں ان کاموں سے ہچکچاتا۔ تو سوسائٹی مجھے ٹھکراتی، لوگ مجھے کمزور کہتے ــــ کمزور اور بزدل ــــ جس طرح آج میں نہیں کہہ سکتا ہوں!"

اصغر حیران سب کچھ سنتا چلا گیا۔ موٹروں کی گھرر گھرر گھوڑوں کے سموں کی کھٹ کھٹ، سائیکلوں کی فرر فرر سے بے خبر وہ باپ کی انوکھی نصیحتوں کو سنتا رہا۔ اسکا دل یہ فیصلہ کرنے سے معذور تھا کہ وہ کونسی راہ پکڑے ــــ مگر آج کی رات باپ کا ساتھ ضرور دینا تھا۔ ورنہ وہ اُسے پھر "کمزور اور بزدل" کہے گا۔

وہ چلتے گئے۔ اور آخر ایک عالیشان کوٹھی کے پاس پہنچے۔ اصغر کا باپ جھاڑیوں کی آڑ میں لیٹتا کھسکتا۔ دیوار سے چمٹتا۔ برآمدوں میں رینگتا جا رہا تھا۔ اور اصغر اس کے پیچھے پیچھے اپنے باپ سے سبق لے رہا تھا۔ گناہ کی ابجد یاد کر رہا اس کے جسم پر خراشیں پڑ گئیں۔ انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ ٹھوڑی زمین پر لگ کر چھل گئی۔ مگر وہ باپ سے "کمزور اور بزدل" کے القاب نہیں سننا چاہتا تھا۔ اور آخر وہ ایک کمرے میں پہنچے ایک سیٹھ سو رہا تھا۔ بے خبر! ــــ اصغر کا باپ بڑھا سیٹھ کے منہ میں ایک رومال ٹھونس دیا۔ اور پھر ایک رسی سے کس کر باندھ دیا۔ تجوری کو ایک آلے سے توڑا۔ اور روپوں کے ڈھیر نوٹوں کے گٹھے اپنی جیبوں میں ڈالتا اصغر کو اشارہ کرتا یہ جا وہ جا نشاط سے دوسرا شو دیکھ کر آنیوالے تماشائیوں میں مل گیا

اصغر نے دیکھا کہ اُس کے باپ کے چہرے پر ایک قسم کی طمانیت اور تسلی سی ہے، اور اصغر۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

اف۔ جس وقت سیٹھ اپنی آنکھوں سے اپنی عمر بھر کی کمائی لٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اور اصغر کا باپ۔ روپوں کو دونوں ہاتھوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر اپنی لمبی جیبوں میں ڈالتا جاتا تھا! اصغر کی آنکھوں میں دھند سی پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں پولیس، لاٹھی، ہتھکڑی، جیل، چکی۔ پھانسی کو ایک ایک کر کے لہراتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر جب وہ بھیڑ میں آکر ملگیا۔ تو اُسے ہر شخص پر خفیہ پولیس کے سپاہی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ سب سے الگ چل رہا تھا۔ تار کے کھمبوں کی اوٹ لیتا۔ سڑک کے درختوں کے پیچھے چھپتا۔ میکلوڈ روڈ کے دونوں جانب کی سبز گنجان باڑ کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ اور اُسکا باپ! ــــ اُسکا باپ ایک دکان سے شراب خرید رہا تھا۔ اصغر کی روح چیختی ہوئی معلوم ہوئی۔ اُس کے جی میں آئی کہ پکار پکار کر لوگوں کو بتا دے کہ میں مجرم ہوں میں ڈاکو ہوں۔ مگر یہ سب الفاظ اس کے سوکھے ہوئے حلق میں آکر اٹک گئے۔

آخر وہ گھر پہنچے۔ اُس کی ماں موجود نہ تھی۔ اصغر باپ سے کچھ بات کئے بغیر اپنے کمرے میں آلیٹا۔ وہ سوچنے لگا۔

"کہ چوری کرنا کتنی مشکل بات ہے۔ مگر کس قدر فرحت بخش۔ اب اگر ابا دس سال تک بھی کسی کی چوری نہ کرے تو ہم ایک نواب سے بڑھ چڑھ کر زندگی بسر کرسکیں گے۔ مگر اکر بڑی چیز نہیں۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے نا! ہم اس دنیا میں ماتم کے لئے تو نہیں بھیجے گئے۔ خوب ابا۔ خوب کیا" ——— مگر پھر اسے خیال آیا ——— وہ بیچارا بیٹھ۔ اس کی حالت کیا ہوگی؟ آخر وہ بھی انسان تھا۔ اس نے اپنی محنت سے سب کچھ کمایا تھا۔ وہ کیوں لوٹا گیا؟"

اچانک اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس کی ماں دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اصغر فطیماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹا" ماں نے آگے بڑھکر کہا "مبارک ہو!"

اصغر اس مبارکبادی کا مطلب سمجھ گیا۔ شرمایا۔ مسکرایا اور سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ یکایک اُسے اپنے پاس کسی غیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ دروازہ بند تھا۔ اور اُس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ نوخیز ——— نگاہیں فرش پر گاڑے ہوئے، پسینے سے شرابور، کانپتی ہوئی پلکوں پر دو چار آنسو بھی لرز رہے تھے۔ اصغر حیران رہ گیا۔ اُسکا کلیجہ پھیل کر سمٹا۔ اور اُس کے جسم کا تمام خون اُس کی آنکھوں میں آگیا۔ اسے اپنے سر کے گرد دوزخی آگ بھڑکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر زبان پتھر کا ٹکڑا بنکر رہ گئی۔ اُسے لڑکی کی ایک ہچکی بھی سنائی دی۔ اصغر کو رحم سا آگیا۔ اُٹھا اور بولا۔

"تم رو کیوں رہی ہو لڑکی؟"

لڑکی حیران رہ گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ اف اصغر

ہونٹ۔ گول گلابی چہرہ۔ موزوں قد۔ اٹھتی جوانی۔ اس نے اصغر کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ اصغر نے چیخنا چاہا۔ اُس کی روح ایک پہاڑ تلے دبتی معلوم ہوئی۔ مگر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"تم یہاں کیسے آئیں لڑکی؟"

"آپ نے جو بلایا ہے" لڑکی نے جواب دیا۔ مگر ایسی آواز میں جس میں مظلومیت۔ دردمندی اور رحم کی التجا کانپ رہی تھی۔

"میں نے بلایا ہے؟" اصغر حیران رہ گیا۔ "میں نے تمہیں نہیں بلایا بھولی لڑکی مجھے تم سے کیا کام!"

لڑکی قدرے آگے بڑھی اور فرش پر بیٹھ گئی۔ اصغر پلنگ پر ذرا پرے کھسک گیا۔ ایک غیر لڑکی کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر اسے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو مجھ پر رحم کیجئے۔"

"کیسا رحم؟ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں؟"

"مجھے میرے گھر پہنچا آیئے۔"

اور لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ادھر وہ مسکرائی اُدھر اصغر کا دل اچھلا۔ وہ پلنگ سے اٹھا۔ اور پوچھا۔

"تو چلو۔"

مگر اب اسے اندر ہی اندر کوئی احساس پکار پکار کر کہہ رہا تھا "اصغر اسے جانے نہ دینا" اور خدا جانے کس لئے۔ کس بات سے مجبور ہو کر۔ اصغر نے اُس کی انگلی اپنے ہاتھ میں لی۔ بجلی کی ایک سخت لہر اُس کی رگوں میں دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نیند سی بھر گئی۔ اسے ایک انگڑائی بھی آئی۔ اس نے ایک آہ بھری

دروازے کے پیچھے اُسے اپنے والدین کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ قدرے سہم گیا۔ مگر وہ اُس لڑکی کو نگل جانا چاہتا تھا کتنی لطف انگیز اور وجد آمیز خصوصیتوں کی مالک تھی وہ لڑکی ——— صبح ہوگئی۔ لڑکی باہر نکلی۔ اصغر نے دیکھا کہ اس کی ماں لڑکی کو پانچ روپوں کا ایک نوٹ دے رہی ہے۔ وہ مسکرایا اور اپنا سر تکئے پر رکھ کر سوگیا۔

ایک سال گذر گیا۔ اصغر نے اپنے باپ کی کارکردگیوں کا ریکارڈ توڑ دیا۔ گناہوں کا زنگ اس کے احساسات پر اس سختی سے چھا گیا۔ کہ اس نے چوریاں کیں۔ بنکوں میں چھاپے مارے سیٹھوں کے پیٹوں میں خنجر بھونکے۔ بیواؤں کی پونجیاں اڑائیں اور زندگی کو ایک کھلونا سمجھ لیا۔ اسکا باپ اُسی طرح اپنے کام میں مشغول رہا۔ اور اُس کی ماں اسی طرح اپنے فرض میں مگن رہی۔ خدا انہیں ایک بے حس وحرکت لوز کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ خدائی اُن کے لہو ولعب کا ایک میدان تھی۔ جس میں رکاوٹیں نابود تھیں۔ اور پھر غضب یہ کہ اصغر لاہور کی معزز ترین کلب کا پریذیڈنٹ بھی تھا۔ ایک کروڑپتی اور ایک کروڑپتی کا بیٹا! ایک ایسی خاتون کا لڑکا جس کا اثر لاہور کے تمام شریف گھرانوں پر چھایا ہوا تھا۔ اصغر بازار سے گزرتا تو لوگ اُسے سلام کرتے، عورتیں جھک جاتیں۔ اصغر مسکراتا ہوا چلا جاتا۔ اُسے اُن نیک اور متقی بندوں پر رحم آتا جو ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکائے، داڑھیاں بڑھائے مسجدوں میں خدا کی خوشامدیں کررہے تھے۔ اور اُن پجاریوں کی

قدموں سے سر رگڑ رگڑ کر اپنا جیون نشٹ کر رہے تھے!

اُسے یہ سنسار گناہ کا ایک طویل جو عریض سمندر معلوم ہوتا۔ جس پر وہی کشتی چل سکتی تھی۔ جو گناہ کے چپوؤں سے چلائی جارہی ہو، شرافت نیکی۔ اور پرہیزگاری کی کشتیاں اس سمندر میں کچھ دیر تیرتیں مگر اچانک غرق ہوجاتیں۔ اور سطح آب پر بہتے تسبیحیں۔ خرقے۔ سجادے تیرتے ہوئے چھوڑ جاتیں۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ اصغر کی ماں اپنے بیٹے کیلئے ایک ایسی لڑکی لینے گئی۔ جسکا غرور بڑے بڑے کجکلاہوں کی التجاؤں کو روند چکا تھا۔ اور جسکا استغنا بڑے بڑے دماغ والوں کا سر غرور جھکا چکا تھا۔ اسکا باپ اس کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔

اصغر بیٹا! کتنی اچھی زندگی ہے تمہاری۔ گناہ اور ثواب کا احساس روح کے لئے موت ہے بیٹا! گناہ کیا ہے؟ ثواب کیا ہے؟ ڈھکوسلے۔ خدائی فوجداروں کی خود غرضانہ موشگافیاں ثواب حاصل کرنے والوں کو دیکھتے ہو؟ بے چارے بدحال نچلے طبقے کے ذلیل لوگ، اور ہم ——— بتاؤ۔ کون ہے۔ جو ہماری عزت نہیں کرتا۔ یہ ثواب کی گٹھڑیاں اٹھانے والے زاہد لوگ بھی ہمیں سلام کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہے نا، یہی کہ گناہ اس دنیا کی بنیاد ہے۔ اگر گناہ کا وجود نہ ہوتا تو بابا آدم جنت ہی میں پھنسے رہتے۔ فطرت کی اس نئی اور انوکھی جنت کو نہ دیکھ سکتے۔ یہ جنت ہے۔ اصغر مگر کئی بدبختوں کے لئے دوزخ بھی ہے۔ مگر دنیا تو موم کی طرح نازک چیز ہے،

شرافت کی ہوا میں سانس لے چکا ہوں۔ اُسوقت یہ جہان
میرے لئے بھی دوزخ تھا۔ اور اب ——— اب جنت
سے کچھ بلند ہی ہے۔ ہاں۔ اگلی دنیا کا احساس کبھی کبھی ڈستا
ہے۔ مگر کون جانے اگلی دنیا میں کیا ہوگا! آخر وہ ہستی جسے
لوگ خدائے رحیم اور رب کریم کہ کر پکارتے ہیں، اپنی رحمت
کو کام میں تو لائے گی۔ اور اگر نہ لائی۔ تو دوزخ سہی، جل مرینگے
بس!

جب حشر کا دن آئے گا
اُسوقت دیکھا جائے گا

ہاں تمہیں اپنی شرافت کی داستان بھی سنا دوں، تاکہ
کہیں تم پھر اس غلیظ خطے میں نہ پھنس جاؤ۔ میں لاہور میں پڑھا
کرتا تھا۔ طالبعلمی کے زمانے میں میری شادی ہوگئی۔ کالج کا ہر
فرد میری شرافت اور سادگی کی تعریف کرتا تھا۔ اور میں واقعی اس
قدر شریف تھا۔ اس قدر سادہ اور متین۔ کہ آج وہ دن یاد کرکے
مجھے تعجب ہوتا ہے، ہاں۔ تو سب میری تعریف کرتے تھے۔ مگر ان کی
تعریف میں ایک قسم کا مزاح سا تھا۔ ایک نفرت انگیز لہجہ۔ جس
میں کئی شریر قہقہے درپردہ گونج رہے ہوں۔ کوئی ایسا ہفتہ نہ
تھا جس میں میری چوری نہ ہوجاتی ہو۔ کبھی گھڑی گم ہے تو کبھی ٹوپی
غائب، کبھی سوٹ نہیں تو کبھی بوٹ نہیں۔ اور کبھی بٹوا کی تلاش
ہورہی ہے لڑکے مجھ سے ہمدردی کرتے، اور بیٹا! انہی ہمدردوں
میں چور بھی ہوتے، میرے خیرخواہوں کی اس فوج میں میرے
بدخواہ سب سے بڑھ چڑھ کر مجھے سہارا دینے کی کوشش کرتے،
"ارشاد بھائی! روز لٹ جاتے ہو۔ بتاؤ ہمارے لائق کوئی خدمت
[illegible]

شریف تھا۔ شرم سے سمٹ جاتا۔ اور کہتا۔ یہ بھائی بمعنی ماضی۔
اب کیا ہوسکتا ہے، تم خوش رہو۔ تمہاری ہمدردی ہی بہت
ہے!" خیر آخر کالج چھوٹا۔ میری بیوی کا نام جس سے میں انتہائی
محبت کرتا تھا۔ عفیفہ تھا۔ اور میں اُسے اسم بامسمیٰ سمجھتا تھا۔
بیروزگاری کی لعنت سے مجھے بھی دو سال دوچار ہونا پڑا۔ اس
نے کبھی شکایت نہ کی کہ ہم بھوکے مر جائیں گے، صبر و شکر سے
جو مل جاتا کھا لیتی۔ وہ مجھے اپنی وفا کا احساس دلاتی۔ میں اسے
اپنی محبت کی داستان سناتا۔ اور اگر وہ مجھے فرشتہ سمجھتی تھی
تو میں اُسے حور جانتا۔ اور بیٹا! ایک دن میں نے کیا دیکھا۔ وہ
آدھی رات کو چارپائی سے اُٹھی۔ میں نے دل میں کہا یہ کہاں
جارہی ہے؟ اُسکے پیچھے ہولیا۔ وہ باہر نکلی۔ دروازے پر ایک
نوجوان کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ اور پھر ——— پھر
میں نے ایک اینٹ اٹھائی۔ اور پوری طاقت سے نوجوان
کے سر پر دے ماری، وہ چیخا۔ اور تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ پھر میں نے
بیوی کو بالوں سے پکڑا۔ اُسے گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ اور اُس
کی خوبصورت ناک کا آخری حصہ کاٹ لیا۔ اور گھر سے باہر نکال دیا
وہ تمہاری ماں تھی!"

"کیا؟" اصغر کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

"وہ تمہاری ماں تھی" اصغر کے باپ نے مسکراتے ہوئے
کہا۔

"وہ میری ماں تھی!"

ہاں۔ میں نے لاش کو ٹھکانے لگایا۔ اور بعد میں سنا کہ تمہاری
ماں نے ایک اور جگہ شادی کر لی ہے۔ اور سال کے بعد اُس کے
[illegible] پھر مجھے کچھ معلوم نہیں

اس دن سے نیکی اور پرہیزگاری کی مقدس نقاب اُٹھ گئی مجھے مذہبوں کے پردوں میں کئی چیتے پنجے پھیلائے دہاڑتے ہوئے یتیموں پر جھپٹتے ہوئے نظر آئے۔ اور میں نے عزم کر لیا کہ اب گناہ کرونگا۔ گنہگار بنونگا۔ اور گنہگاری کی سند لیکر قیامت میں اُس "رحیم و کریم" ہستی کے سامنے پیش ہو جاؤنگا دیکھو۔ کسی پر یقین نہ کیا کرو۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور ہوتی ہے، یہ بڑے بڑے پرہیزگار ہم سے بھی زیادہ گنہگار ہیں۔ یہ لاشوں کو بیچ کر پیسے کمانے والے مردوں کی ہڈیاں چچوڑنے والی گدھیں۔ ہاں۔ سمجھے۔ پھر میں لاہور سے نکل بھاگا۔ اور ایک اور شہر میں اُس بازار کے چکر کاٹنے شروع کئے۔ جہاں حسن کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔ وہاں سے ایک عورت کو ورغلایا۔ شادی کر لی۔ اور لاہور آ گیا۔ وہی آجکل تمہاری ماں بنی ہوئی ہے۔ اب تم ہی کہو میں گنہگار بنا نہیں بنایا گیا ہوں، اور آخر خود بنتا۔ تو کون سی بڑی لغزش تھی۔ بیٹا میرا تو یقین ہے کہ اس دنیا میں گناہ کرنا ثواب ہے اور نیکی کرنا گناہ۔"

اصغر پہلے ہی شرافت سے متنفر تھا۔ اور اب تو نیکی اُسے ایک بھوت معلوم ہونے لگی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ جو انسانیت کے گلے کو دباتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے کہا "ابا میں ان حالات کو سمجھ چکا ہوں اُشکر ہے، میں نے شرافت کو زیادہ نہیں پوجا۔ میں اِس زندگی سے مانوس ہو گیا ہوں ابا ـــــ"

آخر اُس کی ماں آ گئی۔ اُس سراپا غرور کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اور [illegible]

لڑکی تھی اور بس!

ہوس نے کروٹیں لیں نفس نے پر پھیلائے۔ اور شرافت کا گلا کٹ کر دور جا گرا۔ آدھی رات گزر گئی۔ کمرے میں بجلی کی روشنی تھی۔

اصغر لڑکی کے قریب ہو کر کہنے لگا۔

"پیاری۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ اگر تم میری اور صرف میری ہو جاؤ تو ـــــ"

لڑکی بولی "اصغر پیارے۔ تم نے مجھے اپنا بنا لیا ہے میں نے آج تک کسی غیر مرد سے بات تک نہیں کی۔ میری بے کس ماں اور بوڑھے باپ کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ نوجوان طبقہ میرے قدموں پر جھکا پڑتا تھا۔ مگر میں اُسے ٹھکراتی رہی، کیونکہ ماں نے مجھے یہی تعلیم دی تھی۔ میری ماں۔ بے چاری۔ بدنصیب عورت، وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کا خاوند پہلے تو اُس پر بہت مہربان تھا۔ مگر ایک روز خدا جانے کیوں اُس نے میری ماں کو مارا۔ اور اُس کی ناک کاٹ کر گھر سے باہر نکال دیا۔

"کیا؟" اصغر کا دم گھٹ گیا "کیا کہا؟"

"ناک کاٹ کر گھر سے باہر نکال دیا اور ـــــ"

اصغر ہکا بکا رہ گیا۔ لڑکی بدستور باتوں میں مشغول رہی۔

"اور آخر۔ میری ماں نے ایک ادھیڑ عمر شریف سوداگر سے شادی کر لی۔ ناک کے کٹ جانے سے وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتی تھی۔ مگر میرے باپ نے اُسے سمجھایا۔ کہ اُس کی نظر میں صورت سے سیرت زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی [illegible]

"تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟"

"عفیفہ"

"عفیفہ؟"

اصغر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلنگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بازو اکڑ گئے۔ اس پر سکتہ کا عالم چھا گیا۔ لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں کیا ہے اصغر؟"

"تم میری بہن ہو!"

"بہن؟" اور لڑکی نے دیکھا کہ اصغر کی آنکھیں بے نور ہو گئی ہیں جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ جھکتا گیا۔ جھکتا گیا۔ اور آخر فرش پر گر پڑا۔ اس کے ماں باپ اندر دوڑے آئے، دیکھا تو اصغر سرد ہو چکا ہے۔ دونوں نے تعجب سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کا رنگ اڑ چکا تھا۔ پتلیاں پھر گئی تھیں۔ اس نے اصغر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرا بھائی تھا"

"بھائی؟" دونوں یک زبان ہو کر بولے، اور قبل اس کے کہ وہ لڑکی کو سنبھالتے وہ گر کر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اصغر کے باپ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی! وہ خود بھی مسکرایا اور کہنے لگا۔

"بیچارے گناہ کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے!"

دونوں نے قہقہے لگائے۔ اور اصغر اور اس کی بہن کو باہر قبرستان میں دفن کر آئے۔

جناب آسی رام نگری

افسانہ

قسمت کی ہیٹی

دائی کے منہ سے بات نکلی ہی تھی کہ سارے گھر میں کہرام مچ گیا "لڑکی پیدا ہوئی! لڑکی پیدا ہوئی"۔ سب کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ لوگوں کے چہروں پر اداسی چھا گئی جس نے سنا اسی نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا "ہے ایشور! بیٹی پیدا ہوئی۔ بھلا پانچ لڑکیوں کا کیسے گذارا ہوگا"

بابو شیام سندر نیچے دالان میں بیٹھے ہوئے تھے لڑکی ہونے کی خبر ان کے کانوں میں بھی پہنچی۔ انہیں یقین نہ ہوا۔ انہوں نے فوراً نوکر کو بلا کر پوچھا۔ سر نیچا کر کے جب اس نے بھی دھیرے سے وہی بات دہرائی تو ان کا دل کانپ اٹھا۔ انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ جیسے اُنکے اوپر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے پاگل سے ہو گئے۔ پھر سنبھلے۔ اور اپنے دل کو سمجھانے بہت کوشش کی لیکن ان کی یہ سعی غم و غصہ کی آندھی میں پنکھے کی ہوا بنکر رہ گئی۔ ان کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔

اسی وقت ان کے بہنوئی رادھے موہن نے آکر کہا — "لڑکی مبارک ہو!" جلتی ہوئی آگ میں تیل کا چھینٹا پڑ گیا۔ شیام سندر جھنجھلا کر بولے — "رہنے دیجئے مبارکبادی"۔

"لڑکی کے نام سے آپ اتنے ناخوش کیوں ہو گئے؟"

"آپ کے بھی پانچ پانچ لڑکیاں ہوتیں تو پتہ چلتا"

"واہ بھئی لڑکیاں کوئی آفت ہیں جو آپ ان سے اتنا گھبراتے ہیں۔ جیسے بیٹے ویسے بیٹیاں۔ دونوں ایشور کی دین اور دل بہلانے کے انمول کھلونے ہیں"

"بھائی صاحب! مجھے آپ کا اپدیش اچھا نہیں لگتا یہ سب اس کمبخت نالائق عورت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر پانچ بیٹے ہوتے تو میرا سر اونچا ہو جاتا۔ ان لڑکیوں کی بدولت مجھے زندگی بھر خوشامد کرنے اور ناک رگڑتے گزرے گی۔ میرا اونچا سر نیچا ہو جائے گا۔ اور تنی ہوئی مونچھیں جھک جائیں گی"

"بھابی جی کو تو آپ ناحق ہی الزام دے رہے ہیں اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ یہ سب تو بدھاتا کی لیلا ایشور کی مایا ہے"

"تمہاری بھابی جی چولہے میں جائیں۔ میرے سامنے ان کا نام نہ لو۔ پانچ پانچ لڑکیوں کی ماں تمہاری بھابی ہوں گی۔ مجھے تو اُن کے نام سے بھی نفرت ہوتی جاتی ہے"

رادھے موہن نے ان کی الٹی سیدھی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور چپ چاپ اُٹھ کر چلے گئے۔

شیام سندر بیٹھے ہوئے خیالات کی رو میں بہہ رہے تھے کبھی اپنی آئندہ زندگی پر غور کرتے کبھی قسمت کو کوستے۔

کچہری کا وقت آگیا۔ نوکر نے حسب معمول آکر کہا "بابو جی بھوجن تیار ہے" شیام سندر بگڑ کر بولے "سامنے سے چلا جا۔ بک بک مت کر۔ میں بھوجن نہ کروں گا۔ مہراجن سے کہہ دے رسوئی اٹھا دے۔

بارہ بجے ان کا غصہ کچھ کم ہوا۔ انہوں نے اٹھ کر کپڑے بدلے۔ اور بغیر کھانا کھائے کچہری چل دیئے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان سے دوبارہ کھانا کھانے کو کہتا۔

جس کمرے میں شیام سندر اور ان کے بہنوئی باتیں کر رہے تھے۔ زچہ خانہ سے لگا ہوا تھا۔ لیلاوتی اپنے پتی اور انکے بہنوئی کی ساری باتیں کان لگا کر سن رہی تھی۔ ان کی باتیں سنکر اور یہ جان کر کہ پتی دیو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر غم وغصہ کے مارے کھانا کھائے بغیر کچہری چلے گئے۔ اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ پہلے ہی سے جانتی تھی کہ اگر اس بار لڑکی پیدا ہوئی تو خیریت نہیں۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟ وہ سوچتی تھی کہ یہ کچھ اس کے بس کی بات تو تھی ہی نہیں۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ اسے اب اولاد ہی نہ ہو۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ لیلاوتی اپنی مجبوری اور شوہر کے غصہ پر رو پڑی۔ اور قسمت کو کوسنے لگی کہ اسے اس بارے میں ایسا بے بس کیوں بنایا گیا؟ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے

ابھرن ہو رہی ہے تو اس کا خاتمہ ہی کیوں نہ کر ڈالوں؟"

لیلاوتی نے اِدھر اُدھر کمرے میں دیکھا۔ کوئی نہ تھا اس نے بے قصور بچی کو ہمیشہ کے لئے دھرتی ماتا کو سونپ دینے کے لئے اسے گود میں اٹھا لیا۔ لیکن ممتا کی ماری ماں کا ہاتھ کانپ اٹھا۔ اس کی نظر بچی کی پیاری صورت پر پڑی۔ وہ اپنی بھولی چتون سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

لیلاوتی کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے بے گناہ بچی اپنی حسرت بھری نگاہوں سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہو۔ ماں کا دل نرم تو ہوتا ہی ہے۔ ممتا اور محبت سے لبریز ہو گیا۔ لیلاوتی اپنی کمزوری اور بے بسی پر تڑپ اٹھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور سوچنے لگی بھلا اس بیگناہ بچی کو مار ڈالنے کے لئے میں کیوں آمادہ ہو گئی تھی؟ اور مجھے کیا حق حاصل ہے کہ ایک بے گناہ بچی کو جان سے مار ڈالنے کے ننگِ انسانیت خیال کو بھی اپنے دل میں جگہ دے.....؟

ماں ہو کر بھی وہ اتنا سخت برتاؤ کرنے کے لئے کیوں آمادہ ہو گئی؟ وہ بچی اسکے گوشت اور خون سے بنی ہے۔ اُسکے لئے اس نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں؟ کتنی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ لیکن آج اُسے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنے جا رہی ہے۔ جس اولاد کی انگلیاں دکھنے پر ماں کی چھاتی پھٹ جاتی ہے۔ جسکے رونے پر ماں کا کلیجہ ہل جاتا ہے۔ اُس کے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری پھیرنے جا رہی ہے؟ ہے ایشور! مجھے کیا

ہوگیا۔ ۔ ۔ ؟ مجھے اچھی سمجھ دے۔ میری بیٹی مجھے معاف کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لیلاوتی نے خیالات کے رو میں بہتے ہوئے ایک بار پھر بچی کے منہ کو چوما۔ اور پیار کیا۔ اس سے اس کے دل کو کچھ سکون حاصل ہوا۔ اور وہ بچی کو چھاتی سے لگاکر لیٹ گئی۔

کسی نہ کسی طرح بارہ دن گذر جانے کے بعد لیلاوتی زچہ خانہ سے باہر نکلی لیکن پتی پتنی میں ابھی دل کھول کر بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

بچی کے پیدا ہوتے ہی سارے گھر میں افسردگی چھاگئی تھی۔ اس لئے لیلاوتی اسے ابھاگنی کہہ کر پکارتی تھی۔ دھیرے دھیرے ابھاگنی دو مہینے کی ہوگئی۔ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کبھی کبھی مسکرا دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں چنچل ہرنی کی طرح تھیں۔ اسکا پیارا مکھڑا چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اور وہ لکشمی کا نیا اوتار معلوم ہوتی تھی۔ اُسے جو دیکھتا بے پیار کئے نہ رہتا۔ اور لیلاوتی کا کیا پوچھنا۔ وہ تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔

آج ابھاگی کچھ بیمار تھی۔ اس کی علالت کی وجہ سے لیلاوتی فکرمند اور اداس تھی۔ وہ رہ رہ کر گھبرا اُٹھتی تھی۔ اور طرح طرح کے بُرے خیالات اُسے پاگل بنا رہے تھے۔

لیلاوتی ابھاگی کو دم بھر کے لئے بھی اپنے سے الگ نہ رکھتی تھی۔ چار دن تک برابر ڈاکٹر وید آتے رہے دوا دارو ہوتا رہا۔ ماتا کی ماری ماں نے جانے کتنے تعویذ اور گنڈے ٹوٹنے باندھے۔ لیکن مرض برابر بڑھتا ہی گیا۔ اور ساری دوا دوش بیکار ثابت ہوئی۔ جس ابھاگنی کو وہ پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کے لئے تیار تھی۔ جس کی پیدائش کی خبر نے باپ کو متفکر اور مغموم بنا دیا تھا۔ وہ ابھاگنی آج خود ہی اس بے رحم باپ کو ٹھکرا چل بسی۔

بچی کے سدھار جانے کے بعد ماں کی ماتا کی ندی آنسوؤں کے روپ میں آنکھوں کی راہ اُمنڈ پڑی۔ لیلاوتی کی گود سونی ہوگئی۔ اس کی سونے کی چڑیا جسے وہ جان سے زیادہ پیار کرتی تھی اڑگئی۔ وہ ابھاگنی ابھاگنی چلا رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ابھاگنی اب بھی اسے رو رو کر بلا رہی ہو

ابھاگنی چلی گئی لیکن لیلاوتی کے دل میں ایک ٹیس چھوڑ گئی۔ رات دن جاگ کر پریشان ہوئی۔ ہزاروں دکھ سہے۔ لڑکی پیدا ہونے پر لوگوں کے طعنے سنے صحت برباد کی۔ لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جو ملا تھا وہ بھی چھن گیا۔ لوگوں کے لئے ابھاگنی کی پیدائش رنج و ملال کا موجب تھی۔ لیکن لیلاوتی کے لئے ابھاگنی کی موت ناقابل برداشت صدمہ تھی۔ اور اسے کچھ ماتا کی ماری ماں کا دل ہی جانتا تھا۔

× × × × ×

ایک دن کمرے میں پتی پتنی بیٹھے تھے۔ ابھاگنی کو مرے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ اس کے مرنے کا سانحہ گئی گذری بات ہو چکی تھی۔ شیام سندر بابو ادبہ

لیلا وتی میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔

"لیلا وتی! آج تم بہت زیادہ اداس ہو۔ کچھ طبیعت تو اچھی ہے؟"

شیام سندر نے لیلا وتی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اداس تو نہیں ہوں۔"

"لیکن اور دنوں کی طرح آج تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔"

"نہ ہوگی مسکراہٹ۔ کسی کی جوانی سدا تھوڑی ہی رہتی ہے۔ یہ تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔"

شیام سندر ذرا تیز آواز میں بولے "تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جب دیکھو ٹیڑھی باتیں کرتی ہو سیدھی بات کرنے کے لئے جیسے قسم کھا رکھی ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہیں میرے سایہ سے بھی نفرت ہو گئی ہے؟"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے" لیلا وتی مسکراتی ہوئی بولی۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم مجھ سے کوسوں دور کیوں بھاگتی ہو؟ جب میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ تو تم پیچھے کھسک جاتی ہو۔"

"اسلئے کہ بہت دنوں تک ساتھ رہ چکی۔ اب ساتھ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔" لیلا وتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو کیا مجھ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہو؟"

"ہاں آپکے خیالات اور برتاؤ تو مجھے اس کے لئے اکساتے ہیں۔ کیونکہ میرے ہمیشہ بیٹیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس بار پھر میری بدقسمتی نے وہی دن دکھائے تو میرے لئے یہ گھر نرک بن جائے گا۔" لیلا وتی بھی ذرا تیز ہو کر بولی۔

شیام سندر نے منانے کا انداز اختیار کرتے ہوئے اور لیلا وتی کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا ——

"ارے تم ہنسی ہنسی میں برا مان جاتی ہو؟"

لیلا وتی نے شیام سندر سے تھوڑی دور پیچھے ہٹتے ہوئے کہا —" میں روٹھ کر یا آپ سے خوشامد کرکے مزہ لینے کے لئے یہ باتیں نہیں کہہ رہی ہوں۔ بلکہ جو کچھ کہہ رہی ہوں سچے دل سے۔ اور خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ تاکہ میری افسردہ صورت اور روکھے برتاؤ سے آپ کو تکلیف نہ ہو۔ اور آپ کی زندگی بے مزہ نہ ہو جائے یہ کہنا کہ بیٹی کے حقیقی پیدا کرنے والے آپ یا میں ہوں غلط ہے۔ یہ تو ہم اپنی بے سمجھی اور غصہ کی وجہ سے بیٹی پیدا ہونے پر کڑھتے ہیں۔ یا دوسروں کو الزام دیتے ہیں۔ بھاگنی کی پیدائش سے آپ کو رنج ہوا۔ اور آپ نے مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ آپ نے بھاگنی کو بھی اپنے اور خاندان کے لئے شرم و ندامت اور کلفت و مصیبت کا باعث سمجھ کر اس سے نفرت کی۔ آپ بھاگنی کے باپ تھے۔ اسکے پیدا ہونے سے آپکو رنج ہوا۔ اور اسکے مرنے پر خوشی ہوئی۔ یہ ہے باپ کی محبت۔ بھاگنی کی پیدائش نے ہمارے —— زندگی بھر کے تعلق کو انتہائی ناخوشگوار بنا دیا تھا۔ کیا

پتہ کہ بھگوان مجھے پھر آگئے ہیں کہ چھٹی ابھاگنی ہی کی ماں بناوے۔ مجھے تو اپنی اولاد پیاری ہے۔ ابھاگنی کی پیدائش سے میری زندگی میں نئے سرسے بہار آگئی تھی۔ اس کے مرجانے سے میں بے جان ہوگئی ہوں۔ آہ کیسی ہنسی! ہنسی تو مردوں کے لئے سدا بہار بنکر آئی ہے۔ تم ہنسو اپنی بیٹی کی موت پر۔ تم باپ تھے۔ باپ کا دل پتھر کا ہوتا ہے میں ماں تھی۔ ماں کی ممتا تم کیا جانو۔ ماں کا دل موم کا ہوتا ہے۔

شیام سندر اب زیادہ نہ سن سکے۔ اور اپنی پتنی کے پیروں پر گر پڑے۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ پھر بھی ان کے دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے الفاظ صاف سنائی دے رہے تھے ——"معاف کرو لیلاوتی میں بڑا ظالم۔ بڑا سنگدل ہوں۔!"

"ہاں ہاں یہ کیا ناتھ —!" کہتی ہوئی لیلاوتی نے بڑھکر پتی کو اٹھا لیا۔ اور آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ——"یہ کیا کرتے ہو ناتھ! کیا مجھے نرک کے لائق بھی نہ رکھو گے . . . . . ؟"

جناب چونی لال کاوش سرحدی

گیت

پریم کا میں نے روگ لیا ہے
روگ بسا کر جوگ لیا ہے
اُن کے ہونے سوگ لیا ہے
پیت کی یہ ہے ریت۔سکھی ری پیت کی یہ ہے ریت
پہلے پیتم پریم لگاوے
پھر برہن کو آنکھ دکھاوے
کایا کو سو روگ لگاوے
یہ ہے اِن کی پیت۔سکھی ری پیت کی یہ ہے ریت
جگ کو نفرت مجھ سے پڑسے
نینن مورے نیر وہ برسے
موتی جن کی جوت کو ترسے
کس کے رہے ہم ... سکھی ری ...

حضرت نوحؔ ناروی

چین ہو یا بے چینی ہو پہلے دل گھبرائے گا
جاتے جاتے جائے گی آتے آتے آئے گا

قاصد آنے جانے میں تھک تھک کر گھبرائے گا
جائے گا پھر آئے گا آئے گا پھر جائے گا

ڈھونڈنے والی نظروں سے دیکھینگے پہلو کی طرف
اُنکی اس دل جوئی پر میرا دل اترائے گا

دل میں امیدیں لاکھوں تھیں کچھ نکلیں کچھ باقی ہیں
خیر کبھی پھر آؤ گے پھر کبھی دیکھا جائے گا

دیر و حرم کے مالک سے ہم کبھی کچھ مانگیں تو سہی
ہے وہ بڑا دینے والا دے گا یا دلوائے گا

دل کے خود آزار و الم دل کی قدر بڑھائینگے
ہو گا یہ اکسیر مگر خاک میں جب مل جائے گا

ناصح آنے والا ہے دو ہی باتیں ہونی ہیں
یا اُسے ہم سمجھائینگے یا وہ ہمیں سمجھائے گا

شکوۂ غم ہو محشر میں اس کی کچھ امید نہیں
سامنے وہ آجائیں گے ہوش کسے رہ جائے گا

دل دینے والا غم سے چھوٹ جائیگا دل دیکر
دل لینے والا دل میں دل لے کر پچھتائے گا

نوحؔ کے رونے پر ہنسنا بے دردو نکا خوب نہیں
بحرِ محبت میں اس سے اور بھی طوفاں آئے گا

جناب کسرٰے منہاس

روضۂ تاج محل آگرہ کی تعمیر!

روضۂ تاج محل ہندوستانیوں کی عظمتِ گذشتہ کا مرقع اور ان کے کمالِ ہنرمندی کا غیر فانی شاہکار ہے۔ یہ آج سے تین سو سال قبل تعمیر ہوا تھا۔ لیکن آج بھی ایک آبدار موتی معلوم ہوتا ہے جس میں ہندوستانی صناعوں نے اپنے کمالِ فن اور جادوگری سے حسن و وفا اور خلوص و محبت کے جذبات کو بھر دیا ہے۔

لیکن افسوس کہ آج ہندوستانی اس نکبت و افلاس کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں۔ کہ یقین نہیں آتا۔ کہ اس عجائبِ عالم اور نادر روزگار عمارت کے بنانے والے اسی ہندوستان کے باشندے تھے۔ چنانچہ یورپ والے طرح طرح کے حیل و حجت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ روضۂ تاج محل کا نقشہ بنانے اور اس کی تعمیر کرنے کا سہرا یورپین انجینئروں کے سر ہے۔

ہرچند کہ ہندوستان کی تاریخ اور اس کی گذشتہ عظمت سے واقفیت رکھنے والے یورپ والوں کے دعوٰی کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دے سکتے۔ تاہم ہندوستانی مورخین کا فرض ہے۔ کہ وہ مذکورہ بالا دعوے کی حقیقت کو واضح طور سے بیان کریں۔ تاکہ ہر کوئی اصل معاملہ سے واقف ہو جائے۔ چنانچہ انگریزی معاصر "ٹوئنٹیتھ سنچری" میں مسٹر نندلال چیٹرجی نے روضۂ تاج محل کی نسبت یورپ والوں کے دعوٰی کی تردید میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

تاج محل آگرہ کی تعمیر کے متعلق یورپ والے دو نظریے پیش کرتے ہیں۔ سلیمین نے سب سے پہلے پہلی مرتبہ یہ خیال پیش کیا۔ کہ روضۂ تاج محل کی نسبت تاریخوں میں جو استاد عیسٰی کا ذکر آتا ہے۔ وہ فرانسیس آسٹن ڈی بورڈ ہے۔ چونکہ وہ عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ اس لئے لوگ اسے استاد عیسٰے کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن اس زمانہ کی تاریخوں کا مفصل طور سے مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ استاد عیسٰے نام دراصل مکمل نام محمد عیسٰے آفندی کا مخفف ہے۔

روضۂ تاج محل کی نسبت دوسری کہانی جسے کپتان سمتھ اور پادری ہوسٹن ایسے مورخ صحیح تسلیم کرتے ہیں یہ ہے کہ شاہ جہان کے عہد میں ایک ہسپانوی [illegible] مانرک نامی آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ [illegible]

تاج محل کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اس نظریے کی صحت کا یہ حال ہے کہ مانرک کی یادداشت کے علاوہ اطالوی انجینئر کا نام کسی اور تذکرہ میں درج نہیں لیکن اسکی تائید میں یورپین مورخ عجیب عجیب دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے دیدہ دانستہ اطالوی انجینئر کا نام نظرانداز کر دیا تاکہ روضہ کی تعمیر کا سہرا کسی غیر ملکی کے حصہ میں نہ جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مانرک نے ممتاز محل کے والد آصف خاں سے دوستی اور رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ اس لئے اس نے ذاتی واقفیت کی بنا پر روضہ کے بنانے والے کی نسبت لکھا ہے۔ اسکے علاوہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ روضہ تاج محل کا نقشہ یورپین طرز کا نہیں۔ لیکن ایک ہوشیار یورپین انجینئر کے لئے ممکن تھا کہ ہندوستانی ماہرین فن کے مشورہ کے بعد خود نقشہ مرتب کر لیتا ہو۔ ایک اور بات جو اس نظریئے کی تائید میں پیش کی جاتی ہے۔ کہ ویرونیو کا انتقال لاہور میں ہوا لیکن اس کو آگرہ میں دفن کیا گیا جس سے اس کی اہمیت اور شخصیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے ویرونیو کے انتقال کے بعد استاد عیسٰے نے روضہ کی تکمیل کی ہو۔ اس لئے اس کا نام مشہور ہوگیا۔ ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ روضہ کے اندر سنگ مرمر پر نقاشی اور منبط کاری میں اطالوی اثر ظاہر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام روضہ کو اطالوی انجینئر نے تعمیر کرایا۔

اس قسم کی دلیلوں کی خوب وضاحت سے تردید کی جا چکی ہے۔ موجودہ زمانے کے نقادوں میں سے ہاول اور سر جان مارشل نے مانرک کے نظریے کی غلطی کو واضح کیا ہے۔ تاریخی اور فنی ہر دو اعتبار سے ثابت ہوتا ہے کہ روضہ تاج محل کی تعمیر کے متعلق یورپینوں کا خیال بالکل بے بنیاد ہے۔

فارسی تاریخوں میں روضہ کے بنانے والوں کے نام۔ کاریگروں کی تنخواہیں۔ اور تعمیر پر کل خرچ تمام باتیں مفصل درج ہیں۔ حتےٰ کہ جو مصالحہ استعمال کیا گیا اسکا بھی ذکر موجود ہے۔ ان تاریخوں میں ترکی ایرانی اور ہندوستانی صناعوں اور ماہرین فن کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی یورپین انجینئر کا ذکر تک نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ مانرک کے علاوہ کسی اور یورپین سیاح نے اطالوی انجینئر کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ اگر روضہ تاج محل کی تعمیر میں کسی اطالوی کا دخل ہوتا۔ تو ڈاکٹر برنیئر۔ ٹیورنیئر اور نکولس منوچی جو سب یورپین تھے۔ اطالوی انجینئر کا ضرور تذکرہ کرتے خصوصاً نکولس منوچی کیونکہ وہ خود بھی اطالوی تھا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ ابتدا میں کسی اطالوی نے معمولی حیثیت میں روضہ کی تعمیر میں کام کیا ہو چونکہ وہ عمارت کی تکمیل سے پہلے فوت ہوگیا۔ اس لئے اسکا تذکرہ ضروری نہ سمجھا گیا۔ امر واقع یہ ہے کہ روضہ تاج محل کا نقشہ مقبرۂ ہمایوں سے بہت ملتا ہے یہی نہیں بلکہ فنی اعتبار سے بھی جو باتیں مقبرۂ ہمایوں میں پائی جاتی ہیں۔ انکو روضہ تاج محل میں انتہا تے کمال تک پہنچایا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی روضہ تاج محل بالکل ہندوستانی ہے۔ اس لئے کسی یورپین انجینئر کی مداخلت کا خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے اور روضہ کے اندرونی حصہ میں جو نقاشی کے نمونے ملتے ہیں۔ اس سے تو مذکورہ بالا نظریے کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ ص

جناب انجم رضوانی

ارتباط

میری اُن سے خاص رسم و راہ تو کوئی نہ تھی
تھی شناسائی یونہی سی، چاہ تو کوئی نہ تھی

بے توجہ میں گذر جاتا تھا اُن کے پاس سے
اور قطعاً بے خبر تھا دل کسی احساس سے

ق

ہاں کبھی اُن پر نگاہیں یونہی پڑ جاتی بھی تھیں
بے سبب معصوم سے چہرہ پہ گڑ جاتی بھی تھیں

مجھ پہ پڑ جاتی نظر انکی، تو جھک جاتی تھیں یہ
ہاں مگر شرما کے آنکھوں ہی میں رُک جاتی تھیں یہ

دیکھ کر یہ رنگ کچھ مبہوت ہو جاتا تھا میں
سحر ہو جاتا تھا مجھ پر یعنی کھو جاتا تھا میں

میری اس حالت پہ اکثر مسکرا پڑتے تھے وہ
ہو نہ سکتا ضبط تو بس کھلکھلا پڑتے تھے وہ

رفتہ رفتہ کچھ مجھے احساس سا ہونے لگا
اور اِس معصومیت کا پاس سا ہونے لگا

ہاں حسیں تھے وہ، متاعِ حُسن کے سرمایہ دار
انکے رخ سے جلوۂ حسن آفریں تھا آشکار

شوخیاں، رنگینیاں، زیبائیاں بے انتہا
ایک پیکر حسن کا، رعنائیاں بے انتہا

دلربا، دلکش، جہاں آرا وہ تصویرِ جمال
آرٹ کی اک روح، فطرت کے مصوّر کا کمال

یہ حقیقت تھی، اور اِس پر وہ بجا مسرور تھے
ناز و عشوہ تھا، مگر نخوت سے کوسوں دور تھے

الغرض میری طرف رُک رُک کے وہ آنے لگے
یعنی دنیائے دلِ انجم پہ چھا جانے لگے

میں اُدھر بڑھنے لگا، کچھ وہ اِدھر بڑھنے لگے
لطف کے سائے میں دل پروان یوں چڑھنے لگے

اس طرح آہستہ آہستہ ملاقاتیں بڑھیں
قسمتوں نے رنگ بدلا، پیار کی باتیں بڑھیں

ہر ادا اُن کی مرے دل کو پسند آنے لگی
پیار کرنے پر کوئی شے مجھ کو اکسانے لگی

لیکن ان کیفیتوں میں مبتلا دونوں ہی تھے
روح پرور لذتوں سے آشنا دونوں ہی تھے

چاہتا تھا میں انہیں، تو مجھ پہ مرتے وہ بھی تھے
صدق دل سے دم مری اُلفت کا بھرتے وہ بھی تھے

ہر طرح سے کرتے رہتے تھے وہ دلداری مری
اُنکے ہر انداز سے ظاہر تھی غمخواری مری

یوں انہیں مجھ سے، مجھے اُن سے محبت ہو گئی
زندگی میں روح بھرنے کی یہ صورت ہو گئی

اب میں اُنکا ہوں، وہ میرے، زندگی کیا خوب ہے
ہمنشیں اِرہ ارتباطِ باہم کیا خوب ہے

جناب گوپال مٹل بی۔ اے

(افسانہ)

سرسوں

بھادوں کا مہینہ تھا اور پالم پور میں سرسوں بوئی جا رہی تھی۔ جو وہاں کی خاص فصل تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اور کوئی فصل ہوتی نہ تھی حقیقت یہ ہے۔ وہاں کی سرزمین اس قدر زرخیز تھی کہ خواہ کوئی چیز بوئی جاتی کثرت سے ہوتی۔ مگر سرسوں کے لئے تو وہ غیر معمولی طور پر سازگار تھی۔ اسی لئے اس کے بونے میں بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

اس سال بھی کسانوں نے نہایت احتیاط سے ہل چلایا تھا اور اچھے سے اچھا بیج فراہم کیا تھا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو چکیں اور فصل بونے کا دن آگیا تو وہ لوگ منہ اندھیرے ہی اپنے کھیتوں میں پہنچ گئے، اور پورے انہماک کے ساتھ زمین میں بیج ڈالنے لگے۔ جو شخص سب سے زیادہ انہماک کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ "منو" تھا۔ آج وہ اس قدر تندہی سے کام کر رہا تھا کہ اس کے پرانے واقفکاروں کو حیرت ہوتی تھی۔ انہیں یہ بھول کر بھی گمان نہ ہوا تھا کہ "منو" اس قدر جانفشانی سے کام کر سکتا ہے۔ جس شخص کی تمام عمر آوارگی میں بسر ہوئی ہو۔ جس کا دامن ہر قسم کے عیوب سے داغدار ہو اور جو شخص جوئے میں اپنی

بری عادتوں کو چھوڑ کر ایک غنی کسان بن جائے۔ اس سے بڑھ کر عجوبہ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آج تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ منو اور احساس فرض دو متضاد چیزیں ہیں لیکن آج وہ اپنے طرز عمل سے اس خیال کی تکذیب کر رہا تھا۔

منو کے گھر والے نہایت خوش تھے۔ لیکن ان سب سے زیادہ خوشی لالہ مکٹ بہاری کو تھی ۔ انہیں منو سے تقریباً پانصد روپیہ لینا تھا۔ جس کی وصولی کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ لیکن اب منو کو کام میں مصروف دیکھ کر ان کی ٹوٹی ہوئی آس بندھ گئی تھی۔ وہ دور سے منو کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ فصل پک جانے میں روپے کی وصولی کی کوئی صورت ہو جائے گی۔

اگر یہ سب لوگ دور سے تماشا کرنے کی بجائے منو کے نزدیک آکر دیکھتے تو ان کے جذبات بالکل مختلف ہوتے منو جو چیز زمین میں ڈال رہا تھا۔ وہ سرسوں نہ تھی بلکہ مٹی تھی محض مٹی۔ کیا کثرت شراب نوشی سے منو کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اور یہ حرکت اس سے عالم دیوانگی میں سرزد ہو رہی تھی؛ بھلا جب تک کوئی شخص عقل و خرد کو بالکل ہی جواب نہ دیدے اس مجنونانہ طریقے سے اپنے وقت کو کیونکر برباد کرتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ منو دیوانہ نہ تھا۔ اور نہ اس

روز اس نے شراب پی رکھی تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی۔ کہ جو واقعہ اسے آج پیش آیا تھا۔ وہ اگر شراب کی حالت میں بھی پیش آتا تو تمام نشہ ہرن ہو جاتا۔

آج صبح جب وہ گھر سے چلا تو اس کے پاس دانے سرسوں تھی۔ اور وہ اسے بیج ڈالنے کی غرض سے گدھے پر لاد کر اپنے کھیت کی جانب جا رہا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ راستہ میں اسے ایک جواری دوست مل گیا۔ اور چند داؤ لگانے پر مجبور کرنے لگا۔ منو نے لاکھ کہا کہ وہ توبہ کر چکا ہے اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن وہ کمبخت نہ مانا۔ اور برابر مجبور کیا گیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ منو کے پائے استقلال میں تزلزل آگیا "آخر چند داؤ لگانے میں کیا نقصان ہے" اس نے خیال کیا اور اپنے دوست کے ساتھ جوا کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ منو نے تین داؤ لگائے۔ اور تینوں ہی ہار گیا۔ اس کے بعد اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ جب وہ کھیل سے فارغ ہوا تو سب کچھ ہار چکا تھا۔ نہ صرف نقدی بلکہ وہ سرسوں بھی جسے بو کر اسے سال بھر کے رزق کا سامان کرنا تھا۔ اور دنیا پر ظاہر کرنا تھا کہ منو بھی کام کر سکتا ہے اور دوسروں کی طرح اسے بھی اپنے فرض کا احساس ہے۔

اب اس کے بعد گھر واپس جانا اور بیوی کے سامنے اس امر کا اعتراف کرنا کہ وہ بیج تک کو جوئے میں ہار گیا ہے ایک ایسا ذلیل کن فعل تھا۔ جسے منو کی حمیت کسی حالت میں بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اس بات کو صیغۂ راز ہی میں رکھے۔ اور کھیت میں فرضی بیج ڈال کر شام کو گھر چلا جائے۔ کچھ دن تو چین سے بسر ہو جائیں گے جب انشائے راز ہوگا اس وقت دیکھا جائیگا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن شام کے وقت جب وہ اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے انجام دیکر گھر پہنچا اور اس کے گھر والوں نے اس کی غیر معمولی طور پر آؤ بھگت کی۔ تو اسکا ضمیر سرزنش کرنے لگا۔ ایک مرتبہ تو اسے خیال آیا کہ حقیقت پر سے پردہ اٹھا دے لیکن ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ خاموش ہو رہا۔ البتہ ضمیر کی سرزنش کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اُسکے انقلاب ذہنی کی تکمیل ہو گئی۔ اس کے دل کے دامن پر جو تھوڑا بہت میل باقی تھا۔ اشک ندامت نے اسے بھی دھو دیا۔ اور اب منو ایک ایسا جفاکش اور ایماندار انسان بن گیا تھا۔ جسے شیطان اپنے تمام حربوں کے ساتھ بھی گمراہ نہ کر سکتا تھا۔

جب ایک ماہ گذر گیا اور منو کے کھیت میں کونپل تک نہ پھوٹی تو اسکے گھر والوں کو تشویش ہونے لگی۔ کیا اس کی محنت اکارت ہی جائے گی؟ آخر کھیت کو کیا ہو گیا؟ منو جب اپنے گھر والوں کو اس قسم کی باتیں کرتے دیکھتا تو تو اس کے قلب و جگر پر چھریاں چل جاتیں۔ وہ اپنے آپ کو بے حد ملامت کرتا اور دل ہی دل میں کہتا "افسوس میں نے ان غریبوں کو کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ یہ بے چارے کیا جانیں کہ اس میں کھیت کا کوئی قصور نہیں۔ قصور سب مجھ نالائق کا ہے۔ جو بیج کو جوئے میں ہار گیا۔ جب بیج ہی [illegible] مٹی گئی ہو تو کھیت میں [illegible]۔

آخر منو کے گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ ان سے یا تو کوئی بدشگونی ہو رہی ہے۔ یا کسی نے کھیت پر جادو کر دیا ہے

ورنہ غیر ممکن ہے کہ ایک ماہ تک کھیت میں کونپل نہ پھوٹے منو کی بوڑھی والدہ کو ان باتوں میں خاص دسترس تھی۔ لہٰذا معاملہ کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد جب اس نے یہ فیصلہ دیا کہ دوسری بات صحیح ہے تو اسے ناطق مانا گیا۔ اور اس امر پر غور ہونے لگا کہ ایسا کرنے والے کو سزا کیونکر دی جائے۔ منو کی والدہ اس میدان میں بھی فرد تھی۔ اس نے فوراً ہی ایک ہنڈیا میں لوہے کے چند ٹکڑے اور پانی ڈال کر اس کو آگ پر رکھ دیا جب پانی خوب اُبلنے لگا اور لوہے کے ٹکڑے آپس میں ٹکرا کر شور کرنے لگے تو اس نے خاندان کے دیگر افراد سے کہنا شروع کیا کہ جو حالت لوہے کے ٹکڑوں کی ہو رہی ہے وہی حالت اس شخص کی ہو گی۔ جس نے ہمارے کھیت پر جادو کیا ہے۔ جب تک ہنڈیا کو آگ کے نیچے نہ اتارا جائے گا اُسے چین نصیب نہ ہو گا۔ تم دیکھ لینا کہ ابھی وہ شخص ہاتھ جوڑ کر یہاں آموجود ہو گا۔ اور معافی مانگ کر ہنڈیا کو آگ سے نیچے اتارنے کی درخواست کرے گا اگر وہ آئے تو ہنڈیا اتارنے سے پہلے اس کی اچھی طرح مرمت ہو جانی چاہئے۔

ادھر یہ منصوبے ہو رہے تھے اور اُدھر لالہ مکٹ بہاری سوچ رہے تھے کہ اگر منو کی فصل نہ ہوئی تو وہ اپنا قرض کس طرح وصول کریں گے۔ آخر انہوں نے تمسک لیا اور تقاضا کی غرض سے منو کے گھر کا رُخ کیا۔ ممکن ہے وہ اسے اپنا گھر بیچنے پر آمادہ کر سکیں۔ ان کا وہاں پہنچنا تھا کہ سب ان پر پل پڑے جس روز منو بیج ڈال رہا تھا۔ اس روز لالہ مکٹ بہاری کھیت کے گرد منڈلا رہے تھے اور منو کی بیوی کو اس کا پتہ بھی چل گیا تھا۔ اس لئے ان کو آتے دیکھ کر یہی خیال کیا گیا کہ وہ ہنڈیا کو اتروانے آئے ہیں۔ اور کھیت پر جادو انہی نے کیا ہے۔

ابھی لالہ مکٹ بہاری کے ایک یا دو گھونسے ہی پڑے ہونگے کہ وہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ اور اس بھاگڑ میں قرضے کا تمسک بھی وہیں چھوڑ گئے جب تھوڑی دیر بعد گھر میں امن وامان ہوا تو وہ منو کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے چپکے سے اسے آگ میں ڈال دیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "محنت بھی رائیگاں نہیں جاتی۔ خواہ مٹی ہی بوئی جائے وہ بھی پھل لاتی ہے آخر یہ تمسک اسی کا ثمرہ تو ہے۔"

"مستفاد"

حضرت ثاقبؔ کانپوری

ایک دوست سے آخری ہمدردی!

ترا دل جب پریشاں ہوگا جذباتِ محبت سے
تو میں بہلاؤنگا اُسکو کسی شاداب جنگل میں
جہاں ہوگی ہوا لبریز پھُولوں کے تعطّر سے
جہاں خوابیدہ ہوں گی ذہنیں نمناک با دل میں
جہاں دل رقص میں آجائیگا وادی کے منظر سے
جہاں ہونگی فضائیں غرق عشرت کی تمنا میں
جہاں جذبات واحساسات میں نشو ونما ہوگی
جہاں ہوگی خلش دیدار کی ذوق تماشا میں
میں اکثر چاندنی راتوں میں تیرے مضطرب دلکو
ضیائے ماہ میں نہلاؤں گا فرطِ مسّرت سے
جہاں خوابیدہ ہوگی حسن کی مسحور رعنائی
جہاں اظہار ہوگا حسُن کا خود حُسنِ فطرت سے
جہاں اشجار نگرانی کرینگے مضطرب دل کی
جہاں نغمے بدل دینگے پریشانی کا یہ عالم
جہاں ساری فضا میں ہوتا ہے اک کیف روحانی
چمکتی ہے شعاعِ مہر سے ہر خار پر شبنم
وہیں لیجاؤں گا تیرے دلِ برباد ارماں کو
وہیں شائد بدل جائیں ترے آلام روحانی
کبھی تو دور ہوگا دل سے یہ رنج والم تیرا
کبھی تو ختم ہوگی تیری یہ آشفتہ سامانی
نہ بہلے گا اگر تیرا دلِ وارفتہ اس پر بھی
اگر سو جائے گا وہ موت کی آغوش میں جاکر
تو اُس کو دفن کر دونگا اِسی شاداب وادی میں
جہاں ہوتی رہیگی بارشِ گل اُسکے مدفن پر
کریگی شبنم اپنے آنسوؤں سے مرثیہ خوانی
ہوا ہر صبح کو آہیں بھرے گی آکے تربت پر
نہیں موقوف کچھ انسان پر اشجار بھی غم سے
کفِ افسوس ہی ملتے رہینگے تیری فرقت پر
تمنا ہے یہی میری کہ تیرے کام آجاؤں
کسی صورت سے حاصل ہو سکونِ دائمی مجھ کو

اگر دیدیگا اپنے آپ کو میری حفاظت میں
نہ دیگا پھر فریب السافرب زندگی تجھ کو

میرزا ادیب

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

صولت کی موت

افرادِ ڈراما ——————!

صولت —— ایک مریض قریب مرگ

یوسف —— صولت کا بیٹا

خالدہ —— صولت کی بڑی بیٹی

صابرہ —— صولت کی چھوٹی بیٹی

رحیم —— ان کا خادم

موت ——

منظر:۔ ایک وسیع و شاندار عمارت۔ دائیں طرف ایک ندی بہ رہی ہے۔ بائیں جانب باغات کھڑے ہیں۔ اور عقب میں، تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر، مکانات استادہ ہیں عمارت کے وسطی کمرے میں، ایک طرف پلنگ پر صولت دراز ہے۔ اس کی عمر بمشکل بتیس سال ہوگی۔ لیکن طویل بیماری نے اس کی آنکھوں سے جلالت، چہرے سے سرخی اور جسم سے توانائی چھین لی ہے۔ گال پچک گئے ہیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوتے ہیں۔ اور چہرے کی رنگت سیاہ ہوگئی ہے، پلنگ کے قریب، سنگِ مرمر کی ایک اونچی سی میز پر گلدانوں میں نہایت خوبصورت اور دلآویز گلدستے رکھے ہوئے ہیں۔ جن کی خوشبو سے کمرے کی فضا مہک رہی ہے [illegible]

بڑا سا شمعدان لٹک رہا ہے۔ صولت دایاں ہاتھ سینے پر اور بایاں سر کے نیچے رکھے، سو رہا ہے، پلنگ کے پاس ایک کرسی پر بوڑھا رحیم بیٹھا ہے۔ مسلسل شب بیداری کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔ کرسی سے کچھ دور، ایک صوفے پر ننھی صابرہ سو رہی ہے، اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے وہ ابھی ابھی روئی ہے۔

باہر پھیکی پھیکی چاندنی پھیلی ہوتی ہے۔ یوسف اور خالدہ کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے ہیں۔ یوسف نے ایک ہاتھ کھڑکی پر رکھا ہے۔ اور دوسرے میں پھول پکڑا ہے۔ خالدہ نے بھی ایک ہاتھ کھڑکی پر رکھا ہے —— وہ مڑ کر بیمار باپ کو دیکھتی ہے۔ ایک آہ اس کے لبوں سے نکلتی ہے

خالدہ (مغموم آواز میں) نہ معلوم ابا جان کو کب آرام آئیگا؟ ۔۔۔۔۔ تین ماہ کتنی لمبی مدت ہے!

یوسف۔ ابا جان کو بیمار ہوئے تین ماہ ہو گئے!

خالدہ۔ تین ماہ سے بھی زیادہ!

یوسف۔ اتنی لمبی مدت میں ہر گھڑی، ہر لمحہ بستر پر پڑے رہنا ۔۔۔۔۔ کتنی بڑی مصیبت ہے!

خالدہ۔ اور ابھی معلوم نہیں ۔۔۔۔۔ (مایوسانہ بھائی کو دیکھتی ہے)

یوسف۔ مایوس نہیں ہونا چاہئے خالدہ ۔۔۔!

خالدہ۔ میں مایوس نہیں ہوں بھائی جان! خدا ابا جان کو جلد صحت دے۔ ان کے سوا ہمارا دنیا میں کون ہے؟

یوسف۔ کوئی بھی نہیں ۔۔۔۔۔ اماں کو دنیا سے رخصت ہوتے چار سال گذر گئے (اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں) اب دنیا میں آخری سہارا ابا جان ہیں۔

خالدہ۔ تم رونے کیوں لگے بھائی جان! آنسو پونچھ لو۔ کہیں ابا جان نہ دیکھ لیں۔ انہیں تکلیف ہو گی!

یوسف۔ (آنسو پونچھتے ہوتے) تمہاری آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہیں۔

خالدہ۔ میں روتی تو نہیں بھائی جان! یونہی آنسو آنکھوں میں آ گئے ہیں (آنسو پونچھ لیتی ہے)

یوسف۔ ابا جان کو سوتے ہوئے ایک گھنٹہ تو ہو گیا ہے!

خالدہ۔ سوتا رہنے دو۔ کئی راتوں کے بعد اس وقت آنکھ لگی ہے۔ خدا کرے آنکھ کھولتے ہی ان کی تمام بیماری رفع ہو جائے۔

یوسف۔ خدا غمگین دلوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ ہماری دعا بھی قبول ہو گی۔

خالدہ۔ اس وقت ہم کتنے خوش ہونگے ۔۔۔۔۔ کتنے خوش!

یوسف۔ (مدہم چاند کی طرف دیکھتے ہوئے) آج رات چاند روشن نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی نے اس سے روشنی چھین لی ہے!

خالدہ۔ درختوں کے پتے گر رہے ہیں۔ اور ندی کا پانی سوکھ گیا ہے!

یوسف۔ پودوں پر پھول بھی نہیں رہے۔

(صولت پہلو بدلتا ہے۔ اور آنکھ کھول دیتا ہے۔
رحیم بعجلت اُٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔
خالدہ اور یوسف بھی وہاں جا کھڑے ہوتے ہیں
صولت کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہویدا ہے)

خالدہ۔ ابا جان! اب آرام ہے؟

صولت۔ قدرے ۔۔۔۔۔ افاقہ ہے بیٹی! صابرہ کہاں ہے؟

خالدہ۔ وہ سو رہی ہے۔

صولت۔ سو رہی ہے۔ بیچاری بچی بڑی دیر تک جاگتی رہی!

یوسف۔ ابا جان! آپ کو صحت ہو تو ہمیں بھی آرام آئےگا۔ اور بے چینی میں کون سو سکتا ہے؟ کیسے نیند

آسکتی ہے ؟

رحیم ۔ (صولت سے) آدھی رات ہوگئی ہے ۔ نہ تو یوسف ایک گھڑی کے لئے سویا ہے اور نہ خالدہ !

صولت ۔ (مغموم آواز میں) تم کیوں نہیں سوتے ۔۔ ؟ اتنی رات ہوگئی اور تم جاگ رہے ہو ۔۔۔ رحیم تم بھی جاگ رہے ہو۔

رحیم ۔ میری فکر نہ کیجئے آقا ! انہیں کہئے سو رہیں ۔ میں نے ہزار بار کہا مگر نہیں سنتے ۔

خالدہ ۔ ابا جان ! آپ کو جب آرام آجائے گا اس وقت ہم بڑے مزے سے سوئیں گے ۔

یوسف ۔ اس بے چینی میں کیونکر نیند آسکتی ہے ابا جان !

صولت ۔ مجھے آرام ہے اب ۔ پرسوں اترسوں تک بالکل تندرست ہو جاؤں گا ۔

خالدہ ۔ آپ درست کہہ رہے ہیں !

صولت ۔ کیوں نہیں !

خالدہ ۔ ابا جان ! وہ جو ہماری لمبی سیر کا پروگرام ۔۔۔

صولت ۔ (مسکرا کر) ضرور ۔۔۔ جہاں چاہو گی لے چلیں گے تمام دنیا کے گرد چکر لگاویں گے ۔۔۔ اب جاؤ سو رہو ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے !

خالدہ ۔ آپ سو جائیں ابا جان !

صولت ۔ تم بھی سو جاؤ ۔۔۔ دیکھو میں کہتا ہوں ۔ تم بھی رحیم ۔۔۔ ! جب ضرورت ہوگی میں تمہیں آواز دے دوں گا !

(خالدہ ایک طرف صوفے پر دراز ہو جاتی ہے ۔ رحیم بھی لیٹ جاتا ہے ۔ یوسف نہیں سوتا ۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے ۔ صولت دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے ۔ وقفہ ۔۔۔ نیچے دروازے پر دستک ہوتی ہے ۔ یوسف کھڑکی میں دروازے کو دیکھتا ہے ۔ ایک سیاہ بلی صولت کے پلنگ کے نیچے سے نکلتی ہے ۔ اور ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی سنگھار کی میز پر چڑھ جاتی ہے ۔ پھر وہاں سے بھاگتی ہے گلدان دھم سے نیچے گر پڑتے ہیں ۔ گلدستے کہیں جا پڑتے ہیں ۔ اور گلدان ٹوٹ جاتے ہیں ۔ یوسف یہ منظر دیکھتا ہے ۔ اور میز کے قریب آتا ہے ۔ اسکے لبوں سے کلمہ تاسف نکلتا ہے ۔ بلی کمرے سے نکل جاتی ہے ۔ یوسف پھر کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے ۔ کھڑکی میں سے دیکھتا ہے ۔ رحیم اُٹھکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے ۔ یوسف اس کے قریب آتا ہے ۔ اور اُسے دروازہ کھولنے کے لئے کہتا ہے ۔ رحیم چپ چاپ چلا جاتا ہے آندھی کے تیز رو جھونکوں سے پلنگ کے قریب کھڑکی کے سیاہ پردے کو جنبش ہوتی ہے ۔ اور وہ صولت کے چہرے کو چھونے لگتا ہے شمعدان کی روشنی خود بخود کم ہو جاتی ہے ۔ پلنگ کے اوپر چھت میں سے جہاں چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا ہے ۔ چند تنکے اور تھوڑی سی مٹی گرتی ہے اور صولت پر پڑتی ہے ۔ صولت کے منہ سے آہستہ آہستہ نکل رہا ہے ۔ " دروازہ نہ کھولو ۔۔۔

دروازہ ——— نہ کھولو۔ کوئی بھی اس کی آواز نہیں سن سکتا۔ صابرہ کے ہاتھ سوتے میں اخود بخود آگے بڑھتے ہیں۔ اور وہ خوف کے زیر اثر چیخ مار کر بیدار ہو جاتی ہے۔ صولت اپنا ہاتھ بند کرتا ہے ——— کروٹ لیتا ہے۔ اور گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ خالدہ اور یوسف صابرہ کو لئے کھڑکی کے قریب چلے جاتے ہیں۔)

یوسف۔ کیا ہوا صابرہ !

خالدہ۔ سوتے میں ڈر گئی ہے۔

یوسف۔ (صابرہ کو چپ کراتے ہوئے) ابا جان سو رہے ہیں ——— تمہارے رونے سے جاگ اٹھیں گے —!

صابرہ۔ ابا ——— ابا !!

(صابرہ حیران و ششدر دونوں کو دیکھ رہی ہے خالدہ ٹوٹے ہوئے گلدانوں کو دیکھتی ہے)

خالدہ۔ گلدان ٹوٹ گئے۔

یوسف۔ کمبخت بلی توڑ گئی ہے۔

(خالدہ کے لبوں سے کلمۂ تاسف نکلتا ہے)

خالدہ۔ اب پتے زیادہ گرنے لگے ہیں۔ آسمان پر چاند اور پھیکا ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا ایک زرد پتا پانی میں بہ رہا ہے ——— ندی کا پانی تو کہیں نظر ہی نہیں آتا !

(دونوں کی آنکھوں کی گہرائیوں میں خوف و

[illegible]

کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ شمعدان کی روشنی اور کم ہو جاتی ہے۔ بلی پھر آتی ہے، اور چپکے سے ایک گلدستے کے پھول نوچنے لگتی ہے)

یوسف۔ تم ڈر کیوں رہی خالدہ !

خالدہ۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے بھائی جان !

یوسف۔ حوصلہ کرو ——— ابا جان جاگ اٹھے ہیں۔

(دونوں اس طرف جاتے ہیں۔ صولت بیقرارانہ کروٹ لیتا ہے۔ آندھی کے تیز و تند جھونکے ششدر سے ٹکراتے ہیں۔ سمع خراش شور پیدا ہوتا ہے رحیم آتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک سایہ حرکت کر رہا ہے۔ جھونکے روشندانوں سے ٹکرا کر ایسی آواز پیدا کرتے ہیں جو قبرستان کے پرانے زنگ آلود دروازے کے کھلنے سے پیدا ہوتی ہے چند لمحوں کے بعد موت ——— ایک سیاہ رنگ خوفناک صورت بوڑھی عورت، جس کے لمبے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ موٹے موٹے کالے بال شانوں اور زرد گالوں پر بکھرے ہوئے ہیں، داخل ہوتی ہے۔ اور بے تکلفانہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ تمام حیران ہو جاتے ہیں صولت، خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھتا ہے۔ سیاہ بلی اُسے گھور گھور کر دیکھتی ہے۔ اور چیخ مار کر تیزی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ صابرہ ڈر کر بھائی کے سینے سے چمٹ جاتی ہے)

یوسف ۔ (موت سے) تم کون ہو؟

موت ۔ (صولت سے) ڈر گئے ـــــ تمہیں مجھ سے ڈرنا ہی چاہئے ۔ (بلند قہقہہ لگاتی ہے)

یوسف ۔ تم کون ہو؟

موت ۔ لوگ میرے عمل سے مجھے جان لیتے ہیں ۔

صولت ۔ یوسف! اسے باہر نکال دو ۔ اس کی آنکھیں اندھے کنوئیں کی طرح تاریک دکھائی دے رہی ہیں ۔ اس کے بال سلاخوں کی طرح نظر آتے ہیں ۔

موت ۔ میں خود بخود چلی جاؤں گی!

یوسف ۔ تم کون ہو آخر؟

موت ۔ تم پوچھنے پر مصر ہو تو بتاتی ہوں ۔ میں وہ ہستی ہوں، جو چاند کو روشنی سے محروم کر دیتی ہے ـــــ پھولوں سے تر و تازگی چھین لیتی ہے ۔ نہر کا پانی چوس لیتی ہے ۔ درختوں کے پتے گرا دیتی ہے ۔ تباہی میرے بالوں کے گہوارے میں جھول رہی ہے ۔ خزاں میرے سانس کی لہروں میں رہتی ہے ۔ اور تخریب میری آنکھوں کی گردش میں زندگی کے سانس لے رہی ہے ۔

خالدہ ۔ اسے نکال دو بھائی جان!

یوسف ۔ یہاں تمہارا کیا کام!

موت ۔ یہاں بھی میں اپنا فرض ادا کرنے آئی ہوں ۔

یوسف ۔ کیا فرض؟ یہاں درخت نہیں، نہر نہیں، پودے نہیں! رنگت، خوشبو اور تر و تازگی چھیننے آئی ہوں ۔

(صولت بیقرارانہ کروٹ لیتا ہے ۔ اس کے چہرے کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے ۔)

صولت ۔ (کمزور و ضعیف آواز میں) پانی ـــــ اف میرے سینے میں سخت ـــــ درد ہو رہا ہے ۔

(خالدہ ایک کونے میں جاکر گلاس میں پانی ڈالتی ہے ۔ اور گلاس لاکر صولت کو دیتی ہے)

یوسف ۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟ یہاں سے چلی جاؤ ۔

موت ۔ میں نے جو کہہ دیا خود بخود چلی جاؤں گی ـــــ لیکن اپنا فرض ادا کرنے کے بعد ۔

یوسف ۔ تو اب کیوں نہیں جاتیں ۔

موت ۔ وہ پھول ابھی پژمردہ نہیں ہوا ۔

یوسف ۔ کونسا پھول؟

موت ۔ (صولت کی طرف اشارہ کرکے) یہ پھول ۔

خالدہ (مضطربانہ) ابا جان ـــــ ابا ۔

موت ۔ اب تم نے جان لیا میں موت ہوں ۔

یوسف ۔ موت ـــــ یہاں؟

صولت (گھبرا کر) موت (فرطِ ضعف سے گلاس اسکے ہاتھ سے گر پڑتا ہے ۔ تمام پانی بہ جاتا ہے)

موت ۔ میں زندگی کے جام بھی اسی طرح خالی کر دیتی ہوں ۔!

صولت ۔ یہاں تم ـــــ

موت ۔ (اس کے الفاظ کاٹ کر) یہاں میں تمہارے واسطے

یوسف۔ مردہ ——؟ تم بوڑھی عورت! میں تمہاری ہڈیاں پیس ڈالوں گا (غضبناک ہو کر موت کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اور اسے مروڑنا چاہتا ہے۔ موت ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیتی ہے)

موت۔ (قہقہہ لگا کر) بے عقل نہ ہو لڑکے! دنیا کی کوئی طاقت میرا بڑھتا ہوا ہاتھ نہیں روک سکتی۔ میرا جسم پتھر کا ہے۔ مجھے مار کر اپنے ہاتھ کو چوٹ پہنچاؤ گے!

صولت۔ تم موت ہو —— اور میری جان لینے آئی ہو؟؟

موت۔ ہاں۔

صولت۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں کمزور ہوں۔ میرے بازوؤں میں طاقت نہیں، مگر میں تمہارے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لوں گا۔ تمہاری کلائی کو مروڑ دوں گا۔

یوسف۔ ابا جان! آپ مطمئن رہیں۔ یہ بوڑھی کھوسٹ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔

(موت کے سینے پر گھونسہ مارتا ہے۔ اور شدتِ درد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔)

موت۔ نادان بچے! کیا فائدہ ہوا۔ اپنے ہاتھ کو ناحق تکلیف دی۔

خالدہ۔ میں ابا جان کی حفاظت کروں گی۔ ابا جان! (پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے۔ یوسف موت کو متحیرانہ دیکھتا ہے)

یوسف۔ رحیم! آؤ اسے نکال دیں۔

(موت رحیم کو گھور کر دیکھتی ہے۔ وہ بچی کو گود سے اتار دیتا ہے۔ اور موت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہے موت کے ہاتھ کو ذرہ بھر حرکت نہیں ہوتی۔ وہ حیران و ششدر کھڑا ہو جاتا ہے)

موت۔ تمہاری یہ کوششیں بالکل بیسود ہیں —— جو ہونا ہے وہ بہر صورت ہو کر رہے گا —— موت کا ہاتھ کبھی رک نہیں سکتا!

یوسف۔ آج رک جائیگا —— ہم جان پر کھیل کر ابا جان کو بچائیں گے۔

خالدہ۔ ہماری موت کے بعد ابا جان پر تمہارا قبضہ ہوگا!

موت۔ میں دیکھتی ہوں فانی انسان کی مضحکہ خیز کوششیں میرے راستے میں کیا رکاوٹ پیدا کرتی ہیں (صولت کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ دونوں بھائی بہن اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ مگر وہ آگے بڑھے جاتے ہیں۔ صولت کے چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو گیا ہے۔ آنکھیں بے نور ہوتی جا رہی ہیں ننھی صابرہ چیخنے لگتی ہے۔ موت کا ہاتھ تھم جاتا ہے۔ سب حیران و سراسیمہ، خوفزدہ و متعجب کھڑے ہیں)

خالدہ۔ (موت کو ملتجیانہ دیکھتے ہوئے) ابا جان کو چھوڑ دے موت! ہمارا ہمارا آخری سہارا نہ چھین۔

[illegible]

(صابرہ: ابا جان ابا جان کہتی ہوئی مریض باپ کے پاؤں سے چمٹ جاتی ہے)

یوسف۔ فرض؟ کونسا فرض؟ ؟ چلی جاؤ!

موت۔ مجھے تم بیوقوفوں پر ہنسی آتی ہے۔

یوسف۔ جاؤ، ورنہ مجھے اپنی تلوار سے کام لینا ہوگا۔ رحیم تلوار لاؤ۔

موت۔ (قہقہہ لگاکر) موت کو تلوار سے ڈراتے ہو۔ بے عقل بچے!

یوسف۔ خبردار اب ابا جان کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا۔ رحیم! جلدی میری تلوار لاؤ۔

(رحیم تلوار لاکر یوسف کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)

موت۔ کیا کرو گے اب بے سمجھ بچے!

یوسف چلی جاؤ۔ ورنہ میں تم پر وار کرونگا۔

صولت۔ ٹھہرو بیٹا! یہ فضول ہے ــــــ فضول ہے۔

یوسف۔ نہیں ابا جان! میں اسے قتل کرڈالوں گا۔

موت۔ کرو وار۔ تمہاری تلوار کند ہوجائے گی ــــــ تمہارے ہاتھ پر چوٹ آئے گی۔ بیہودہ انسان کیا کیا حرکتیں کرتا ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے۔

(یوسف پورے زور سے 'موت' پر وار کرتا ہے۔ تلوار موت کے جسم پر لگتی ہے۔ اور یوسف کے ہاتھ سے گر پڑتی۔ یوسف کے ہاتھ کو چوٹ آتی ہے)

خالدہ (ڈرکر) بھائی جان!

یوسف۔ میرے ہاتھ کو چوٹ آئی ہے۔

ہاتھ میں دو بیٹا!

یوسف۔ ابا جان! اس کا جسم لوہے کا ہے۔

موت۔ ایک اور وار کرو۔

خالدہ۔ ظالم ڈائن!

یوسف۔ میں تمہیں آگے نہیں بڑھنے دونگا۔

صولت۔ خاموش رہو بیٹا!

موت۔ تم بولتے جاؤ۔ میرے کان بہرے ہیں۔ میرا دل پتھر کا ہے!

خالدہ۔ رحم کر موت! ابا جان کے سوا ہمارا دنیا میں اور کوئی نہیں۔

موت۔ مجھے کیا۔ ان الفاظ سے میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

خالدہ۔ تجھے رحم کرنا آتا ہے ــــــ تو رحم کرسکتی ہے! میں تیری منت کرتی ہوں۔ تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اگر کہو تو تمہارے پاؤں پر اپنا سر رکھدوں!

موت۔ ان باتوں سے فائدہ کم عقل لڑکی؟

یوسف۔ اس قدر سنگدل!

موت۔ اس سے ہزار درجہ زیادہ۔

خالدہ۔ میں تیری منت کرتی رہوں گی۔ یہاں تک کہ تیرے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوجائے۔

موت۔ رحم! میں نہیں جانتی رحم کیا ہے؟ رحم کی تم ایسے فانی انسانوں کو حاجت ہے۔ مجھے نہیں۔ میرا کام ہی بے رحمی ہے!

تو رحم کرنے پر مجبور ہو جائے گی!

صولت۔ خاموش رہو پیاری بیٹی! جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا!

خالدہ۔ آپ زندہ رہیں گے ابا جان! میں موت کی ٹانگوں سے لپٹ جاؤں گی۔ اپنے آنسوؤں سے —— اسکے پاؤں دھو ڈالوں گی۔

یوسف۔ سنگدل موت! یہ الفاظ سُنکر بھی تیرے دل میں رحم پیدا نہیں ہوتا!

موت۔ کبھی نہیں۔ تمام دنیا بھی آہ وزاری کر کے میرا ہاتھ روکے تو میں اپنا کام کر دوں گی۔

خالدہ۔ تو رحم کرے گی —— کرے گی۔ دیکھ میں تیرے پاؤں پر اپنا سر رکھدیتی ہوں۔

(خالدہ جھک کر اپنا سر موت کے پاؤں پر رکھدیتی ہے۔ موت ایک حقارت انگیز ہنسی ہنسکر اس کے سر کو ٹھوکر لگاتی ہے۔ یوسف غضبناک ہو کر موت کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر خود بخود رک جاتا ہے)

یوسف۔ تمام دنیا کی بے رحمی نے تیری صورت اختیار کر لی ہے۔

موت۔ ہاں، اس لئے کہ میں موت ہوں!

خالدہ۔ نہیں یوسف! یہ نہ کہو یہ رحم کرے گی!

یوسف۔ تمہارے سر کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

خالدہ۔ تم چپ رہو۔ موت! ابا جان نے اس سر پر ہزاروں بار پیار سے ہاتھ پھیرا ہے۔ آج یہ سر دوبارہ تیرے
پاؤں پر رکھتی ہوں۔ تو [illegible]

ٹھکرانی رہے گی۔ تیرے پاؤں ٹھکراتے ٹھکراتے تھک جائیں گے۔ میرے سر کے بال تیری انگلیوں کو جکڑ لیں گے۔

صولت۔ پیاری بچی! ایسا نہ کرنا۔ خالدہ —— میری خالدہ۔

یوسف۔ اب تو رحم کر موت! میں تمام عمر تیرا احسان مند رہوں گا۔ دیکھ ننھی صابرہ کس طرح بلک رہی ہے۔ یہ ہر وقت ابا جان کی گود میں رہتی ہے۔ دیکھ اس بچی پر رحم کر!

خالدہ۔ تم جو چاہتی ہو مجھ سے لیلو۔ میرے پاس بہت قیمتی ہیرا ہے۔ یہ لے لو۔ یہ ہیرا ہمارے خاندان کی سب سے بڑی وراثت ہے۔

موت۔ ہیرا!

(خالدہ جلدی سے جاتی ہے اور ایک الماری میں سے ہیرا لے آتی ہے)

خالدہ۔ لو یہ ہیرا۔

(ہیرے کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی ہے)

یوسف۔ میرے پاس دو موتی ہیں وہ بھی لے لو۔

موت۔ (ہیرے کو پھینکتے ہوئے) کتنی فضول کوشش!

خالدہ۔ یہ نہ کہو۔ ہمارا دل نہ توڑو۔ آج تک کسی نے بھی سخت بات ہم سے نہیں کہی۔ تمہارے ظلم سے ہمارا دل ٹوٹ جائیگا۔

موت۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔

صولت۔ بیٹی مجھے اپنا ہاتھ دو۔ میرا آخری وقت آپہنچا۔

[illegible]

ہوگیا ہے۔ وہ جا رہی ہے!

موت۔ کتنی لغو تسلی!

یوسف۔ تو یہ ظلم ضرور کرے گی!

موت۔ ہاں مجھے بہرصورت اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

رحیم۔ (جو اب تک خاموش رہا ہے) دیکھ ظالم موت! ننھی بچی کس طرح چیخ رہی ہے۔ اس پر تو رحم کر۔

خالدہ۔ تم نہ بولو رحیم! موت کے دل میں رحم پیدا ہوگیا ہے۔

موت۔ بولتے جاؤ ـــــ مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ کرکے رہونگی!

خالدہ۔ رحم موت رحم۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ آنکھیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔ میں ایک آنکھ تمہیں دے دونگی ـــــ اباجان کو ایک ہی آنکھ سے دیکھا کروں گی۔

صولت۔ (تڑپ کر) بیٹی خالدہ ـــــ میری خالدہ۔ اپنا ہاتھ دو۔ اپنا ہاتھ۔

(صولت اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ خالدہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے۔ صابرہ کو گود میں اٹھالیتا ہے)

یوسف۔ یہ منظر بھی تمہیں رحم کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

موت۔ نہیں۔ میں موت ہوں!

صولت۔ یوسف تم بھی ہاتھ دو مجھے اپنی پیشانی چومنے دو صابرہ میری ننھی بچی۔ میری صابرہ!

موت۔ میں اب ـــــ زیادہ وقت ضائع نہیں کرسکتی!

خالدہ۔ خدا کے لئے ہم سے اباجان نہ چھینو۔

موت۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

خالدہ۔ رحم کر موت۔!

(صولت سے چمٹ جاتی ہے۔ یوسف بھی باپ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ننھی صابرہ ڈر کر باپ کے سینے سے چمٹ جاتی ہے۔ کمرے میں شور و شیون برپا ہوجاتا ہے)

موت۔ اب وقت آگیا ہے۔

(خالدہ کا ہاتھ زور سے کھینچتی ہے ـــ وہ پلنگ سے گر پڑتی ہے۔ اس کے سر سے خون بہنے لگتا ہے۔ موت ننھی صابرہ کو بھی کھینچ لیتی ہے۔ آندھی کے تیز و تند جھونکے زور زور سے روشندانوں کیساتھ ٹکرا رہے ہیں۔ موت صولت کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے وہ مردہ ہوکر گر پڑتا ہے۔ خالدہ پھر اُٹھتی ہے باپ سے لپٹ جاتی ہے۔ یوسف بھی باپ سے لپٹ جاتا ہے۔ موت تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے اتر جاتی ہے۔)

یوسف۔ اباجان۔ اباجان!

خالدہ۔ اباجان۔ تم بولتے نہیں۔ تمہاری آنکھیں بے نور ـــ بھائی جان ان کو کیا ہوگیا ـــ موت ـــ اباجان ـــ

(بیہوش ہوکر گر پڑتی ہے۔ یوسف اور رحیم اسکے منہ میں پانی ڈالتے ہیں۔ عالم بیہوشی میں وہ آہستہ اباجان! اباجان کہہ رہی ہے ننھی صابرہ باپ کے سینے سے لپٹکر اُسے

[illegible]

جناب روشؔ صدیقی

منزلِ خورشید

شکستِ نغمہ روحِ ساز کا پیغام ہو جائے
اجازت ہو، کہ اب سوزِ محبت عام ہو جائے

ہر اک ذرہ جہاں منزل ہے خورشیدِ محبت کی
وہیں اے کاش اصبحِ زندگی کی شام ہو جائے

جو آغازِ محبت کا کوئی انجام ہوتا ہے
تو آغازِ محبت ہی، مرا انجام ہو جائے

اسے اے جذبۂ بے اختیارِ عشق کیا کہیے
کہ وہ ناکام کر دیں اور کوئی ناکام ہو جائے

وہاں کچھ شکوہ ہائے برملا، لیکر چلا ہوں میں
جہاں شکرِ جفا بھی، موردِ الزام ہو جائے

وہیں سے ابتدا ہوتی ہے اقلیمِ محبت کی
جہاں مجبورِ دورِ گردشِ ایام ہو جائے

نہ پرسش ہو کسی سے چاک دامانِ محبت کی
وہاں بھی کاش میری وحشتوں کا نام ہو جائے

تصور رہی روشؔ اک بادۂ خوش جام ہے شاید
خوشا وقتے کہ دورِ بادۂ خوش جام ہو جائے

جناب سید اختر احمد صاحب اورینوی ایم۔ اے۔

(چار ایکٹ کا ڈراما)

شہنشاہ حبشہ

افراد ڈراما

۱ شہنشاہِ حبش ——————

۲ ملکۂ حبش ——————

۳ شہزادی نیورا (شاہ حبش کی منہ بولی بیٹی)

۴ ڈیڈشاسماچ محمد - ایک فوجی افسر۔

۵ جرنیل واہب پاشا - ایک ترکی جرنیل -

۶ راس سیتوم - حبشی جرنیل

۷ " دستہ " "

۸ " گاست " "

۹ " نمرو " "

۱۰ " مولوسجتا " "

۱۱ " نصیبو " "

۱۲ ڈاکٹر احمد —— ایک ہندوستانی ڈاکٹر

۱۳ حبشی نرسیں ——————

۱۴ " مددگار ——————

۱۵ فوجی کپتان ——————

۱۶ محافظ دستہ کے سپاہی ——————

۱۸ پہرہ دار ——————

۱۹ [illegible] راس اور فوجی افسر ——————

۲۰ پادری، راہب، عورتیں، قبائلی جنگجو وغیرہ

۲۱ صدر مجلس اقوام ——————

۲۲ مندوبین اقوام ۵ کس

۲۳ اطالوی صحافی ۳ کس

۲۴ دوسرے صحافی ——————

۲۵ راہ نما ——————

۲۶ روموگو - افسر لاسلکی (فرانسیسی)

۲۷ فوج کے چند دستے ——————

۲۸ سلطان اوسا - شہنشاہ حبش کا ایک مسلم باجگذار سلطان

۲۹ زخمی سپاہی - کئی ——————

۳۰ خبر رساں۔ ——————

۳۱ شہنشاہ کے افرادِ خاندان

دو بیٹے اور تین بیٹیاں ——————

ایکٹ نمبر (۱)

منظر اوّل

اگست ۱۹۳۵ء

منظر (ادیس ابابا۔ شاہی محل صبح صادق کا وقت شاہِ حبش کے خاصہ کا محافظ دستہ محل کے احاطے میں پہرہ دے رہا ہے۔ سارے شہر کو بھور کا دھندلکا ملفوف کئے ہوئے ہے۔ دور افق پر منڈلاتے ہوئے ہوائی جہازوں کی گردش کنان پنکھیوں کا شور سکوتِ صباح کو توڑ رہا ہے۔ شہر پر اداسی سی طاری ہے۔ ایک بیرونی محلے میں، جہاں غیر ملکی رہتے ہیں۔ کچھ شور وغل سنائی دیتا ہے۔)

ایک سپاہی۔ جنگ! جنگ!! دیکھو سنو! شہر کے اوپر ہوائی جہاز منڈلا رہے ہیں۔ اطالوی! اطالوی!!

دوسرا سپاہی۔ ایں ... ! کیا جنگ چھڑ گئی؟ طیارے! طیارے؟؟

ایک نوجوان افسر۔ خاموش! یہ پُرامن ممالک کے ہوائی جہاز ہیں، اپنے اپنے ملکوں کی رعایا کو لینے آئے ہیں۔

تیسرا سپاہی۔ تو کیا آخر کار جنگ چھڑ گئی؟ تب ہی تو غیر ملکی شہر چھوڑ رہے ہیں۔

نوجوان افسر۔ قرینہ تو یہی ہے۔

پہلا سپاہی۔ اچھا تو یہ اطالوی طیارے نہیں ہیں۔ شکر خدا!

دوسرا سپاہی۔ جنگ چھڑ گئی اور ساری گفت وشنید بیکار گئی ہے نا؟

نوجوان افسر۔ ہمارے شہنشاہ نے بہت کوشش کی کہ ان کی رعایا جنگ میں ہلاک نہ ہو۔ مگر ان کی سعی لاحاصل رہی۔ مسولینی ایک سرپھرا سانڈ ہے۔ پُرغرور انسان وہ دنیا کو جنگ کے شعلوں میں جلانا چاہتا ہے۔

پہلا سپاہی۔ کیا اطالوی بہت طاقتور ہیں؟

افسر۔ اُن کو اپنی طاقت پر ناز ہے۔ مگر فتح وشکست کو کوئی نہیں کہہ سکتا۔

دوسرا سپاہی۔ کیا نہتا حبش، سازوسامان والے اطالیہ کا مقابلہ کر سکے گا؟

افسر۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) بزدل! سپاہی کا کام صرف حفظِ وطن میں جنگ کرنا ہے۔ فتح وشکست سے اُسے کیا بحث! سپاہی کی فتح اُس کی جان سے پیاری ہے۔ ڈرپوک کی فتح بھی شکست ہے۔ اور بہادر کی شکست حقیقتاً فتح ہے۔

محافظ دستہ کے سب سپاہی۔ بیشک! بیشک!! حبش زندہ باد! ہیلے شلاسی کی فتح!! ....

(شاہِ حبش محل کے وسیع جھروکے میں سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے اُسے نہیں دیکھا۔ ہیلے شلاسی بہت متفکر نظر آتا ہے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں دورِ افق پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کی بلند پیشانی پر پیچھے دو بال پریشان ہیں۔ بشرے سے اضمحلال ٹپکتا ہے مگر اُس کی پیشانی

کی تنی ہوئی لکیروں اور اس کے کھڑے ہونے کے
پُرشوکت انداز سے عزم و ارادہ ظاہر ہوتا ہے)

دوسرا سپاہی۔ (شرمندہ ہوکر) نہیں نہیں! میرا مطلب
یہ تھا کہ کیا ہمارا ملک بھی جنگی طیاریاں کر رہا ہے
یا نہیں؟

افسر۔ اصل طیاری تو حوصلوں کی بلندی اور جذبۂ ایثار
کی فراوانی ہے۔ مگر ہمارے شہنشاہ جنگی طیاریوں
سے بھی غافل نہیں وہ دن رات اسی فکر میں غلطاں
رہتے ہیں۔ ہمارے پیارے شہنشاہ کی رفیع پیشانی
پر فکر زائیدہ قطرات عرق بلند آسمان کے ستاروں
کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ کیا ہم اکثر صبح کو یہ منظر اس
جھروکے پر نہیں دیکھتے (جھروکے کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے)

(سب سپاہیوں کی نظریں جھروکے کی طرف
اُٹھ جاتی ہیں، جہاں شاہ حبش استادہ ہے۔
اسلحہ آراستہ ہو جاتے ہیں، ہر سپاہی چوکس ہوکر
فوجی سلام کرتا ہے اور نعرہ بلند ہوتا ہے)

سب سپاہی اور افسر۔ زندہ باد شہنشاہ! پایندہ باد شہنشاہ!

(شاہ حبش اپنے محافظ دستے کی طرف متوجہ ہوکر
محبت و احسان مندی کی نظروں سے دیکھتا ہے)

شاہ حبش۔ ڈیڈ شاسماچ محمدؐ!

نوجوان افسر۔ شہنشاہ زندہ باد! (چبوترے پر سے
ہوکر بیرونی دروازے سے جھروکے کی سیڑھیوں پر
چڑھ جاتا ہے)

شاہ حبش۔ شاسماچ محمدؐ!

(افسر فوجی سلام کرتا ہے اور گردن جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

شاہ حبش۔ بہادر اور وفادار شاسماچ! ملک کے تمام افسران
فوج اور عمائدین کو اطلاع بھیجو کہ ایک ہفتے کے
اندر مجلس شوریٰ میں یہاں جمع ہوں۔ حفاظتِ
ملک و وطن کے لئے ہمارے دماغ و دل کو اکٹھے
ہو جانا چاہیئے۔ جاؤ!

(نوجوان افسر سر جھکاتا ہے اور فوجی سلام کرکے رخصت
ہوتا ہے)

(زیرین منزل کے ہال سے فلورا شاہ حبش کی
بیٹی نمودار ہوتی ہے۔ افسر سیڑھیوں پر سے اتر
کر اور شہزادی کو دیکھ کر فوجی سلام کرتا ہے۔
شہزادی محبت پاش نظروں سے افسر کو دیکھتے
ہوئے مسکراتی ہے۔ نوجوان افسر فخر و محبت کے
نشہ میں جھوم کر نگاہوں سے سلام نیاز پہنچاتا
ہے۔ اور زیادہ گرمجوشی، سر بلندی اور غرور کے
ساتھ اپنے دستے سے جا ملتا ہے ـــــ پہرے
کی تبدیلی کا گھنٹہ بجتا ہے۔ محافظ دستہ رخصت
ہوتا ہے۔ دور سے دوسرا دستہ آتا دکھائی دیتا
ہے۔ شاہ حبش جھروکے پر کھڑا ہے اور شہزادی
فلورا زیرین منزل میں دونوں رخصت ہونے
والے دستے کو دیکھ رہے ہیں۔)

منظر دوم

(شاہ حبش کا دربار۔ راس سیوم، راس گاسا

راس دستہ۔ راس عمرو وغیرہ افسران حاضر ہیں۔ شاہ ہیلے شلاسی۔ ملکۂ سبا کے قدیمی تخت پر فوجی لباس میں متمکن ہے۔ تخت تراشے ہوئے سنگ سیاہ سے بنایا گیا ہے۔ پشت پر درمیان میں دائرے کے اندر معبود شمس کا چہرہ ہے اور دائرے کے اوپر صلیب کا نشان ترشا ہوا ہے۔ دائیں اور بائیں لانبے لانبے ایال والے صحرائی شیر ببر کے مجسمے ہیں۔ افسران فوج دامن دراز سفید لبادہ وردی کے اوپر پہنے ہوئے ہیں اور داہنے ہاتھ میں چمکدار و طویل نیزے لئے ہوئے۔ سب کھڑے ہوئے ہیں۔ اور انکے عقب میں مغربی وضع کی اونچے پشت والی کرسیاں دو رویہ ایک مختصر خم دائرہ بنا کر ترتیب دی گئی ہے۔)

شاہِ حبش ۔ معزز سردارو! وفادار سالارو! بیٹھ جاؤ۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کیوں بلائے گئے ہو۔ ظالم اور کمینہ اطالیہ کے پُرغرور دماغ میں پھر یہ خیال خام پیدا ہوا ہے کہ وہ معزز حبش کے شریف باشندوں کو غلام بنائے آج سے چالیس برس پہلے بزدل اطالیہ نے یہی سوچا تھا۔ مگر بہادر شیر دل منلک اعظم نے ہزاروں اطالویوں کو جہنم واصل کرکے یہ ثابت کردیا تھا کہ قدیم حبش بزور شمشیر آزاد رہے گا۔ آج ہمارے سامنے بھی ایسا ہی موقعہ ہے۔ ہم ملکۂ سبا اور سلیمانِ اعظم کے وارث ہیں۔ اور ہم پر فرض ہے کہ اس مقدس وراثت کی حفاظت میں اپنی جانیں لڑادیں۔

(نیزے بلند ہوتے ہیں اور زندہ باد حبش کے نعرے ہال میں گونجتے ہیں) تمہارا شہنشاہ تمہارے سامنے ہے۔ اور قسم ہے تختِ سلیمان کی! یہ اپنی جان آزادیٔ وطن کے لئے ہر وقت قربان کرنے کو حاضر ہے (زندہ باد شہنشاہ! شہنشاہ کی عمر دراز کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔)

تمہارے شہنشاہ نے ہر شریفانہ کوشش کی کہ اس کی رعایا کا خون نہ بہایا جائے۔ مگر مغرور مسولینی انسانیت کو جنگ کے خونخوار درندے کے سامنے پھینک دینا چاہتا ہے۔ مجلس اقوام کی تنبیہ کے باوجود وہ بدذات حیلہ جو معزز و قدیم حبش پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں۔ کہ تم اے باوقار سردار اور سارا ملک اس کمینہ بھیڑیئے کے حملے کی مدافعت اپنے نیزوں کی تابر نوک سے کرنے کے لئے بےچین ہے (شاہ حبش اپنے نیزے کو زور سے زمین پر ٹیکتا ہے اور خاموش ہوجاتا ہے)

سب سردار ۔ تمہاری بے مثال وفاداری سے ہمیں یہی امید ہے!

راس سیوم (کھڑے ہوکر) اے شہنشاہ عالی مرتبت! ہماری تلواریں میانوں میں دشمن کا خون پینے کے لئے مچل رہی ہیں۔ حکم ہو اور ہم دشمن کے حلقوم کو بیل کی گردن کی طرح کاٹ کر رکھدیں

(بیٹھ جاتا ہے)

راس دستہ۔ (کھڑے ہوکر) قسم ہے مقدس آگ کی،
ہم شیرِ نیستاں کی طرح اطالوی گورخروں کی گردن
چبا ڈالیں گے! (بیٹھ جاتا ہے)
راس عمرو۔ (کھڑے ہوکر) عالیجاہ! ہمارے سورما سرحدوں
پر پرے جمائے ہوئے ہیں۔ صرف حکم کی دیر ہے!
(بیٹھ جاتا ہے)
راس گاسا۔ (کھڑے ہوکر) مقدس ارواح کی سوگند! اے
شہنشاہِ عالی تبار! ان بہادر سرداروں نے سارے
حبش کی ترجمانی کی ہے۔ مگر ہمیں مزید کوشش
کرنی چاہیئے کہ صلح کی صورت پیدا ہوجائے تاکہ
مردم سوز جنگ کی شعلہ فشانیاں حبش کے دورِ جدید
کی نئی کونپلوں کو جلاکر راکھ نہ کردیں (بیٹھ جاتا ہے)
شاہِ حبش۔ معزز جرنیلو! راس گاسا نے صحیح خیال کا اظہار
کیا ہے۔ مگر اب تک واقعات کے دھارے اس
مقام سے آگے بہہ نکلے ہیں۔ ہم نے مجلس اقوام کے
ذریعہ دولِ عظمیٰ کے سفراء کی وساطت سے اور
اپنے نمائندوں کے ہاتھوں سعی پیہم کی کہ سرحدی
تنازع صلح و آشتی سے طے پاجائے۔ مگر مسولینی
کی حرص نے اور ہی کچھ اسے سوجھایا ہے۔ تم واقف
ہو اے وفادار و شریف سردارو! کہ اس کے شرائط
صلح کس درجہ ذلت آمیز ہیں۔ قدیم حبش کی آزادی
کسی قیمت پر بھی بیچی نہیں جاسکتی۔ خدائے بزرگ
و برتر نے حبش کی سلطنت مجھے اس لئے دی ہے
کہ میں اس کی حفاظت کروں نہ کہ اس لئے کہ اسے
کسی مغرور و سرکش دشمن کے ذلیل ہاتھوں بیچ
دوں۔ راس تفاری اطالیہ کا غلام بنکر سلطنت نہیں
کرسکتا۔ راس تفاری اپنے محبوب حبش کو تاج و تخت
کے لئے بھی فروخت نہیں کرسکتا۔ معزز و قدیم حبش
کی آزادی مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔
مجھے ملکہ سبا کے تخت کی قسم میں حبش کی عزت
کے لئے سب کچھ قربان کردوں گا۔ (شاہ اپنے نیزے
اور اپنے پاؤں کو زور سے فرش پر ٹپکتا ہے)
سارا دربار۔ (سب کھڑے ہوجاتے ہیں) جنگ! جنگ!!
جنگ!!!
(مختلف آوازیں) ہم اطالیہ کو جہنم واصل کردینگے!
ہم مسولینی کو جنگلی سور کی طرح اپنے نیزے پر چن
لیں گے! زندہ باد حبش! شہنشاہ کی عمر دراز!....
شاہِ حبش۔ ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اور
اگر مقدس مریم نے اپنے بچوں پر نگاہ رکھی تو ہم
دشمنوں کے خون سے ایک دوسرے اوڈوا
کا نقشہ کھینچکر رکھدینگے۔ دلیرو! وطن کے جاں نثارو
بیٹھ جاؤ! (سب پھر بیٹھ جاتے ہیں)
راس سیوم۔ اے تختِ سبا کے وارث ذی جاہ! دشمن،
کمینہ اور حیلہ جو دشمن ہماری سرحدوں کے قریب
آگیا ہے۔ اور شہنشاہ کے جاں نثار بھی سرحدوں
کے قریب ڈٹے ہوئے ہیں۔ اے شہنشاہ! اب
ہمیں تاب برداشت نہیں کہ ہم باوقار حبش کی
ہتک ہوتی ہوئی دیکھ کر اپنے نیزوں اور برچھوں

کو بغیر حرکت دئے ہوئے نہیں رہ سکتے۔ عالیجاہ اشارہ فرمائیں اور ہم اطالیہ کے غول کو جنگلی گھاس کی طرح کاٹ کر رکھدیں!

سارا دربار۔ اے شہنشاہ! حکم! حکم! رخصتِ جنگ! اذنِ پیکار!!

شاہ حبش۔ بے شک! حبش کی عزت کی حفاظت کیجائیگی! ذی ہمت سردارو! میں ناحق اپنی رعایا کو ہرگز نہیں کٹوانا، مگر غیرت مند اور شریف خون کو حفظِ ناموس میں بہہ ہی جانا چاہئے۔ ہماری ملکہ نے مسلسل روزے رکھے اور امن و امان اور صلح آشتی کے لئے دعائیں کیں۔ ہم نے ان تھک کوشش کی کہ دنیا کا امن جنگ کی ہیبتناکیوں سے تباہ نہ ہو۔ اور ہنوز ہماری کوششیں جاری ہیں ہمیں امید ہے کہ برطانیہ اور فرانس مسولینی کے سر پُر غرور کو جھکا کر چھوڑینگے۔ برطانیہ تانا جھیل اور نہرِ سوئز اور مشرقی مقبوضات کے تحفظ و استحکام کی خاطر ضرور ہماری مدد کرے گا.....

(لاسلکی کے دفتر کا افسر عجلت سے دربار میں داخل ہوتا ہے)

مسٹر روموگو کیا خبر ہے؟

روموگو۔ (فرانسیسی) شہنشاہ! شمالی سرحدوں سے ابھی اطلاع آئی ہے کہ اطالوی پیش قدمی کرنے کے لئے آمادہ ہو چکے ہیں۔

شاہ حبش۔ معزز سپہ سالارو! اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنی نجابت و غیرت کا ثبوت دو! راس سیوم! تم ایک گھنٹہ کے اندر اندر اوڈاوا کی طرف روانہ ہو جاؤ اور شمالی افواج کی کمان اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لو۔

(راس سیوم کھڑے ہو کر سینہ پر دونوں ہاتھوں سے چلیپا بناتے ہوئے گردن اظہار قبول کے لئے جھکاتا ہے)

راس گاسا! تم جنوب کی طرف جاؤ اور کمان لے کر دشمن کی پیش قدمی کو ادھر روکو! (راس گاسا راس سیوم کی پیروی کرتا ہے) راس دستہ! تم راس سیوم کے ماتحت شمال کی جانب پر مامور ہو جاؤ (راس دستہ راس گاسا کی پیروی کرتا ہے) اور تم راس عمرو اوڈاوا سے ستر میل ادھر ایک لشکر جرار کی تنظیم و ترتیب کر کے احکامات کے منتظر رہو! (راس عمرو راس دستہ کی پیروی کرتا ہے) جاؤ اے بہادر سردارو! برق رفتاری کے ساتھ دشمن کے سروں پر ٹوٹ پڑو۔ جاؤ! اے وفادار دلیرو! مسیح تمہاری حفاظت کریں!!

(دربار برخواست ہوتا ہے۔ ایک خاموش جوش اور ایک پُر از ہول سنجیدگی طاری ہے۔ آنسوں کی ہلکی سی جھنکار اور قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ شاہ حبش تنہا رہ جاتا ہے)

شاہ حبش۔ (تخت سے آہستہ آہستہ اترتا ہے اور بے چینی سے ٹہلتا ہے)

عزت کی موت یا بے عزتی کی زندگی ؟ لے دل ! اے دل تو کیوں ڈوبا جاتا ہے ؟ . . . . نہیں ! نہیں ! یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ میں پیارے حبش کو ذلیل حیلہ جو مسولینی کے ہاتھوں فروخت کردوں . . . . .

آہ ! مگر مقابلہ ! غریب حبش ! مظلوم حبش ! ! کاش مجھے چند برس اور مل جاتے تو میں اپنے ملک کی پوشیدہ طاقتوں کو ابھار کر اس رومی درندے کے سر کو کچل دیتا ! . . . . کیا برطانیہ ہماری مدد نہ کریگا ؟ . . . . . کیوں نہ میں ملک کی معدنیات کا ٹھیکہ اُس اینگلو امریکن کمپنی کو دے دوں ؟ نہیں . . . ؟ بھیڑیئے کے منہ سے نکل کر شیر کے منہ میں جانا کونسی عقلمندی ہے ! یہ یورپ کے فراعنہ ! الامان ! یہ رنگدار اقوام کے گلے میں غلامی کی رسی رشتۂ محبت کے پردے میں ڈالتے ہیں — اور پھانس کو آہستہ مگر یقینی طور پر تنگ مضبوط کرتے جاتے ہیں . . . اے خدا ! اے خدا ! تو کب تک مظلوم رنگ دار اقوام کی مدد کو اپنے جلال و قدرت کے تخت سے اتریگا ! . . . . . آہ ! لیکن اس کے سوا چارہ کیا ہے ؟ . . . جاپان ؟ . . . بہت دور . . . . میرے اللہ ! اداسی تفاری جنگ سے نہیں ڈرتا ۔ اس نے اپنی زندگی تلوار کے سایہ میں گذاری ہے ۔ مگر وہ حبش کی تخریب کے خیال سے بھی کانپ اٹھتا ہے . . . .

کبھی نہیں ! قابل صد نفرت مسولینی کی آرزو کبھی نہیں پوری ہوگی ۔ اسنے حبش کی مسلسل ہتک کی ہے . . . . مجبوری ! مجبوری ! برطانیہ و فرانس کو تجارتی و معاشی حقوق دینے ہونگے مظلومی و مجبوری ! . . . اس تفاری کو لیگ کے دروازے پر بھیک مانگنی ہوگی ! (دلگیر ، اُداس ، سر جھکائے ہوئے ہال کے عقبی دروازے سے نکل جاتا ہے)

جناب شیخ محمد طفیل شماوی

نوائے رنگین

خیالات جب بھٹکے ہوئے طائر کی طرح اپنا آشیانہ تلاش کرلیں تو شعر بن جاتے ہیں ۔

تنکوں کو ضائع مت کر شاید کسی کا آشیاں بننے کے کام آئیں ؛

جناب میراجی

نظم

خاموشی

موہنی تال کنارے پہ چلی آتی ہے،
نرم قدموں کی صدا، دھیمی، نزاکت سے بھری!
لڑکھڑاتی چلی آتی ہے کوئی جل کی پری
جھیل کے سینے کو رفتار سے سہلاتی ہے!
سیمگوں سحر، مناجات کی ہموار صدا،
ہنس کی صاف روانی کا سکونِ ابدی!
یا فضاؤں میں ہو طیارے کا منظر، دھندلا،
سطحِ بحر پہ یا کوئی جہازِ بحری!
اور یا خواب میں اِندر کی پری کا بوسہ!
اوّلیں خون میں ملبوس کے جس طرح نہاں،
شرم آلودہ ہو، دوشیزہ، اچھوتا جذبہ!
نئی معبود سِنارے پہ چلی آتی ہے،
نرم قدموں کے سکوں زار میں لرزاں لرزاں،
موہنی تال کنارے پہ چلی آتی ہے!

شیخ محمد طفیل - ایس.پی.ایس

ہندوستانی بچوں کی صحت

اگر ہندوستان کے ایک بچے کا چال چلن بگڑ گیا۔ تو تو سمجھو ایک مایہ ناز لیڈر وفات پا گیا۔ کیونکہ اچھی تربیت سے وہی بچہ قابل قدر لیڈر بن جاتا ہے۔

دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ملک کے بچے غلیظ سست کمزور اور پڑھائی میں بالکل نکمے ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی صحت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اور اس طرح سے غریب بچوں کی صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے۔

مغربی ممالک کے ہر شہر میں بچوں کے کھیلنے کیلئے اس کثرت سے میدان موجود ہیں کہ آبادی کے بڑھ جانے پر بھی وہ کافی ہوں گے۔ اور جہاں جگہ کی قلت ہے وہاں حکومت نے اور طریقے اختیار کئے ہیں۔ جن سے بچوں کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

چھوٹے چھوٹے بازاروں کو جہاں پہیہ گاڑیوں کی آمد و رفت زیادہ نہیں یا خاص اوقات میں بچوں کے کھیلنے کے لئے بند کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ بچے حادثے سے بے خبر ہو کر کھیلیں۔ اور یہ تجویز کافی حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

سلفورڈ نے اس تحریک کو انگلستان میں چلایا اور اب روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے۔ محکمہ تعلیم برطانیہ کی طرف سے پچھلی دفعہ جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس میں اس خیال کی منظوری کے متعلق اعلان درج ہے۔

یہ تجویز چاہے عارضی کیوں نہ ہو لیکن ہم اسے ہندوستان جیسے ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔

اول۔ ہندوستان کی صحت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں گری ہوئی ہے۔

دوم۔ ہندوستان کے شہروں میں یہ تجویز بآسانی کامیاب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حکومت کو میدان بنوانے کیلئے زر کثیر صرف کرنا پڑے گا۔ جب تک میدان نہ بنیں اس تجویز پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی پود کی صحت ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے گی۔ ہماری آئندہ قسمت کا فیصلہ بچوں پر منحصر ہے۔ اگر ہم نے ان کی طرف توجہ نہ دی تو یہ سارے ترقی کے خواب وہم ہو کر رہ جائیں گے۔

حکومت نے اس سلسلے میں چند اقدام اٹھائے ہیں لیکن وہ ہندوستان کی کثیر التعداد مخلوق کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

مشکلات۔ خاص اوقات میں سڑکوں کا بند کر دینا

ایک آسان چیز نہیں جب یہ تجویز بمبئی کونسل میں پیش ہوئی تو اس کے لئے کوئی قانون نہ ملا جس کی وجہ سے سڑکوں کو خاص اوقات میں بچوں کے کھیلنے کے لئے بند کر دیا جائے۔

ہمارا یہاں یہ مطلب نہیں کہ اُن سڑکوں کو بھی بند کر دیا جائے جہاں آمد و رفت کثرت سے ہوتی ہے۔ صرف ان سڑکوں اور بازاروں کو پہیہ گاڑیوں کے لئے روک دیا جائے۔ جہاں آمد و رفت کم ہے۔ اور بچوں کی کافی تعداد کھیلنے کے لئے موجود ہے۔ اور نزدیک کوئی میدان نہیں۔ اس اصول پر بمبئی میں کئی یکطرفہ سڑکیں موجود ہیں۔ یعنی ان کے ایک ہی طرف گاڑیاں چل سکتی ہیں۔

یہ اعتراض کرنا کہ سڑکوں کو خاص اوقات میں بند کرنا موٹر لاری والوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوگا۔ صحیح نہیں۔ کیونکہ آج بھی کئی ایسے بازار موجود ہیں۔ جو پہیہ گاڑیوں کے لئے بند ہیں۔ اسی طرح اگر چند سڑکیں بچوں کے لئے بند کر دی جائیں تو کیا حرج ہے۔ ان کی تھوڑی سی تکلیف کے مقابلے میں ہندوستان کی آئندہ ترقی کا دارو مدار ہے۔

یہ ضروری ہے کہ بچوں کے کھیلنے کی جگہ ان کے گھروں کے نزدیک ہو۔ یہ بہت مشکل ہے کہ بچے کسی بڑے میدان میں جا کر کھیلیں۔ اس کے لئے اول تو وہاں تک پہنچنا بذاتِ خود مشکل ہے۔ اور یہ ٹریفک کی مزید مشکلات میں اضافہ کر دے گا۔

نئے کھیل۔ جگہ کی کمی کے باعث ایسے کھیل ایجاد کرنے چاہئیں۔ جن سے تھوڑی سی جگہ میں بچوں کی کافی ورزش ہو جائے۔ بچوں کو کھیل کے قواعد اچھی طرح سمجھائے جائیں۔ ہندوستانی بچے مثلاً اس بات میں بالکل نکمے واقع ہوئے ہیں۔ انہیں کپڑے کی میلی سی گیند بنا کر گلیوں میں اچھال لینی ہی آتی ہے۔ وہ قواعد سے بالکل لاعلم ہوتے ہیں۔

بچوں کا اصول پر عمل پیرا ہو کر کھیلنا ان کی زندگی کو بھی سدھار دیگا۔ اور انہیں اپنی زندگی میں ایک باقاعدہ انسان بنا دیگا۔ مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

ہر ایک شہر میں خاص انجمن ایسی قائم ہونی چاہئے۔ جو بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ آوارہ گلیوں میں پھرتے ہوئے بچوں کو روک کر اُن کے والدین کو اطلاع دے۔ اور اگر والدین کوئی عملی قدم اسکے متعلق نہ اٹھائیں تو انہیں جرمانہ کی سزا دی جائے۔ امید ہے کہ اس طرح ہندوستانی بچوں کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا!

عوام کو چاہیے کہ حکومت سے ایسے قوانین منظور کرا لیں۔ جن سے ہندوستان کی تباہ ہوتی ہوئی صحت بچ جائے۔

جناب پروفیسر عبداللطیف تپش ایم۔ اے۔

غزل

ہوا گلچیں کے آگے کیا بندھے بلبل کی گلشن میں
نہ گل اسکے گریباں میں نہ کلیاں اُس کے دامن میں

کرشمہ ساز کیف و کم ہے اک نیرنگِ نظارہ
طلسم نو بہ نو ہے پردہ پردہ چشمِ پُرفن میں

میری بربادیاں رو رو پڑی ہیں میری حالت پر
نزی بیباکیاں آ آ گئی ہیں دل کی الجھن میں

مجھے ناکامیٔ ارمان جانسوزی کا شکوہ ہے
مری قسمت بنی ہے حدِ فاصل برق خرمن میں

عناصر ہی کے دم سے کسوتِ ہستی کی رونق ہے
دھرا ہے چار ٹکڑوں کے سوا کیا جامۂ تن میں

نزاکت کو نزی رووؐں کہ اپنی سخت جانی کو
چلا آتا ہے اک مدت سے جھگڑا تیغ و گردن میں

محبت نے تپش یہ لطف کھویا زندگانی کا
بڑھاپا ہے جوانی میں جوانی تھی لڑکپن میں

جناب راجہ مہدی علی خانصاحب

نگارستانِ چین

جانشینی

میں اس تنہا پودے کے لئے اداس ہوں۔
جو دریا کے بستر کے — بہت قریب اگا ہے۔
آم کے بلند درخت پر کوئل نے
"کوکو" کر کے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔
دریا میں طغیانی آچکی ہے۔
دور دور تک پانی کے چھینٹوں کی آواز سنائی
دے رہی ہے۔
بن گھٹ کی کشتی آہستہ آہستہ ہچکولے کھا رہی ہے
کیونکہ ملاح موجود نہیں۔

(توفو)

زندگی

کشتی کی سیر کے بعد میں نے
دریا کے کنارے بیٹھ کر اتنی شراب پی
جتنی کبھی کسی نے نہیں پی
اور اب واپس آرہا ہوں۔
بہت کم لوگوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔
تتلی پھول پھول پر منڈلا رہی ہے۔
کالی مکھی پھولوں کے رخساروں کا رس چوس چوس کر
آہستہ سے اڑ جاتی ہے۔
ہر چیز اپنی مختصر سی زندگی میں لطف اندوز ہو رہی ہے
آؤ ہم بھی اپنی مختصر سی عمر میں زندگی سے زیادہ
سے زیادہ لطف اٹھائیں۔

(توفو)

اُمید

گذشتہ شام تم ایک دلہن تھیں۔
اس صبح تمہارا خواب تکمیل کو پہنچ چکا ہے . . . .
اپنے شوہر بدکار کو یوں رد نہ کرو۔
وہ ایک بار پھر تمہارا ہو سکتا ہے۔

(جوان نے یو)

بیزاری

میں اپنی چھوٹی سی ندی کو جاتا ہوں۔
جہاں سر ہلاتے ہوئے نے کے پودے
اور خوشبودار بوٹیاں اگی ہیں۔
اس کی گہرائیوں میں جل دیو
ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

آہ مجھے کس قدر تمنّا ہے کہ میں وہیں بیٹھا رہوں۔
لیکن اب میں زیادہ دیر تک
اس خوشنما مقام پر نہیں ٹھیر سکوں گا
میں یہاں بیٹھ کر خیالوں میں وقت کیوں کھوؤں۔
مجھے اپنے فرض کا احساس ہو چکا ہے
میں اپنے آسمانی آقا کا حکم بجا لاؤں گا۔
اس نے انسان کو بہت مختصر زندگی عطا کی ہے۔
اس مختصر سی زندگی کو یوں کاہل بن کر کھو دینا
کہاں کی دانشمندی ہے۔؟

(ہان یو)

خیمے میں بیٹھکر

سٹیپ کے میدانوں کے آر پار
جنوب کی تیز و تند ہوائیں
آوارہ پھر رہی ہیں۔
پو پھٹتے وقت ٹھٹھرتا ہوا چاند چمک رہا ہے۔
میری روح وطن کے خوابوں میں کھو گئی ہے۔
اور یہ اس وقت تک کھوئی رہے گی
جب تک لڑائی کے بگل کی آواز
مجھے چونکا کر بلا نہ لے گی۔

(ہن یو)

ابدی نیند

صبح کی مصروف مکھی کو گزند نہ پہنچاؤ۔
رات کے مچھروں کی جان نہ لو۔
[illegible]

تو انہیں اس سے روکو
بالکل مار ہی نہ ڈالو
آخر ان کی زندگی ہی کتنی ہے۔
وہ ایک دن کی پرواز کے بعد
اور مصروفیت کی چند مختصر گھڑیاں گذار کر
وہ تمہاری ہی طرح
ابدی نیند سو جاتے ہیں۔

وصال

جھلملاتا ہوا لباس پہنے
ایک دوشیزہ
اپنی خلوت گاہ سے
نیچے اترتی ہے
اور وہ اپنی بدقسمتی کا ماتم کر رہی ہے
جو اسے آوارہ پھرنے کی اجازت نہیں دیتی
وہ صحن میں ہر پھول کے قریب لگی ہوئی
کلیوں کو گننے لگتی ہے۔
اتنے میں یکایک
ایک بڑی سی کالی مکھی
پر پھڑپھڑا کر
اس کے بالوں میں سجے ہوئے
خوبصورت کلپ کے قریب آ بیٹھتی ہے۔

(ولیو یوحسی)

قصر ویران

اب یہ شاہی محل اجڑ چکا ہے
صرف چند پھول ہی باقی رہ گئے ہیں . . . . .
بادشاہ کی آنکھوں کا نور ———
سفید بالوں والی دوشیزہ
ایک جگہ بیٹھ کر
گذرے ہوئے دنوں کی باتیں
سنانے لگی ہے۔

——— (یوآن چین)

ایک معتوب

بہار کے چمکیلے پھولوں پر
شبنم چمک رہی ہے۔
ہوا ان کی خوشبو
دور دور لے جارہی ہے چرا کر۔
چاند کے نیچے
محل سے
گیتوں اور نغموں کی آوازیں
آنے لگی ہیں
یوں معلوم ہونے لگتا ہے
جیسے پن گھڑی میں
سارے سمندر کا پانی
ڈال دیا گیا ہے
تاکہ یہ طویل رات
مجھے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی
رات معلوم ہو

——— (تو مو)

فرقت

لٹکے ہوئے پردے سے پرے
خزاں کا چاند
سردی سے کانپتے کانپتے
آسمان سے جھانک رہا ہے
[illegible]
[illegible]
اپنے پر [illegible] رہی ہیں
رات اس قدر ٹھنڈی ہو رہی ہے
کہ ہر وادی میں [illegible] رہا ہے
آسمان کی [illegible] والی [illegible]
[illegible]

——— (تو مو)

۱ ایک ستارے کا نام۔ ۲ ایک ستارے کا نام

جناب رشید بی۔ اے　　　　(ادب لطیف کا افسانہ نمبر ایک نقاد کی نظر میں)

ادبِ لطیف کا افسانہ نمبر

"ادبِ لطیف" کی زندگی کا تیسرا سال شروع ہے۔ دو سالنامے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک افسانہ نمبر اب دوسرا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے۔ اور ہمارا ریویو بنقطہ ہے۔ ریویو کے محدود احاطے میں تفصیلات میں جانا ناممکن ہے۔ اس لئے میں اسے مختصر سے مختصر کرنے کی کوشش کرونگا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ادیب صاحب نے اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود افسانہ نمبر کو نہایت کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں۔ ہر قسم کا مواد بہم پہنچایا ہے۔ اور ترتیب و تدوین میں کافی محنت سے کام لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دو ایک افسانے کمزور بھی ہیں۔ میرزا ادیب "رابندر ٹیگر زدہ" معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے خاص نمبروں کے لئے خطوط کا سلسلہ محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ خطوط ان کا کوئی مفروضہ "صحرا نورد" دوست لکھتا ہے۔ جن میں صحرا کے کچھ رومان بداماں خوفناک واقعات جن میں دلچسپی الف لیلہ سے بھی بڑھ پائی جاتی ہے۔ درج ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے جب یہ سلسلہ کتابی صورت میں شائع ہو گا تو بہت دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ میرے خیال میں ایک صحیح قاری ان کے مطالعہ کے وقت اپنے آپ کو کسی صحرا یا کسی پُراسرار غار میں محسوس کرتا ہو گا۔ اشک صاحب نے اپنے تخلص کی رعایت سے ہمیں ایک اشک آور کہانی سنائی ہے۔ ممکن ہے بعض "عشق زدہ" بھائیوں کے لئے آنسوؤں کی یہ لڑی بیکار و لغو ہو لیکن میری نظروں میں تو یہ کافی قیمت اور وقعت کے قابل ہے۔ آپنے اپنے نفسیاتی مطالعہ کا کافی ثبوت دیا ہے۔ صادق الخیری دہلوی کے قلم سے ایک ایسی چیز نکلی ہے۔ جسے صرف ابھی کہنا صادق صاحب کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ آپ نے "سرزمین بے آئین" کا ایک انتقامی واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن صادق صاحب نے جیسے پیش کیا ہے، وہ افسانویت سے بھی علیحدہ نہیں۔ اور صرف یہ بات کہ انہوں نے اپنے سے دور۔ بہت دور رہنے والی قوم کی زندگی کا ایک حصہ نہایت کامیابی کے ساتھ صحیح پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے نگار ہونے کے لئے کافی سند ہے۔ اثر جعفری نے اپنے حسن انتخاب اور مترجمانہ قابلیت کا کافی ثبوت دیا ہے۔ افضل جالندھری کا حُسن انتخاب بھی قابل داد ہے۔ اگرچہ ترجمہ میں وہ اثر نہیں جو اثر جعفری کے ہاں پایا جاتا ہے۔ شبلی صاحب کا ترجمہ اچھا ہے۔ اگرچہ نظم بلند پایہ نہیں۔ یہ نظم ان نظموں میں سے لی گئی ہے جو ورڈس ورتھ اور کالرج کی مشترکہ کوششوں سے (Lyrical Ballads) میں شائع ہوئیں اور ان نظموں کی سخت مذمت کی گئی تھی۔

اب وہ مضامین ہیں جن کے ساتھ مجھے گہری دلچسپی ہے۔ اور وہ مضمون فن افسانہ نگاری کے کسی نہ کسی حصہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سید بادشاہ حسن، راحت مولائی اور سید اختر احمد اختر قابل ذکر ہیں۔ اور ان میں مجھے سید بادشاہ حسن صاحب

پیش نظر آتے ہیں۔ آپ نے نہایت سادہ طریق سے اسلوب بیان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ راحت مولائی کا مضمون اچھا ہے۔ لیکن وہ بعض اشخاص کی تعریف میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ پر اتر آئے ہیں۔ اور بعض مقامات پر خلط مبحث کا بھی شک پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے مضمون غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے۔ سید اختر احمد صاحب نے اپنی علمیت اور حسن ذوق کا کافی ثبوت دیا ہے۔ اور "حقیقت اور مثالیت" پر اچھی بحث کی ہے۔ میں تو ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کو بھی قابلِ ستائش سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر ایک شخص کوئی فضول سی بات لکھے گا تو ایک بہتر آدمی کی توجہ اس طرف منعطف ہو جائے گی۔ اور ادب میں کسی قابلِ قدر چیز کا اضافہ ہوگا۔ اس لحاظ سے اوّل الذکر ایک "نیکی" کا محرّک ہوگا۔ جو قابلِ ستائش بات ہے۔ مجموعی طور پر پرچہ نہایت کامیاب ہے اور ادیب صاحب کی کاوش و محنت بار در ہوتی ہے

شاعر آگرہ

ادب لطیف" لاہور (افسانہ نمبر) پنجاب کے وسیع اور مشہور رسائل میں "ادب لطیف" کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ گو اس کی عمر دوسرے مشہور جرائد سے کم ہے لیکن اس نے اپنے اعلیٰ معیار اور خاص نمبروں کی اشاعت سے اپنے صوبہ کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ ادب لطیف کا ہر نیا نمبر پچھلے نمبر سے بلند ہوتا ہے خالص ادبی لٹریچر پیش کرنا اسکا مسلک ہے۔ ماہ جولائی میں معاصر موصوف کا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے۔ جو اس سال کے دیگر افسانہ نمبروں سے ہر طرح ممتاز ہے۔ لکھائی چھپائی کی عمدگی کے ساتھ ساتھ اس دفعہ افسانہ ایڈیشن میں بعض مضامین "فن افسانہ نویسی" پر بھی لکھوائے گئے ہیں۔ جو افسانوں سے زیادہ مفید ہیں۔ افسانہ ایڈیشن کے مضامین کی تعداد ۲۶ ہے۔ بعض افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے باعتبار ندرتِ تخیل و واقعات بہت خوب ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں پڑھا جائے نور۔ کا چوتھا خط بھی خوب ہے۔ یہ افسانہ تین گذشتہ افسانہ نمبروں سے چل رہا ہے۔ چار منظوم افسانے بھی زینتِ رسالہ ہیں۔ افسانہ ایڈیشن بہرصورت قابلِ مطالعہ ہے۔ چار دورنگی اور سہ رنگی تصویریں بھی رسالہ میں دی گئی ہیں۔

رسالہ معارف اگست نمبر

ادب لطیف افسانہ نمبر۔ ادب لطیف اس سے چند مہینے پیشتر اپنا سالنامہ نکال چکا ہے۔ اب اس نے افسانہ نمبر نکالا ہے۔ کسی رسالہ کا تمام ادبی دلچسپیوں کو قائم رکھتے ہوئے متواتر خاص نمبر نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے ادب لطیف کی یہ ہمت لائق ستائش ہے۔ کہ وہ ہر خاص نمبر میں اپنی روایات کو قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نمبر میں بھی اس نے ہر مذاق کے ستھرے اور پڑھنے کے لائق افسانے فراہم کئے ہیں۔ فن افسانہ نگاری پر متعدد مفید مضامین ہیں۔ "صحرانورد کے خطوط" جن کا سلسلہ عرصہ سے قائم ہے بخصوصیت کے ساتھ زیادہ دلچسپ ہیں۔

[illegible]

جناب نذیر مرزا برلاس بی۔ اے۔ (آنرز)

نظم

جوانی

مرے خیال میں کیفیتیں جھلکتی ہیں
مرے ارادوں سے رنگینیاں ٹپکتی ہیں

ہر اک حسین تمنا میں رنگ بھرتا ہوں
جسے میں حسن کی دیوی کی نذر کرتا ہوں

ہر ایک شے مجھے گرویدگی سکھاتی ہے
مری جوانی محبت میں بدلی جاتی ہے

مجھے فضا میں ترنم سنائی دیتا ہے
مجھے گلوں میں تبسم دکھائی دیتا ہے

ہوائیں جھوم کے نغمے سنا رہی ہیں مجھے
گلوں کی نکہتیں وحشت سکھا رہی ہیں مجھے

ترانے عشق کے سنتا ہوں آبشاروں سے
میں چھینتا ہوں حسیں پھول لالہ زاروں سے

فضاؤں میں نظر آتے ہیں کچھ حسیں جلوے
کہ جیسے خواب کی دنیا کے شرمگیں جلوے

تصورات میں پہروں خوشی مناتا ہوں
کسی کو ساتھ لئے بادلوں میں جاتا ہوں

یہ کون دور سے نغمے سنائے جاتا ہے
کوئی تو چاند میں بیٹھا مجھے بلاتا ہے

یہ چاہتا ہوں کہ ملجاؤں جا کے تاروں میں
جوانی اپنی گزر جائے ماہ پاروں میں

حسیں ارادے ہیں تسکین کامرانی ہے
جہان کیف و مسرت مری جوانی ہے

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب لاہور لیٹر نمبر ۲۲۱۱ سی، مورخہ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۳۶ء۔

منظور کردہ محکمہ تعلیم حیدرآباد دکن ۲۴۲۰ سنہ ۴۴ ف مثل نمبر د ۱۸/۱۱۳ (۴۴ ف)

مکتبہ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادب لطیف لاہور

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی۔ اے

میرزا ادیب بی۔ اے

مقام اشاعت

مکتبہ اردو لاہور

فی پرچہ چار آنے

منیجر پرنٹر پبلشر
چودھری نذیر احمد

(محمد شریف عباسی کاتب لاہور)

ادب لطیف کا سالنامہ ۱۹۳۸ء اردو کا ممتاز ترین سالنامہ ہوگا

سالانہ چندہ مع ضخیم سالنامہ (افسانہ نمبر) ۴ روپے | مَمالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرس

جلد ۶ بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء نمبر ۲

[illegible] لاہور سے شائع کیا

اداریہ

نذرِ اولین

سالنامہ سنہ ۱۹۳۳ء :-

ادبِ لطیف کا سالنامہ سنہ ۳۳ء جملہ صوری و معنوی خصوصیات کے ساتھ نومبر کے اختتام پر شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے گذشتہ سالنامے نے ملک کے ادبی حلقوں میں کافی وقعت حاصل کی تھی! اور بعض نقادوں کی رائے میں تو اسے پچھلے سال کا بہترین سالنامہ قرار دیا گیا تھا۔ ممکن ہے اس میں کسی قدر مبالغہ کو دخل ہو مگر یہ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سالنامہ سنہ ۱۹۳۳ء اپنی بے شمار صوری و معنوی خوبیوں کے باعث نہ صرف سنہ ۳۳ء کا بہترین و ممتاز ترین سالنامہ ہوگا۔ بلکہ ہر پہلو سے اس قدر کامیاب، اس درجہ شاندار ہوگا کہ لوگ اردو رسالوں کے تمام متقدم و ضخیم سالنامے بھول جائیں گے۔ ادارۂ "ادبِ لطیف" پوری سرگرمی کے ساتھ ادبی دلآویزیوں کی فراہمی، نہایت کامیاب مضامینِ نظم و نثر کے حصول، اور سالنامے کو شاندار سے شاندار، دلآویز سے دلآویز صورت میں پیش کرنے کی تجاویز میں منہمک ہے! گذشتہ سالنامے میں، باوجود اتنی خوبیوں کے دو نقائص رہ گئے تھے۔ ایک تو ٹائیٹل پیج (سرورق) اس قدر حسین و جمیل نہیں تھا کہ دوسرے تمام سالناموں کے مقابلے میں ممتاز ہو۔ اور دوسرا نقص تھا کہ تصاویر (جن میں کوئی شک نہیں کہ بہت زیادہ تھیں)

[illegible]

سرورق بہت حسین ہوگا۔ اور تصاویر کے انتخاب کے معاملے میں تو ہم خاص احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ تصاویر کم ہوں گی مگر ہر تصویر دوسرے سالناموں کی متعدد تصاویر سے بدرجہا بہتر۔ ہمارے سالناموں کا معنوی پہلو بہت بلند رہا ہے اب کے اس قدر بلند ہوگا کہ آپ اسے حقیقی سالنامے کا "معیار" قرار دے سکیں!

آئندہ نمبر میں چند مضامین اور تصاویر کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون نگار حضرات :-

ہمارے مضمون نگار حضرات عموماً تساہل کیشی سے کام لینے کے عادی ہیں یہی وجہ ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے گذشتہ سالنامہ پورے وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ امید ہے محترم مضمون نگار حضرات کرمفرمائیوں میں عجلت سے کام لیں گے!

مضامین بہرصورت ۲۰ اکتوبر سے پیشتر پہنچ جانے چاہئیں۔ یہ بھی نہ ہو کہ ہر محترم مضمون نگار ۲۰۔ اکتوبر ہی کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ اس صورت میں مضامین کی ترتیب و تہذیب میں ہمیں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مکتبہ اردو کی سرگرمیاں :-

مولانا کوثر چاندپوری کی دونوں کتابیں عورتوں کے افسانے اور دنیا کی حور اور دیگر افسانے۔ ہفتہ عشرہ تک مارکیٹ میں آجائیں گی۔

خواہشمند حضرات فوراً آرڈر بھیجیں۔

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے بھی

پریس میں ہیں اور وہ بھی دس بارہ روز تک شائع ہوجائیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس دفعہ آغا حشر کے متعلق کچھ نہ لکھا جا سکا اس کی وجہ قلت گنجائش کے سوا اور کچھ نہیں آئندہ نمبر میں کچھ لکھا جائیگا۔

جناب سید اختر احمد اورینوی ایم۔ اے

(سلسلہ کے لئے ستمبر کا پرچہ ملاحظہ فرمائیں)

شہنشاہ حبشہ

ایکٹ نمبر ۲

منظر اول

(بھوزادیس ابابا کے محل کا پائیں باغ۔ یوکلپٹس کے نازک لانبے درخت کملائی ہوئی چاندنی میں خاموش کھڑے ہیں۔ دسمبر کے پھیکے آسمان پر ابر پارے آوارہ پھر رہے ہیں۔ ایک سرو کے درخت کے سائے میں گلاب کی جھاڑی کے مقابل سنگ مرمر کا بنچ بچھا ہوا ہے۔ شہزادی فلورا اس پر ایک عجب سوگوارانہ وارفتگی کے عالم میں بیٹھی ہوئی ہے)

فلورا۔ (تنہا) وہ نہیں آئیگا! آہ! میرا دل! .... شاسماچ! شاسماچ! (ایک غیر ارادی سرگوشی میں) کاش میں یوکلپٹس اور گلاب کی خوشبو بنکر خود اس تک پہنچ سکتی! یا ہوا کا ایک سرد جھونکا بنکر اُسے خوابِ ناز سے جگا سکتی! نہیں میرے محبوب تجھے میں اتنی سی تکلیف بھی نہیں پہنچاؤں گی .... ! میں سردیوں میں ٹھہرنا پسند کروں گی۔ مگر تیری پیاری نیند کو ہوا سے بھی نہیں اٹھاؤں گی ..... آہ! اب تک تو اسے بیدار ہو جانا چاہیئے تھا۔ صبح سویرے سے اس کے رستے کا پہرا ہے ..... آہ! وہ نہیں آئیگا!

ڈیڈ شاسماچ محمد۔ (سرو کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے) میری قابلِ صد احترام شہزادی! آپ کا غلام حاضر ہے!

فلورا۔ (چونک کر مگر تبسم) آہیں! آ گئے شاسماچ! تم نے تو مجھے بہت انتظار کی راہ دکھلائی! کاش تم بھی جانتے کہ خلشِ انتظار کس کیفیتِ مضطرب کا نام ہے!

شاسماچ۔ میری محبوب شہزادی! مجھے معاف کر دیں اگر میں نے آپ کے دلِ نازک کو صدمہ پہنچایا! لیکن میں نے تو سویرے آنے کی کوشش کی!

فلورا۔ (ایک پیارے طنز کے ساتھ) ہاں بہت سویرے آئے! میری ہی غلطی تھی۔ ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تو تم قائل ہوئے نہ کہ محبت میں عورت مرد سے بہت آگے ہے؟ بیٹھ جاؤ شاسماچ!

شاسماچ۔ (بیٹھتے ہوئے) مرد تو عورت سے ہمیشہ قائل ہو ہی جاتا ہے! رات شہنشاہ سے بہت دیر تک مسائلِ جنگ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ آدھی رات گئے سویا تھا۔

فلورا۔ آہ [illegible]

شاسماچ۔ شہنشاہِ معظم کا ارادہ ہے کہ جرار کے علاقہ میں ایک لشکرِ جرار کی ترتیب و تنظیم کے لئے مجھے مامور کیا جائے۔

فلورا۔ پیارے شاسماچ! تم بھی محاذِ جنگ کی طرف چلے!

شاسماچ۔ ہاں میری پیاری شہزادی! مجھے بھی ملک کی خدمت کا ایک زریں موقعہ ملا ہے! خدا نے چاہا تو ہم درندہ صفت اطالویوں کو ملک سے باہر نکال دینگے!

فلورا۔ شاسماچ پیارے! نہ معلوم کیوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ایک مبہم سی غمناکی میری روح پر ہر وقت طاری رہتی ہے۔ کیا ہوگا شاسماچ؟ آہ کاش۔ یہ ملعون جنگ نہ چھڑتی!

شاسماچ۔ (مضطرب ہوکر) نہیں میری پیاری شہزادی ہراساں ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جنگ کا رُخ پھر چکا ہے۔ اب اطالویوں کے قدم اکھڑنے لگے ہیں۔ ہماری فوجیں دشمن کو پیچھے دھکیل رہی ہیں خود مسولینی اپنی فوج کی ناکامی سے متاثر ہوکر جرنیل کی تبدیلی پر مجبور ہوگیا ہے۔

فلورا۔ آہ شاسماچ! میں دل کو لاکھ سمجھاتی ہوں مگر اس کی دھڑکنیں نہیں رُکتیں! کچھ ہونے والا ہے شاسماچ! مجھے رات کو بہت ڈراؤنے خواب آتے ہیں! میرے اللہ!

شاسماچ۔ آپکو تو وہم ہوگیا ہے! ناحق گھبراتی ہیں!

فلورا۔ محبت میں انسان کا دل بہت رقیق ہوجاتا ہے آرزو اور تکمیلِ آرزو کے درمیان کی گھڑیاں آہ نہ پوچھو شاسماچ! دل ڈوبا جاتا ہے۔

جری پاتا ہوں۔ محبت فرض کو مقدس بنادیتی ہے محبت شعار عورت کی وفا پاش نظریں طبل جنگ اور نغمہائے رجز سے زیادہ جرأت آفریں ہیں! میری شہزادی! میں آپ کے لئے دشمن سے لڑوں گا۔ زیادہ مستقل عزم وارادہ سے زیادہ قوی بازو ہوکر اور زیادہ سے زیادہ جوش وولولہ کے ساتھ!

فلورا۔ (مسرور و محجوب ہوکر) تم بہت بلند اخلاق ہو میرے سپاہی! آہ! مگر عورت کا دل! کاش اپنے دل کے راز سے عورت خود واقف ہوتی! عورت کی محبت ایک رازِ جاوداں ہے۔ محبت عورت اور مرد کو یکساں طور پر بہادر بنادیتی ہے مگر جب محبت کے نور سے عورت کا دل منور ہوتا ہے۔ تو اس کی نگاہوں میں قدرِ حیات بڑھ جاتی ہے۔ زندگی اُسے پُرمعنی اور قیمتی نظر آنے لگتی ہے۔ اپنی زندگی سے زیادہ اُسے اپنے محبوب کی زندگی گراں بہا معلوم ہوتی ہے۔ عالمِ عشق میں عورت کے شبہات اور آلام بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ایثار کرنے میں دلیر ہے۔ مگر حزن و ملال میں مبتلا رہنے پر مجبور!

شاسماچ۔ مگر جب حزن و مایوسی کی کوئی وجہ نہ ہو تو اے شہزادی آپ کیوں یاس انگیز باتیں کرتی ہیں۔ ہمارا مستقبل روشن ہے۔ فتح ہمارے شہنشاہ کو ضرور حاصل ہوگی!

فلورا۔ اے مسیح ایسا ہی کر! پیارے شاسماچ! میرا

دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اُٹھتے ہیں۔ مبتلائے
عشق ہو کر میں ہر محبت ناک وجود سے پہلے سے
بہت بڑھ چڑھ کر محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے ہر آن
شہنشاہ کی جان کی فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے
لئے میں ہر گھڑی کڑھتی ہوں۔ شاسماچ! میں حبش
کے ہر سپاہی کے لئے دل دکھاتی ہوں۔ اس کی
ایک ایک رعایا کے لئے آنسو بہاتی ہوں۔ آہ محبت
عورت کے دل کو بہت زیادہ حساس بنا دیتی ہے!

شاسماچ۔ میری حسین دلربا، شیریں مزاج، لطیف خو شہزادی!
آپ اپنے دل نازک کو ناشاد نہ فرمائیں۔ جب تک
شاسماچ زندہ ہے شہنشاہِ معظم کا کوئی بال بیکا نہیں
کر سکتا! آپ مسرت سے اپنی دعاؤں کے ساتھ مجھے
اذنِ رخصت عطا فرمائیے!

فلورا۔ شاسماچ پیارے! میں تم سے علیحدہ زندہ نہیں
رہ سکتی میں بھی محاذِ جنگ کی طرف جاؤں گی۔ میں
بھی اپنے ملک پر قربان ہو جاؤں گی۔ میں نرس بنکر
جاؤں گی! تمہارے لشکر کے ساتھ جاؤں گی!

شاسماچ۔ میری شہزادی! آپ کا دل جتنا نازک ہے
اتنا بہادر بھی ہے۔ لیکن آپ یہ ارادہ نہ فرمائیں۔
آپ کا غلام لڑنے بھڑنے کے لئے ہے۔ اور آپ
اُسکے جذبۂ فدائیت کو ابھارنے کے لئے!

فلورا۔ نہیں پیارے شاسماچ! مجاہد کی دلہن کو
بھی مجاہد ہونا چاہئے۔ مجھے تمہاری محبت پکارتی
ہے۔ مجھے مادرِ وطن آواز دیتی ہے۔ عورت صرف
آنسو بہانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ
ہر حال میں مرد کی شریک کار ہے۔ حبش کی لڑکیاں
حبش کے فدا کار زخمی نوجوانوں کو کس مپرسی کے
عالم میں نہیں چھوڑ سکتیں۔ وہ جائیں گی! وہ جانے
کے لئے آمادہ ہیں۔ اور اُن کی قیادت میں اپنی
عزت محسوس کریں گی!

شاسماچ۔ میری بلند ہمت و محبت پرست شہزادی! بیشک
حبش کا ہر نوجوان آپ جیسی لڑکیوں کے لئے اپنی جان
قربان کر دینا مقصدِ حیات سمجھے گا۔ مگر ظالم درندہ خو
اطالوی زخمیوں کے کیمپ پر بھی بم گرانے میں ذرا شرم
محسوس نہیں کرتے۔ آپ اپنی بیش قیمت جان کو ایسے
سخت خطرے میں نہ ڈالیں!

فلورا۔ شاسماچ! تم ایسی باتیں کرتے ہو! محبت خطرات
میں پڑکر اور بالیدہ ہوتی ہے اور موت سے ہمکنار
ہو کر زندگئی دوام حاصل کرتی ہے۔ عورت کی زندگی
صرف محبت ہے۔

شاسماچ۔ اگر آپ تشریف لے گئیں تو ہر وقت مجھے آپکی
جان عزیز کی فکر لاحق رہے گی۔ میں آزادی کے
ساتھ لڑ نہ سکوں گا۔ آپ نہ جائیں میری شہزادی!

فلورا۔ تھوڑی دیر قبل تو تم بڑے دلیر بن رہے تھے
اور اب خدشات واوہام کی زنجیروں میں گرفتار ہوئے
جاتے ہو۔ ابھی ابھی تمہیں میرے شبہات کو دور
کرنے کی سعی کر رہے تھے؟

شاسماچ۔ دیکھو اگر بہادر ساتھ نقارہ کا لڑکا کیا بہادر ہے!

فلورا ۔ (ایک پندار کے ساتھ) ہاں شاسماچ! ایسا ہی ہے!

(پہرے کی تبدیلی کا گھنٹہ بجتا ہے)

شاسماچ ۔ اجازت شہزادی! قسم کھانے کی رسم کے بعد فوراً مجھے روانہ ہو جانا ہے۔ (فلورا کا ہاتھ پکڑ کر دوزانو ہو جاتا ہے) پیاری شہزادی! آپ کا غلام زندگی و موت میں ہمیشہ آپ کا ہے۔

فلورا ۔ (شاسماچ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے۔ اور اُسکے توی سینہ پر اپنا سر رکھدیتی ہے) جاؤ میرے سپاہی! (رونے لگتی ہے) جاؤ! خدا اور مسیح تمہیں اپنی حفاظت میں رکھیں!

شاسماچ ۔ (فلورا کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے) شہزادی! شہزادی!! میری فلورا! میری فلورا!!

فلورا ۔ (روتی جاتی ہے) شاسماچ! شاسماچ!!

شاسماچ فلورا سے علیحدہ ہو کر ایک بیتابانہ عجلت کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے

فلورا نڈھال ہو کر بنچ پر گر جاتی ہے

(دور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے)

فلورا ۔ (مضطربانہ کھڑی ہو جاتی ہے اور نحیف و مضمحل آواز میں پکارنے لگتی ہے) شاسماچ! شاسماچ!!

(اور پھر نڈھال ہو کر مایوسانہ انداز میں بنچ پر گر پڑتی ہے)

منظر دوم

[illegible] شاہی [illegible] کے سامنے وسط میدان، خلقت

کا ہجوم۔ وسط میدان میں شعلہ افشاں الاؤ جل رہا ہے۔ الاؤ سے ذرا پرے سبز و زرد رنگ کا حبش کا قومی جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہے۔ جھنڈے سے ملحق ایک آبنوسی صلیب رکھی ہوئی ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ جمع ہیں۔ حرآز اور اوگاڈن کے حبشی، ملاگا اور گورہائی کے قبائل نیل اسفر کے منبع کے قریب کی پہاڑیوں میں رہنے والی گالا قوم کے جنگجو لوگ، وغیرہ۔ راہب اور پادری گھنیری لانبی داڑھیوں، چوبی صلیبوں اور طویل تسبیحوں کے ساتھ اِدھر اُدھر نظر آرہے ہیں۔ رؤوسائے قبائل زرق برق اور رنگین لبادوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ سونے اور موتی کے ہار گلے میں پڑے ہیں۔ سر پر شترمرغ کے پروں کا طرّہ تاج کی طرح آراستہ کیا گیا ہے۔ ان سے نیچے درجہ کے سرداروں کے گلوں میں مونگا، سیپ اور کوڑیوں کے ہار ہیں۔ اور سر پر کی کلغی اتنی گفش نہیں۔ بڑے بڑے نقارے جابجا پڑے ہیں، انہیں بھی شیر کے ناخنوں اور دانتوں اور مور کے قوس قزح رنگ پروں سے سجایا گیا ہے۔ مجمع سے اوپر نکلتے ہوئے دراز و خونخوار برچھے اور نیزے نظر آرہے ہیں۔ الاؤ کے شعلہ کی کو نیزوں کی انی کو چمکا رہی ہے۔ سپاہیوں کے کاندھوں پر تیر و ترکش آویزاں ہیں۔ ایک جانب منظم فوج کے دستے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مغربی وضع

کی رائفلوں کے جدید نمونوں کے ساتھ قدیم
نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ سپاہی کچھ جدید کچھ
قدیم وردیوں میں عام قبائلی جنگجوؤں سے ممتاز
معلوم ہوتے ہیں جو گویا نیم برہنہ ہیں۔ شہری عورتوں
کا ایک گروہ الاؤ سے بہت قریب پرے جمائے
ہے۔ لباس زیب تن کے علاوہ ایک "دیران نما"
چادر انکے گلے سے بندھی ہوئی لٹک رہی ہے
سارا مجمع پرجوش انتظار کے عالم میں غرق ہے
لوگوں کی گردنیں ادھر اُدھر اُٹھ رہی ہیں---
ادیس آبابا کے شہری اور گردونواح کے لوگ
امحارک زبان میں باتیں کر رہے ہیں - اور
قبائلی لوگ اپنی قدیم زبان اور مختلف لہجوں
میں سرگرم گفتگو ہیں - الاؤ میں سیاہ رنگ
توانا غلام ہر جانب سے لکڑیاں ڈال رہے
ہیں۔ مجمع کا انتظار بڑھ رہا ہے۔ اس سرے
سے اُس سرے تک ایک بے چین شور اُٹھ رہا
ہے۔ یک بیک نقارے پر چوٹ پڑتی ہے۔ اور فوجی
باجا بجنے لگتا ہے۔ ہر طرف شہنشاہِ حبش زندہ باد کے
نعرے گونجتے ہیں۔ ہیلے سلاسی آراستہ و پیراستہ
ابلق ترکی گھوڑے پر سوار محافظ دستے
کے حلقے میں الاؤ کی جانب بڑھتا ہوا نظر آتا ہے
سارے حبشی سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ شہنشاہ
الاؤ کے قریب پہنچکر مقدس صلیب کا بوسہ

شہنشاہ۔ بہادرو! اٹھو اور سنو!

(سارا مجمع کھڑا ہو جاتا ہے)

شہنشاہ۔ ہمیں مسرت ہے کہ باشندگانِ حبش مادرِ وطن
کی پکار پر ہر طرف سے دوڑے آئے۔ ملک و ملت کے
فدائیو! انہیں مبارک ہو کہ اطالوی درندوں کو ہماری
فوجیں شکست پر شکست دے رہی ہیں۔ اصولی
جنگ کے مطابق پہلے ہماری فوجیں پسپا ہوتی
رہیں، بعد ازاں شیرانِ حبش اپنے بھٹوں سے
نکلے اور اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے۔ حبشی فوجیں
مبکالے اور تیگرے اور اس کے گردونواح میں فاتحانہ
حیثیت سے داخل ہو گئی ہیں۔ صرف شمالی محاذ
پر چار ہزار سات سو اطالوی ہلاک ہوئے۔ ہمارے
بہادروں نے اطالوی عساکر سے ایک ہزار رائفلیں
اور چالیس کلدار توپیں چھین لی ہیں۔ اکسم کی جنگ
میں متعدد ٹینک ہمارے مجاہدوں کے ہاتھ آئے
[illegible] کاسا اور راس دستہ کی فوجیں اطالوی لشکر
پر زبردست حملے کر رہی ہیں۔ اطالوی پسپا ہوتے
چلے جا رہے ہیں۔ قدیم حبش کے لشکر جرار نے
صومالی لینڈ کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا ہے۔ علاقہ
ٹیٹن میں راس سیوم کی افواج نے اڑھائی ہزار
اطالویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہادرو! اپنے
بھائیوں کے دوش بدوش جنگ آزمائی و فداکاری
کے جوہر دکھاؤ۔ جاؤ! اطالوی ٹڈیوں کو اپنے نشانہ

متبرک آگ کی قسم کھاتا ہوں (الاؤ کی طرف ہاتھ اٹھاکر)
کہ میں تخت سلیمان کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دونگا
دلیرو! وطن کے فدائیو! آؤ تم بھی قسم کھاکر میدان
جنگ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔!!

(شہنشاہ کی فتح! تخت سلیمان پائندہ باد!
کے نعرے لگتے ہیں۔ اور سب سے پہلے راس مولوغیتا
اور راس نصیبو نیزے لئے آگے بڑھتے ہیں۔
اور الاؤ کے پاس جاکر قسمیں کھاتے ہیں)

راس نصیبو۔ (ہاتھ اٹھاکر) قسم ہے مقدس آگ کی۔ میں
تادم آخر اپنے نیزے کو حفاظت وطن میں دشمنوں
کا لہو پلاتا رہونگا! (راس واپس آجاتا ہے)

راس مولوغیتا۔ (ہاتھ اٹھاکر) سوگند ہے آتش متبرک
کی میں تخت سلیمان کو اطالوی چیونٹیوں کے نرغے
سے بچاؤں گا! (واپس ہوجاتا ہے)

ڈیڈ شاسمارچ۔ (ہاتھ اٹھاکر) خدائے وحدہٗ لاشریک
کی عزت و جلال کی قسم میں ایک سچے مسلمان کی
طرح حفاظت وطن میں سینہ سپر رہوں گا! (شاسماچ
کی نظر عورتوں کی جماعت کی طرف پڑتی ہے شہزادی
فلورا سے نگاہیں چار ہوتی ہیں اور وہ بے خود ہوکر دوبارہ
قسم کھاتا ہے) قسم ہے قلب مومن کی وفا شعاری کی
میں اپنے ملک وملت کے حفظ ناموس میں لڑتا ہوا
شہید ہوجاؤں گا! (اس کے لہجے میں رعونت نہیں
بلکہ ایک جوش اور ایک شان تقدس ہے جس سے مجمع
متاثر ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شاسماچ عزم و استقلال
کی تصویر اور ایک پیکر وفا بنا ہوا واپس ہوجاتا ہے
اس کے بعد قبائل کے لوگ بڑھ چڑھ کر قسم کھاتے
ہیں اور نقارے پر چوٹ دیتے ہوئے میدان جنگ
کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں۔ فوج مارچ کرتی ہوئی
آتی ہے اور بینڈ پر جنگی گیت گاتی ہوئی عرصۂ کارزار
کا رخ کرتی ہے)

شہنشاہ۔ (افسران فوج اور عمائدین کے حلقے میں)
معزز سردارو! آج حبش کے ہر شیدائی کا دل مسرت
وانبساط سے لبریز ہے۔ محاذ ہائے جنگ پر ہماری
فتح اور ملک کا جوش وخروش قابل صد اطمینان ہے
(شاسماچ کی طرف مخاطب ہوکر) شاسماچ! سلطان اوسا
کیوں اب تک تشریف نہیں لائے؟ کیا دشمنوں کی
اطلاع صحیح ہے؟

شاسماچ۔ اے شہنشاہ والا تبار! سلطان اپنے علاقے سے
حلف وفاداری کی توثیق و تبریک کے لئے روانہ
ہو چکے ہیں۔ اطالیہ کے دروغ گو بہت بڑے فریبی
ہیں۔ سلطان اوسا ایک مسلم جانباز ہے۔ اہل اسلام
سے ملک وملت کی غداری نہیں ہوسکتی۔ وطن کی
محبت داخل ایمان ہے۔ کل کی اطلاع ہے کہ سلطان
موصوف ادیس آبابا کے اندر داخل ہوگئے ہیں۔
اب وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔

تمام عورتیں۔ قسم کھانے کے لئے بڑھتی اور
شہزادی فلورا کی قیادت میں ایک ساتھ قسم
کھاتی ہیں اور [illegible]

ــــــــ قسم ہے آتش ازلی کی،
سوگند ہے مقدس مریم کی! ہم وطن عزیز کے پیارے
سورماؤں کی خدمت کے لئے میدان جنگ میں بلا
خوف وخطر جائیں گے، اے مقدس ماں ہماری مدد کر
(وہ تینوں الاؤ کے پاس سے ہٹ جاتی ہیں۔ باجوں اور
نقاروں کی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دیتی ہے)

شاسماچ ۔ حضور شہنشاہ معظم! وہ دیکھئے سلطان اوسا
لانبا چوغہ اور عمامہ پہنے ہوئے، عمامہ میں پروں کی
کلغی لگائے آتے ہیں (شہنشاہ حبش کو دیکھ کر عربی گھوڑے
سے اتر آتے ہیں اور شہنشاہ کے قریب آکر تعظیم بجا
لاتے ہیں)

شہنشاہ ۔ (مسرت کے ساتھ سلطان کی پیشانی کا
بوسہ لیتا ہے) اے معزز سلطان اوسا! آپ کا
نہایت وطن کو سخت انتظار تھا، مبارک ہو آپ آگئے!

سلطان اوسا ۔ اے ذات مکرم شہنشاہ! اے واجب التعظیم
کماندار حبش! ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں!
اب میں حضور معظم کی خدمت میں حاضر ہوں حکم ہو
تاکہ میں اطالیوں کا جھوٹ اپنے نیزے سے ان کی
حلقوں میں واپس لوٹا دوں۔

شہنشاہ ۔ اے وفادار حلیف! آپ کی ذات سے
ایسی ہی امید ہے
(سلطان اوسا الاؤ کی طرف قسم کھانے بڑھتے
ہیں)

سلطان ۔ قسم ہے خالق عناصر رب المشرقین والمغربین کی
میں سلطان اوسا حبش کی حفاظت میں ہر آن
تیغ بدست و سر بکف رہوں گا!

شہنشاہ ۔ (دربار کے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر)
مکرم جان بازو! آج میری مسرت نقطۂ کمال پر ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتح ہماری ہی قسمت میں ہے
تمہیں معلوم ہوگا کہ مجلس اقوام نے اطالیہ کے
خلاف تعزیرات جاری کر دی ہیں اور مجھے توقع ہے
کہ اگر اطالیہ چیرہ دستی سے باز نہ آیا۔ تو فوجی تعزیرات
کا اجرا بھی ہو جائیگا۔ مسٹر ایڈن اور موسیو لاوال نے
ہمارے نمایندے کو بہت امیدیں دلائی ہیں۔
خبر آئی ہے کہ اہل جاپان اپنی حکومت سے حبش کی
مدد کے لئے شدت کے ساتھ درخواست کر رہے ہیں
اور اے مادر وطن کے بہادر سپوتو! سب سے بڑھ کر
ہمیں اس امر کی مسرت ہے کہ فرزندان حبش ہر جانب
سے ملک پر جان قربان کرنے کے لئے جمع ہو رہے
ہیں۔ دلیرو! جاؤ اطالیہ کی دبا کو ملک سے ناپید کر دو!

سلطان اوسا ۔ اے شاہ نجاشی کے وارث بلالؓ کے ہم
مذہبوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ حفظ وطن
اور دفع اعدا میں وہ سچے دین دوست کی طرح
مومنانہ شان سے لڑیں گے۔!

شہنشاہ ۔ ہاں اے سلطان سارے حبش کو دشمن
کے مقابلہ میں دوش بدوش ہو کر سینہ سپر ہو جانا
چاہیئے! سلطان اوسا! آج آپ میرے مہمان
رہیں! [illegible] نصیب [illegible] تقریب [illegible] مدعو [illegible]

(شاہ حبش گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتا ہے۔ محافظ دستے آگے چلتے ہیں۔ ولیعہد اور سلطان اوسا، راس نسیبو اور راس [illegible] جلو میں چلتے ہیں۔ نقارے اور بینڈ بجتے ہیں۔ میدان میں کچھ تماشائی رہ جاتے ہیں)

ایکٹ نمبر (۳)

منظر اول

(مارچ ۱۹۳۶ء۔ میدان جنگ سے پرے ایک پہاڑی کے دامن میں جنگی ہسپتال کے چند خیمے۔ خیمے کے اندر اور خیمے کے باہر زخمی سپاہی پڑے ہوئے ہیں۔ حبشی لڑکیاں نرس کا کام انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر احمد[1] ایک ہندوستانی جو اس چھوٹے سے ہسپتال کا افسر نگران ہے۔ میدان کارزار سے تازہ وارد زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال اور چیر پھاڑ میں حد درجہ منہمک ہے۔ دور میدان جنگ سے توپ اور مشین گن کی گرج سنائی دیتی ہے۔ پہاڑی کے مقابل افق دھوئیں میں ملفوف ہے۔ اسٹریچر پر آنے والے زخمی سپاہیوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ایک خیمہ کے باہر ڈاکٹر احمد ذرا دم لینے کے لئے آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ شہزادی فلورا نرس کے لباس میں اسی خیمہ کی ایک طناب پکڑے ہوئے مغموم و مضمحل کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی ہر گھڑی سوگوار رہنے والی سیاہ آنکھیں حد درجہ سوگوار معلوم ہو رہی ہیں)

ڈاکٹر احمد۔ الٰہی پناہ! جنگ کس درجہ خوفناک و ہلاکت ہو رہی ہے۔ گھمسان کی لڑائی ہے۔ غضب کا رن پڑا ہے۔

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! کیا ہوگا؟ اطالوی ہر جگہ فتحیاب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد۔ خدا رحم کرے! ہمارے جنگی ہسپتال کا اسٹاف ناقابل بیان حد تک کم ہے (زخمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے) آہ بے چارے زخمی سپاہی! کاش میں ان میں ہر ایک کی پوری مدد کر سکتا۔

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! مظلوم حبش! غریب حبش!! ہمارے حمل و نقل کے ذرائع بھی کتنے کم ہیں۔ ہمیں پیچھے ہٹتے وقت گذشتہ مورچے کے عقب میں کتنے مجروح اور سسکتے ہوئے سپاہیوں کو دشمن کے ظالم پنجے میں چھوڑ دینا پڑا۔ آہ! معبود! ڈاکٹر ان بیچاروں کا کیا ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر احمد۔ آہ! نہ پوچھو نرس فلورا (کرسی سے اٹھتے ہوئے) چلو ہم کام پھر جاری کریں۔ مظلوم و مجروح بندگان خدا!

نرس فلورا۔ ہاں ڈاکٹر! آپریشن کی میز پر ابھی ایک

[1] ڈاکٹر احمد ایک پنجابی احمدی نوجوان طبی امداد کے لئے ہند سے حبش گئے تھے۔

مجروح سپاہی لٹایا گیا ہے!

(دونوں خیمہ کے اندر جاتے ہیں)

ڈاکٹر احمد (مجروح سپاہی کا معائنہ کرتے ہوئے) الامان اُف بیچارے کا چہرہ کیسا جھلسا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ کٹ گیا ہے۔ نرس اسکیپل اور فورسپس (چھری اور چونٹا) آرٹری فورسپ، زخم سینے کا سامان اور پٹی!

(نرس فلورا مطلوبہ چیزیں لاکر دیتی ہے ڈاکٹر کام میں لگ جاتا ہے۔)

ڈاکٹر احمد۔ (کام ختم کر کے) دوسرا مجروح! (حبشی بگار میز پر سے سپاہی کو اٹھا کر جنگلی گھاس کے بستر پر لٹا دیتے ہیں۔ اور دوسرے سپاہی کو لاکر میز پر لٹاتے ہیں۔)

ڈاکٹر احمد۔ (معائنہ کرتے ہوئے) اسے زخم تو نہیں آئے مگر دل و دماغ پر زہریلی گیس کا بُری طرح اثر ہوا ہے نرس کافور کا انجکشن: دوسرا سپاہی لا

(پہلے کو نرس کافور کا انجکشن دیدیتی ہے اور میز پر دوسرا سپاہی لاکر رکھا جاتا ہے۔ یک بیک ہوائی جہاز کی گھنگھناہٹ بہت قریب سنائی دیتی ہے۔ اور فی الفور بم پھٹنے کی آوازیں پے در پے آتی ہیں۔ سب لوگ سکتے کے عالم میں جہاں کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہتے ہیں اور کچھ وقفے کے بعد خیمہ سے باہر بدحواسی میں دوڑ پڑتے ہیں۔ اطالوی بمبار ہوائی جہاز سے ہر طرف بم اور شل گر رہے ہیں۔)

ڈاکٹر احمد۔ (بدحواسی کے عالم میں) پہاڑی کے دامن میں! پہاڑی کے دامن میں (خود بھی اس طرف دوڑتا ہے۔ سارا عملہ علیحدہ علیحدہ چٹانوں کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ (زخمیوں کا ایک گروپ بم سے آتش گیر ہو کر بھک سے جل اٹھتا ہے خیموں میں بے کسی کی آہ و زاری مضطرب کراہیں اور بھاگنے کی سعی لاحاصل کا شور سنائی دیتا ہے۔ خیموں کے باہر سپاہی بھیانک گول گول سیاہ و سپید دیدے نکالے آسمان کی طرف تک رہے ہیں۔ زخموں کے باعث اٹھنے سے بھی مجبور ہیں۔ زیر لب، نیم مردہ یا بلند آواز سے بڑبڑا رہے ہیں۔ ایک خیمہ سے ایک مجروح سپاہی نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر آتے ہی دھم سے گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ دس منٹ کی بمباری کے بعد یہ مردم شکار میکانکی پرندے منڈلاتے ہوئے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ پانچ منٹ کی قبرستانوں جیسی خاموشی کے بعد ڈاکٹر اور اس کے عملے کی برآمد سے سکوت ٹوٹتا ہے۔ یہ لوگ سب سے پہلے آگ لگے ہوئے خیمے کے قریب جاتے ہیں)

نرس فلورا۔ ہائے میرے اللہ۔ (سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

دوسری نرس۔ سارے سپاہی! آہ سارے سپاہی!

حبشی مددگار۔ اف اے مسیح! یہ بھنی ہوئی لاشیں! یہ جلے ہوئے ڈھانچے!

ڈاکٹر احمد۔ خدایا! یہ غارت گر تہذیب و تمدن! اے خدا سے دور دنیا! دوزخ! دوزخ!! ۔ اب کیا بچ گیا ہے؟ صرف جلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ۔ بھرکس کئے ہوئے انسانی اعضاء ۔ خون آلودہ لوتھڑے خاکستری ہڈیاں، صد پارہ کھوپڑیاں! آہ ۔ کچھ نہیں لاحاصل! ظالم! ظالم!

(ڈاکٹر دوسرے خیموں کی طرف رخ کرتا ہے۔ سب اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خیموں میں جاکر نرسیں مجروح سپاہیوں کی تسلی و تشفی کرتی ہیں۔ اور ڈاکٹر احمد ان مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں جنکے زخموں کے ٹانکے بھاگنے کی کوشش میں ٹوٹ گئے ہیں۔ میدان جنگ سے مہیب آوازیں آرہی ہیں، غلغلہ سمع شکن)

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! فوج کا کیا حال ہوگا؟ مجھ پر کیوں نہیں بم گر پڑا! میں مرگئی ہوتی!

ڈاکٹر۔ شہزادی فلورا! دعا کیجئے اور صبر! مظلوموں کا خون رنگ لائیگا۔ یورپ کی سرزمین آج نہیں تو کل آگ اور خون میں نہلائی جائے گی۔ خدا کا عذاب قریب ہے۔

نرس فلورا۔ ڈاکٹر۔ (ٹنکچر آیوڈین اور بورک کاٹن دیتے ہوئے) جنرل شاسماچ کس بے جگری سے لڑ رہا ہے۔ فوج بھی اس پر جان دیتی ہے!

ڈاکٹر احمد۔ بورک کاٹن؟ ۔ ہاں نرس فلورا! شاسماچ ایک شیر غرّاں ہے۔ آہ کاش حبش کے پاس بھی ہوائی جہاز ہوتے!

(خیمہ کے دروازے پر کچھ آواز سنائی دیتی ہیں)

نرس فلورا۔ ڈاکٹر! میدان جنگ سے کوئی زخمی آیا ہے۔

ڈاکٹر۔ (ایک سپاہی کو پٹی باندھ کر) چلو آپریشن کے خیمہ میں ۔!

(سب جاتے ہیں۔ فوج کے چار کپتان اسٹریچر اٹھائے ہوئے ہیں۔)

ایک کپتان۔ ڈاکٹر! جلدی کرو! ڈاکٹر!

دوسرا کپتان۔ فوج کے کمانڈنگ جنرل کے بازو میں گولی لگی ہے اور چہرے کو بم کے ٹکڑوں نے مجروح کیا ہے۔

نرس فلورا۔ آہ کون؟ جنرل شاسماچ؟

تیسرا کپتان۔ ہاں! ہاں! افسوس!

(نرس فلورا بے ہوش ہوکر گر پڑتی ہے)

ڈاکٹر احمد۔ (آپریشن ٹیبل پر پہنچتے ہوئے) شاید مرگیا غریب (میز پر پڑے ہوئے سپاہی کی حرکت قلب آلہ سے دیکھتا ہے) خاموش اسے اٹھالو اور جنرل کو لٹاؤ (لوگ شاسماچ کو لٹاتے ہیں) گولی بازو کے پار ہوگئی ہے۔ نرس! ای ۔ سی لوشن (آب سنرین) اور ڈریسنگ کا مکمل سامان! (نرس سب چیزیں لاکر دیتی ہے ڈاکٹر شست و شو میں مشغول ہوجاتا ہے) نرس ڈولی! تم نرس فلورا کو دیکھو! نرس

کیتھرن۔ مشک و کافور کا انجکشن! (زخم کو دھونے اور جراحتوں پر پٹی باندھ دینے کے بعد ڈاکٹر شاسماچ کو انجکشن دیتا ہے اور چاروں فوجی جرنیل کو آہستگی سے اٹھا کر گھاس پھوس کے بستر پر لٹا دیتے ہیں ڈاکٹر احمد حرکتِ قلب کا معائنہ کرتا ہے سانس کی رفتار کو دیکھتا ہے) سانس اور دل کی حرکت بے ترتیب ہے۔ زہریلی گیس کا اثر معلوم ہوتا ہے (ڈاکٹر مریض کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

ایک کپتان۔ ہاں ڈاکٹر! میدان جنگ کی فضا زہریلی گیسوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے سپاہی پٹ پٹ گر رہے ہیں۔ سامنے شل کی بارش اور مورچوں کے اوپر زہریلے بم! بہادر جرنیل شاسماچ اپنے ہاتھوں سے چھ گھنٹے مسلسل طیارہ شکن توپ چلاتے رہے ہیں۔ آخر انہیں ایک گولی آ لگی، پھر بھی ہمارے جرنیل ڈٹے رہے۔ ایک بازو جھول رہا تھا۔ اور وہ ایک ہاتھ اور شانوں اور پاؤں کی مدد سے دشمنوں کو نشانہ بناتے رہے (کپتان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ہیں)

دوسرا کپتان۔ آہ ہمارے جرنیل بم کی چوٹ اور زہریلی گیس کے اثر سے بے ہوش ہو کر گر پڑے!

تیسرا کپتان۔ چلو مورچے کو سنبھالیں۔

چوتھا کپتان۔ اس مورچے کی خیر نہیں! تم دونو

ہیں، چلو۔

(دو کپتان چلے جاتے ہیں۔ شہزادی فلورا کو ہوش آجاتا ہے)

فلورا۔ شاسماچ! ڈاکٹر! شاسماچ؟

ڈاکٹر احمد۔ خاموش! آہستہ!

فلورا۔ بدحال، بدحواس، بے ہوشی سے بدتر ہوش کے عالم میں جرنیل شاسماچ کے قریب جا کر بیٹھ جاتی ہے) ڈاکٹر! اچھے ہو جائیں گے جرنیل؟

ڈاکٹر احمد۔ آہ کون کہہ سکتا ہے؟

(شاسماچ انجکشن کے اثر سے قدرے ہوش کے عالم میں آتا ہے)

فلورا۔ ڈاکٹر! بولو! جرنیل بالکل اچھے ہیں نہ ڈاکٹر؟

شاسماچ۔ دبڑبڑا رہا ہے۔ آواز الفاظ کی شکل نہیں اختیار کرتی۔ غرغر۔ . . آ . . . . ش . . . حا . . . . ں . . . غ غ . . .

فلورا۔ شاسماچ بولو۔ پیارے شاسماچ! شاسماچ!

ڈاکٹر احمد۔ نرس فلورا! صبر! شہزادی صبر!

(خاموشی! کچھ دیر کے بعد شاسماچ آنکھیں کھولتا ہے اور پھر بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ پتھرائی ہوئی آنکھ، یاس انگیز حالت اب کچھ الفاظ سنائی دیتے ہیں)

شاسماچ۔ کپتان داہنے مورچے کی خبر لو . . . طیارہ وہ گرا!

(ایک خبر رساں داخل ہوتا ہے)

کو ہو گیا ہے۔ اطالوی زبردست آگ برسا رہے ہیں۔
تین گھنٹے سے زیادہ فوج نہیں ٹھہر سکے گی۔ اپنے
کیمپ کو یہاں سے ہٹا لیجئے!

ڈاکٹر۔ (گھبرا کر، مایوسی کے عالم میں) ؎

غضب ہے آدمی کیواسطے مجبور ہو جانا
زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

(شاسماچ کو قے آتی ہے۔ فلورا جرنیل کا سر
اپنے زانو پر لیکر بیٹھ جاتی ہے۔ اور دھیرے
دھیرے آنسو بہا رہی ہے)

شاسماچ۔ (بحران کے عالم میں) شہنشاہ!... جبش!
... فلورا!! (ایک ہچکی کے بعد دم توڑ دیتا ہے)

ڈاکٹر۔ (آلہ سے حرکت قلب دیکھ کر) خاموش! خاموش!
خاموش!!

(سارے کیمپ میں بھاگڑ پڑی ہوئی ہے۔ شہزادی
فلورا نیم بے ہوشی کے عالم میں شاسماچ کا سر
زانو پر لئے غیر شعوری طور پر بڑبڑا رہی ہے)

فلورا۔ مر گیا! مر گیا!! شاسماچ!! شاسماچ!!
موت! موت! نہیں غیر فانی! ... آہ! آہ!۔
محبت۔ زندگی! ارمان!... شاسماچ! آؤ!
اٹھو! مجھے گلے سے لگا لو! جنگ! جنگ! ظالم!
انسانیت سوز! شاسماچ! شاس... ماچ
شاس.... !

(بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے)

منظر دوم

ترالہ درید کی شکست کے بعد

(ساسابانہ ادیس ابابا سے [illegible] میل کے فاصلے پر
محاذ جنگ سے تین میل ادھر ایک خیمے میں رات
کے وقت مجلس جنگ بیٹھی ہے۔ ہوائی تاخت
کے خوف سے خیمہ کے اندر روشنی بہت مدھم
رکھی گئی ہے۔ شہنشاہ حبش، راس سیوم،
راس مولوگیتا، راس عمرو، راس دستا ۔۔ اور
جرنیل واہب پاشا[1] فرش یا زمین پر بیٹھے ہوئے
ہیں۔ سب [illegible] میں)

راس سیوم۔ شہنشاہ معظم! امید منقطع ہو چکی ہے۔
دارالسلطنت کو کوئی [illegible] سے ملک [illegible]
ہماری جانیں آپ [illegible] یہاں حضور کی جان کو
خطرہ ہے۔

(شہنشاہ متفکرانہ خاموش بیٹھا ہوا ہے)

راس دستا۔ عالیجاہا! ادیس ابابا کو عرصہ سے سامنے
دائیں پہاڑیاں محفوظ رکھے ہوئے ہیں ورنہ اب تک
ظالم اطالوی وہاں تک پہنچ چکے ہوتے!

(شہنشاہ اب بھی خاموش ہے)

راس سیوم۔ جہاں پناہ! حضور کے غلام بندہ جگری

---

[1] واہب پاشا ایک ترکی جرنیل انسانی ہمدردی

سے لڑے ہیں۔ دنیا ہمیں بزدلی کا الزام نہیں دے سکتی
اے شہنشاہ! آپ نے محاذاتِ جنگ کا خود معائنہ
فرمایا ہے۔ اکثر مقام ایسے آئے ہیں۔ کہ نہتے سپاہی
عریاں سینوں پر دشمن کی گولی، اور کھلے سروں پر بم
کی چوٹ کھا کھا کر مر گئے۔ مگر ان کے پائے استقامت
میں جنبش نہ آئی!

شہنشاہ۔ (سر اٹھاتے ہوئے) اے جانباز راس!
حبش بزدل نہیں۔ غریب ہے! آہ ہمیں دھوکا
دیا گیا! . . . . اے بہادرو! تمہارے شاداب
کھیتوں، تمہاری پُرامن آبادیوں پر آگ برسائی گئی
— تم بھوکے اور نہتے لڑے، مگر آفریں ہے تم پر
کہ تم نے مدعیانِ تہذیب پر ایسے کٹھن وقت میں،
اپنی شرافت و نجابت اور اپنی حب الوطنی و شجاعت
کا ثبوت دیا! (شہنشاہ خاموش و مغموم ہو جاتے ہیں)

راس مولوغیتا۔ عالیجاہ! یہ بالکل غیر مساویانہ لڑائی تھی
جنگ نہ تھی قتل تھا! ظالم اطالویوں نے مجلس اقوام
کی دفعات کا بھی پاس نہ کیا! ہم پر زہر آتشیں اور
آتش خونیں کی بارشیں کی گئیں۔!

شہنشاہ۔ (جوش میں آکر) مجلس اقوام! مجلس اقوام!
فریب کار! جھوٹی! کمزوروں کا خون چوسنے والی!
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

راس سیوم۔ شاہا! یہ سب رنگ دار اقوام کی خوابِ غفلت
کا نتیجہ ہے۔ حضور، روالا صدیوں کے سوتے ہوئے
حبش کو جگا [illegible]

نے اس کا مال و متاع لوٹ لیا! ہاں ہم لڑتے لڑتے
مر جائیں گے۔ مگر دشمنوں کی اطاعت قبول نہ کریں گے!

راس دستہ۔ آقا! جسم کا ذرہ ذرہ خدمتِ وطن میں
مٹ چکا! اب صرف مادرِ وطن کی حرمت کے
تحفظ کے لئے جان دینی باقی ہے۔

شہنشاہ۔ راس تفاری بھی تمہارا ساتھ دے گا
حبش! حبش!!
(شاہ لبوں کو کاٹتا ہے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا
جاتی ہیں)

جرنیل واہب پاشا۔ اے شہنشاہِ والا تبار! میرے
ذہن میں ایک تدبیر ہے۔ ارشاد ہو تو عرض کروں۔

شہنشاہ۔ بتلاؤ اے معزز جرنیل!

واہب پاشا۔ لیگ کی تعزیرات کا خاطر خواہ اثر
اس سبب سے نہ ہو سکا کہ بہت سے ممالک تعزیرات
کے خلاف رہے۔ اور فوجی تعزیرات کا اجرا
برطانیہ اور فرانس کی خود غرضیوں کے سبب نہ ہو سکا
پھر بھی میرا خیال ہے کہ لیگ کے اثر و اقتدار سے
فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ حضور، سوڈان اور مشرقی
مقبوضات کے تحفظ کے لئے برطانیہ ضرور کوئی
کارروائی کریگا۔ برطانوی مدبرین شک و انتظار کے
عالم میں پڑے رہے اور مسولینی نے اپنی فتوحات
حاصل کر لیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ حبش کچھ علاقہ اطالیہ
کے سپرد کر دیگا اور بات رفت و گذشت ہو جائیگی
[illegible]

پر بھی اپنی نظر جمائے ہوئے ہے۔ بحر متوسط کو وہ
خالص اطالوی جھیل بنانا چاہتا ہے۔ ادھر فرانس
والے اب تاڑ گئے ہیں کہ اطالیہ در پردہ جرمنی سے
سازباز کر چکا ہے۔ لہٰذا فرانس برطانیہ کی ضرور
مدد کرے گا۔ فرانس و برطانیہ کی متحد قوت مسولینی
کے سر پر غرور کو نیچا کر دکھائے گی۔!

راس عمرو۔ مگر اب کیا کیا جائے؟ ادیس ابابا ہفتہ عشرہ
میں محاذ جنگ بن جائے گا۔ شہنشاہ کی جان کا سخت
خطرہ ہے!

واہب پاشا۔ ہاں شہنشاہ کو اپنی جان کی حفاظت
کرنی لازم ہے اور فی الفور!

شہنشاہ۔ نہیں اے بہادر و! میں بے عزتی کی زندگی
قبول نہیں کرسکتا! میں اپنے پیارے وطن کیلئے
ایک معمولی سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مر جاؤں گا۔

جرنیل واہب۔ اے شہنشاہ! ابھی وقت نہیں آیا۔
آپ حبش کی خاطر اپنی جان کی حفاظت کیجئے۔
حبش کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ سارے ملک
کو متحد رکھنا صرف آپ کی ذات سے ہوسکتا ہے

راس سیوم۔ بالکل صحیح! جرنیل سچ فرماتے ہیں!

راس مولوغیتا۔ ہاں اے وارث تخت سلیمان! آپ
کی جان بہت عزیز ہے!

جرنیل واہب پاشا۔ ادیس ابابا تو مفتوح ہو ہی جائیگا
مگر ملک کا مغربی کوہستانی علاقہ حبشی فوجوں کیلئے
[illegible]

آ چلی ہے۔ جولائی کا مہینہ اطالویوں پر حملہ کرنے کے
لئے بہت موزون ہوگا۔ مگر سب سے پہلے مجلس اقوام
کو اطالیہ کے خلاف تیار کرنا ضروری ہے۔ اور
موجودہ صورت حال حضور کے حق میں ہے۔ میری
رائے ہے کہ آپ دیجبوتی ریلوے کے ذریعہ
یورپ تشریف لے جائیں اور مدبرین برطانیہ و
فرانس پر اثر ڈالیں۔

شہنشاہ۔ میں اپنے پیارے حبش کو دشمنوں کے
رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جاؤں؟ نہیں، نہیں!
اگر مجلس اقوام کو متوجہ کرنا ہے۔ تو وہ یہیں سے
ہوسکتا ہے۔

راس سیوم۔ حضور والا! جس وقت تک مجلس کا اجلاس
منعقد ہوگا، قرائن یہ کہتے ہیں کہ ادیس ابابا فتح
ہو چکا ہوگا اور اگر حضور یہیں رہے تو پھر حبش کے لئے
آخری امید بھی منقطع ہو جائے گی۔!

راس دستہ۔ اے شہنشاہ! وقت بہت ہی کم ہے
دشمن نے ادیس ابابا کی ناکہ بندی کر رکھی ہے مغربی
صوبہ کی طرف ہمارا پسپا ہونا بھی سردست ناممکن
ہے۔ اور وہاں کوئی منظم فوج بھی نہیں

راس عمرو۔ حضور والا۔ آپ اپنی جان کی حفاظت
فرمائیں۔ آپ کے غلام لڑ بھڑ کر سر بکف مغرب
کی طرف نکل جائینگے۔ اور وہاں حضور کے احکامات
کا انتظار کرینگے!

شہنشاہ۔ [illegible] مظالم [illegible] شہنشاہ ایک بیکس

فراری! معزز سردارو! مجھے اپنے دوش بدوش لڑ کر مر جانے دو۔

جرنیل واہیب۔ سیاستِ جنگ کے لئے پسپا ہونا بزدلی نہیں! حضور ضرور فی الفور یورپ تشریف لے جائیں۔ حالات اس کے متقاضی ہیں

راس مولوغیتا۔ شہنشاہ! حبش کی خاطر!

راس سیوم۔ عالیجاہا! ہم لوگ آخر دم تک سپر انداز نہ ہونگے۔

راس دستہ۔ جب تک دم میں دم ہے۔ اطالوی ملک پر تسلط حاصل نہیں کر سکتے!

راس عمرو۔ جرنیل واہیب کی رائے بہت صائب ہے سب سے پہلے شہنشاہ کی جان کی سلامتی کی ضرورت ہے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

شہنشاہ۔ میرے وفادار سردارو! میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟ میں اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟ مجھے پھر کوشش کرنے دو! مجھے پھر کوشش کرنے دو! جرنیل واہیب! تم نئے سرے سے عساکر کی تنظیم کرو۔ راس عمرو اور راس دستہ تم تازہ دم فوج بھرتی کرنے کی سعی کرو۔ اور تم راس سیوم اور راس مولوغیتا دشمن کے قدم روکے رکھو میں ادیس ابابا سے اسلحہ ہائے جنگ اور رسد کا بندوبست کر کے تمہیں بھیجتا ہوں۔ کچھ سامان جنگ بندرگاہ تک پہنچ گیا ہے۔ میں یورپ اور امریکہ کی چند کمپنیوں سے جنگی طیاروں کی خرید کی بھی بات چیت کر رہا ہوں۔ بہادرو ہمت نہ ہارو۔ اسی دم سے کام شروع کردو۔

(شہنشاہ خیمہ سے باہر نکل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے)

رباعیات

دھندلی ہے نظر نگاہ کرتے کرتے
تاریک ہے دل سیاہ کرتے کرتے
یارب مجھے اپنی رحمت میں چھپا
میں تھک گیا ہوں گناہ کرتے کرتے

ہم مرد ہیں ابرو پہ نہ بل ڈالیں گے
اس قید علائق کو کچل ڈالیں گے
کیا موت کا ڈر، موت کی ہستی کیسی؟
میلی ہے یہ پوشاک بدل ڈالیں گے

از [illegible]

صاحبزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

خیالِ خام

میری بربادیوں کے نوحہ گر! | مفلسی کا مجھے نہ دے الزام
میں تو در اصل اس زمانے میں | چاہتا تھا رہوں بلند مقام
وقت میرا غلام بن کے رہے | میرے قابو میں ہو حیاتِ دوام
میری زد میں ہوں چاند اور تارے | میرے بس میں ہو گردشِ ایام
موت کی فکر سے رہوں آزاد | زندگی کو بناؤں اپنا غلام
آسماں کو پلک جھپکنے میں | قطع کرتی ہو میری تیزیٔ گام
مفلسوں کو پلائے جاؤں میں | ظالموں کے لہو سے بھر کر جام
ایک پُرخوف احترام کے ساتھ | یاد کرتے ہوں لوگ میرا نام
سربلندوں کو روند ڈالے میرا | توسنِ بے لگام، تیز خرام
میرے در پر جھکیں سکندر و جم | میرے خنجر کو چومیں رستم و سام
دیکھ کر میری رفعتِ تخئیل | تھرتھراتا ہو چرخِ نیلی فام
اور مجھے روحِ میرزا غالب | شاعری کا بنائے ماہِ تمام
میری پرواز کو نہ روک سکے | یہ نظامِ لیالی و ایام
بجلیوں کے بھی دل لرز جائیں | جب اُٹھے میری تیغِ خوں آشام
میرے پرچم تلے اکٹھے ہوں | دہلی و لزبن و عراق و شام
میری بربادیوں کے نوحہ گر! | یہ مری روح کے تھے وہم تمام
جانتے ہو کس مصیبت سے | ایک تنکے کو توڑتا ہے غلام

آہ ان رفعتوں کا ذکر نہ چھیڑ

[illegible]

افسانہ

میرزا ادیب

بدنصیب

شیخ احمد اسمٰعیل کا اکلوتا لڑکا یوسف اسمٰعیل اپنے شاندار کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھا ہوا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ ایک خادم اندر آیا۔ اور کہنے لگا" حضور! آپ سے ایک شخص ملنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

اس نے مجھے نام نہیں بتایا۔ کہتا ہے وہ مجھے جانتے نہیں۔ اس لئے نام بتانا بیکار ہے۔"

"بلالو ــــ"

خادم چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک کریہہ المنظر شخص دروازے میں سے اندر جھانکا۔" مسٹر یوسف آپ ہی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں! اندر تشریف لے آئیے۔"

وہ شخص اندر آگیا۔ اور جیب سے ایک سبز رنگ کا لفافہ نکال کر یوسف کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "فیروز آپکا خادم کل فوت ہوگیا ہے۔ یہ خط اس نے آپکے نام بھیجا ہے۔"

"فیروز فوت ہوگیا ہے؟" یوسف نے قدرے غمگین لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! کل صبح اس نے دم دیا ہے۔ مرنے سے چند دن پیشتر اس نے یہ لفافہ مجھے دیا تھا۔ اور کہا تھا۔ جب میں مر جاؤں تو یہ شیخ احمد اسمٰعیل کے لڑکے یوسف اسمٰعیل کو دیدینا۔

یوسف نے لفافہ [illegible] سے لیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں [illegible] ملازم ہوں۔ [illegible] سے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے۔ بڑا نیک انسان تھا۔"

"بہت نیک انسان ہے" یوسف نے اس کے الفاظ دہرائے۔"

"چند دن کے بعد اس کی شادی ہونیوالی تھی۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔"

اس کے بعد اس شخص نے یوسف سے مرحوم کے متعلق دوچار اور باتیں کیں۔ اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد یوسف نے لفافہ کھولا۔ اور پڑھنے لگا۔ عبارت کی سطریں ٹیڑھی ٹیڑھی تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ تحریر لکھنے والے کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ تحریر یہ تھی:۔

میرے یوسف!

اُمید ہے تم مجھے بھولے نہیں ہوگے۔ اور میری تحریر پڑھ کر غالباً تم مجھے سمجھ بھی [illegible] لوگے۔ [illegible] ــ

اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز جو تمہاری زندگی کا بھی ایک بہت بڑا راز ہے منکشف کر رہا ہوں۔ یہ راز ـــــ اب تک راز بنکر ہی میرے دل میں رہتا۔ اور میرے مرنے کے ساتھ ہی میرے سینے میں دفن ہو جاتا۔ مگر ایک خاص ضرورت ـــ ایک خاص وجہ مجھے مجبور کر رہی [illegible] ـــ میرے اچھے یوسف! اب میں اپنی زندگی کی درد انگیز داستان بیان کرتا ہوں۔!

لاہور کے ایک معزز خاندان میں میں پیدا ہوا۔ بچپن میں والدین دنیا سے رخصت ہو گئے۔ والد مرحوم نے تجارت میں لاکھوں روپے کمائے تھے۔ اس لئے جب میں سن بلوغ کو پہنچا۔ تو اپنے آپ کو ایک بہت بڑی جائداد کا تنہا وارث پایا۔ تنہا میں نے اس لئے کہا ہے۔ کیونکہ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دولت توقع سے بڑھ کر تھی۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ سب میرے قبضہ میں تھی۔ اس [illegible] گذارنی شروع کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ دولت بذاتِ خود دنیا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر بعض اوقات انسان اسے اپنے لئے ایک ہولناک لعنت بنا لیتا ہے۔ مجھے دنیا کی یہ بہت بڑی نعمت ملی۔ مگر بدقسمتی سے میں نے اسے ہولناک لعنت بنا لیا۔ افسوس میں نے سمجھا کہ زندگی عبارت ہے عیش و عشرت سے، مجموعہ ہے طرح طرح کی مسرتوں کا اور نام ہے حظائظ نفسانیہ کے حصول کا۔ عیش پرست دوستوں نے اس خیال کو تقویت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے باپ کی محنت سے کمائی ہوئی جائداد کو فضول خرچیوں کی نذر کرنا شروع کر دیا [illegible]

کی چشم حیرت تھی۔ مجھے ان تباہ کن فضول خرچیوں بربادی اور ذلتوں اور ذلت خیز اطوار سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کرتی۔ مگر میرے یوسف! انسان جب ایک دفعہ گناہ آلود راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ تو مشکل ہی سے چھوڑتا ہے۔ [illegible] باوجود [illegible] تھا۔ اپنی فضول خرچیوں میں میں نے ذرہ بھر کمی نہ کی۔ یہاں تک کہ دولت نے [illegible] کمیاں لینی شروع کر دیں۔ اس وقت بھی مجھے ہوش نہ آیا۔ دولت بے وفائی کر چکی تھی۔ دوست منہ موڑ چکے تھے۔ رشتہ دار تمام تعلقات منقطع کر چکے تھے مگر دنیا میں ابھی ایک ہستی تھی جو اب بھی میری تھی۔ جو اب بھی میری بربادیوں کو دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہا رہی تھی۔ جو اب بھی پہلے کی طرح مجھ سے محبت کرتی تھی اور میری دلی ہمدرد تھی۔ وہ ہستی میری بیوی تھی۔ عائشہ! آہ یہ محترم و مقدس نام لیتے ہوئے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے ـــ مگر میرے یوسف! دل ایک ایک حرف پر ٹوٹ سکے مگر قلم نہیں رکیگا مجھے جو کچھ لکھنا ہے وہ ضرور لکھوں گا۔

میرے پاس دولت تو نہیں تھی۔ تاہم دل میں ہوس تو زندہ تھی۔ اس ہوس کو پورا کرنے کے لئے ذلیل و ناپاک نفرین ذرائع سے دولت حاصل کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ اور بہت جلد یہ خیال عملی صورت اختیار کر گیا آہ! مجھے وہ رات ابھی تک نہیں بھولی۔ جب میری بیکس بیوی اپنے ننھے سے بچے کو گود میں اٹھائے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر مجھے بدی سے روکنے کے لئے آہ و زاری کر رہی تھی [illegible] ایک قیامت تھا۔ ـــــ

——— اس معصوم کو بھی شائد معلوم تھا۔ کہ میں ذلیل مقصد کے لئے گھر سے نکل رہا ہوں۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ وہ حسرت انگیز منظر میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے۔ افسوس۔ اس وقت مجھے بدی اور گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔

——— میں نے اپنا ناپاک ارادہ پورا کیا ———

ایک نہایت ذلیل ذریعے سے دولت حاصل کی ——— میں ذلت کی گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا۔ پھر اپنی حالت کا خیال، نیکی کا احساس میرے ذہن میں کیونکر آسکتا تھا۔ اپنی بیوی کی مسلسل گریہ آلود التجاؤں کے باوجود میں نے ——— اس ذلیل انسان نے، ہزاروں ذلیل ارادے پورے کئے نیکی کے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں ہیں۔ مگر بدی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ایک دن میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ میرے ایک دوست نے آواز دی میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا۔

”چلو گے ———؟“ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

اس ”چلو گے“ کا مطلب میں کیونکر نہ سمجھتا میری باچھیں کھل گئیں۔ فوراً تیار ہو گیا۔

”تمہارا بچہ کہاں ہے“؟ اس نے خلاف توقع پوچھا

”اندر ہے!“

”ذرا لاؤ نا اُسے!“

”کیوں؟ کیا بات ہے؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”بتاتا ہوں۔ تم لے آؤ۔ پھر چلو گے۔“

میں تیزی کے ساتھ اندر گیا معصوم بچہ ڈیوڑھی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹولی پر سو رہا تھا۔ ماں اندر کوئی کام کر رہی تھی۔ میں نے بچے کو اٹھایا اور باہر آگیا میرے دوست نے بچہ اپنی گود میں لے لیا۔ اور چلنے لگا ——— ”ایک زریں موقعہ ہاتھ آیا ہے“ کچھ دیر چل کر میرے دوست نے کہا۔

”کونسا موقعہ؟“

”ایک بہت بڑا رئیس ایک خوبصورت بچے کی تلاش میں ہے۔“

”کیوں“؟ میں نے استفسار کیا۔

”کیونکہ رئیس کے ہاں اپنا کوئی بچہ نہیں۔ اور وہ کسی خوبصورت بچے کو متبنیٰ بنانا چاہتا ہے۔ بچے کے لئے اس نے بہت بڑی رقم پیش کی ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ذرا اس ننھی جان کو رئیس کے حوالے کر دیں۔ اور اس سے رقم اینٹھ لیں ——— چند دن بعد موقعہ پا کر اسے لے آئیں۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا ———؟“

میں نے حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”خاموش ہو گئے۔ بھئی سچی بات یہ ہے۔ کہ آج کل ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ روپیہ پیدا کرنے کا نادر ترین ذریعہ ہے بچے کا میں ذمہ دار ہوں۔ دس دن کے اندر اندر بچہ نہ لے آیا تو تم جو چاہو سزا دینا۔“

”لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔“

”سب کچھ ہو سکتا ہے۔“

”چند دن کے اندر اندر بچہ لے آؤ گے؟“

”اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ سمجھ سکتے ہو کچھ ہم نے

جھوٹ، دھوکہ بھی کیا ہے ؟"

اتنے میں شراب کی دکان آگئی۔ ہم دونوں اس کے اندر گھس گئے۔ شراب کی بوتلیں ہمارے سامنے آگئیں۔ اس ذلیل انسان نے کچھ نقد میرے ہاتھ میں دی۔ اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا "نقدی پوری کر کے ابھی آیا"۔ میں نے شراب کا گلاس منہ سے لگایا ——— اور ———!

میرے یوسف! تم یہ سطور پڑھ کر مجھے لعنت و ملامت کر رہے ہو گے۔ خوب کرو۔ مگر ——— تب ابھی کچھ نہیں کہتا تمہیں جلد ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

جب میرا خمار اترا تو وہاں نہ میرا دوست تھا۔ اور نہ میرا بچہ۔ تمام نقدی بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں فوراً دوست کے گھر پہنچا وہاں تالا لگا ہوا تھا میں بہت سٹپٹایا۔ ایک محلہ آشنا وہاں مل گیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ وہ شیطان یہ گھر چھوڑ چکا ہے۔ اور اب معلوم نہیں کہاں ہے میں اسے تلاش کرتا رہا۔ مگر بے سود۔ آخر میں گھر کی طرف چلا۔ ابھی دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ پولیس کے سپاہیوں نے ایک چوری کے الزام میں جو میں نے دو مہینے پیشتر کی تھی۔ گرفتار کیا ——— اس کے بعد میں جیلخانے میں تھا۔

جب میری بیوی کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ مجھ سے ملنے آئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پچکے ہوئے رخساروں پر جا بجا آنسوؤں کے دھبے نظر آتے تھے اس نے صرف چند الفاظ کہے۔ مگر یہ چند الفاظ نشتر بن کر میرے دل میں چبھ گئے۔ آہ اس وقت اس کی حالت کتنی قابل رحم تھی۔ جب وہ [illegible] سلاخوں [illegible]

سے ہٹائے اپنا مغموم و غمناک چہرہ ایک سلاخ سے لگائے دھوپ میں کھڑی ہوئی رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر نہایت درد انگیز لہجے میں کہہ رہی تھی "میرا بیٹا کہاں ہے ؟"

یہ الفاظ سنتے ہی میرا سینہ پھٹ گیا۔ میں نے چاہا کہ اسے تسلی دوں۔ اسے کہوں کہ تمہارا بیٹا صحیح سلامت موجود ہے مگر میری زبان رک گئی۔ اس نے یہ نشتر بدامن الفاظ دہرائے میں پھر خاموش رہا۔ اپنی تمنا اپنی آرزو کے خلاف خاموش رہا۔ وہ چلی گئی۔ اس کے الفاظ آتشیں شعلے بنکر میرے دل کو جلانے لگے۔ روح کی گہرائیوں میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اپنے گذشتہ مظالم ایک ایک کر کے مجھے یاد آنے لگے ——— یاد آ آ کر تڑپانے لگے۔ میری طبیعت سخت بیقرار رہنے لگی۔ رات کو جب میں لیٹتا تو سوتے میں وہ بدنصیب عورت مجھ سے اپنا بیٹا مانگتی میں چیخ مار کر ——— گھبرا کر بیدار ہو جاتا۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا۔ مگر میرا ہاتھ ظالم سلاخوں کو چھو کر رہ جاتا۔ بھیانک تاریکی میں کوئی صورت دکھائی نہ دیتی۔ خوفناک خاموشی میں کوئی آواز کان میں نہ آتی۔

اس ذہنی کوفت، دماغی بیقراری، روحانی اذیت نے میرا برا حال کر دیا۔ چند دن کے بعد میری بیوی پھر آئی۔ بدقسمت عورت نے آتے ہی وہی الفاظ کہے۔ جنہوں نے میری زندگی کا چین اور آرام چھین لیا تھا۔ اس وقت میں بے اختیار چاہتا تھا کہ اسے تمام واقعہ سنا دوں میں واقعہ سنانے لگا۔ وہ چپ چاپ ایک زخمی پرندے کی طرح جو بیرحم شکاری کے پھندے میں پھنس کر حسرت ناک نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ مجھے دیکھتی رہی اور ——— اس کا شکاری

اس کے معصوم بچے کا شکاری بولتا رہا۔ یہاں تک کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بدنصیب عورت کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس کی آخری رحم طلب نگاہیں تیر بنکر میرے دل پر لگیں۔
مجھے اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ میرا بیٹا زندہ ہے یا مردہ ——— اب بدنصیب ماں سے زیادہ بدنصیب باپ اپنے بیٹے کے لئے تڑپ رہا تھا جب قید کی میعاد پوری ہوگئی تو میں نے قسم کھائی کہ سب سے پہلے اپنے بیٹے کی تلاش کرونگا اور اس مقصد کے حصول میں اگر جان بھی چلی جائے تو دریغ نہیں کرونگا میں نے اپنے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ اور یہ دیکھ کر میں سخت حیران ہوگیا کہ میرے ٹوٹے پھوٹے مکان کی بجائے ایک عالیشان مکان کھڑا ہے۔ ہمسایوں نے مجھے بتایا کہ یہ مکان ایک سیٹھ کا ہے جسکا میں قرضدار تھا قرضے میں اُس نے میرا مکان قرق کروالیا تھا۔ اور میری بیوی ——— ؟ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کہاں ہے ؟

میں شہر میں گھومنے لگا ——— میرے پیش نظر دو مقصد تھے۔ ایک تو اپنی بدنصیب بیوی کی تلاش۔ اور دوسرے اپنے بیٹے کو دیکھنا ——— ان مقاصد کے لئے میں نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ ملا۔ آخر میں تمہارے شہر میں آیا۔ تھک کر ایک باغ میں بیٹھا تھا۔ کہ مجھے اپنے قریب ہی اپنا بیٹا ——— اپنا یوسف نظر آیا۔"

یوسف کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔" اپنا بیٹا یوسف"! اس نے آہستہ سے کہا۔ اُسے زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ا تنے بڑے رئیس کا بیٹا اور ——— معمولی سے ملازم کا بیٹا ——— ؟ کتنا تعجب انگیز واقعہ ؟ ؟

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"یہ الفاظ پڑھ کر تمہیں بڑی حیرت ہوئی ہوگی۔ مجھے اس کا سخت افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ایک نہایت تلخ حقیقت سے آگاہ کیا۔ مگر کیا کروں میرے بیٹے! افشائے راز پر مجبور ہوں۔

خیر! میرا ایک مقصد تو پورا ہوگیا تھا ——— میرا بیٹا تو مجھے نظر آگیا تھا! میں نے سوچا۔ کہ جس رئیس نے تمہیں متبنےٰ بنایا ہوا ہے۔ اس کے ہاں نوکری کر لوں۔ اس طرح تمہارے پاس بھی رہونگا۔ اور اپنی بیوی ——— تمہاری ماں کو بھی ڈھونڈتا رہوں گا۔ دوسرے دن میں شیخ احمد اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ اور نوکری کے لئے درخواست کی۔ انہوں نے تمہاری خدمت کے لئے مجھے نوکر رکھ لیا حقیقی باپ اپنے بیٹے کا نوکر مقرر ہؤا۔

یوسف کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر گرنے لگے۔

"اب میرے سپرد دو کام تھے۔ ایک تمہاری خدمت اور دوسرا تمہاری ماں کی تلاش۔ ہر روز وقت ملنے پر میں ادھر اُدھر پھرتا۔ لوگوں سے پتہ پوچھتا ——— الغرض تمہاری ماں کی تلاش میں انتہائی کوشش کرتا۔ مگر بے سود۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بدنصیب کائنات کے کس گوشے میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

میرے بیٹے! میں نے تمہاری ماں کی تلاش جاری رکھی۔ آٹھ سال تک میں اسی کوشش میں سرگرداں رہا۔ آخر ایک دن مجھے پتہ مل گیا کہ وہ زندہ ہے! اور جالندھر کے محلہ چاہ لالے والا میں رہتی ہے۔ میں فوراً وہاں پہنچا۔ آہ! دکھیاری

عورت کو غموں نے بہت جلد بوڑھا کر دیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا وہ سو رہی تھی میں نے اُسے جگایا اور کہا۔

"عائشہ! تمہارا بیٹا مل گیا ہے۔ وہ تم سے ملنے آئیگا!"

"تم ——"؟ اس نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر کہا۔

"میرا بیٹا آئیگا! کب"؟

"ابھی تم سے ملنے آئیگا۔ اب تو وہ بہت امیر ہے!"

"میرا بیٹا! اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ فرط ضعف سے اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ اس کی افسردہ آنکھیں کہہ رہی تھیں جلد میرے بیٹے کو لاؤ۔ اس کے بعد میں واپس آیا۔"

یوسف کا دل دھڑکنے لگا ——

"میں نے تمہیں کہا۔ جالندھر میں میرے ایک رشتہ دار کی شادی ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ میرے اچھے یوسف! تم چلنے پر تیار ہو گئے۔ اس وقت میرا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ ہم دونوں پر لگا کر تمہاری ماں کے پاس پہنچ جائیں۔

جب ہم ٹرین میں بیٹھے۔ تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

ہم محلہ چاہ لالے والا میں داخل ہوئے۔ ایک شخص کفن ہاتھ میں لئے ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔ میرے دل پر ایک چرکہ سا لگا۔ آگے بڑھے تو دیکھا ایک شخص تھال ہاتھ میں اٹھائے لوگوں سے پیسے مانگ رہا ہے۔ اُس نے تھال ہمارے آگے بھی بڑھایا اور کہا۔

"ایک غریب عورت فوت ہو گئی ہے۔ تجہیز و تکفین میں آپ بھی مدد دیں۔"

"کون غریب عورت؟" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا

"اُس مکان میں رہتی تھی بیچاری ——" اُس شخص نے اُسی مکان کی طرف اشارہ کیا جس میں میں نے تمہاری ماں کو دیکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ میرا سینہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے میرے یوسف! میرے بیٹے! مجھ سے میری اپنی بیوی تمہاری ماں کے جنازے کے لئے کچھ خیرات مانگی جا رہی تھی"؟

یوسف کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں کاغذ پر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے رومال سے آنسو پونچھے۔ ٹھنڈی آہ بھری۔

"میں نے تمہیں وہیں ٹھہرایا۔ اور مرحومہ کے پاس پہنچا۔ تمہاری ماں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گویا وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اس وقت مجھ سے ضبط کرنا محال تھا۔ —— تم باہر کھڑے تھے میں چاہتا تھا۔ اس اندوہناک واقعہ کی تمہیں خبر نہ ہو" تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ؟" —— میں نے دل میں کہا۔ بڑی کوشش سے میں نے آنسو روکے۔ باہر آیا۔ اور تمہیں یہ کہہ کر واپس بھیجدیا کہ میری ایک دور کی رشتہ دار فوت ہو گئی ہے۔ تم چلے گئے —— پھر میں بدنصیب عورت کی نعش سے لپٹ کر خوب رویا۔ اور معلوم نہیں۔ میری یہ حالت کب تک رہتی۔ مگر لوگوں نے مجھے علیحدہ کر دیا۔

میرے یوسف! آٹھ سال تک میں تمہارے ہاں رہا تھا۔ پندرہ روپے مجھے تنخواہ کے طور پر ملتے تھے۔ جن میں سے میں زیادہ سے زیادہ دو تین خرچ کرتا تھا۔ باقی جمع کرتا تھا۔ تاکہ جب تمہاری ماں ملجائے تو اُسے دیدوں۔ اُس وقت

تمام جمع شدہ رقم میری جیب میں تھی۔ میں نے اس میں سے کچھ مرحوم کے تجہیز و تکفین پر خرچ کی اور باقی روپے میری جیب میں رہے ——— میری بدنصیبی کی انتہا ہو چکی تھی۔ تاہم میں چاہتا تھا۔ کہ ایک دفعہ تم سے مل لوں۔ اور پھر کہیں دور چلا جاؤں۔ جب میں سٹیشن پر پہنچا۔ تو تمہارے نوکروں نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہارے ہاں میری عدم موجودگی میں جو چوری ہوئی تھی۔ اس کا مرتکب مجھ بدنصیب کو سمجھا گیا تھا۔ ستم پر ستم یہ کہ میری نقدی نے ان کے شبہ کو یقین کی صورت دیدی ——— میرے بیٹے! جب تم نے میرے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیکھا تو تمہیں بہت افسوس ہوا تمہیں کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ میں چور ہوں۔ میرے پیارے بیٹے! اب حقیقت تم پر ظاہر ہو گئی ہے۔ میں جیل پہنچا دیا گیا۔ اب میری زندگی کی داستان ختم ہو گئی ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ بتا دیا۔ شاید میں دو تین دن اور زندہ رہوں ایک آرزو ہے میرے بیٹے! اپنے باپ کی بدنصیبی پر افسوس نہ کرو۔ جو ہونا تھا۔ ہو چکا اب جبکہ میں موت کے کنارے پہنچ چکا ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری ماں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میرے لخت جگر تم بھی مجھے معاف کر دو۔ اپنے بدنصیب باپ کو معاف کر دو۔ دعا کرو خدا بھی مجھے معاف کر دے۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ اچھا بیٹا! الوداع! ——— تمہارا بدنصیب باپ" فیروز

حضرت طالب انصاری

غزل

آنکھ مخمورِ مئے حسن ہے اور دل مدہوش | یہ وہ عالم ہے کہ جس میں غم فردا ہے نہ دوش
کس قدر اوج پہ ہے آج ترا کوکبِ حسن | دیکھتا ہوں مہ و پرویں سے تجھے دوش بدوش
دیکھ کر آج مرا حالِ پریشاں اُس نے | کھولدی میرے لئے اپنی ہلالی آغوش
بن گئی ہے اثرِ جامِ مئے گلگوں سے | مستیٔ بزمِ دو عالم نگہِ بادہ فروش

ہے یہ طالب اثرِ گرمیٔ عشقِ ساقی
میرے ساغر میں ہے ہر موجِ رواں شعلہ بدوش

سید بادشاہ حسین صاحب (حیدرآبادی)

ترغیبِ خودکشی

ایک مصری اور اس کی روح کے درمیان کئی ہزار سال قبلِ مسیح ایک فلسفیانہ مکالمہ

کچھ عرصہ قبل ایک گراں قدر مخطوطہ جرمن اکیڈمی کے ہاتھ لگا۔ اس کی شروع کی عبارت کرم خوردہ ہے۔ اس لئے اس کے طریقہ آغاز پر روشنی نہیں ڈالی جا سکی مگر اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ کوئی مصری اپنی روح سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس مکالمہ کو برمن نے ترجمہ کیا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ کئی ہزار سال قبل مسیح کا ہے

اُن دنوں مصریوں کے عقائد کے موافق انسان کے جسم میں ایک روح نہیں بلکہ متعدد روحیں بستی تھیں۔ ایک تو وہ تھی جو جسم کے بے جان ہوتے ہی عالم بالا کی طرف پرواز کر جاتی تھی۔ دوسری جسم کے ساتھ قبر کے تاریک و تنگ گوشہ میں جسم کی رفیق ہوتی تھی۔ اور تیسری دنیا میں رہ کر غلط راستہ پر چلنے والوں کی رہنمائی کرتی تھی۔

ذیل کا مکالمہ ایک مصری اور اس کی ان متذکرہ بالا روحوں میں سے دوسری قسم کی روح کے درمیان معلوم ہوتا ہے اس مکالمہ کا غائر نظروں سے مطالعہ کرنے سے دو خیال ذہن میں آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اپنی آئندہ زندگی سے بالکل بے خبر ہونے کی وجہ سے پریشان اور مضطر ہو کر روح سے اپنی تکالیف بیان کرتا ہے۔ اور روح موجودہ اور آئندہ زندگی کے درمیان جو خلیج حائل ہے۔ اس سے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ اور دوسرا خیال وہی ہے جو برمن کے ذہن میں آیا اور وہ یہ کہ انسان دنیادی مصائب و آلام سے پریشان ہو کر اور آئندہ زندگی سے نا اُمید ہو کر موت کی آرزو کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دنیاوی مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ خودکشی ہے۔

مکالمہ کا ابتدائی حصہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکا۔ مگر دو چار لفظ جو سمجھ میں آ سکے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ روح انسان سے شکایت کرتی ہے اور مصری اس کے جواب میں کہتا ہے:۔

" . . . . . . تیری شکایتوں میں حقیقت کی جھلک بہت کم ہے اور تیرا گلہ غیر ضروری ہے۔ تو نے آڑے وقت میں کبھی میرا ہاتھ نہیں بٹایا، میری مصیبتوں میں غمخواری نہیں کی —— شائد اس وجہ سے کہ میں نے تیرے اُس بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ جو مجھے سیدھا موت کے منہ میں لے جاتا تھا —— میں سچ کہتا ہوں تیرا

کام یہ تھا کہ تو میری پریشان حالیوں کے وقت سہارا دیتی
تماشائیوں کے گروہ سے نکل کر میرے قریب آتی، میرے
آنسو پونچھتی اور تسکین اور دلاسہ دیتی مگر تو نے ایسا نہیں کیا
مجھے موت کے لپکتے ہوئے شعلوں میں زبردستی نہ دھکیل
میں بودا نہیں ہوں۔ سوچ کر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ زندگی
دوبارہ حاصل نہیں کی جا سکتی ——— زندگی، اس دنیا کی
زندگی! تجھے کیا بتاؤں کہ زندگی میں کتنی لذت ہے کس طرح
سمجھاؤں کہ اس لذت میں کس درجہ کشش ہے۔ موت! اُف
رونگٹے کھڑے ہونے لگے، جسم میں لرزہ پیدا ہونے لگا۔ اور
دل کانپنے لگا۔ موت کے بعد پرسش گناہ، پھر عذاب!
الاماں والحفیظ۔"

روح سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے طیش میں آ کر کہا
"او شیطانی خصائل والے انسان! اے لذت دنیا
کا مزہ چکھ کر عاقبت کو بھول جانے والے غافل! گناہ کرتے
وقت عذاب سے نڈر کر لذت نفسی پر انسانیت کو قربان
کر دینے والے مجرم! تو اپنی ہوسناکی، رندی و مستی سے
تو اجتناب نہیں کرتا اور عاقبت کے عذاب کے خیال سے
کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے!

مصری نے دخل دیا۔

"دیکھ! اس طرح پند و نصائح کا خشک گلدستہ
میرے آگے پیش کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ میرے عمل پر تنقید
کر کے عاقبت کے عذاب سے ڈرانے سے تیرا مدعا حاصل نہیں
ہوگا۔ سن لے! میں بہانگ دہل کہتا ہوں کہ کبھی اپنے پاؤں
پر آپ کلہاڑی نہ ماروں گا۔ اور کبھی تیری رہبری میں موت کا
لقمہ نہ ہوں گا! یہ میرا فیصلہ اٹل ہے کیونکہ میں زندگی سے ابھی
ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔

روح نے اس قطعی لہجہ کی کوئی پروا نہ کی بلکہ وہ پہلے
سے زیادہ متین انداز میں کہنے لگی۔

"اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اے نادان! تو نے اس دنیا کو دائمی عیش سمجھ رکھا ہے۔ خبردار
ہو جا کہ تو میدان خار زار میں ہے اور یہاں کا ہر خشک
کانٹا تیری آبلہ پائی سے پیاس بجھانے کے لئے بے چین ہے
مصیبتوں کا جال بچھائے صیاد گھات میں ہے . . . .

"کسان اپنے خون جگر سے کھیتی کو سینچتا ہے اور فصل
تیار ہونے پر اسے کشتی پر لاد کر دریا کا سینہ چاک کرتا گھر کی طرف
لاتا ہے۔ اس پیداوار کو جمع کرنے کی خوشی سے باغ باغ ہوتا
ہے۔ مگر دفعتاً وہ دیکھتا ہے کہ طوفان کے آثار رونما ہو رہے
ہیں۔ غریب کسان اپنی جان پر کھیل کر اناج کو بچاتا ہے اور
ساحل پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لینا چاہتا ہے کہ یہ خبر
وحشت اثر سنتا ہے کہ اس کی بیوی اور بچے جو اس سے ملنے
اور اسکا ہاتھ بٹانے آ رہے تھے۔ طوفان کی نذر ہو گئے۔

ایک مشکل سے تو بچ بچ کے ہوا تھا جینا
یہ گلے پڑ گئی اللہ مِرے اور نئی

اس مثال سے مصری کا دل موم ہو جاتا ہے۔ اور اس پر یہ
حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

اور وہ کشاکشِ حیات سے رہائی کی فکر کرتا ہے کیونکہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

پھر وہ اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کرکے کہتا ہے:۔

"دیکھو! مجھے اُن چیلوں سے بھی زیادہ بدنام کر دیا گیا ہے۔ جو چلچلاتی دھوپ میں مردہ جسموں کی تلاش میں چکر لگاتی ہیں ــــــ مجھے اس طرح ذلیل کیا گیا جس طرح کہ رشک وحسد کی آگ میں جلنے والا ہمسایہ بیوی پر تہمت لگا کر خواہ مخواہ شوہر کے سامنے اس کو ذلیل کرتا ہے ــــــ مجھے اس طرح رسوا کیا گیا جس طرح کہ ایک بہادر لڑکے کے متعلق کمینے لوگ جھوٹے واقعات سے والدین کے کان بھر کر ان کو بدظن کردیتے ہیں۔

"انسان ان تمام باتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیونکر کرے جبکہ دنیا والے ظالم اور بوٹے ہیں۔ میں ان سب باتوں کو کس سے بیان کروں کہ بھائیوں کا خون سفید ہوگیا ہے۔ دوستوں میں محبت عنقا ہوگئی ہے، دل سخت ہوگئے ہیں اور ہر شخص اپنے ہمسایہ کا حق غصب کرنے کے لئے سب سے پہلے آمادہ ہوجاتا ہے، کمزور موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں اور طاقتور کا قبضہ روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ انصاف دنیا سے اُٹھ گیا۔ اور بدکاری کا بازار گرم ہوگیا ہے۔"

"موت ہی اسے پناہ دے سکتی ہے جو دنیا کی وحشتوں اور مصیبتوں سے گھبرا گیا ہو، موت ہی ایک ایسی دوا ہے جو دنیا سے بیزاری کے مرض کو رفع کرسکتی ہے، موت ہی دنیا کی بےمعنا دوڑ دھوپ کے بعد صحیح معنوں میں تسکین دے سکتی ہے۔ موت ہی ایک ایسا تنگ وتاریک گوشہ ہے۔ جہاں امن وسکون کا متلاشی دل بلا شرکت غیرے اطمینان پا سکتا ہے۔

موت اس بھورے پرندہ کا نام ہے جو کنول کی پنکھڑیوں سے نکل کر پانی کی سطح پر پھیل رہی ہو، موت اس میٹھی نیند کا نام ہے۔ جو کسی مدہوش کی پتلیوں میں گردش کر رہی ہو، موت اس خمار کا نام ہے جس کی کیفیت متوالا کردے۔

"موت سپاہی کے لئے بازگشت ہے، موت ملاح کیلئے گھر لوٹانے والا جہاز ہے۔ موت وہی خوشی ہے جو ایک قیدی کو قید سے چھوٹ کر گھر جانے کے بعد بیوی اور بچوں کو اپنا منتظر دیکھ کر ہوتی ہے۔"

روح مصری کے اس اعترافِ شکست کو اپنی کامیابی سمجھ کر جام سے باہر ہوجاتی ہے۔ انسان کو مبارک باد دیتی ہے کہ بالآخر اس نے اپنی عقل سے کام لیکر صحیح راستہ ڈھونڈھ نکالا اور اپنی پچھلی ہٹ دھرمیوں پر نادم ہے۔ اسکے معاوضہ میں وہ اس سے وعدہ کرتی ہے:۔

"اے انسان! تو یہ نہ سمجھ کہ قبر میں تو اکیلا رہیگا۔ اور تجھے تنہا ساری منزلیں طے کرنی ہوں گی، نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ میں تیرے ساتھ رہوں گی، تیری دلداری کروں گی اور تجھے تنہائی محسوس نہ ہونے دوں گی۔"

روح کا خودکشی کے لئے ترغیب دینا آج تعجب خیز ضرور ہے۔ لیکن عہدِ عتیق میں مصری فلسفہ اور روحانیت کا یہ ایک اہم جز تھا۔ فقط۔

جناب روش صدیقی

حیرانِ جمال

لبِ خاموش ہی جب مجرمِ رسوائی ہو
آہ! کس طرح محبت میں شکیبائی ہو

اس کے اندازِ نوازش کو کہے کیا کوئی
جس کی بیداد بھی اک عالمِ رعنائی ہو

چشمِ احساس کو جو کچھ نظر آتے کم ہے
جب کوئی خود ہی حجابِ شبِ تنہائی ہو

دل کسی اور ہی عالم میں ہے "حیرانِ جمال"
طور ہی نازکشِ انجمن آرائی ہو!

صاحبِ ہوش وہاں بھی ترا دیوانہ رہا
کہ جہاں ہوش بھی دامن کشِ رسوائی ہو

منزلِ شوق ہی ہو جائے خود آوارۂ شوق
یوں بھی اے عشق کبھی بادیہ پیمائی ہو

دل میں اک درد کی دنیا لئے حاضر ہے روشؔ
کاش! یہ نذر بھی شایانِ پذیرائی ہو

جناب کسریٰ منہاس

کارل مارکس

کارل مارکس بتاریخ ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی کے شہر ٹریو میں ایک نامور یہودی النسل وکیل کے ہاں پیدا ہوا۔ یہ اپنے والد کی آنکھوں کا تارا اور اس کی امیدوں کا مرکز تھا کیونکہ تمام لڑکوں میں سب سے زیادہ ہونہار تھا۔ مدرسے سے فارغ ہوکر کارل مارکس بون اور برلن کی یونیورسٹیوں میں داخل کیا گیا۔ تاکہ فلسفہ اور قانون کی تعلیم حاصل کرے۔ مگر نوجوان مارکس نے شاعری کی مشق کرنی شروع کی اور فوراً ہی اسے معلوم ہوگیا۔ کہ وہ فطری شاعر نہیں۔ پھر وہ ہیگل کی سرپرستی میں فلسفہ کی تکمیل میں منہمک ہوگیا۔ مگر اس میں بھی وہ اپنی پوری توجہ صرف نہ کرسکا۔ اور اس کی طبیعت جلد ہی اکتا گئی اور وہ ایک عرصہ عقلی اور روحانی بے چینی کا شکار رہا۔ اسکا باپ بیٹے کی آشفتہ مزاجی سے بہت رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے اپنے فلسفیانہ مزاج رکھنے والے بیٹے کو ہمیشہ ملامت کی۔ لیکن والد کی زجر و توبیخ سے کارل مارکس کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ اور وہ دنیاوی سود و بہبود کی فکر سے ہمیشہ آزاد رہا۔ کیونکہ قدرت نے حصول زر سے بھی کہیں زیادہ اہم کام کے لئے اُسے پیدا کیا تھا۔

کارل مارکس نے اپنی تمام عمر "فلسفہ افلاس" کے حل کی کوشش میں بسر کر دی۔ وہ دنیا کو مفلسی کے چنگل سے آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ یہی وہ بلا ہے۔ جو انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی میں سد راہ ہے۔ اور اسی سے غلامی کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ عوام کی حالت سخت خستہ ہے۔ یہ کیا راز ہے؟ کہ کسان جس کی مشقت پر شاہنشاہی کا دار و مدار ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا بھی حاصل نہیں کر سکتا اور مزدور جس کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے سرمایہ دار کے عالی شان محلات تعمیر ہوتے ہیں مفلس نادار اور ذلیل ہے۔ کاشتکار جس کی طاقت کا لوہا مان کر زمین سونا اگلتی ہے ہمیشہ تنگ دست رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیش پرست امراء تو زر و جواہر میں کھیلیں۔ لیکن محنت و مشقت کرنے والے لوگ نانِ شبینہ کو بھی محتاج رہیں۔ یہ سوالات جوان مارکس کو پہروں سوچنے پر مجبور کرتے۔ اس نے انہی سوالات کے حل کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور اپنے آرام و آرائش کو خاک میں ملا دیا۔ وہ سوچتا تھا کہ پیشہ ور جماعتوں کو اخلاق۔ صحت اور روح کو ہلاک کر دینے والی مفلسی سے کیونکر نجات دی جا سکتی ہے؟

کارل مارکس نے خلوت اور جلوت میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس کی والدہ نے انتہائی رنج و کرب محسوس کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسکا پیارا بیٹا فلسفہ اور سیاسیات

کے خارزار میدانوں میں چلا گیا ہے۔ کیونکہ اُسے اپنے بیٹے
سے بہت امیدیں تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اسکا بیٹا علمی قابلیت
سے ایک بے انتہا دولت اور شہرت کا مالک ہوگا۔ لیکن اُس
بے چارے کو کیا علم تھا۔ کہ اس کا جگر گوشہ اپنی تمام عمر جلا وطنی،
عسرت اور ناداری میں بسر کریگا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی قبر بھی اپنے
وطن سے بہت دور سمندر پار رہے گی۔

۱۸۴۳ء میں کارل مارکس کی شادی ایک حسین نیک دل
اور معزز خاتون سے ہوگئی تھی جو تنگدستی اور جلا وطنی کی زندگی
میں بھی اس کے شریکِ حال رہی اور جس نے مصائب اور آلام
کا ہمیشہ خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ جس طرح مزدور پیشہ جماعتوں
کی حالت بہتر بنانے کا خیال مارکس کو تھا۔ اس سے بڑھکر
جینی ان کو اچھی حالت میں دیکھنے کی آرزومند تھی۔ اس شوہر
پرست خاتون نے اپنے دو بچوں کی زندگیاں بھی اس جدوجہد
میں قربان کر دیں۔

۱۸۴۲ء میں کارل مارکس نے اخبار نویسی شروع کی۔
تاکہ کچھ نہ کچھ ذریعہ معاش کی بھی صورت پیدا ہو جائے۔ اور عوام
میں وہ اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکے۔ ان دنوں جرمنی
میں مطلق العنان حکومت اپنے پورے زوروں پر تھی۔ عوام
آزادی ایسی نعمت سے محروم تھے۔ سربرآوردہ اور کارپرداز
قوم دورِ ملوکیت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے کارل
بھی ان کا مددگار بن گیا۔ اور اخبار رینش گزٹ میں اس کی
زبردست تحریروں نے دھوم مچا دی۔ اور وہ ایک قلیل عرصہ
کے بعد اس کا چیف ایڈیٹر بن گیا۔ اس نے بڑی قابلیت سے
اخبار کو [illegible]

حکومت کے خلاف اس کی تحریروں نے عوام سے خراج
تحسین حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ایک کثیر جماعت اس کی ہم خیال
ہوگئی۔ آخر حکومت اُس کی بے پناہ تحریری مزاحمت کو
برداشت نہ کر سکی۔ اور یہ اخبار اپریل ۱۸۴۳ء میں حکماً بند
کر دیا گیا۔

اب مارکس نے سوچا کہ جرمنی میں رہ کر وہ کوئی مفید کام
نہیں کر سکتا۔ اُس زمانے میں فرانس کے اخبارات یورپ کے
افلاس کو دور کرنے کے لئے مسئلہ اشتراکیت کی حمایت میں برابر
مضامین لکھ رہے تھے۔ نیز وہ سیاسی اعتدال پرستی پر اب
قانع بھی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ اس میں کسانوں اور مزدوروں
کی امداد کا کوئی علاج شامل نہ تھا۔ اس لئے اُس نے فرانسیسی
"اشتراکیوں" کے خیالات کے مطالعہ کا عزم بالجزم کر لیا۔ اور جرمنی
سے فرانس چلا گیا۔ جو اس وقت تمام محبانِ آزادی کا واحد
مرکز تھا۔

پیرس پہنچتے ہی وہ ایک آزاد خیال اخبار "ڈیورس" کا
ایڈیٹر بن گیا۔ جس کے اجرا کا مقصد جرمن سیاسی تحریک کو
ترقی دینا تھا۔ جرمن حکومت کو اس سے اندیشہ پیدا ہو گیا۔
اور اس نے فرانس گورنمنٹ سے "ڈیورس" کے بند کرنے کی
درخواست کی۔ ۱۸۴۵ء میں فرانس کے وزیر موسیو گوئزوٹ نے
مذکورہ اخبار کو خلافِ قانون قرار دیا۔ اور اس کے تمام مضمون نگاروں
کو ملک بدر کر دیا۔ مارکس اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ برسیلز
چلا گیا۔ وہاں تین سال تک رہا۔ اور سیاسی جلاوطن جرمنوں
سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں ایک اخبار "ڈیوٹشی برد سیزر ٹینگ"
[illegible]

پولیٹکل اکونومی پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے) کی ادارت اپنے ذمہ لی۔ — وہاں مختلف اشتراکی سوسائٹیوں کی ایک لیگ قائم کر کے ایک اعلان ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو شائع کیا۔ اور اسی روز دنیا نے سنا کہ پیرس میں انقلاب عظیم برپا ہوگیا شاہ فرانس بھیس بدل کر بیرون پوش ہوگیا۔ اور وزیر فرانس جس نے مارکس کو ملک بدر کیا تھا کسی غیر ملک میں جا کر پناہ گزین ہوا۔ فرانس میں عارضی حکومت کے قیام کے فوراً بعد جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا۔ ایک عرصہ سے جرمن گورنمنٹ بلجیم کے اراکین سلطنت کو درپردہ مارکس کو بلجیم سے نکال دینے پر زور دے رہی تھی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر فروری ۱۸۴۸ء میں مزدور پیشہ جماعتیں اشتراکیت کی بہت حد تک حامی ہوگئیں جس سے بلجیم گورنمنٹ کے حواس باختہ ہو گئے۔ اور آخر مارکس کو بلجیم کے چھوڑ دینے کے لئے فوری احکام صادر کر دیئے گئے۔

انقلاب فرانس نے اب اس کے لئے پیرس کا راستہ بالکل صاف کر دیا۔ اور گورنمنٹ فرانس نے بھی مارکس کو فرانس آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مارکس پھر پیرس واپس آگیا۔ لیکن چند ماہ کے قیام کے بعد ایک اخبار "نیو رینش زیٹنگ" جس میں جمہوریت۔ مساوات۔ حریت اور اخوت کا پرچار ہوتا نکالنے کی غرض سے جرمنی چلا گیا۔ اور یکم جون ۱۸۴۸ء کو اس کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ لیکن اس اخبار کی پالیسی بھی گورنمنٹ برداشت نہ کر سکی۔ اسی سال ایک "ڈیموکریٹک کانگرس" کولون میں منعقد ہوئی جس میں مارکس نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ البرٹ برسبین، ایک امریکن سوشلسٹ جو اس جلسہ میں شامل تھا۔ مارکس کے متعلق رقمطراز ہے۔

"میں نے مارکس کو دیکھا۔ جو تحریک آزادی کا علمبردار ہے۔ اس نے مزدوری اور سرمایہ داری پر جو کچھ لکھا اور جو اصول سوشلزم کے اس نے واضح کئے اس سے یورپ کی سوشلسٹ تحریک کو . . . . بہت تقویت اور عروج حاصل ہوا اس کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ میانہ قد۔ گٹھیلا جسم۔ خوبصورت چہرہ اور سر پر گھونگر یلے بال۔ اس کی تقریر سے مترشح ہوتا تھا۔ کہ اس کے اندر بے پناہ قوت ہے۔ اور اس کی پاکیزگی اخلاق کے پس پشت ایک عزم صمیم اور اعلٰے جذبات کی آگ روشن ہے۔ وہ سرمایہ کی طاقت سے سخت متنفر ہے۔ کیونکہ یہ طاقت ظلم اور خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔ اور اس نے مزدور پیشہ اقوام کو غلام بنایا ہوا ہے۔ اس نوجوان کی زبان سے ہمارے موجودہ اقتصادی لائحہ عمل کی مخالفت میں جو الفاظ پہلے پہل میں نے سنے وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں!!

جرمن گورنمنٹ کارل مارکس کی آزادانہ تحریروں سے بہت غضبناک ہوگئی۔ اور آخر ۹ فروری ۱۸۴۹ء کو مارکس اور اس کے ہم جلیسوں پر چند اراکین سلطنت اور سرکاری وکیلوں کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا۔ مارکس نے اپنی صفائی کی شہادت خود ہی پیش کی۔ اور جیوری کے روبرو متواتر ایک گھنٹہ تک تقریر کی۔ اسکی تقریر کے آخری الفاظ یہ تھے "یہ نہ صرف جرمنی کی عام حالت بلکہ موجودہ کی صورت معاملات ہم اخبار نویسوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ گورنمنٹ کی ہر ایک کارروائی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں

اور پبلک کے سامنے موجودہ نظام حکومت کے خفیف سے خفیف ظلم کی علانیہ مذمت کریں۔ صرف جولائی کے مہینے میں ہمیں خلاف قانون گرفتاریوں کے متعلق صدائے احتجاج بلند کرنی پڑی تھی۔ اخبارات کا یہ فرض اولیں ہے کہ مظلوموں کی حمایت کریں۔ اور اُن کی جدوجہد میں مدد کریں۔ محض عام حالت اور اعلیٰ طاقتوں ہی سے جنگ کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ اخبارات کو عزم بالجزم کر لینا چاہیئے۔ کہ وہ سرکاری دکیلوں کونسلوں اور کانسٹیبلوں تک کی خبر لیں گے۔ مارچ کے انقلاب نے صرف اعلیٰ سیاسی جماعت کی اصلاح کی ہے۔ لیکن بیوروکریسی کا بدستور وہی رویہ ہے۔ وہی پرانی ملازمت شاہی۔ وہی پرانی فوج۔ وہی پرانی عدالتیں اور وہی پرانے جج جو سب مطلق العنانی کے دور میں پیدا ہوئے۔ اسی عہد میں تعلیم پائی ابھی تک موجود ہیں پس اس وقت اخبارات کا اولیں فرض یہ ہے کہ وہ موجودہ سیاسی مصلحین کی اعانت کریں"۔

جیوری نے جب یہ اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ سنے تو وہ حیران رہ گئی اور اس نے مارکس اور اس کے ساتھیوں کو عزت سے رہا کر دیا لیکن دو روز ہی کے بعد یعنی ۹ فروری ۱۸۴۹ء کو مارکس اور اُس کے رفیقوں پر ایک اور الزام لگایا گیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف مسلح بغاوت کرنے پر آمادہ ہیں۔ اور لوگوں کو اکسا رہے ہیں۔ مارکس نے اسکی صفائی میں بھی ایک زبردست تقریر کی اور آخر وہ اس سنگین جرم سے بھی رہا کر دیا گیا۔ بلکہ ممبران جیوری نے اس کی دلچسپ نتیجہ خیز اور سبق آموز تقریر کا اپنے ایک ممبر کے ذریعے شکریہ بھی ادا کیا۔

مئی ۱۸۴۹ء میں ڈریسڈن اور صوبجات رائن کے دیگر مقامات میں بغاوت ہو گئی جس سے گورنمنٹ پروشیا نے مارکس کو ملک بدر کرنے کے احکام صادر کر دیئے۔ اُس کے اخبار کا آخری پرچہ ۹۔ مئی کو سرخ سیاہی سے چھاپا گیا۔

مارکس نے پھر پیرس کا رُخ کیا۔ اور وہاں سے تھوڑے دنوں کے بعد لنڈن چلا گیا۔ افلاس کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب اٹھائے۔ لنڈن میں قیام کے دوران میں سخت مصائب و نوائب برداشت کئے۔ خشک روٹی کے سوا اس کی کوئی خوراک نہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات بچوں کی گرسنگی کا خوف اُسے فاقے پر مجبور کرتا۔ وہ خالی پیٹ برٹش میوزیم میں مطالعہ کے لئے چلا جاتا۔ رسالوں اور اخباروں کے لئے مضمون لکھتا۔ اور گذر اوقات کرتا۔ ایک دفعہ عسرت نے یہاں تک مجبور کیا۔ کہ اس نے ریلوے کے ایک دفتر میں کلرکی کی درخواست کی لیکن وہ اس وجہ سے نامنظور ہو گئی کہ اسکا خط اچھا نہ تھا۔ دنیا کی تاریخ اس عبرت اثر واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کہ جرمنی کے ایک شہرۂ آفاق فلاسفر اور جلیل القدر ادیب اور انشاء پرداز کو ریلوے کی کلرکی بھی نہ مل سکی۔ بعد ازاں کارل مارکس نیویارک کے اخبار "ٹریبون" کا لنڈنی نامہ نگار مقرر ہو گیا۔ جس سے ایک پونڈ فی ہفتہ معاوضہ ملنے لگا۔ اس قلیل رقم پر تمام کنبہ گذارہ کرتا لیکن یہ آمدنی بھی کچھ عرصہ کے بعد نصف رہ گئی۔

عسرت اور ناداری کے اس زمانہ میں بھی لنڈن کے کارکنوں کو پولیٹیکل اکونومی پر جو لکچر دیا کرتا تھا۔ اس کا معاوضہ کبھی ۳۱ [illegible] نے منظور نہ کیا تھا کیونکہ [illegible] منتقد

غربا اور مزدوروں کی اعانت کرنا تھا۔ اس فلاکت کے دوران میں جرمنی کے وزیر اعظم بسمارک نے ایک کثیر رقم بطور رشوت دینے کی کوشش کی کہ وہ مزدوروں میں روح آزادی پھونکنے سے باز رہے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

انہیں دنوں بسمارک کی تحریک سے اس کے ایک قدیمی دوست بوچر نے اُسے ایک سرکاری اخبار کی نامہ نگاری کے لئے لکھا۔ مگر مارکس نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے دامن پر سرکار پرستی کا ناپاک دھبہ نہ لگنے دیا اور اپنی ذاتی ضروریات پر اصول کو ترجیح دی۔ اور بسمارک کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

۱۸۶۴ء میں مارکس نے اپنے چند ایک ہم خیال دوستوں کے ساتھ ملکر ایک بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی جس نے یورپ کی سیاسیات میں ایک ہل چل مچا دی میزینی نے بھی اٹلی کے کاریگروں کی طرف سے اس انجمن میں شرکت کی۔ مگر اُسے انجمن کے تمام قوانین سے اتفاق نہ تھا۔ اس لئے تھوڑے عرصے کے بعد ہی وہ علیحدہ ہو گیا۔ اس انجمن کے سالانہ اجلاس بڑے تزک و احتشام سے مختلف شہروں میں بڑی کامیابی سے ہوتے۔ پروگرام مرتب ہوتے اور ریزولیوشن پاس ہوتے تھے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ مختلف ممالک کی مزدوری پیشہ جماعتوں میں اتفاق اور اتحاد کا رشتہ مستحکم ہو گیا۔ مارکس کا نعرۂ جنگ "سب ملکوں کے مزدورو! متحد ہو جاؤ" تمام یورپ میں گونج اٹھا۔ اس انجمن کے اراکین کو گورنمنٹ نے قسم قسم کی اذیتیں پہنچائیں۔ مگر اس کی طاقت میں ہر سال نمایاں اضافہ ہوتا گیا۔

آخر ۱۸۷۱ء میں فرانس، جرمنی اور پیرس کے اشتراکیوں کے بلووں سے تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بہت سے سرگرم اراکین کام آگئے۔ اور دوسرے حامی خوفزدہ ہو گئے۔ ممبروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک جماعت کا لیڈر مارکس تھا۔ جو امن پسند اور آئینی طریقوں پر کاربند تھا۔ دوسری جماعت کا رہنما روسی فلاسفر مائکل بکونن تھا۔ جو انقلاب پسند تھا۔ اس نفاق سے انجمن مذکورہ ۱۸۷۲ء میں ٹوٹ گئی۔

۱۸۸۱ء میں مارکس کی وفادار اور چاہیتی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۴۔ مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ خود بھی راہیٔ ملک بقا ہو گیا۔ تیرہ سال سے اس کی صحت اچھی نہ تھی۔ کثرت افکار نے اس کی صحت پر بہت اثر ڈالا تھا۔ دماغی تکان اور خراب خوراک نے اس کے جسم کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔

مارکس ہائی گیٹ کے قبرستان میں مدفون ہوا۔ جہاں اسکی بیوی دائمی نیند سو رہی تھی۔ چند سال ہوئے یہ تجویز کی گئی تھی کہ اس کی قبر پر ایک عظیم الشان یادگار قائم کی جائے۔ مگر اسکے ایک معتقد نے کہا کہ اسکی یادگار تو بنی نوع انسان کے دلوں میں کب کی قائم ہو چکی ہے اگرچہ وہ ڈھالے ہوئے پیتل کی شکل میں نہیں۔ تمام بین الاقوامی تحریکیں اُسی کی یاد ہیں۔ اور سوشلسٹ طاقتوں کی ہر فتح اُس کی یادگار کو بلند کرتی ہیں۔

مارکس اپنے دل میں بنی نوع انسان کے لئے ایک بے پایاں ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ یورپ میں یہ پہلا فلاسفر تھا جس نے سرمایہ داروں کیخلاف مزدوروں کی حمایت میں جنگ کی۔ وہ عوام کا بہت بڑا خیرخواہ۔ مربی اور فیض رساں تھا۔ اس کی اثر میں ڈوبی ہوئی تقریریں بے پناہ طاقت پنہاں ہوتی تھی۔ جب بھی وہ کوئی بات کہتا۔ مزدوروں کے دلوں پر نقش ہو جاتی۔ اور وہ طاقتیں جو ایک عرصے سے اُن کے اندر سوئی

پروفیسر عبداللطیف صاحب تپش۔ ایم۔ اے، ایم او، ایل

ہم بھی چُپ رہے

تم نے جو قدرِ آہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے
پروائے رسم و راہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

ذکرِ وفا پہ جب وہ ہوئے بدگماں سے کچھ
پھر زندگی تباہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

خونِ جگر کا رنگ بدلتا رہا مگر
"بیدید" نے نگاہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

کچھ سوچ کر ہی شکوۂ اغیار پی گئے
تائید خواہ مخواہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

واعظ نے میکدے میں کیا وعظِ خامشی
تعریفِ خانقاہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

توبہ کے ساتھ ساغرِ ہستی چھلک گیا!
پھر جرأتِ گناہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

افشائے رازِ عشق کا اللہ رے خیال
دل نے بھی ڈر کے آہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

آخر کو دل کی دل میں رہی حسرتِ فغاں
تیرِ نظر نے راہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

راہِ وفا میں ٹھوکریں کھایا کئے تپش
پروائے عزّ و جاہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

نوشتہ فرانسیسی افسانہ نگار موپاساں — مترجمہ حضرت علی احمد صاحب — (افسانہ)

عورت کی لاش

میں اُس سے محبت کرتا تھا۔ ہاں میں اُسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ ہم محبت کیوں کرتے ہیں؟ یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص دنیا کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی ہستی کو اپنے دل میں جگہ دے۔ ایک ہی خیال اور ایک ہی آرزو رکھے۔ صرف ایک ہی نام کا ورد کرے . . . . وہ نام جو طوفان خیز دریا کی طرح دل کی گہرائیوں میں سے نکلتا ہے۔

محبت کے تمام افسانوں کا میں ذکر نہیں کروں گا اسلئے کہ محبت صرف ایک ہی داستان رکھتی ہے اور اُس کا انجام وہی ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ میں نے اُس سے محبت کی۔ اُس کو اپنا شریک زندگی بنایا۔ اُس کی محبت بھری آغوش میں رہا۔ اُس کی محبت پاش نظروں میں گم رہا۔ اُس کی سحر آفریں باتوں میں بے خود رہا۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو بھول گیا

پھر وہ مرگئی۔ کس طرح؟ میں نہیں جانتا۔ اور اب بھی میں کچھ نہیں جانتا۔ برسات کی ایک سرد شام کو وہ بھیگی ہوئی آئی۔ دوسری صبح وہ بیمار تھی۔ کھانسی آرہی تھی۔ ایک ہفتہ تک وہ بستر پر پڑے پڑے کھانستی رہی۔ اُس کو کیا ہوگیا تھا۔ میں نہیں جانتا۔ ڈاکٹر آئے۔ نسخے لکھے اور چلے گئے۔ لیکن بے سود [illegible]

لیکن اس سے ناامیدی ٹپکتی تھی۔ میں نے اُس سے گفتگو کی۔ اس نے مجھے جواب دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ کہا —— میں نہیں جانتا —— مجھے اب کچھ یاد نہیں۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ وہ مرگئی۔ مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے جب اس نے آخری کمزور سانس لی تھی۔ نرس نے آہ کی اور میں سمجھ گیا۔

میں کچھ نہیں سمجھا۔ اب تک کچھ بھی نہیں۔ ہاں وہ بھیانک منظر مجھے اب تک یاد ہے۔ جب اُس کو میری نظروں کے سامنے سپرد خاک کیا گیا۔

اُس کو دفن کردیا گیا۔ لوگ اس کی نیکیوں کا ذکر کررہے تھے۔ مجھ میں سننے کی طاقت نہ تھی۔ میں نکل گیا۔ دور بہت دور۔ کئی گھنٹہ میں چلتا رہا۔ پھر گھر واپس آیا۔ یہاں میں نے دیکھا وہ پلنگ جس پر وہ سوتی تھی وہ کرسی جس پر وہ بیٹھتی تھی گھر کی تمام چیزیں اُسی قرینے سے رکھی ہوئی تھیں جس قرینے سے اس نے رکھا تھا۔ ہر چیز اُس کی یاد دلارہی تھی۔ مجھ سے ٹھہرا نہ گیا۔ میں گھبرا کر باہر دوڑا۔ فوراً اُس قدآدم آئینہ پر نظر پڑی جس کو اُس نے دروازے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ تاکہ وہ گھر سے نکلتے وقت سر سے پاؤں تک اپنی آرائش کا [illegible]

وہی آئینہ جس نے ہزاروں بار اُس کی صورت دیکھی تھی۔ میرے سامنے تھا۔ میں ایک سکتہ کے عالم میں آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ میرے پاؤں لغزش کر رہے تھے۔ میری آنکھیں آئینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ شفاف اور چکنی گہرائیوں پر جو خالی — بالکل خالی تھیں۔ اور کبھی اپنے اندر اس کی حسین تصویر رکھتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ مجھے آئینہ سے کچھ اُنس سا ہو گیا ہے میں نے ہاتھوں سے اُسے مس کیا۔ وہ ٹھنڈا تھا۔ میں گھر کے باہر آ گیا اور بغیر کسی قوت ارادی کے یہ جانتے ہوئے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بغیر کسی خواہش کے میں قبرستان کی طرف جا رہا تھا —— میں نے اُس کی قبر دیکھی بہت سادہ تھی۔ اور ایک سنگ مرمر کا پتھر اُس کے قبر پر قائم تھا۔ جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"اس نے محبت کی۔ محبت کی گئی۔ اور مر گئی"

وہ وہاں تھی زمین کے اندر۔ ایک خاک کا تودہ۔ مجھ پر رقت طاری ہوئی۔ اور میں اپنی پیشانی کو قبر پر رکھ کر بے ساختہ سسکیاں لے لیکر رونے لگا —— میں وہاں دیر تک ٹھہرا۔ بہت دیر تک یہاں تک کہ میں نے دیکھا رات آ رہی ہے اور تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔ وہ غیر فطری جذبہ جو ایک مایوس عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے —— میں نے چاہا کہ رات اُس کے قریب بسر کروں۔ آخری رات اُس کی قبر پر رونے کے لئے لیکن اس خیال سے کہ لوگوں کو کچھ شبہ نہ ہو میں اُس کی قبر پر سے اُٹھ کر اس چھوٹی سی مردوں کی بستی میں پھرنے لگا۔ یہ چھوٹی سی خاموش اور سنسان بستی سے بہت ہی مختلف تھی،

جس میں زندہ لوگ رہتے ہیں۔ میں اس قبرستان کے آخری حصہ میں پہنچا جہاں تمام قبریں ویران حالت میں اپنی ویرانی کی داستان دہرا رہی تھیں۔ ان تربتوں کی دیواریں شق ہو گئی تھیں اور کوئی کتبہ موجود نہ تھا۔ غالباً طویل مدت نے انہیں خاک میں ملا دیا تھا۔ خود رو گھاس بسیاہ بیلیں جنگلی گلاب اور خار دار درخت اس سرزمین میں انسانی گوشت کی کھاد سے نہایت ترو تازہ معلوم ہو رہے تھے —— میں تنہا اور بالکل تنہا تھا۔ میں نے ایک گنجان درخت کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ درخت کی گھنی شاخوں کی وجہ سے مجھے کوئی دیکھ نہ سکتا تھا۔ میں درخت کے مضبوط تنے سے لپٹا ہوا رات کا بےچینی سے انتظار کر رہا تھا۔

جب تاریکی بڑھ گئی اور رات بھیگ چکی تو میں اپنی جگہ چھوڑ کر آہستہ آہستہ لاشوں سے پٹی ہوئی زمین پر چلنے لگا۔ دیر تک۔ بہت دیر تک گھومتا رہا۔ لیکن اُس کی قبر کا نشان مجھے نہ مل سکا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں سے قبروں کو گھورا کیا۔ پتھروں اور قبروں سے ٹھوکر کھا کر کئی مرتبہ گرا اور پھر اُٹھا اُس اندھے کی طرح جو اپنی راہ کی تلاش میں مصروف ہو۔ میں نے ہاتھوں سے ایک ایک قبر کو چھوا اور کانپتی ہوئی انگلیوں کو کندہ الفاظ پر پھیرتے ہوئے ہر ایک کا نام پڑھا۔ وہ رات بھی کس قدر تاریک تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں اُسے تلاش نہ کر سکا۔ سیاہ آسمان پر چاند کا پتہ نہ تھا۔ کچھ تارے تاریک ابر کے پردوں سے جھانک رہے تھے —— مجھ پر خوف طاری ہو گیا ہر طرف قبر ہی قبریں۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اور میں ایک قبر [illegible]

خاموشی — موت کی سی خاموشی تھی۔ دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دفعتہً عجیب قسم کی آوازوں سے ساری فضا گونج اٹھی۔ میں چونک پڑا اور ادھر اُدھر دیوانوں کی طرح دیکھنے لگا۔ یہ آوازیں قبروں میں سے آ رہی تھیں ـــــ میں اس حالت میں وہاں کب تک بیٹھا رہا میں نہیں جانتا۔ مجھ پر خوف سے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اور میں قبر پر گر پڑا ـــــ یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قبر کا وہ پتھر جس پر میں پڑا ہوا تھا حرکت کر رہا ہے ـــ اور درحقیقت اُس میں حرکت ہو رہی تھی جیسے اندر سے کوئی باہر کی طرف دھکیل رہا ہے ـــــ ایک چیخ کے ساتھ میں اچھل کر دوسری قبر کے قریب آ گیا اور اب میں نے دیکھا ـــــ میں نے دیکھا کہ وہ قبر جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کھل گئی اور اُس میں سے ایک برہنہ مرد جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا باہر نکلا۔

رات اگرچہ کافی تاریک تھی لیکن اُس وقت میں اُس کی قبر کے کتبے کو صاف پڑھ سکتا تھا۔ اُس پر کندہ تھا۔

"اُس نے ۱۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ ایک نیک اور ایماندار شخص تھا۔ جو اپنے خاندان سے محبت کرتا تھا۔ اور خدا کی عبادت کرتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔"

اب وہ مردہ خود اپنی قبر کے کتبے کو غور سے پڑھ رہا تھا۔ اور جب وہ پڑھ چکا تو اُس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا۔ اور کتبہ کے کندہ الفاظ کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اُس پتھر سے کھرچ کر مٹانے لگا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنی آنکھوں کے خالی [illegible]

پتھر پر کندہ تھی۔ پھر اُس نے اپنی انگلیوں کی ہڈی سے پتھر پر حسب ذیل تحریر صاف طور پر لکھی :۔

"اس نے ۱۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اپنی بخیلی کی وجہ سے اپنے باپ کی موت کا باعث ہوا اس لئے کہ یہ اسکی ملکیت پر جلد قابض ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کو طرح طرح کی اذیتیں دیں اور عذاب میں رکھا۔ ہمسایوں کو دھوکا دیا اور ایک ذلیل موت مرا۔"

اُس ہڈیوں کے ڈھانچہ نے اپنا لکھنا ختم کیا اور پھر اپنے لکھے کو غور سے پڑھنے لگا۔ میں دفعتاً مڑا۔ اور اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی ـــ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام قبریں کھلی ہوئی ہیں اور ہر ایک مردہ اپنی قبر کی اُس جھوٹی کندہ عبارت کو مٹا رہا ہے۔ جو اُسکے رشتہ داروں نے لکھی تھی اور اپنی ہڈی دار انگلی سے صحیح واقعات لکھ رہا ہے۔ میں نے پڑھا کہ انہیں سے ہر ایک قاتل بدباطن۔ ریاکار۔ مکار۔ چور۔ جھوٹا اور دھوکہ باز تھا اور کسی نہ کسی بڑے جرم کا مرتکب تھا۔ اور اُن کے رشتہ داروں نے اُن کی قبروں پر جو کچھ لکھا تھا اُس میں سے ایک لفظ بھی درست نہ تھا۔ غرض تمام مردے اپنی قبروں پر بیٹھے ہوئے اُس سچائی کا اظہار کر رہے تھے جس سے دنیا ناواقف ہے یا ناواقف ہونے کا بہانہ کرتی ہے۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ وہ بھی اپنی قبر پر بیٹھی لکھ رہی ہوگی اس خیال کے آتے ہی میں بے خوف ہو کر ـــ دیوانہ وار قبروں اور زندہ لاشوں کے درمیان بھاگنے لگا۔ لیکن جلد ہی میں اُسکی قبر کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ لیکن صورت نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ کفن میں خود کو لپیٹے ہوئے تھی ـــ میں نے دیکھا کہ وہی [illegible]

جناب حفیظ ہوشیارپوری۔ ایم۔ اے

گیت

کیسے کٹے گی رات

پیا بن
کیسے کٹے گی رات

(۱)

جب سے پی کے بس ہیں جی ہے!
اُس دن سے لب پر پی پی ہے!
نینن سے برسات لگی ہے!
نینن سے برسات!

پیا بن
کیسے کٹے گی رات!

(۲)

یاد آئے وہ پل پل چھن چھن!!
نیند اچاٹ ہوتی ہے اُس بن!
تھک گئیں آنکھیں تارے گن گن!
ہووت نا پربھات!

پیا بن
کیسے کٹے گی رات!

(۳)

کب آئے گا پیارا ساجن؟
میرا راج دلارا ساجن!
میری آنکھ کا تارا ساجن!
کوئی نہ پوچھے بات!

پیا بن
کیسے کٹے گی رات!

سلہ لو سلہ صبح

محترمہ شکیلہ اختر

شاید

ستمبر کا مہینہ تھا۔ بارش نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں حسرت سے کبھی آسمان کی طرف اٹھتیں اور کبھی زمین کی طرف۔ مگر سوائے پانی کے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی ۱۶ ستمبر کو اتنی بارش ہوئی کہ اس کے خیال سے اب بھی دل کانپ جاتا ہے کچی سڑکوں کا کیا پوچھنا۔ پختہ سڑکوں کا میلوں تک پتہ نہ چلتا تھا۔ ڈاک کی آمد و رفت تو مدت ہوئی بند ہو چکی تھی۔ ہر طرف سے مکانوں کے گرنے کی ہیبتناک صدائیں بلند ہو رہی تھیں بارش کے ساتھ ہی یہ غضب ہو گیا کہ دریا نے بھی بڑے زور و شور سے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور ستمبر کی رات کو غضب ناک شیرنی کی طرح بھلگو ندی ابل پڑی غریبوں کی جھونپڑیوں کا کیا کہنا بڑی بڑی کوٹھیوں کی مستحکم بنیادیں ڈگمگانے لگیں۔ ایسی بارش اور ایسی طغیانی تھی کہ ریلوے لائن بھی اس کی متحمل نہ ہو سکی! آخر خدا خدا کر کے پانی تھما مگر کب؟ آہ جب سینکڑوں مکانات پیوند زمیں ہو چکے تھے۔ آبادیاں ویرانوں میں منتقل ہو چکی تھیں۔ اور جب خوشحال گھرانے مٹھی بھر چاول اور چنے کی طرف بھوکے کتوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

اب بارش ختم ہو چکی تھی اور ندی بھی تھم گئی تھی مصیبت زدہ

تھا میں خطوط لکھنے میں بےطرح مشغول تھی کہ ایک آواز ــــ ایک دلدوز آواز نے مجھے چونکا دیا ـــــ "بیٹی! .... پانچ دن سے ــــ مسلسل پانچ روز سے ہم بھوکے ہیں۔ آہ! میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی پانچ دن سے ایک ایک دانہ کے لئے تڑپ رہے ہیں۔

میں نے گھبرا کر دیکھا تو میرے سامنے ہی ایک شریف صورت ادھیڑ عمر کی عورت ایک میلی چادر میں لپٹی کھڑی تھی۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

میرے اس سوال سے وہ پھوٹ پڑی اور بولی "میرا گھر؟ ـــ آہ آپ کہاں ـــ اسب کچھ تو ہوا۔ مگر آہ! میرا بچہ! میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ وہ کہاں رہ گیا؟" اس نے اشک آلود نظروں سے مجھے دیوانہ وار گھورتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! میں سونی کی رہنے والی ہوں! مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ سبھی کچھ میسر تھا۔ مگر اب کچھ بھی نہیں۔ ظالم طغیانی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ آہ! ـــ میرا گھر! ـــ میرا معصوم بچہ! میرا منور! ہائے اس کو مجھ سے کیوں لے لیا؟ منور! میرا بچہ! آہ! میرا لال ــ"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل بھی بھر آیا اور

وہ کہنے لگی ۱۱ ستمبر کی رات کو ہم لوگ اپنے گھر میں آرام سے تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر اتنا بے چین نہ تھا جتنا آج ہے! میرے بچے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ میری نئی بہو گھر کے انتظام میں لگی ہوئی تھی اور میں نماز پڑھ رہی تھی۔ سویرے ہی سُنا تھا کہ پھلگو ندی بڑے زور سے بڑھ رہی ہے۔ میں نماز میں مشغول تھی۔ مگر بادل کی گرج سے دل دہل رہا تھا۔ دفعتہً بڑے زور کا ایک دھماکا ہوا اور میرے صحن کی دیوار چور چور ہو کر صحن کے پانی میں گھُل مل گئی۔ میں نے نماز ختم کر کے جیسے ہی سلام پھیرا کہ میری نظر مکان میں رینگتے ہوئے پانی پر گئی۔ میں حیران تھی کہ یا اللہ یہ کیسا پانی ہے بارش کا یا ندی کا؟ پانی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا۔ ہم اس میں بہنے لگے۔ اب ہم ایک دوسرے سے بے خبر بہتے ہوئے ایک نامعلوم اور لامحدود منزل کی طرف چلے جا رہے تھے ـــــ! اس کے بعد میری بچی! مجھے کچھ خبر نہیں نہ جانے کتنی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ اپنے گاؤں کے رئیس بنگالی بابو کے بنگلے میں پڑے ہیں۔ جیسے ہی میری آنکھیں کھلیں بے چین ہو ہو کر اپنے پیاروں کو ڈھونڈھنے لگی سب ہی تھے۔ مگر آہ! میرا منور میرا آٹھ سال کا پیارا بچہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر اپنے بچے کو آوازیں دیں دیوانہ وار ہر طرف ڈھونڈھنے دوڑی۔ مگر آہ! منور! میرا پیارا بچہ نہ ملا"

اتنا کہہ کر وہ پھر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ اس نے بولنے کی غرض سے منہ کھولا مگر بھوک اور غم کی شدت سے اُس کی آواز مشکل نکل رہی تھی "میرا شوہر اور میرا لڑکا نوکری کے لئے رنگون گیا ہے۔ میری اک سال کی بیاہی ہوئی بہو امید سے ہے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا نہ کوئی گھر ہے نہ در۔ آج اپنی بستی سے چلے ہوئے پانچ روز ہو گئے ہیں اس دوران میں میرے بچوں کی غذا صرف وہی دو مٹھی چنے تھی۔ دو مٹھی چنے اور میرے تین بچے پانچ روز کا سفر۔ میرے اللہ میرے بچے کیسے تڑپ رہے ہیں۔ کاش میرا منور ہوتا اور آج یہ غم دیکھنے کے لئے میں نہ ہوتی" وہ اتنا کہہ کر گردن جھکا کر بیٹھ گئی اُس کے لب کانپ رہے تھے اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں اُس نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "سفر کرتے ہوئے آج پانچ روز ہو گئے اور ابھی ہماری منزل بہت دور ہے میں پٹنہ باقر گنج اپنے میکے لٹی ہوئی جا رہی ہوں۔ وہاں جا کر اپنے بیٹے اور شوہر کو اپنی بربادی کی خبر بھیجوں گی! کیا تم بتا سکتی ہو کہ پٹنہ یہاں سے کتنی دور ہے"

میں نے کہا۔ یہاں سے پٹنہ کافی دور ہے قریب ۱۴۰ میل! مگر آپ اسٹیمر سے کیوں نہیں جاتیں۔ آج اسکے آنے کا بھی دن ہے! میری باتوں کو سُن کر وہ تڑپ کر بولی۔ اسٹیمر سے جاؤں؟ مگر کرایہ کہاں سے لاؤں؟ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکوں! ۱۴۰ میل میرے بچے کیسے چل سکیں گے؟ یہاں تک تو آتے ہوئے انکے نازک پیروں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی میں انہیں بہلا پھسلا کر لے ہی آئی۔ اب انہیں کیسے سفر پر آمادہ کروں جبکہ بھوک کی شدت پر بھی وہ سفر کے اختتام کے خیال خام پر خوش ہو کر کھیل رہے ہیں۔" میں نے کچھ پیسے دیکر کہا۔ "اپنے بچوں کو

راستہ میں کوئی خرید کر دیجئے گا۔ اور یہ کھانا ہے۔ کھانا آپ خود کھالیں۔ وہ ممنون نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "بیٹی کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ ایک ماں اپنے ننھے ننھے بچوں کو بھوک میں تڑپتا چھوڑ کر پہلے اپنا پیٹ بھر سکتی ہے؟ تم ماں کی ممتا کو کیا جانو۔ آہ یہ دل جو اپنے آٹھ سال کے بچے کے غم میں ماتم کر رہا ہے۔ وہی دل آج تمہارے در پر اپنے دوسرے بچوں کے واسطے بھیک لینے کے لئے مجھے گھسیٹتا ہوا ابھی لایا ہے۔ لاؤ میں یہ کھانا پہلے اپنے بچوں کو کھلاؤں گی اُس کے بعد اگر کچھ بچ رہے گا تو میں بھی کھالوں گی۔ دیکھو سردی کس بلا کی پڑ رہی ہے۔ اور اس ٹھنڈک میں میرے بچے درخت کے نیچے ٹھٹھرے ہوئے پڑے ہیں" میں نے اُسے ایک چادر دیتے ہوتے کہا "شاید یہ آپ کی کچھ مدد کر سکے" اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی اور مکان ہے جہاں سے وہ کچھ اور مدد حاصل کر سکے۔ میں نے اپنی ملازمہ کے ساتھ اُسے ایک مکان میں بھجوا دیا

جب وہ وہاں سے آئی تو معلوم ہوا کہ سوجھے ہوئے پیروں اور اشک آلود آنکھوں کو دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگائے ہیں اُس نے اپنی دردناک کہانی مختصر پیرائے میں بیان کی۔ جسے سنتے ہی لوگ کہنے لگے "ہم نے یہ سب ڈھکوسلے بہت سنی ہیں۔ تم ایک کہنہ مشق فریبی ہو۔ کیونکہ واقعی تمہارے لب ولہجہ سے بہت کم آدمی تمہیں پہچان سکتے ہیں۔ اور یہ آنسوؤں کی جھڑی تو تمہاری اچھی خاصی مددگار ہے۔ جاؤ وہاں جاؤ جہاں آنسوؤں کے پردے معصوم عقلوں پر پڑ کر تمہارے فریب کو کارآمد بنا سکیں" اُس نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں آج یہ وقت آیا کہ میں دوسروں کی محتاج ہوں مگر مجھے آپ سے شکایت نہیں گلہ ہے تو اس خدا سے جس نے دنیا کو فریبی بنا کر سچے حقداروں کے حقوق کیوں چھین لئے" اُس کی یہ باتیں سُنکر وہ اور زور سے ہنس پڑے۔ غریب عورت غمگین لہجے میں مجھ سے بولی "آہ اب لوگ مجھے فریبی کہتے ہیں۔"

وہ جھکی اور میرے دئے ہوئے کھانے کو اٹھا کر لنگڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ شاید یہ ایک پُرفریب کھیل ہو؟

جناب اختر انصاری

غزل

دُکھ محبت میں وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
اس قدر صدمے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

یوں تو وہ ایک اُچٹتی سی نظر تھی، لیکن
زخم اس طرح کے آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

اب تو خاموش ہیں لیکن انہی آنکھوں نے کبھی
ایسے طوفان اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

کیا کہوں حسن کے پندار کو، اس ظالم نے
وہ وہ ارمان مٹائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اختر اس چرخ کی گردش نے تمناؤں کے
وہ وہ ایوان گرائے ہیں کہ جی جانتا ہے

دیگر

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اختر لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

نوشتہ خلیل جبران　مترجمہ سید بشیر ہندی ایڈیٹر فلمستان لاہور

شکست

شکست ـــ میری شکست ـــ میری تنہائی اور
میری گوشہ نشینی۔ تم مجھے ہزاروں فتوحات سے عزیز تریں ہو۔
اور میرے دل کے لئے دنیا کی تمام مسرتوں سے پیاری ہو

شکست ـــ میری شکست ـــ میرا ذاتی
علم اور میری جرأت مقابلہ تمہارے ذریعے میں جانتا ہوں۔
کہ میں ابھی نوجوان ہوں اور تیز گام بھی۔
اور میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے فریب میں نہیں آسکتا
اور میں نے تم میں یکتائی کا راز پالیا ہے'
اور ذلت اور تحقیر کی مسرت کا مجھے احساس ہوگیا۔

شکست ـــ میری شکست ـــ میری چمکتی
ہوئی تلوار اور ڈھال'
تمہاری آنکھوں سے میں نے یہ معلوم کیا ہے۔
کہ تاج غلامی کا نشان ہے
اور آشنائی پستی کی علامت ہے۔

. . . .

اور مقید ہونا کامرانی کا عروج ہے۔
اور پکے ہوئے میوے کی طرح گرنا اور وسعت
میں سما جانا ہے'

شکست ـــ میری شکست ـــ میری بہادر
رفیقہ' تم میری خاموشی' میری چیخیں اور میرے نغمے سنوگی۔
اور تم اپنے پروں کی جنبش سے میرے ساتھ گفتگو کروگی!
اور سمندر کے مد و جزر
اور ان پہاڑوں کے متعلق جو رات کو روشن ہوتے
ہیں'
اور صرف تمہارا ہی میری روح کی بلندی اور پستی
پر قبضہ ہوگیا۔

شکست ـ میری شکست ـ میری اور لافانی جرأت
ہم طوفان کے ساتھ قہقہے لگائینگے۔ اور ہم تمام مردہ جذبات کے
مرقد کھود دینگے۔ اور پختہ عزم کیساتھ دنیا کا سامنا کرسکیں۔ اور
اس وقت ہم خطرناک ہونگے ـــ بہت خطرناک ؎

جناب مضطر صاحب

اردو ہندوستانی

ادب لطیف میں علامہ سید سلیمان ندوی کا گراں قدر مضمون "ہماری زبان کا نام" نظر سے گذرا۔ فاضل موصوف نے زبان کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ اب راز نہیں رہا۔ ہر اردو دان جانتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جب اردو کی تعلیم دی جاتی تھی اور گلکرائسٹ صاحب کے ایماء سے نثر کی چند کتابیں اس میں تالیف ہوئیں، اس وقت اس کا نام "ہندوستانی" ہی تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی اکثر مقامات پر جہاں اردو کا تذکرہ کیا گیا ہے لفظ "ہندوستانی" ہی آیا ہے۔ ڈنکن فاربس نے اردو قواعد کا نام بھی "ہندوستانی گرامر" رکھا ہے۔ اور اسی گرامر میں ایک مقام پر "ہندوستانی یا اردو یا ریختہ" لکھا ہے یعنی ہندوستانی، اردو اور ریختہ مترادف الفاظ ہیں۔ یہ تو دور کی بات ہے۔ چند روز ہوئے مجھے ایک ضروری کام سے سرکل انسپکٹر مدارس کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کوئی بیس یا پچیس سال کے پرانے فائل دیکھ رہا تھا کہ ان میں لڑکوں کے اردو مدرسہ کو "ہندوستانی مدرسۂ طفلاں" لڑکیوں کے مدرسہ کو "ہندوستانی مدرسۂ نسواں" اور ڈپٹی انسپکٹر اردو مدارس کو "ہندوستانی ڈپٹی انسپکٹر" لکھا ہوا تھا۔ اور سرکاری طور پر بھی لکھا جاتا تھا۔ میں نے موجودہ تبدیلی کی وجہ دریافت کی۔ مگر کوئی معقول جواب نہ ملا۔ جبر ضرورت اب اس امر کی ہے۔ کہ بہی خواہان زبان بہت جلد علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر توجہ فرمائیں۔ اور اُسے اس کا اصلی نام "ہندوستانی" جو اس کا پیدائشی حق ہے دیدیں۔

ہندی اور ہندوستانی زبان کا جھگڑا کوئی علمی بحث نہیں بلکہ عصبیت اس کی محرک ہے۔ ایسی صورت میں اس مسئلہ پر بحث کرنا ہوا کو ناپنا ہے۔ ہم کو یہ کہنے کا حق کیا ہے کہ ہمارے ملکی بھائی (حامیان ہندی) اپنے محدود حلقہ کی زبان کو پورے طول و عرض ملک میں پھیلانے کے لئے یہ کچھ کر رہے ہیں اور یہ ذرائع اختیار کر رہے ہیں کہ یہ بالکل بیہودہ ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنے اجتماعی نقطۂ خیال سے کر رہے ہیں جو "متمدن اقوام" کا خاصہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بالمقابل ہم کیا کر رہے ہیں۔ اخباروں، ماہناموں اور رسالوں میں تجویزیں، ادبی مجلسوں میں تقریریں اور تنقیدیں، مشاعروں میں شاعری؛ یہ کعبہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے یا ترکستان کا پہاڑی اور دشوار گذار راستہ۔ کہتے سب ہیں مگر کرتا کوئی نہیں۔

ہمارے خیال میں اس وقت سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان کے تمام تعلیمی ادارے، علمی مجلسیں اور ملک کے ہندوستانی مصنفین اور مؤلفین، اخبار اور ماہناموں کے ایڈیٹر سب اردو کو "ہندوستانی" لکھیں اور دوسروں کو لکھنے کے لئے مجبور کریں۔ نیز اس

[illegible]

دو آتشہ

لالۂ طور

(علامہ اقبال مدظلہٗ)

(۱)

دلِ من روشن از سوزِ درون است
جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنوں است

(۲)

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم
نمی دانم چہ میخواہم چہ جویم
بر آید آرزو یا بر نہ آید
شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

(۳)

ز مرغانِ چمن نا آشنایم
بشاخِ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی از من کراں گیر
کہ خونم مے تراود از نوایم

لالۂ صحرا

(نذیر میرزا برلاس بی۔ اے (آنرز))

(۱)

ہے دل روشن مرا سوزِ دروں سے
جہاں بیں آنکھ میری اشکِ خوں سے
نہ سمجھے کاش رمزِ زندگی وہ
جو نسبت دے محبت کو جنوں سے

(۲)

پریشاں اس چمن میں مثلِ بو ہوں
نجانے کیوں اسیرِ جستجو ہوں
بر آئے آرزو یا بر نہ آئے
شہیدِ سوز و سازِ آرزو ہوں

(۳)

چمن والوں سے میں نا آشنا ہوں
کہ تنہا شاخ پر نغمہ سرا ہوں
نہ پاس آنا اگر نازک سا دل ہے
حقیقت یہ ہے میں خونیں نوا ہوں

نوشتہ ٹیگور مترجمہ سید شریف حسین انور گیلانی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

قربانی

رائے چرن کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی۔ جب وہ کسی امیر کے یہاں ملازم ہؤا۔ اس کے سپرد آقا کے بچہ کی نگہداشت کا کام تھا۔ جب لڑکا جوان ہؤا تو اُسے سکول میں داخل کرا دیا گیا ہؤا ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوکر اُسے کالج میں بھیجا گیا پھر وہ ڈگری کے امتحان میں کامیاب ہوکر ایک سرکاری محکمہ میں کسی ممتاز عہدہ پر سرفراز ہوگیا۔ شادی ہونے تک رائے چرن اُس کی خدمت کرتا رہا لیکن جب چھوٹے آقا کی شادی ہوگئی۔ تو وہ آقا کی بیوی کی خدمت کرنے لگا۔ سال کے بعد انوکل کے گھر لڑکا پیدا ہؤا۔ رائے چرن اب بچہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہؤا۔ وہ بچہ کو دیں رکھتا۔ پیار کرتا اسکو دیکھ دیکھ کر مسکراتا بچوں کی طرح اُس سے باتیں کرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد بچہ نے توانائی حاصل کی۔ اور چلنے پھرنے لگا۔ اکثر مکان سے باہر چلا جایا کرتا۔ جب رائے چرن پکڑنے جاتا تو وہ بھاگتا اور مسکراتا۔ رائے چرن کے لئے وہ ایک کھلونا تھا۔ وہ بچہ کی بہت تعریف کرتا۔ اور اس کے متعلق اپنے آقا سے کہتا "یہ بچہ کسی دن جج مقرر ہوگا" بچہ جوان ہوتا گیا۔ اور بات چیت کرنے لگا۔ اُس کی باتیں بہت بھلی معلوم ہوتیں۔ وہ اپنی والدہ کو 'ماما' اور رائے چرن کو 'چنا' کہہ کر پکارتا۔ رائے چرن بچہ کو خوش رکھنے کے لئے گھوڑا بنتا۔ اس کو پشت پر بٹھا کر دوڑتا۔ بچہ اُس کے منہ میں رسی ڈالتا۔ اور اُس کی پشت پر چھڑی مارتا۔ مگر رائے چرن اسے بُرا محسوس نہ کرتا۔ اس اثنا میں انوکل کی تبدیلی دریائے پدما کے قریب ایک قصبہ میں ہوگئی۔ اب رائے چرن اور اس کے آقا اس نئے قصبہ میں رہنے لگے۔ انوکل نے اپنے بچہ کے لئے ایک گاڑی خریدی۔ جس میں رائے چرن بچہ کو بٹھا کر سیر کراتا۔

برسات کا موسم شروع ہؤا۔ اور دریا میں طغیانی آگئی فصلیں خراب ہوگئیں۔ کئی دیہات تباہ ہوگئے۔ اور کئی جانیں تلف ہوگئیں۔ ایک روز پچھلے پہر جب بارش تھمی۔ رائے چرن بچہ کو گاڑی میں بٹھا کر دریا کی طرف لیگیا کیونکہ بچہ جانے پر مصر تھا۔ رائے چرن چاولوں کے کھیت میں پہنچا۔ کھیت میں اُس وقت کوئی نہ تھا۔ اور [illegible] کی کشتی تھی۔ کنارے سے کچھ فاصلہ پر [illegible] ہؤا تھا۔ جس پر پھول تھے۔ بچہ نے رائے چرن کو کہا کہ مجھے ایک پھول لادو۔ رائے چرن پہلے تو ٹالتا رہا۔ لیکن بچہ کی ضد نے اُسے مجبور کیا۔ چنانچہ جانے سے پہلے وہ بچہ کو تاکید کر گیا کہ گاڑی سے نہ اُترنا۔

رائے چرن پانی میں اُچھلا اور تیرنے لگا۔ درخت

تک پہنچ گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں بچہ دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کی لہروں کے منظر سے لطف اُٹھا رہا تھا۔

جلد ہی اُسے خیال پیدا ہؤا کہ وہ اتر کر دریا تک پہنچے۔ چنانچہ وہ اُترا راستہ میں اُس نے ایک چھڑی دیکھی جسکو اُس نے اُٹھالیا۔ جب وہ کنارے پر پہنچا تو چھڑی کو پانی میں ڈبونے لگا۔ کبھی چھڑی کو پانی میں ڈالتا اور کبھی اُسے باہر نکال لیتا۔ جس طرح ماہیگیر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اس اثنا میں پانی کی لہر اُس کی طرف بڑھی اور اُسے بہا کر لیگئی۔

رائے چرن جب پھول توڑ کر فارغ ہؤا۔ تو وہ واپس کنارے کی طرف لوٹا۔ اور گاڑی کا رُخ کیا۔ لیکن جب بچہ کو وہاں نہ پایا تو بے حد متعجب ہؤا۔ وہ پریشانی میں اِدھر اُدھر بھاگا۔ اور ننھے! ننھے!! کہکر بچہ کو پکارنے لگا۔ یہاں تک کہ عالم مایوسی میں گر پڑا۔ اور کچھ دیر تک بے ہوش رہا۔ آخر وہ اٹھا اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ چلتا تھا لیکن ہر قدم اُس کو ایک ایک من کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آقا کو کیا جواب دیگا۔ دنیا اُس کو تیرہ و تاریک معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ اُس کو معلوم نہ تھا۔ کہ اُس کا چھوٹا آقا دریا کی موجوں کا لقمہ بن گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ دریا میں ڈوب کر مر جائے۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔ آخر وہ مجسمہ غم آقا کے گھر کی طرف لوٹا۔ وہ گاڑی کو دھکیلتا آتا تھا لیکن اُس کو خالی دیکھ کر اُس کے دل کو کچوکے لگ رہے تھے گھر پہنچ کر وہ آقا کے قدموں پر گر پڑا۔ اور تمام واقعہ سُنا دیا۔ اگرچہ عوام کا یہ خیال تھا کہ بچہ دریا [illegible]

اس صدمہ کو بڑے صبر و استقلال سے برداشت کیا تاہم یہ زخم کاری تھا۔ جو مندمل نہ ہو سکا۔ بچہ کی والدہ تو غم سے نڈھال ہوگئی۔ اور اکثر روتی رہتی۔

رائے چرن کے لئے اب اسی گھر میں کوئی تسکین نہ تھی۔ آقا کا اب اُس سے اچھا سلوک نہ رہا۔ اُس کی موجودگی اُن کے غم کو بڑھا رہی ہے۔ لہذا اُس نے ایک دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اور اپنے وطن کو واپس لوٹ گیا۔ رائے چرن ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کی بیوی بھی عالم شباب گذار چکی تھی اُن کے اولاد نہ تھی۔ اور نہ اب امید ہوسکتی تھی۔ کہ اُن کے گھر کبھی بچہ پیدا ہوگا۔ خدا کا کرنا ایسا ہؤا کہ سال کے بعد ان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہؤا۔ اگرچہ رائے چرن کو گاؤں کے لوگوں نے مبارک باد دی لیکن اُسے کوئی خوشی نہ تھی۔ آقا کے بچہ کا خیال ہر لحظہ اُس کے دل کو اندوہگیں رکھتا تھا۔

بچہ جوان ہوتا گیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے اس کی شکل وصورت اپنے آقا کے بچے کی طرح ہوتی گئی۔ اب رائے چرن بہت خوش تھا۔ وہ بچہ کی بہت نگہداشت کرنے لگا۔ اور اسکی خوراک اور لباس کا زیادہ خیال رکھنے لگا۔ وہ اُسے اچھا کھلاتا اور اچھا پہناتا۔ جب لڑکا پانچ سال کا ہؤا تو رائے چرن نے اُسے سکول میں داخل کرا دیا۔ گاؤں میں ایک مڈل سکول تھا۔ لڑکے نے مڈل تک تعلیم حاصل کرلی۔ اس اثنا میں رائے چرن کے دل میں طرح طرح کے خیالات گذر رہے تھے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ پرمیشور نے اس کو بچہ اس واسطے عطا کیا ہے کہ وہ اپنے آقا کی نذر کر سکے۔ ورنہ یہ ناممکن تھا

کہ اس ادھیڑ عمر میں اُس پر خدا کی رحمت ہوئی۔ نیز بچہ کی شکل وصورت آقا کے بچہ سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اور یہ اس لئے ہے کہ اُس کا آقا اُس بچہ کو اپنا ہی تصور کرے۔ وہ اپنی غلطی پر نادم تھا۔ اُس سے ایک بڑا قصور سرزد ہو چکا تھا۔ جس کی تلافی وہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بچہ 'فیلنا' کی پرورش ایک رئیس زادہ کی طرح کی۔ اُس کی سیروتفریح کے لئے ایک گھوڑا اور ایک گاڑی خرید دی۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ وہ اُسے بہت کم میل جول کی اجازت دیتا تھا۔ اگرچہ گاؤں کے لوگ اُس پر ہنستے تھے۔ کیونکہ اُس کے ذرائع اتنے وسیع نہیں تھے۔ وہ بھی ان کی طرح ایک غریب آدمی تھا۔ لیکن وہ ان کے استہزا کی پروا نہ کرتا تھا اور اپنے فرض کو ادا کئے جاتا تھا۔ وہ آقا اور غلام کی طرح رہتے تھے۔ رائے چرن ایک خادم معلوم ہوتا تھا۔ رائے چرن نے لڑکے پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اُسکا باپ ہے۔ گاؤں کے تمام لڑکے رائے چرن سے مذاق کرتے تھے۔ اور فیلنا بھی اُن کے ساتھ رائے چرن کی عدم موجودگی میں شامل ہو جاتا۔ مگر دل سے تمام لڑکے اُسے چاہتے تھے۔ اور فیلنا کو بھی ان کے ساتھ ایک گونہ محبت تھی۔ رائے چرن بارہ سال کے عرصہ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اب وہ تن دہی سے کام نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے اب وہ زیادہ اُجرت نہ حاصل کر سکتا تھا۔ کہ لڑکے کی ضروریات پوری کر سکے۔ فیلنا اسوقت پریشان ہوتا۔ جب اس کی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ واقع ہوتی۔ آخر رائے چرن ایک دن فیلنا سے دو دن کی اجازت لیکر گاؤں سے باہر گیا۔ وہ سیدھا "برست" پہنچا۔ جہاں

اُس کا آقا انوکل مجسٹریٹ تھا۔ اس طویل عرصہ میں انوکل کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس کی بیوی بہت غمزدہ رہتی تھی۔ رائے چرن اپنے آقا کے گھر پہنچا۔ اُس وقت وہ گھر پر ہی موجود تھے۔ اس نے سلام کیا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اُس کے آقا کو اُس کی کمزور حالت پر رحم آیا۔ اُس نے اُسے دوبارہ ملازم رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی اثنا میں انوکل کی بیوی بھی پہنچ گئی۔ اُس کا غصہ اب فرو ہو چکا تھا۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ رائے چرن اُن کی خدمت کرے۔ تاکہ وہ اُن کو غم میں ڈھارس دے۔ رائے چرن اُن کی باتیں سُنکر خوش ہوا۔ لیکن اُس نے نہایت ادب سے کہا "آقا! میں صرف آپکا کا نیاز حاصل کرنے آیا ہوں۔ نیز اس جرم کا اقرار کرنے آیا ہوں کہ آپکے بچہ کو میں چرا کر لے گیا تھا۔ اور وہ میرے پاس زندہ ہے۔ انوکل نے سنکر بے ساختہ کہا "خدایا! کیا میرا بچہ زندہ ہے" وہ رائے چرن کی طرف مخاطب ہوا۔ اور اُسے کہا "کیا تم سچ کہتے ہو"

رائے چرن نے کہا۔ "ہاں زندہ ہے اور میں اُسے پرسوں اپنے ساتھ لاؤں گا" رائے چرن پھر سلام کہکر چلا گیا۔ تیسرے روز انوکل اور اُس کی بیوی بچہ کا انتظار کرنے لگے۔ آخر رائے چرن آ پہنچا۔ اور اس کے ہمراہ ایک بارہ سال کا لڑکا تھا۔ جو امیر زادہ معلوم ہوتا ہے۔ انوکل کی بیوی نے اُسے چھاتی سے لگایا۔ پیار کیا۔ چوما۔ اور خوشی میں آنسو اُس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ لڑکا نہایت شکیل تھا۔ انوکل کا دل بھی لڑکے کو دیکھ کر بھر آیا۔ اور محبت کی نظر سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ انوکل نے رائے چرن

سے پوچھا۔ "رائے چرن کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے؟" رائے چرن نے جواب دیا۔ "آقا اس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کہ اس کو میں نے ہی چرایا تھا۔" جب انوکل نے دیکھا کہ اُس کی بیوی لڑکے سے بہت محبت سے پیش آرہی ہے۔ تو اُس نے مزید سوالات کرنے مناسب نہ سمجھے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ رائے چرن بوڑھا آدمی ہے۔ اس کے اولاد نہیں ہوسکتی۔ یہ ضرور اُسی کا بچہ ہے۔ نیز وہ اُس کا پُرانا خادم ہے۔ اُس کو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس دھوکہ سے اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن پھر اس کے دل میں رائے چرن کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور اُس نے ارادہ کیا۔ چونکہ رائے چرن دغا باز اور نمک حرام ہے۔ وہ اُسکا خادم نہیں رہ سکتا۔ اس جذبہ کے ماتحت اس نے کہا۔ "رائے چرن تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں ملازم رکھنا نہیں چاہتا۔" رائے چرن نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔ "آقا اب میں کہاں جاؤں؟ میں بوڑھا ہوں۔ مجھے کون ملازم رکھے گا؟" لیکن انوکل اپنے ارادہ کو بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے درشتی سے کہا۔ "رائے چرن میں نے جو تمہیں کہا ہے۔ تمہیں اُس پر عمل کرنا ہوگا۔"

رائے چرن قدموں پر گر پڑا۔ اور نہایت عاجزی سے کہا۔ "آقا۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ مجھے یہاں رہنے دیجئے اپنی خدمت کا دوبارہ موقع دیجئے۔ میں سچ کہتا ہوں یہ قصور میں نے نہیں کیا۔ اس میں خدا کا ہاتھ ہے۔" انوکل اب زیادہ برافروختہ ہوا۔ کیونکہ اُس نے رائے چرن کی زبان سے خدا کے خلاف الفاظ سنے۔ اُس نے گرجتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں اب تم پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ تم نے بے وفائی کی ہے" انوکل پر اُس کی التجاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا۔

جب فیلنا کو معلوم ہوا کہ وہ مجسٹریٹ کا لڑکا ہے اور ابھی تک اُس کو اُس کے والدین سے بے خبر رکھا گیا تو وہ بہت غضبناک ہوا لیکن جلد ہی رائے چرن کی بیچارگی نے اُس پر اثر کیا۔ اُس نے اپنے باپ سے درخواست کی "پتا جی! اسکی خطا معاف کیجئے۔ اگر آپ اس کو ملازم نہیں رکھنا چاہتے تو نہ رکھیں لیکن اس کے اخراجات کے کفیل ہوں اور اس کو ماہوار کچھ رقم دے دیا کریں۔"

رائے چرن یہ سُنکر حیران ہوا۔ اُس نے بیٹے کی طرف آخری بار دیکھا۔ پھر آقا کو سلام کیا۔ اور اُنکے گھر سے چلا گیا۔ اور اس وسیع دنیا میں نہ معلوم اُس پر کیا گذری لیکن قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ وہ چند روز جیا اور مر گیا۔

جب ایک ماہ گذر چکا تو انوکل نے رائے چرن کے پتہ پر اُس کے اخراجات کے لئے کچھ روپے بھیجے۔ لیکن وہ رقم واپس آگئی۔ چونکہ اُس نام کا کوئی باشندہ اُس گاؤں میں نہ تھا۔

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری

غزل

سوز و گداز شمع کو بیکار دیکھکر — تڑپا ہوں صبح تک یہی آثار دیکھ کر

مٹ مٹ گیا ہوں شوخیٔ رفتار دیکھکر — دیکھیں قیامتیں نگہ یار دیکھ کر

حسن آفریں ہے کوئے محبت میں ہر قدم — ہم تو بڑھے تھے راہ کو ہموار دیکھ کر

میرے کمال شوق و تمنا پر اک نظر — آئینہ بن گیا ہوں رخ یار دیکھ کر

تصویر خلد کھچ گئی ساقی کی بزم میں — زاہد سے پاکباز کو سرشار دیکھ کر

پہنچا وہی جو خاک ہوا راہ عشق میں — دل مطمئن ہے منزل دشوار دیکھ کر

گرتی رہیں تبسم پنہاں کی بجلیاں — ہم کو مشاہدہ کا طلب گار دیکھ کر

اے شوق دید کیا یہی حد نگاہ ہے — حیرت زدہ ہوں سنگ دریار دیکھ کر

مجھ کو یہ دیکھنا تھا جو ہوتے وہ نقاب — کس وہم میں ہیں کافر و دیندار دیکھ کر

اے حسن جو سزائے تمنا ہو وہ قبول — لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھ کر

تقویٰ بھی آج ہو گیا قربان میکدہ — ہر جام میں بہار کے آثار دیکھ کر

وقف امید و یاس محبت میں ہم رہے — آسان جان کر کبھی دشوار دیکھ کر

تم تو سکون خاطر ناشاد بن گئے — سمجھا تھا میں کچھ اور یہ رفتار دیکھ کر

قصر عروج قوم کی روداد کچھ نہ پوچھ — چپ ہوں خموشی در و دیوار دیکھ کر

اب بارگاہ حسن میں اے دل خموش ہوں
ہر التجائے عشق کو بیکار دیکھ

جناب عطاء اللہ پالوی

ادبِ لطیف کا افسانہ نمبر میری اور دوسروں کی نظر میں

ابھی حال میں ہندوستان جنت نشان کے دو صوبوں (جنہیں واقعی خادمِ اردو یا فدائے ادب کے دعووں کا بجا حق حاصل ہے) کے دو بلند پایہ جرائد ساقی (دہلی) اور ادبِ لطیف (لاہور) نے اپنا اپنا "افسانہ نمبر" شائع کرکے اردو زبان کے افسانوی ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ مجھے ان افسانہ نمبروں کا مقابلہ یا موازنہ منظور نہیں کیونکہ "ہر افسانہ نمبر" اپنی اپنی جگہ نہایت خوب ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ کسی کی خواہ مخواہ ثنا خوانی کرکے اس کی نظر میں قربت تقرّب خاص حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن دیکھ رہا ہوں کہ "ادبِ لطیف" کے افسانہ نمبر کے متعلق مختلف قسم کے خیالات مسلسل شائع کئے جارہے ہیں۔ اور بعض معتقدانہ و غیر معتقدانہ تنقیدیں (اردو زبان کی اس کشمکش کے دور میں) نہ صرف باہمی آویزش و شکر رنجی کا باعث بننا چاہتی ہیں بلکہ ڈر ہے کہ اردو ادب کو بھی اس سے نقصان نہ پہنچے۔ لہٰذا میں بھی چاہتا ہوں کہ چند مقتدر جرائد و رسائل کے ریویو پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے اپنے خیالات ظاہر کردوں۔ ممکن ہے کچھ فائدہ ہو۔

"ادبِ لطیف" کا "افسانہ نمبر" جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر ۱۳۳ ... کے کل منظوم و منثور مطبوعہ مضامین کی تعداد پچیس ۲۵ ہے "نذرِ اولین" کا شمار مضمون میں کسی صورت سے نہیں ہوسکتا، جس میں پانچ مضامین "فن افسانہ نگاری" سے متعلق ہیں۔ باقی بیس مضامین "افسانے" ہیں جن میں چھ منظوم، چھ منثور، چھ ترجمے اور دو خط کی شکل میں ہیں۔ اور سب سے قبل "نذرِ اولیں" ہے جس میں مدیرِ رسالہ نے تقریباً ہر مضمون کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں اور بتایا ہے کہ کس میں کیا چیز قابلِ ذکر ہے۔

"افسانہ نمبر" کی اشاعت کے بعد حسبِ قاعدہ ملک کے بلند پایہ رسائل نے اس پر ریویو کیا ہے۔ مگر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعضوں نے غایتِ عقیدتمندی میں اسے "عدیم المثال افسانہ نمبر" ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اکثروں نے اسے بالکل معمولی درجے کا ظاہر کیا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے درمیانی درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ان سب کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ ہر تنقید، تبصرہ اور ریویو کا پایہ کیا ہے۔

شاہکار (لاہور) شاہکار نے سب رسالوں سے زیادہ طویل ریویو کیا ہے اور بڑی فیاضی سے دادِ محنت دی ہے۔ سب سے پہلے لکھا ہے کہ "ادبِ لطیف اردو کے مقتدر ادبی رسائل میں شمار ہوتا ہے۔" بلاشبہ یہ صحیح ہے

آگے چلکر لکھتا ہے:۔

"ہر ایک مضمون معلومات سے لبریز مقالہ۔ ہر ایک
افسانہ افسانہ نگار کی کامیاب کوشش کا مظہر اور
اور ہر ایک نظم ایک دلکش افسانہ ہے"

میری گذارش ہے کہ حضرت یزدانی نے اس جگہ جو کچھ فرمایا ہے وہ دادِ صریح نہیں بلکہ ہجو ملیح ہے۔ اگر احسن صاحب مقبول احمد صاحب اور عدم صاحب کی نظمیں "دلکش افسانہ" ہیں تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن نظموں کے متعلق کیا کہا جائیگا۔ جو واقعی "دلکش" ہیں۔ محنت کی داد دینے کے یہ معنی کہاں ہیں کہ "مبالغہ" سے بھی کام لیا جاتے ہ؟

حضرت یزدانی، میرزا ادیب صاحب کے افسانہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرزا ادیب بی۔اے کا افسانہ "صحرا نورد کا چوتھا
خط" عجیب کیفیات کا حامل اور تمام افسانوں
سے بہترین ہے۔ یہ افسانہ اُن کا شاہکار کہا
جاسکتا ہے"

جہاں تک "افسانہ" کی خوبیوں کا تعلق ہے۔ بیشک حضرت یزدانی کا قول قابلِ تسلیم ہے لیکن اسے حضرت ادیب کا "شاہکار" کہنا ان کی تعریف نہیں ہجو کرنا ہے۔ گویا وہ اب اس سے بہتر افسانہ نہ لکھ سکیں گے کسی زمانہ کے متعلق "شاہکار" کا حکم صرف اُسی وقت لگایا جاسکتا ہے جبکہ ممدوح کے تمام کارنامے موجود ہوں اور آئندہ اضافہ کا سلسلہ ختم ہوگیا ہو مگر میں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرزا ادیب کا ہر نیا افسانہ پُرانے افسانوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ اب وہ اس سے بہتر افسانہ نہ لکھ سکیں گے؟

معارف (اعظم گڑھ) معارف کا ریویو عجیب و غریب ہے ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

چنانچہ اس نمبر میں بھی اس نے ہر مذاق کے ستھرے
اور پڑھنے کے لائق افسانے فراہم کئے ہیں۔

لیکن دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"اس کے ساتھ بعض افسانے ایسے بھی نظر آتے ہیں
جنکا منشا "لکھنے" کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا
مثلاً دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے۔"

لیکن یہاں اس بحث کا موقع نہیں۔ اس لئے نظرانداز کرتا ہوں یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اگر کسی افسانے کا منشا محض "لکھنے" کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ فرسودہ ہے تو پھر اوپر ان ہی افسانوں کے متعلق یہ کیونکر فرمایا گیا کہ "ہر مذاق کے ستھرے" اور "پڑھنے" کے لائق افسانے فراہم کئے ہیں"؟ افسانے اس لئے "لکھے" گئے تھے کہ پڑھے جائیں سو "معارف" خود معترف ہے کہ "پڑھنے کے لائق" ہیں۔ اب اور کیا چاہیئے

سلہ معارف کے اس نمبر میں بجز "ساقی" کے افسانہ نمبر کے اور کل خاص نمبروں پر ریویو کیا گیا ہے۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کیا "ساقی" اور "معارف" کا تباد زمحض ایک ہلکی چھیڑ چھاڑ کے بعد بند ہوگیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں دونوں سے التماس کرونگا کہ یہ "ادبی دور" "ذاتی عناد" کے لئے موزون نہیں۔ اس طرح اگر ہمارے ادبا باہمی آویزش کے مرتکب ہوا کرینگے تو پھر ہماری زبان کا کیا حشر ہوگا؟ اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو پھر ساقی پر ریویو نہ کرنے کی وجہ معلوم ہونی چاہیے۔

تھا ؟ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

" افسانہ نگاری پر متعدد مفید مضامین ہیں۔ گو
ان میں سے بعض سطحی ہیں تاہم نومشقوں کیلئے
مفید ہیں "

سبحان اللہ اگر "افسانہ نگاری" سے متعلق مضامین جو واقعی صرف نومشقوں ہی کے لئے لکھے جاتے ہیں "مفید" ہی ہیں تو پھر انہیں "سطحی" کیوں کہا گیا ؟ بہرکیف اس کے علاوہ جو کچھ "معارف" نے لکھا ہے درست ہے۔ اور صحرانورد کے خطوط کا سلسلہ بھی واقعی دلچسپ ہے۔

شاعر (آگرہ) شاعر (آگرہ) نے "ادب لطیف کی کمی عمر کے باوجود انتہائی مقبولیت پر یا اس کے معیار کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، بلا شبہ صحیح ہے آگے چلکر لکھتا ہے :۔

"معاصر موصوف کا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے جو
اس سال کے دیگر افسانہ نمبروں سے ہر طرح
ممتاز ہے۔ لکھائی چھپائی کی عمدگی کے ساتھ
ساتھ اس مرتبہ افسانہ ایڈیشن میں بعض مضامین
فن نویسی پر بھی لکھوائے گئے ہیں جو افسانوں
سے زیادہ مفید ہیں "

بیشک مجھے بھی اعتراف ہے کہ ادب لطیف کا "افسانہ نمبر" بہت بہتر ہے۔ مگر میری عقیدتمندی اس حد تک نہیں پہنچی کہ میں اُسے "اس سال کے دیگر افسانہ نمبروں سے ہر طرح "ممتاز" سمجھوں۔ ایسا کہنا یا تو غائت عقیدتمندی ہے یا فضول "مبالغہ" کسی چیز کی تعریف میں اسے "سبھوں سے ممتاز" کہنا سب سے عمدہ تعریف ہو نہیں بلکہ اسکی خوبیوں کو [illegible] کی قدر کرنا۔ اچھی تعریف ہے نیز اہلیت سے زیادہ تعریف "تعریف" نہیں "ہجو" ہے۔ آگے چلکر فرمایا ہے :۔

"بعض افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے باعتبار
ندرت تخیل و واقعات بہت خوب ہیں۔ جی چاہتا
ہے کہ انہیں پڑھا جائے "

خوب! گویا اب تک جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ بغیر پڑھے ہوتے ؟ نیز جب یہ تسلیم ہے کہ اسمیں کچھ افسانے ایسے بھی ہیں ۔ جو پڑھنے کے قابل نہیں ہیں تو پھر اسے تمام دیگر نمبروں سے "ممتاز" کہنا دوسرے افسانہ نمبروں پر ظلم کرنا نہیں تو اور کیا ہے ؟

"فن افسانہ نگاری" سے متعلق مضامین کیلئے" اس "مرتبہ" کی قید لگائی گئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ادب لطیف کا "ہر افسانہ نمبر" ایسے مضامین سے مزین ہے۔ منظوم افسانے صرف چار بتائے گئے ہیں یہ بھی درست نہیں چھ ہیں۔

ساقی (دہلی) "ساقی" اردو زبان کا بڑا بلند پایہ رسالہ ہے۔ لاریب حضرت شاہد احمد مدیر ساقی نے" ادب لطیف" کے افسانہ نمبر پر ریویو کرنے میں بہ نسبت اوروں کے آزادیٔ رائے کو زیادہ موقعہ دیا ہے اور بلا شبہ یہ درست ہے۔ کہ انہوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا ایک گرانقدر حصہ قابل تسلیم ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ نے سچی تعریف کرنے میں کسی قدر بخل سے کام لیا ہے۔ میرے خیال میں اچھے افسانوں کی فراہمی کی داد ذرا کھلکر دینا تھی اس سے ہمت بڑھتی ہے۔ سب سے زیادہ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت شاہد احمد اس ریویو میں اسی فعل کے "مرتکب ہوئے ہیں جس پر ایک سال قبل وہ معترض" تھے آپ نے فرمایا ہے کہ :۔

"ادب لطیف لاہور کے اچھے رسائل میں شمار ہوتا ہے۔"

حالانکہ جب معارف اعظم گڑھ نے "ساقی" کے "افسانہ نمبر" پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"ساقی دہلی کے اچھے رسائل میں ہے"

تو حضرت شاہد احمد نے "ساقی" بابت ماہ اکتوبر ڈرانے کا جہنم کے "نگاہ اولین" میں فرمایا تھا کہ :-

"تنگ نظری کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ساقی کو صرف دہلی میں محدود کر دیا۔ دہلی کے بجائے اردو لکھنا انہیں گوارا نہیں۔ ایسی ذہنیت کے لوگوں نے پنجاب یو پی اور دہلی کا سوال پیدا کیا ہے اور یہ وہ ذہنیت ہے جو صرف تعصب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے یہ حضرات نہیں سمجھتے اور نہیں سمجھ سکتے کہ اردو کو اس صوبجاتی تعصب سے کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہم سر جوڑ کر کام کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہمارے دلوں میں کدورت و دوری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد"

شاہد صاحب کے متعلق جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے میں یہ جانتا ہوں کہ وہ آدمی جھگڑالو نہیں نیز وہ ایک غیر متعصب اور اردو دوست انسان ہیں پھر ایسی صورت میں انہوں نے ادب لطیف کو لاہور ہی تک کیوں محدود کر دیا تعجب ہے

نیرنگ خیال لاہور۔ نیرنگ خیال کے مدیر

اعلیٰ حضرت یوسف حسن صاحب جہاں اردو زبان کے خادم کی حیثیت سے ایک قابلِ قدر انسان ہیں۔ وہاں بعض ذاتی چھیڑ چھاڑ کیوجہ سے قابلِ افسوس بھی۔ ایک زمانے میں آپ نے ساقی کو تختۂ مشق بنا لیا تھا۔ مگر شکر ہے کہ شاہد صاحب اور حکیم صاحب کی باہمی ملاقات یا وعدہ وعید نے اس فتنہ کو بہت جلد ختم کر دیا۔ صحافتی میدان میں آپ کا یہ دعویٰ کہ

"نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی۔ ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے۔"

درانحالیکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ واقعی یہ دعویٰ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ نیز یہ نہیں معلوم کہ صرف سب سے زیادہ "چھپتا" ہی ہے یا سب سے زیادہ "بکتا" بھی ہے؟ بہرحال "ادب لطیف" کے "افسانہ نمبر" کے متعلق جو کچھ نیرنگ خیال نے لکھا ہے۔ وہ میری نظر سے بھی گذرا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریویو میں تخریبی پہلو مضمر ہے۔ اور حکیم صاحب نے اپنی "عادت" کے مطابق نہ صرف ہجو ملیح کی ہے بلکہ ایسے مشورے بھی دیئے ہیں جن سے انکا اپنا نمبر جس میں یہ ریویو شائع ہوا ہے خالی نظر آتا ہے۔ مثلاً آپ نے مشورہ دیا ہے کہ "زیادہ توجہ کار آمد علمی مضامین کے حصول پر دینی چاہیئے۔" (اس جگہ یہ خیال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ مشورہ افسانہ نمبر پر ریویو کرتے ہوئے دیا جا رہا ہے) مگر خود اسی نمبر میں بعض "ہندوستانی اوہام" فرماتے ہیں۔ جس کا شمار نہ تو علمی مضامین میں ہے اور نہ اسے "کار آمد" کہا جا سکتا ہے۔

متذکرہ بالا مقتدر رسالوں کے ریویو کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب لطیف کا افسانہ حصہ [illegible]

وہاں اسمیں معائب بھی ہیں۔ جہاں اسمیں اچھے اور بلند پایہ افسانے ہیں وہاں کمزور اور کسی حد تک پست بھی۔ بلا شبہ یہ نتیجہ درست ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا موقر جرائد و رسائل کا ہر خاص نمبر ہر لحاظ سے اعلیٰ ترین ہوتا ہے؟ کیا ہر افسانہ نمبر کے تمام افسانے کامیاب ہی ہوتے ہیں؟ کیا ہر شاعر، مضمون نگار اور افسانہ نویس ہر مرتبہ عدیم المثال کامیابی حاصل کرتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ادب لطیف کے افسانہ نمبر میں کونسا نیا عیب ہے؟ ایسی صورت میں کیا ہرج ہے اگر ادب لطیف کے بعض افسانے پست یا پھسپھسے ہیں۔ نیز ہر چیز کی پسند کا انحصار تمامتر اپنے اپنے 'ذوق' پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک کو بہت پسند ہو اور دوسرے کو نہ ہو۔ خود میرزا ادیب صاحب نے 'نذر اولین' میں ہر مضمون کی تعریف بمقتضائے 'ذوقِ خود' کی ہے مگر میں خود یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان سے اختلاف ہے۔

"افسانہ نمبر" کا سب سے بڑا منثور افسانہ خود مدیر ادب لطیف کی جنبش قلم کا مرہونِ منت ہے۔ اس کی تعریف سبھوں نے کی ہے۔ مگر دو تحریریں بڑی زبردست ہیں۔ حضرت اختر اور رینوی افسانہ نگار کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"غالباً فطرت آپ کو اردو کا 'ایڈگر ایلن پو' بنانیوالی ہے۔"

حضرت رشید اپنے تنقیدی مضمون میں فرماتے ہیں کہ "میرزا ادیب رائیڈر ہیگرڈ زدہ معلوم ہوتے ہیں" خوب جب ہر شخص اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق کسی نہ کسی مغربی اہل قلم کا میرزا صاحب کو ہمپایہ بنا رہا ہے۔ تو سائنٹیفک اور جاسوسی عناصر کی وجہ سے کیوں نہ میں بھی یہ کہدوں کہ میرزا ادیب صاحب میں "سر آرتھر کانن ڈائل" کی خوبیاں موجود ہیں؟ مجھے اعتراف ہے کہ میرزا صاحب کا یہ افسانہ واقعی بہت بہتر ہے اور اس میں جہاں پُر اسرار و حیرت انگیز واقعات بیان کئے گئے ہیں وہاں رومانی وولولہ انگیز بھی۔ جہاں سنگدلی و سحرکاری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں وہاں الفت و محبت کے کرشمے بھی۔ جسکے باعث افسانہ حد درجہ طویل ہوتے ہوتے بھی دلچسپ ہے۔ مگر اسکی تعریف کیلئے اسکی کیا ضرورت ہے کہ انہیں کسی نہ کسی مغربی اہلِ قلم کا مد مقابل یا مغرب زدہ ضرور کہا جائے؟ ہماری زبان میں یہ بڑی خرابی ہے کہ ہم کسی شخص کی اسوقت تک تعریف نہیں کر سکتے جبتک اُسکی مثال کیلئے مغربی ستون کا سہارا نہ لیں۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق ہمیں اپنی چیزیں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھنی چاہئیں۔ بہر کیف میری نظر میں ادب لطیف کا افسانہ نمبر ۳۶ء اجمالی حیثیت سے کامیاب ہے اور اسمیں کوئی عیب ایسا نہیں جو انوکھا ہو یا جس سے موجودہ دور کے نقد رسائل کے خاص نمبر منزہ اور پاک ہوں۔

جناب ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

ایک ننھے یتیم کا سوال

امّاں! مجھے بتا مرے ابّا کا نام تو
میں پوچھ کر رہونگا نہ مانوں گا ایک بات
للہ اب فضول بہانوں کو چھوڑ دے
ہاں ہاں میں جانتا ہوں کہ ابّا ہے نامور
دشت و جبل لرزتے ہیں اُسکے وقار سے
معلوم ہے مجھے کہ وہ یکتائے دہر ہے
سب کچھ ہے میرے علم میں امّاں! مگر فضول
لڑکے ہمیشہ میری اُڑاتے ہیں پھبتیاں
"ہرگز نہ اپنے ساتھ تجھے ہم کھلائیں گے"
امّاں! تو ہی بتا کہ انہیں کیا جواب دوں
کہتا ہوں سچ کہ ضبط سے لونگا نہ اب میں کام

بس بس نہ اب چھپا مرے ابّا کا نام تو
میں اب نہیں سنونگا "تو سو جاؤ آ گئی رات"
خواب آفریں حسین فسانوں کو چھوڑ دے
ثانی نہیں ہے اسکا جہاں میں کوئی بشر
خورشید بھی ہے ماندِ نظر کے شرار سے
اُسکا جلال سلطنت آرائے دہر ہے
اس علم کے سبب سے ہی رہتا ہوں میں ملول
"اماں سے جاکے پوچھ ترا باپ ہے کہاں"
"جب تک نہ تیرے باپ کو پہچان جائینگے"
ہر ایک سے لڑوں کہ خموشی سے سب سہوں؟
یہ کیا کہ اپنے باپ کا میں لے سکوں نہ نام؟

امّاں! نہ اب چھپا میرے آبا کا نام تو
چپکے سے دے بتا مرے آبا کا نام تو

"بلو طارق"

گائے

عورت کی سرکاری پر بحث ہو رہی تھی۔ انور خود اس کا شکار تھا وہ بڑھ چڑھ کر اس کی تائید کر رہا تھا۔ افضل کو اس صنف سے کچھ نفرت ہو چکی تھی وہ مردوں کو سراہ رہا تھا۔ ایک اس کی اعجاز آفرینی کی تعریف کر رہا تھا۔ تو دوسرا اس کی خلقی بد اخلاقی اور مرد کی عالی حوصلگی کی لمبی لمبی مثالیں دے رہا تھا۔ مجھے کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اس لئے چپ رہا مگر سوچتا رہا کہ ابھی دست دگریباں تک نوبت پہنچ جائے گی۔ انور غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ثالث کی رائے دریافت کرینگے افضل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا "بھئی تم خموش تماشہ دیکھ رہے ہو ہمارا فیصلہ کر دو مگر یہ یاد رہے کہ کسی کی رو رعایت نہ ہو"

"اجی اس نے کیا فیصلہ کرنا ہے جسے خود پتہ نہیں بھلا عملی دنیا میں بھی فلسفی کی رائے کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟ ان کے نزدیک تو عورت ناگن ہے اور دنیا میں انسان کی سب سے بڑی مصیبت۔ یہ تو افلاطون کے خوشہ چین ہیں جو اپنی خیالی دنیا ہی میں خوش و خرم رہتے ہیں۔ عورت ایک حقیقت ہے اسکا وجود ایک خوشگوار وادی کی طرح شیریں اور فرحت بخش، صبح کے سہاونے پن بلبل کا ترانہ ہنگام شام کوئل کی کوک، اس کا وجود پھولوں کی خوشبوؤں میں گندھا ہوا، بادہ ناب کا چھلکتا ہوا پیمانہ، دلکش، دلنشیں، دلآرام۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اس کے لئے رائے کی کیا ضرورت ہے۔ طلوع آفتاب خود آفتاب کے وجود کی دلیل ہے"

افضل سنتا رہا کئی بار بولنے کی کوشش کی۔ مگر انور کہاں رکنے والا تھا۔ آخر کہنے لگا:-

"دیکھو انور یہ مسئلہ اہم ہے اس میں شاعری کو دخل نہ ہونا چاہئے۔ جذبات کی اپیل کیوں؟ تم عورت کی ظاہری شان و شوکت اور دلکشی پہ مرتے ہو۔ ملمع کو سونا سمجھے بیٹھے ہو۔ اگر عورت کو صحیح معنوں میں جاننا چاہتے ہو تو اس کی فطرت کا مطالعہ کرو۔ اس کے قلب و جگر کو بے پردہ دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ عورت اصل میں ایک خوبصورت اور دلکش ناگن ہے جس کے درخشندہ جسم کی رگ رگ میں مہلک زہر ہے تمہارے مرغ تخیل کے پر اس کی موجودگی میں ٹھٹھر جائینگے تمہاری شاعری معقود اور یہ سب لطیف جذبے خاک میں مل جائیں گے۔ تم سراب اور عورت کا دور ہی سے لطف لے سکتے ہو۔ ان کی قربت میں تمہیں تلخکامیوں سے دوچار ہونا پڑیگا عشق اور محبت میں اس حد تک جاذبیت موجود ہے۔ جہاں تک وہ اپنے مآل سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت حسین ہے، دلکش ہے، سحر کار اور معجز نما بھی ہے مگر یہ سبھی خاصیتیں ایک پہاڑی میں بھی موجود ہیں۔ جس کی چوٹی پر ایک بار پہنچکر تمہیں لازماً نیچے اترنا پڑتا ہے معراج ہوئی

تو کیا اس کے ساتھ زوال بھی تو ہے اور کتنا دردناک ؟"

"مگر ـــ مگر ـــ"

ٹھہر جاؤ نا ۔ مجھے اپنی کہہ لینے دو تم ابھی اسے سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ ابھی تو تم اس کے ہاتھ کا ایک کھلونا ہو جب تمہیں زمین پر پٹک دے گی تو پوچھوں گا۔

تلوّن اس کی فطرت میں داخل ہے تم سمندر کی طوفانی سطح کو تیل چھڑک کر پُرسکون بنا سکتے ہو۔ مگر تمہاری چکنی چپڑی باتوں سے اُس کی تلوّن مزاجی اور بھی بھڑک اُٹھے گی۔"

انور کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا ۔ میں نے افضل کو اشارے سے چپ کرا دیا ۔ دونوں ہی جوش میں تھے۔ ـــــــــــ

ـــــ انور نے سگرٹ سلگایا اور بیٹھ کر لمبے لمبے کش لینے لگا ۔ میں نے کہا ۔

"میں نہیں کہہ سکتا تم دونوں میں کون زیادہ سچا ہے مگر اسبات کا احساس ہو گیا ہے کہ تم دونوں ہی عورت سے بے حد متاثر ہوئے ہو ۔ اس سے اُس کی تاثراتی قوت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔ میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں جس نے خود مجھے بھی حیران کر دیا ہے ۔"

دونوں کے سکون کا جائزہ لے کر میں نے کہا ۔

"اس مقابل والے مکان میں ایک لڑکا اور اس کی بڑھیا ماں رہتے تھے ۔ لڑکے کا نام شائد مراد تھا ۔ اور تھرڈ ائیر کا طالبعلم ۔ میں اس کی شکل کا پہلے بھی شناسا تھا ۔ بے حد ۔ خاموش، سرد مہر اور خلوت پسند کسی کو سامنے آتا دیکھ کر یا واپس ہو جاتا یا راہ تبدیل کر لیتا ۔ کچھ ہونہار بھی معلوم نہ ہوتا تھا ۔ ذہانت کی کوئی جھلک نہ تھی ۔ عادات و اطوار بالکل بیہودہ و لغو تھے ،

اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ میرا مراد تو بالکل گئو ہے ۔ گئو سیدھا ۔ سادہ "

مجھ سے وہ ایک بار ملا تو ذرا گھبرا کر کیسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تھی ۔ اس کے مکان کا دروازہ اور کھڑکیاں عموماً بند رہتی تھیں اور روشنی بہت کم ہوتی تھی ـــ ماں بیٹے کی زندگی کتنی کٹھن تھی ۔ تنہائی میں سکوت میں اور چار دیواری میں بند پڑے رہتے تھے قیدیوں کی طرح اسکی ماں کو کبھی گھر سے باہر قدم رکھتے نہ دیکھا تھا ۔ البتہ وہ کسی ہم جنس سے باتیں کرنے کی بڑی متمنی رہتی ۔ میری والدہ یا ہمشیرہ کو ذرا بھی دیکھ پاتی تو جھٹ کھڑکی کھول کر ان سے گفتگو میں مشغول ہو جاتی ۔ یہی اس کی بیرونی زندگی تھی ۔

اس دوران میں ان کے سامنے والے مکان میں کرایہ دار آ بسے بہت شریف الطبع انسان تھے ۔ جہاں صرف چند ایک گھر ہوں وہاں رسم و راہ پیدا کرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے شام کا وقت تھا ۔ میں کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا ۔ ان کا نوکر آیا کہنے لگا "میاں صاحب کہتے ہیں ہمیں اجازت ہو تو ذرا آ جائیں ۔ میں نے خود ہی وہاں جانا مناسب خیال کیا ۔ اور اس کے ساتھ ہو لیا ۔ وہاں باتیں ہوتی رہیں اور میں کافی رات گئے واپس لوٹا ۔ ان کے ایک لڑکی بھی تھی حسین تو نہیں ۔ مگر اچھی تھی ۔ اور اس پر شستہ ۔

ان کے آنے کے دو تین دن بعد میں نے دیکھا تو مراد کے ڈھنگ ہی نرالے تھے ۔ اسے شیو کئے تین تین چار چار دن گذر جاتے تھے ۔ لیکن اب روزانہ مونچھوں کا بھی صفایا ہونے لگا ۔ [illegible]

ہونے لگی۔ کھڑکیاں دروازے صرف بغیر حاضری میں بند ہونے لگے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ وہ پریم کے گیت الاپنے لگا۔

اقبال کا یہ شعر تو گویا اس کا ورد زبان تھا۔ ؎

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

ایک روز ہمشیرہ آئیں اور کہنے لگیں "اُس گانے کو دیکھا، سمجھتے ہو اسکا باعث؟" میں ہنس پڑا۔ میں خود اس تبدیلی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ ہمشیرہ کی فراست اور تیز نگاہی نے مجھے حیرت میں ڈالدیا۔ میرے خیال میں افضل تم غلط کہتے ہو کہ عورت کا قرب شاعرانہ تخیلات کو نابود کر دیتا ہے۔ یہاں تو اس نے ایک ایسے انسان میں، جس کے دماغی قوا میرے نزدیک "مشکوک" تھے۔ ان تخیلات کو نہ صرف جلا دی ہے بلکہ خلق بھی کیا ہے۔ اس کی خوابیدہ فطرت اگر بیدار ہوتی تو محض عورت کی وجہ سے۔ یہ اور بات ہے کہ اس فطرت میں زیادہ عنصر بوالہوسی کا ہے۔ بے لوث اور معصوم محبت کا نہیں۔"

کچھ دیر کے سکوت کے بعد انور بولا۔

"اس سے تو میری بات کی تائید ہوتی ہے میں بھی تو یہی کہتا تھا کہ عورت میں خلاقیت کی بڑی قوت ہے۔"

"تم نے بھی اسے نہیں سمجھا" افضل نے کہا۔ اس سے تو بلکہ میری باتوں کی صداقت ہوتی ہے تم نے دیکھ لیا کہ اچھے بھلے لڑکے میں عورت کی موجودگی نے ہوس کے زہر آلود بیج بو دیئے ہیں۔ جو اس کی کشتِ حیات کو بدی گناہ اور شرمناک موت میں تبدیل کر دینگے۔"

انور ہم پر ایک قہر آلود نظر ڈال کر چلا گیا۔

محترمہ آنسہ نسیمہ سوز۔ ارول

اے دوست

فلک پہ تاروں کی فرحت اثر ضیا ہو تم
مہ تمام کی تنویر کیف زا ہو تم!

وفورِ دردِ غمِ ہجر کی دوا ہو تم
ہجومِ یاس میں اُمید کی ضیا ہو تم!

سکونِ قلب ملے جس سے تم وہ نغمہ ہو
ربابِ عشق کی حُسن آفریں صدا ہو تم!

نہ آیا رحم تمہیں میری گریہ زاری پر
ستم نواز و جفا کیش و بے وفا ہو تم!

تمام عیش و مسرت ہے تم سے وابستہ
ہماری زیست کا بس ایک آسرا ہو تم!

نقد و نظر

معاہدہ عمرانی

(ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ ضخامت دو سو چونسٹھ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت عہ مع خوبصورت جلد کے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی)

ژان ژاک روسو فرانس کا وہ بطلِ حریت وہ شعلہ طراز مصنف اور وہ عدیم النظیر مفکر ہے۔ جسکے کارنامے وقت کے ساتھ ساتھ دنیائے انسانیت کی نگاہوں میں زیادہ احترام زیادہ عظمت اور زیادہ شہرت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ معاہدہ عمرانی انقلاب فرانس کے اس زندہ جاوید ہیرو کی تصنیف Social Contract کا کامیاب و دلآویز ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب نے جسمیں اصل کتاب کی خوبیاں برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آغاز کتاب میں فاضل مترجم نے ایک بسیط مقدمہ میں روسو کے حالات زندگی اُس کی ذہنی کاوشوں اور اس کے سیاسی افکار پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ تحریر سادہ اور دلچسپ ہے۔ قاری صرف مقدمہ ہی پڑھکر روسو کے افکار سے بہت حد تک روشناس ہو سکتا ہے۔ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں نو دوسرے میں بارہ تیسرے میں اٹھارہ اور چوتھے میں ۹ ابواب ہیں۔ آخر میں فرہنگ اصطلاحات بھی درج ہے۔ معاہدہ عمرانی اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جن کا پڑھنا ہر اردو دان پر فرض ہے۔ کارپردازان جامعہ ملیہ ہمارے عمیق شکریئے کے مستحق ہیں کہ ان کی قابلِ قدر کوششوں سے ایسی مفید کتاب اردو میں منتقل ہوئی۔

مشاہیر ہند

(مولفہ سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی کتابت ۔ طباعت اعلیٰ صفحات ۱۳۰ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ سید عبدالقادر اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز چارمینار حیدرآباد دکن۔)

سوانحی ادب جہاں دلچسپ ہوتا ہے وہاں کارآمد بھی۔ مشاہیر کے قابلِ احترام سوانح حیات بہترین راہنما ثابت ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہینگے۔ اس لئے اس نوع کے لٹریچر کی بے حد ضرورت ہے۔ سید بادشاہ حسین صاحب ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کافی محنت و تلاش سے کام لیتے ہوئے موجودہ ہندوستان کے مشاہیر کے سوانح حیات کو ملک کے سامنے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اس وقت مشاہیر ہند کی پہلی جلد ہمارے پیشِ نظر ہے جسمیں چند جلیل القدر انسانوں کے حالات زندگی دلآویز پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ جیساکہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اور اس میں سر آغا خاں ڈاکٹر اقبال۔ سر اکبر حیدری۔ سر بوس۔ ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو کے اہم حالات ہیں۔

سید بادشاہ حسین صاحب کی یہ کوشش بہت مستحسن ہے۔ امید ہے پبلک اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی۔

جدید دستور کا خاکہ

(از جناب ڈاکٹر زین العابدین صاحب بی اے ایس سی پی ایچ ڈی، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۲ قیمت ۲ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی)

اس کتاب میں دستورِ جدید" (New Constitution) کی آسان پیرائے میں وضاحت کی ہے۔ اور پھر اسکے ہر پہلو پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ جو حضرات "دستورِ جدید" کو پوری طرح سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور اسکے محاسن و معائب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے

کائنات

(از محمود علی خانصاحب جامعی، کتابت و طباعت دیدہ زیب صفحات ۰۰، قیمت ۵ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔)

یہ پُر از معلومات کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر ایک باب اجرام فلکی کے متعلق دلچسپ اور کار آمد معلومات کا ذخیرہ لئے ہوئے ہے۔ پہلے باب میں اجرام فلکی سے تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں دنیا کے گول ہونے کے سلسلے میں دلائل دیئے ہیں۔ تیسرے میں سورج کے فرائض و فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ الغرض ہر باب معلومات کا خزانہ ہے۔ کتاب کا پیرایہ بیان نہایت سلیس و دلچسپ ہے طلباء کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔

دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن

(باہتمام جناب آغا طاہر صاحب قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں دہلی)

دیوانِ غالب مختلف اداروں کی کوششوں سے مختلف صورتوں میں شائع ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اب جناب آغا طاہر صاحب نبیرہ آزاد مرحوم نے میرزا کا کلام بذریعہ بلاک شائع کیا ہے۔ اور ایک مستند و مکمل قلمی نسخہ سے اسے درست کیا ہے۔ جیسا کہ دیباچہ میں خود فرماتے ہیں۔

"خوش قسمتی دیکھئے کہ اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا یعنی میرے پرنانا جناب حسین میرزا صاحب جو صاحب ذوق اور میرزا کے عاشق زار تھے۔ انہوں نے منتخب کلام کا ایک صحیح نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر میرزا کو دیا۔ میرزا نے پڑھکر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار واپس کر دیا۔ میں نے یہ دیوان اسی قلمی نسخہ سے درست کیا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب کی مساعی جمیلہ بڑے پیمانہ شکریے کی مستحق ہیں۔ کہ انکے طفیل ہمیں دیوانِ غالب کا ایسا شاندار دلآویز اور جاذبِ دل و نظر ایڈیشن نصیب ہوا۔

(م - ل)

ادبِ لطیف کا سالنامہ ۱۹۳۸ء اردو کا ممتاز ترین سالنامہ ہوگا

سالانہ چندہ بمع عظیم سالنامہ
افسانہ نمبر تین روپے چار آنے

ممالک غیر سے
آٹھ شلنگ

فہرس

جلد ۶ | بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۳

نذرِ اولیں ۔ درسی کتب اور محکمہ تعلیم پنجاب

چند غور طلب حقائق

چار سال کا عرصہ ہوا کہ پنجاب کونسل نے درسی کتب کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے سامنے بیان دیتے ہوئے بعض بڑے بڑے سرمایہ دار تاجران کتب نے بڑی جرأت کیساتھ اس بات کا اقرار کیا تھا کہ تعلیمی محکمہ میں رشوت کا بازار گرم ہے۔ اور وہ بڑی بڑی رقمیں دیکر اپنی کتب داخل نصاب کراتے رہتے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے ناشرین کی شہادتیں کافی سمجھتے ہوئے رشوت دینے اور لینے والے حضرات پر مقدمے چلائے جاتے۔ رشوت دینے والے اداروں کو بلیک لسٹ پر لا کر ان کی کتب کو نصاب سے خارج کیا جاتا اور رشوت لینے والوں سے بھی مواخذہ کیا جاتا تاکہ آئندہ ایسے قبیح فعل کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن تحقیقاتی کمیٹی نے مجرموں کو سزا دینے کی بجائے ایسی تجاویز منظور کیں۔ جو انہی مجرموں کے حق میں مفید ثابت ہوں۔ اور وہی بڑے بڑے سرمایہ دار ناشرین بلاشرکت غیرے درسی کتب کی تجارت سے مستفید ہوتے رہیں اور چھوٹے چھوٹے پبلشروں کے لئے آئندہ کام کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

سکیم کا مفہوم یہ تھا کہ عالم ٹیکسٹ بک کمیٹی کو توڑ کر اسکے کھنڈرات پر ایڈوائزری بورڈ کی بنا رکھی جائے۔ پہلی تمام منظور شدہ کتب نصاب سے خارج کر دی جائیں اور ان کی بجائے ہر مضمون کے صرف پانچ سلسلے منظور کر کے وہی پنجاب میں رائج کرنے کے احکام صادر کئے جائیں! جو آمدنی ہو وہ انہیں پانچ سلسلوں کے ناشرین و مصنفین میں برابر تقسیم کر کے رشوت دینے یا لینے کا موقع ہی نہ چھوڑا جائے تحقیقاتی کمیٹی نے اس بات کا بھی اعلان کیا تھا کہ کتب کے انتخاب کیلئے بڑے ایماندار اور کسی طاقت کا اثر نہ قبول کرنے والے ریویورز (نقادان فن) تلاش کئے جائیں گے۔ لیکن ساتھ ہی کمیٹی نے یہ بات بھی تسلیم کر لی تھی کہ فی زمانہ ایسے ایماندار اور با اصول ریویورز ملنے مشکل ہیں جو رشوت لئے بغیر اور کسی کے دباؤ کے بغیر کتب منظور کریں۔ کیونکہ انہیں ریویورز کی رائے پر کتب کی منظوری یا عدم منظوری کا انحصار رکھا گیا تھا۔

ہم نے اسی وقت اعلان کیا تھا کہ یہ تجویز چھوٹے چھوٹے کم سرمایہ دار نو وارد پبلشروں کو تباہ و برباد کرنے اور بڑے بڑے سرمایہ دار پبلشروں کو فائدہ پہنچانے والی ثابت ہوگی ہمیں معتبر ذرائع سے علم ہو چکا تھا کہ بڑے بڑے پبلشر نئے پبلشروں کو برداشت نہیں کرتے اور وہ کسی حیلہ اور بہانے سے انکی زد سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تاکہ مارکیٹ میں نئی کتب منظور ہو کر نہ آسکیں اور وہ اپنا غاصبانہ قبضہ برقرار رکھ سکیں۔

آخر کار ہمارا خیال درست نکلا اور ہمارے خدشات حقائق بنکر سامنے آگئے۔ گزشتہ چار سال میں کوئی نئی کتاب منظور نہ ہو سکی۔ دوسرے نئی کتب جو زمانہ کی رو کے مطابق ایسے اسباق پر مشتمل ہوتیں۔ جنکو پڑھ کر ہندوستانی طلباء اپنے وطن اور اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت کرنا سیکھیں۔ طلباء تک نہ پہنچ سکیں۔

خدا خدا کر کے سنہ ۱۹۳۶ء کے اختتام پر محکمہ نے زبان دانی کی کتب برائے منظوری طلب کیں لیکن جولائی سنہ ۱۹۳۷ء میں زبان دانی کی تمام کتب پبلشرز کو واپس کر دی گئیں۔ اور کہا گیا کہ جس وقت سکیم مرتب ہو جائیگی۔ کتب طلب کر لی جائینگی۔

ہاں زبان دانی کے علاوہ باقی تمام مضامین کی کتابیں پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔ اور کئی ایک سیٹ حساب وغیرہ کے ایڈوائزری بورڈ نے منظور بھی کر دیئے لیکن پچھلے مہینے محکمہ کی طرف سے یہ سرکلر دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کوئی ہیڈ ماسٹر رائج شدہ کتب کو تبدیل نہ کرے اور جو کتب اسوقت سکولوں میں رائج ہیں وہی پڑھائی جائیں۔ اس سرکلر کا محض یہی مطلب ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار پبلشروں کی کتب ہمیشہ کے لئے سکولوں میں رائج رکھیں۔ اگر محکمہ نے کوئی ایسا ہی حکم جاری کرنا تھا تو پھر نئی کتب کو منظوری کے لئے طلب کرنا چہ معنی دارد۔ نئی کتب کو طلب کر کے چھوٹے چھوٹے تاجران کتب کو ترغیب دینا اور کتب کے منظور ہو جانے پر ایسے احکام جاری کرنا کہ انکے لئے موقع ہی نہ رہے ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہم آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ وہ اپنی اولیں فرصت میں اس طرف توجہ دیں اور اگر محکمہ کو چھوٹے چھوٹے پبلشروں کو تباہ کرنا ہی مقصود ہے۔ تو ایک ہی دفعہ ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیں۔ ہم آئندہ اشاعت میں اس موضوع پر وضاحت کے ساتھ لکھیں گے۔

ادارہ

سالنامے کیلئے جو مضامین اب تک موصول ہو چکے ہیں ان کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں!

(افسانے)

ایک راز ۔ بہزاد بہن خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی
پریم کا جادو ۔ مصنف الف ڈ بلیوبین ترجمہ سراج الدین احمد نش نی
رت کا ریوتا ۔ از سیاح سامی جرنلسٹ
جھوٹ ۔ ۔ اختر انصاری بی۔ اے (آنرز)
ریلوے سفر ۔ ۔ علامہ ظریف
آپریشن ۔ کوثر چاندپوری
مشورہ ۔ ۔ سید بادشاہ حسین
قسمت ۔ ۔ ایم۔ اسلم
نالہ دل ۔ صادق الخیری۔ ایم۔ اے۔
آزادی ۔ قیس رامپوری
ناگوں کا جوڑا ۔ محترمہ زبیدہ سلطانہ
میکبتھ ۔ شیکسپیر کی ایک ٹریجڈی کا خلاصہ از انور سلطانہ مرحوم
زہرا ۔ ۔ پروفیسر عابد علی ایم۔ اے۔
سماج زادی ۔ حسن عباس
بلائے بے درماں ۔ ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی
جہیز ۔ ۔ احمد ندیم قاسمی بی۔ اے۔
چاہ بابل ۔ صحرا نورد کا پانچواں خط
ہاروت و ماروت کا قصہ

(منظومات)

شام بنگال ۔ ۔ از اختر شیرانی
جواب (آزادی کشمیر میں) از روش صدیقی
رات کا مسافر ۔ از سراج الدین ظفر بی۔ اے۔
زاری فراق ۔ ۔ امجد حیدرآبادی
دو آتشہ ۔ ۔ ۔ سید مقبول حسین احمد پوری
عرض ۔ ۔ ۔ سید اختر ادریزی ایم۔ اے۔
غلامی ۔ ۔ الطاف مشہدی

سہ آتشہ ۔ ۔ از پروفیسر غلام محی الدین ایم۔ اے
شاعر ۔ ۔ ۔ ماہر القادری
طلسم گفتار ۔ ۔ ۔ عدم
میخانہ راز ۔ ۔ ۔ راز چاندپوری
تاثرات ۔ ۔ ۔ شمیم مدیرہ الزہرا
مجھے بار بار یاد آ ۔ ۔ رام جوایا خنداں
رباعیات ۔ ۔ ۔ جوش ملیح آبادی
نیا سپاہی ۔ ۔ ۔ وقار انبالوی
حافظ جلیلی، احسان دانش، ملا رموزی کی ایک مزاحیہ نظم،

ان کے علاوہ

سراجی، روشن علی احمد، باسط سوانی، حاجی تقی احمد سحر سہارنپوری
طالب انصاری، ریزدانی، سید نذیر قادری، حفیظ ہوشیارپوری، عامر عثمانی
کے منظومات بھی پہنچ چکے ہیں ۔۔۔!

تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی مقالات

امہ اردو دی ۔ ۔ از حکیم عیش امروہی
فلسفہ خندہ ۔ ۔ رشید طارق ایم۔ اے
دنیا کی اہم سیاسی تحریکات ۔ از عبدالرحیم شبلی بی کام
اردو زبان کی تنقیدی کتابیں ۔ از عطاء اللہ پالوی
ہندوستان قدیم وسطی میں تفریحات عامہ ۔ از حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)
تنقید ادب ۔ ۔ از رشید بی۔ اے۔
نغمہ تحقیق ۔ ۔ پروفیسر بے خود موہانی۔ ایم۔ اے
سیاسیات پر ہو تو نکا اثر ۔ ۔ پروفیسر غلام مصطفٰے تبسم ایم۔ اے
ہندوستان قدیم میں فوجی نظام ۔ از کسری منہاس

(ڈرامے)

احساس گناہ ۔ نوشتہ گالزوردی ترجمہ سید شریف حسین انور گیلانی بی۔ اے۔ ۔ مرحوم از صاحبزادہ محمد عمر
وطن فروش ۔ ۔ نوشتہ ہڈرک کولم۔ ترجمہ اثر چکوالی بی۔ اے۔
بچپن ۔ از نذیر مرزا برلاس بی۔ اے (آنرز) ۔ ایک خاوند کی ضرورت ۔ ۔ از خلیل بی۔ اے

(ان حضرات کے مضامین کے اندراج کی بھی قوی توقع ہے)

سیماب اکبرآبادی ۔ باری علیگ ۔ پروفیسر عندلیب شادانی ایم۔ اے پی ایچ ڈی، سید نیاز علی تاج بی۔ اے، محترمہ حجاب امتیاز علی، پروفیسر سالک ایم۔ اے، تاثیر ایم۔ اے پی ایچ ڈی، مولانا ظفر علی خاں، پروفیسر محوی صدیقی، قاضی عبدالغفار، پروفیسر سید علی عباس حسینی ایم۔ اے، سید راحت مولائی بی۔ اے (علیگ)، پروفیسر منش ایم۔ اے، جمال مرادآبادی ۔ راز رامپوری ۔ ساغر جعفری بی۔ اے ۔ ۔ ۔ ۔ ساغر نظامی ۔ اعجاز ایڈیٹر شاعر، افسر صدیقی ۔ راجہ مہدی علی خاں ۔ رحمٰن مذنب ۔ وتیرہ ح۔ ب صاحبہ دل شاہجہانپوری ۔ پروفیسر فراق ایم۔ اے ۔ مقبول بدخشانی وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جناب اختر اورینوی۔ ایم۔ اے (آخری قسط)

شہنشاہِ حبشہ

ایکٹ نمبر (۴)

منظر اوّل

(ادیس ابابا کے شاہی محل کا ایک کمرہ۔ شہنشاہ حبش اور ملکہ دیز میرو مینن کوچ پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ آدھی رات بیت چکی ہے۔ شہنشاہ سخت متفکر ہے۔ اور ملکہ اپنے تفکر کو چھپاتے ہوئے شہنشاہ کو سمجھا رہی ہے۔)

ملکہ ۔ خدارا شہنشاہ! جلدی کیجئے! وقت بالکل نہیں۔! شہنشاہ! شہنشاہ! (ملتجیانہ)

شہنشاہ ۔ دیز میرو مینن! کیا میں اطالوی درندوں کے سامنے اپنے ملک کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟ کیا مجھے یہی کرنا ہوگا؟

ملکہ ۔ آپ کی زندگی سے ملک کی، پیارے حبش کی آخری اُمید وابستہ ہے! شہنشاہ! ہم سب پر رحم فرمایئے اٹلی کی فوجی چوکیاں یہاں سے صرف ۷ میل کے فاصلہ پر ہیں۔ ساسابانہ میں حبشی فوج تین طرف سے گھری ہوئی ہے۔

شہنشاہ ۔ میں یورپ جا کر کیا کرونگا؟ مجھے ساسابانہ جا کر مرنے دو! میں تو وہاں سے ادیس ابابا صرف اسلحۂ جنگ اور رسد کے انتظام کے لئے آیا تھا۔ اور نوجوانانِ ملک سے ایک آخری اپیل کرنے کی خاطر!

ملکہ ۔ میرے شہنشاہ! جرنیل صاحب کی رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ اب برطانیہ اور فرانس اطالیہ کے خلاف متحد ہو چکے ہیں۔ امید ہے کہ حبش بچ جائیگا۔ مگر ابھی آپ کی زندگی کی سلامتی ضروری ہے! ملک کے اندر قیام کرنا خطرناک ہے۔ اطالوی ہر جگہ فتح یاب ہو رہے ہیں۔ اور پھر ان پُرخطر ایام میں دوسرے مدعیانِ تاج و تخت کی غداری کا خوف بھی ہے!

(شہنشاہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔)

شہنشاہ ۔ دیز میرو مینن! امبالاگی میں میں نے اپنے عساکر کی خود قیادت کی اور اطالویوں سے چودہ مضبوط جنگی مورچوں پر قبضہ کر لیا میں نے ایڈیگریٹ کو دوبارہ فتح کیا اور اسمارا تک بڑھا جاتا۔ مگر تراتہ دیدکی پہاڑیوں میں مجھے غدارانِ وطن نے دھوکا دیا میں تب پر پانچ ہزار سپاہ نے جنگ سے انکار کر دیا (غصّہ کر) کاش مجھے کچھ اور وقت مل جاتا! مجلسِ اقوام ہمارے

معاملے کو غیر معمولی التوا میں ڈال رہی ہے! ظالم یورپ!
ظالم یورپ!! آہ حبش کا خونی گیسوں سے گلا گھونٹا گیا
اور مجلسِ اقوام کے حلق سے موثر آواز تک نہ نکلی ....
اسے ننگِ تمدن مجلس! حبش کا خون رنگ لائیگا! ع
جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا!

ملکہ۔ اے میرے بہادر شوہر! یورپ کو مسیح کی بد دعائیں بھسم کر دیں گی! ننگِ مسیحیت اقوام ضرور اپنے کئے کا بدلہ پائیں گی! آپ نے تو دلیری سے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آہ! اب ایک آخری فرض!!

شہنشاہ۔ کیا معزز حبش کے شہنشاہ کو مجلس اقوام کے در پر جا کر بھیک مانگنی پڑے گی؟

ملکہ۔ اگر اپنے پیارے وطن کے لئے یہ ذلت بھی گوارہ کرنی پڑے تو ہمارا وطن پرست شہنشاہ کبھی دریغ نہ کریگا!

شہنشاہ۔ اُف تکلیف دہ فرض!

ملکہ۔ پیارے! حبش کو طوائف الملوکی سے آپکے تدبر نے نجات دلائی اور آج بھی اتحادِ حبش کا ضامن کون ہے؟ صرف راس تفاری! اگر آپ کا بال بیکا ہوا تو پھر حبش کے ٹکڑے بٹ جائیں گے۔ اور اطالیہ کا راستہ صاف ہو جائیگا

(ایک پہرہ دار داخل ہوتا ہے)

پہرہ دار۔ (فوجی سلام کرتا ہے) اے شہنشاہِ معظم! راس سیوم اور راس نصیبو حاضری کی استدعا کرتے ہیں۔!

شہنشاہ۔ بلا لو انہیں!

(پہرہ دار چلا جاتا ہے۔ دونوں راس داخل ہوتے ہیں۔ اور فوجی سلام کرتے ہیں)

راس سیوم۔ شہنشاہ! جلدی کیجئے! جلدی! ساسابانہ کا مورچہ ٹوٹ چکا۔ لشکر تتر بتر ہو گیا! شہنشاہ! حضور کا غلام تا دمِ آخر آپ کی اطاعت کرتا رہے گا! میں جان پر کھیل کر مغربی علاقوں کی طرف رُخ کرتا ہوں

راس نصیبو۔ عالیجاہا! جنوبی محاذ بھی اطالویوں کے ہاتھ رہا! روسی طیاروں نے گھنٹوں مسلسل بمباری کی اور ہمارے بہادر سپاہی بے بسی کے عالم میں برباد ہو گئے!

شہنشاہ۔ میرے بہادر سردارو! کاش میں تمہارے دوش بدوش لڑ کر مر جاتا! (شہنشاہ کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں)

راس سیوم۔ اے بہادر شہنشاہ! حبش کی خاطر آپ اپنی جان بچائیے۔ ملک کے اندر آپ کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ قبائل کے لوگ علمِ بغاوت بلند کر چکے ہیں۔ سرحدات کے سردار اور امراء غداری پر تلے ہوتے ہیں۔ اور جان نثارانِ وطن و وفاداران سلطنت تباہ، برباد و بے خانماں ہو رہے ہیں!

ملکہ۔ میرے شہنشاہ! میں سب سامان مکمل کر چکی ہوں۔ میری خاطر! حبش کے لئے ادیس ابابا سے چلئے!

(ملکہ روتی ہوتی شہنشاہ کے قدموں پر گر جاتی ہے)

شہنشاہ (ملکہ کو اٹھاتا ہے) آہ! وزیرو! میں کہاں جاؤں؟ اے ظالم اطالیہ! اے حبش کے غدارو!

راس نصیبو۔ حضورِ والا! انگلینڈ تشریف لے جائیے اور وہاں کے مدبروں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال فرمایئے!

شہنشاہ - آہ! سب لاحاصل! فریب و مکر کی دنیا
خود غرض دولِ یورپ!

راس سیوم - اے ہمارے پیارے شہنشاہ! برطانیہ
اب اپنے مفاد کی خاطر اطالیہ کو حبش سے خارج
کرنے کی سعی کریگا۔ حضور والا! فرانس بھی برطانیہ کا
ہم خیال ہو گیا ہے۔ اے شہنشاہ! آپ وہاں جاکر
ایک آخری کوشش فرمائیں۔ بعد ازاں مناسب
موقعہ پر اپنی سلطنت میں تشریف لے آئیں قسم ہے
مسیح کی میں توپ سے اڑا دیا جانا پسند کروں گا
مگر اطالیہ کے وحشی درندوں کی اطاعت ہرگز قبول
نہ کرونگا۔!

شہنشاہ - (فکرمند) ہاں شاید اپنے مفاد کے لئے! اپنے
مفاد کے لئے! برطانیہ! برطانیہ! (تلخ طنزیہ لہجے میں)

ملکہ - شہنشاہ! شہنشاہ!! (ملکہ کی بڑی بڑی پُر اثر
آنکھیں سوال مجسم بنی ہوئی ہیں)

شہنشاہ - (سر جھکاتے ہوئے) اچھا! خدا حافظ!
حبش! حبش!!
(راس سیوم اور راس نصیبو سے باری باری گلے ملتے ہوئے)
میرے پیارے دوستو خدا حافظ! تیغ فرض! تیغ فرض!!
تمہارے سپرد! پیارا حبش تمہارے سپرد!....
(شہنشاہ کی آواز بھرا آتی ہے، ملکہ رونے لگتی ہے اور
دونوں راسوں کی آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں)

راس سیوم - شہنشاہ! خدا حافظ! ملکہ! مسیح کی ماں!

راس نصیبو - شہنشاہ خدا حافظ! ملکہ! مسیح کا رحم!

ملکہ - (روتے ہوئے) خدا... حا.... فظ!
(دونوں راس چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد
شہنشاہ اور ملکہ خاموش سر جھکاتے ہوئے
کمرے سے نکل جاتے ہیں) پردہ

منظر دوم

(محل کے پھاٹک پر۔ رات کا پچھلا پہر۔ کچھ ستارے
ڈوب رہے ہیں اور کچھ طلوع ہوتے ہیں شہنشاہ
حبش افراد خاندان کے ساتھ ملک چھوڑ رہے
ہیں سب لوگ حسرت سے در و دیوار پر نظر
کرتے ہیں)

شہنشاہ - (سیاہ لبادے میں پہرہ دار سے) محل کو وقف
عام کردو (روتے ہوئے پلٹ کر پہرہ دار سے رخصت
ہوتا ہے) میرا ملک! پیارا حبش! رخصت! خدا
حافظ! رخصت!
(سب لوگ سر جھکائے رات کی تاریکی میں غائب
ہو جاتے ہیں۔ ادیس ابابا کا اداس ویران شہر
سائیں سائیں کر رہا ہے۔ وسط آسمان سے
ایک روشن ستارہ ٹوٹ کر گرتا ہے) پردہ

منظر سوم

(جینوا، مجلس اقوام کے اجلاس کا وسیع کمرہ
(۵۰) پچاس ممالک کے مندوبین بے اطمینان
خاموشی کے عالم میں منتظر بیٹھے ہیں گھبرائے

ہوتے، حراساں۔ فضا بالکل ساکت و سنجیدہ ہے۔ اسی گمبھیرتے میں شہنشاہ حبش جسے شکل سے اپنے ملک کی نیابت کا موقعہ دیا گیا ہے، سیاہ، بڑی بڑی غمگیں آنکھوں کے ساتھ اداس، مگر جذبات کو دبائے ہوئے، زخم خوردہ داخل ہوتا ہے۔ ایک مجلس کا راہ نما اسے تقریر مقام پر پہنچا دیتا ہے شہنشاہ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے)

صدر مجلس (اشارے سے شہنشاہ تقریر شروع کرنے کو عرض کرتا ہے)

شہنشاہ۔ (تقریر کرنے کو کھڑا ہوتا ہے) صاحب صدر! ومعزز مندوبین!

آوازیں۔ میاؤں! میاؤں! میاؤں!... شو او ادا! ہٹو اُدھر ٹو دہٹ! ٹو وہو! شی! شی! شی! شی!

(شہنشاہ کے ابتدائی کلمات اسی شور میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں۔ ناقابل برداشت سکوت ٹوٹ جاتا ہے۔ سب نگاہیں جواب تک شہنشاہ کی طرف گڑی ہوئی تھیں، یک بیک تیزی سے پریس گیلری کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ سب لوگ شور کناں چند اطالوی صحافیوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں)

مختلف آوازیں۔ بہت بُرا!... ناشائستہ حرکت! اخراج! اخراج!... ہوں! ہوں! ہوں!... بدتمیزی انتہائی بدتمیزی! ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا... (لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے پہلو بدلنے لگتے ہیں)

صدر مجلس۔ (فی الفور اُٹھتے ہوئے) محافظو! مجرموں کو ابھی نکالو (ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ **محافظین** فوراً موقعۂ واردات پر پہنچکر آٹھ اطالوی صحافیوں کو پکڑ کر کمرہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ اس سانحہ نے مہر خاموشی کو پراثر طور پر توڑ دیا ہے اور ساری مجلس کے بشرے سے ذرہ اطمینان ظاہر ہونے لگا ہے)

آوازیں۔ پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ.....

(تھپڑیاں) ہُرا! ہُرا! شہنشاہ حبش زندہ باد!

صاحب صدر۔ شہنشاہِ معظم! آپ تقریر جاری فرمائیں!

شہنشاہ۔ (کھڑے ہوکر) صاحب صدر، ومعزز حاضرین!

(مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتا ہے۔ ہر مندوب کے پاس آلہ صوت رکھا ہے) غلامی اور بربریت کے ملک کا بادشاہ آپ لوگوں کے سامنے یہ بتلانے کے لئے آیا ہے کہ قدیم سلطنت روما کے متمدن وارثوں نے کس طرح زہریلی گیسوں سے اپنی شاندار و قابل فخر تہذیب کی تبلیغ ہمارے دیار و امصار میں کی ہے (آہستہ آہستہ ارادی تلخ نوائی کے ساتھ) پُرامن شہروں، بے آزار کشت زاروں اور بدقسمت شفاخانوں پر طیاروں نے ثقافتِ روما کے روشن شعلے برساتے! یہ حبشی اور جاہل حبش مدعیانِ تمدن و تہذیب کے اس اندازِ مفتخر کی داد، اپنی کم مائیگی کے سبب نہیں دے سکتا۔ زیادہ ترقی یافتہ ممالک شائد ہم سے بہتر طور پر اس ہدیہ کی قدر کر سکیں:—

میں مجلس اقوام کا صد درجہ ممنون ہوں کہ اُس نے آڑے وقت میں ہماری خاطر خواہ امداد کی! تعزیرات کے نفاذ کا اعلان کیا کم شکریہ کا مستحق ہے؟ تین یورپی ممالک نے غالباً اس خیال سے تعزیرات پر عمل نہیں کیا کہ کہیں تہذیب و ثقافت کی پرچار میں روک نہ بن جائیں۔ اور بے چارہ حبش برکات تمدن سے محروم نہ رہ جائے۔ دوسرے ممالک نے تعزیرات کو جاری کرنیکی غلطی تو کی، مگر انہیں بھی جلد ہی ہوش آگیا مجلسِ اقوام کے اصول و دفعات سے وابستگی کا اعلان بلند بانگ تو ہوتا رہا۔ مگر وہ رہینِ عمل کبھی نہ بن سکے۔ اور بنتے بھی کیوں؟ آخر یہ اصول و ضوابط یورپ میں امن و صلح برقرار رکھنے کے لئے ہی تو ہیں۔

ڈیجیبوٹی ریلوے کا استعمال حبش کے لئے تو ممنوع قرار پایا (شہنشاہ کی آواز تیز اور تلخ تر ہو جاتی ہے) مگر آج وہ عساکرِ اطالیہ کے قتل و غارت کو سہل و وسیع الاثر بنانے کے لئے کھلی چھوڑ دی گئی ہے! کہاں ہے مجلسِ اقوام کے قوانین کا دفعہ نمبر ۱۶ ؟ کہاں ہے؟ (کوئی جواب نہیں۔ ایک مکمل، بے چین سکوت ہال پر طاری ہے) آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ صرف حبش کا مسئلہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر فساد و ظلم کی تمہید ہے۔ میں چھوٹی قوموں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کھڑا ہوا ہوں (آواز تیز تر ہوتی جاتی ہے) میں بین الاقوامی استحفاظ کا نمائندہ ہوں۔ کیا بین الاقوامی مجلس ایک بین الاقوامی مسئلہ کو یونہی تشنہ چھوڑ کر اپنی موت کا اعلان کر دے گی؟ کیا بین الاقوامی اخلاقیات کا جنازہ نکل چکا؟ (مکمل خاموشی) کیا دنیا پر شیطان کی حکومت کا اعلان عام ہو گیا؟ کیا اہرمن نے یزداں کو شکست فاش دیدی؟ کیا ابلیس اب کوسِ انا و لاغیری بجانے کے لئے آزاد ہے؟ اور کیا مجلس اقوام بھی قعرِ زندانِ تاریکی کے حریص و ظالم چنگل میں ایک دم توڑتا، سسکتا ہوا آخری چراغ ہے؟ (ساری مجلس شرمندگی اور سکتے میں ڈوبی ہوئی ہے) —— تبلایئے! میں اپنی مظلوم رعایا کے پاس کیا جواب لیکر واپس جاؤں؟ (ایک گہری خاموشی ہے جواب میں سب کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ ایک پُر معنی وقفہ)

آوازیں (وقفہ کے بعد) ہُرّا! ہُرّا! شہنشاہِ حبش ہُرّا! مرحبا! مرحبا! پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ (تالیاں)

شاد باش! شاد باش! شہنشاہ حبش زندہ باد-!

(شہنشاہ آہستہ آہستہ ہال سے باہر جانے لگتا ہے۔ چہرہ تمتماتا ہوا، نگاہیں گرمائی ہوئی،

آوازیں۔ پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ! (تالیاں) زندہ باد شاباش! شاد باش! شہنشاہ کی عمر دراز!

خاموشی

(پردہ)

جناب اختر انصاری۔ بی۔ اے بی ٹی۔

غزل

وہ دن بھی تھے کہ میں آلودۂ شراب نہ تھا خراب تھا مگر اتنا کبھی خراب نہ تھا

خدا کے واسطے، پھر کیوں نہ مل سکیں نظریں یہ دل کی چاہ تو ایسا کوئی حجاب نہ تھا

مرے ارادے نہایت بلند تھے یعنی کبھی میں اپنے ارادوں میں کامیاب نہ تھا

نگاہِ ناز سے ہوتا تھا جان کا سودا کوئی سوال نہ تھا اور کوئی جواب نہ تھا

جواں ہوئی تھی محبت کی آرزو در اصل

مرا شباب بھی اختر مرا شباب نہ تھا

رباعی

اب وطن ہند ہوں اور ہندی ہوں

نسل آدم ہوں اور انساں ہوں

ہندو ہوں نہ سکھ ہوں نہ مسلماں ہوں میں

صد شکر کہ غلطاں نہ طوفاں ہوں میں

جوش ملیح آبادی

جناب احمد ندیم قاسمی بی۔ اے۔

ہرجائی

جمعرات کو مجھے اس کھیت کو ہاتھ لگانا تھا جو ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ گاڑی کی ہر وقت کی آمد و رفت سے وہاں تھکے ہاروں کا دل قدرتاً بہلا رہتا ہے۔ میں بدھ کو سویا۔ تو آدھی رات کو ہی آنکھ کھل گئی۔ کروٹیں لیں۔ آنکھیں زور سے بھینچیں۔ اُٹھ بیٹھا۔ لیٹ گیا۔ گھٹنے چھاتی سے لگائے۔ پاؤں پھیلا دیئے۔ مگر نیند عنقا تھی۔ یہ نیند کیا چیز ہے؟ میں نے سوچا۔ یہی۔ سکون۔ اطمینانِ قلب۔ لیکن رونے والے بھی تو سو جاتے ہیں! پھر نیند کیا ہے؟ انہیں وقتی الجھنوں میں مشرق سے پو پھٹنے کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک مبہم سا نور ایک بے نام سا دھندلکا افق کے ساتھ ساتھ ابھرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے درانتی ہاتھ میں لی۔ رسی کمر سے لپیٹی۔ پانی کا ایک پیالہ پیا اور ہولے ہولے اپنے دیہاتی گیت گنگناتا ہوا گاؤں سے باہر نکل گیا۔

اوس سے بھیگے ہوئے پودے یوں جھکے ہوئے تھے جیسے مراقبے میں ہیں۔ گھاس نکھری نکھری تھی۔ نم آلود مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ اپنے لئے نئے بہشت ایجاد کر رہا تھا۔ مستقبل کی تاریکیاں خیالی مسرت کی ہلکی ہلکی کرنوں سے آہستہ آہستہ دور ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ آسمان کی لامحدود وسعت افق کی لاانتہائی۔ سبزہ زاروں کا بے پناہ پھیلاؤ۔ میری پھڑ پھڑاتی ہوئی مضطرب اور بے قرار روح کے لئے حبس ثابت ہو رہے تھے۔ میں کہیں اُچھلنا چاہتا تھا۔ سامنے شفق کی بوقلموں رنگوں والی آسمانی وادیوں میں سما جانا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسکرانا چاہتا تھا۔ اور غم؟ — غم مجھے انسانی زندگی کے کلیجے میں ایک کانٹے کی طرح معلوم ہو رہا تھا — اور یہ غم کرنے والے لوگ؟ — مسرتوں اور بشاشتوں کے سنہرے ناموں پر بدنما دھبے — رومان اور ارضی خلد زاروں کے شفاف ماتھوں پر کلنک کے ٹیکے! — یہ لوگ [illegible] نہ تھے — میں سوچ رہا تھا — سوچ رہا تھا — یہ کھیت جن میں اُگے ہوئے پودوں کے زرد خوشے سرنہوڑائے زمین کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ درخت جن کی فلک بوس چوٹیوں پر چیلوں کے گھونسلے منہ کھولے آسمانوں کو گھور رہے ہیں۔ یہ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں جن کی چھاتیاں صدیوں سے روندے جانے کے باوجود اُبھری پڑی تھیں — میری مسرت کی اٹکھیلیوں اور میرے جذبۂ انبساط کی آسمان پیمائیوں کے لئے یہ دنیا ہے — کوئی اور دنیا چاہئے تھی میرے لئے — کوئی نئی دنیا جہاں رنگ ہوتے۔ راگ ہوتے۔ حُسن ہوتا۔ عشق ہوتا — شاداب عشق — یہ

تلخ کام عشق نہیں جس کی قسمت میں آنسوؤں اور آہوں کے سوا ایک حرف بھی نہیں! ——— میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے درانتی سے دس بارہ پودے کاٹ کر دور پھینک دیئے۔ بسنرے کو نوچ کر ہوا میں اڑا دیا۔ پگڈنڈی کو چھوڑ کر اور راستے پر چلنے لگا۔ گھونسلوں پر پتھر پھینکے۔ چیلیں پھڑپھڑاتی ہوئی دھندلی فضا میں تیرنے لگیں۔ اور میں خوشی سے ناچتا کودتا ہوا ریل کی پٹڑی کے قریب چلا گیا۔

کھیت کے پاس پہنچکر میں نے کمر سے رسی کھولی۔ لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ درانتی کے چمکتے ہوئے دندانوں کی طرف دیکھا۔ اور یہ دلنواز گیت الاپتے ہوئے جوار کاٹنے لگا۔ ع

اساں نال سجن دے لایاں اکھیاں رنگ بھریاں

ننھے ننھے سبز رنگ کے کیڑے پتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے بھیگی بھیگی زمین پر عجیب الخلقت چیزیں رینگ رہی تھیں۔ یکایک میرے کانوں میں گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔ اور اُٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ مغرب کی طرف افق کے پاس دھوئیں کا ایک مرغولہ ہوا میں بل کھاتا ہوا معلوم ہوا۔ اور پھر کالے کالے انجن کی ابھری ہوئی چھاتی ماتھے میں ایک سفید چمکتی ہوئی آنکھ۔ ہوا میں لہراتی ہوئی زلفیں ——— زمانۂ قدیم کی داستانوں کا دیو جو زمین کے سینے کو تاڑتا ہوا دھاڑتا ہوا بڑھا آرہا تھا! دھم دھپ دھم دھپ ——— گاڑی بہت نزدیک آگئی۔ ڈرائیور نے اپنا سر باہر نکالا۔ کالا منہ۔ سفید دانت۔ اڑتے ہوئے بال اور میلے ہاتھ ——— بے چارہ محنت کرنے والا مزدور ———

پھر چھکڑے ۔ ایک انگریز۔ ایک میم چھاتی کے ساتھ کتا لگا ہوا اور پھر ایک ہندوستانی صاحب۔ موٹا سا سگار بوڑھی خاتون ۔ اخبار کا پھڑ پھڑاتا ہوا پرچہ اور پھر ایک دہقان پاس ہی کانپتا ہوا حقہ۔ ایک دہقانی عورت۔ دو بچے ——— میری نظر نہ جم سکی۔ یکایک میرے پاس آم کی ایک گٹھلی آ گری۔ اور پھر ایک کمرے میں ایک بچہ سفید سفید باہوں کی طرف بھاگتا ہوا معلوم ہوا ——— میرے ساتھ مذاق کیا تھا کمبخت نے! ——— یہ ریل بھی کیا عجیب ایجاد ہے ولایت والوں کی! پل بھر میں دھوئیں کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا میں سوچنے لگا۔ یہ صاحب لوگ اور یہ ہندوستانی بزرگ اور یہ دہقان۔ یہ اکھٹے ایک کمرے میں کیوں نہ بیٹھے ——— دہقان بھی انسان تھا آخر! ——— وہ نرم نرم گدیلوں اور ٹھنڈے ٹھنڈے پنکھوں کے نیچے کیوں نہ بیٹھ سکا؟ صاحب کو بدبو آتی ہے۔ اس کے کپڑوں سے؟ کیا صاحب کو متعفن شراب، غلیظ سگار اور بدبو دار سگرٹ سے نفرت نہیں ہوتی؟ نہیں! ——— انسانوں کو انسانوں سے نفرت کیوں ہے؟ دہقان کے پاس پیسہ نہیں! اور صاحب کی جیب میں چاندی ہے۔ پیسہ! ——— پیسے کی دنیا ——— مگر مجھے کیا ——— مجھے کیا؟ ——— میں نے سوچا ——— آخر مجھے کیا؟ میں درانتی ہاتھ میں گھماتا ہوا کھیت کی جانب بڑھا۔

"او بھائی" ایک باریک سی آواز آئی۔ اور میں نے پلٹ کر پٹڑی کے اس پار دیکھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ مجھے کس نے بلایا تھا؟ "او بھائی، ادھر آنا ذرا!" اور سامنے کھیت

سے ایک لڑکی کا سر نمودار ہوا۔ سر کھلا تھا۔ اور رنگ نکھرا نکھرا۔ بس ـــــ دور کی وجہ سے میں اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں نے درانتی کٹی ہوئی جوار پر پھینک دی۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا پٹڑی کو عبور کر کے کھیت کی جانب بڑھا۔

لڑکی جوار کو رسی سے باندھ رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کے بال جن میں سنہری رنگ کی بہت ہلکی سی جھلک تھی۔ جوار کے شبنم آلود پتوں کو چھو رہے تھے۔ کالا کرتا اور کالا تہبند۔ میرے دل میں کوئی خیال نہ آیا۔ کوئی چبھن نہ اٹھی۔ ایسے واقعات مجھے کئی بار پیش آچکے تھے۔ جوار اُٹھا کر اس کے سر پر رکھنی ہوگی۔ ایک جوان لڑکے سے اور کیا کام ہوسکتا ہے؟

"کیا کام ہے؟" میں نے نزدیک جا کر پوچھا۔

"ذرا یہ جوار میرے سر پر رکھدو" لڑکی نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اُف کتنی خوشگوار گھڑی تھی۔ جب میں نے اُس لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ ابھرا ہوا ماتھا۔ ستواں ناک۔ نازک نازک باریک باریک سُرخ سُرخ لب۔ لبوں کے کناروں پر بہت ہی خفیف سیاہی، اور آنکھیں؟ ـــــ جیسے اُن میں سے مستیوں کے چشمے چھلک پڑیں گے! انچ انچ بھر بڑھی اور گھنی پلکیں۔ نچلے ہونٹ کے عین نیچے کھچی ہوئی ٹھوڑی کے حسین گڑھے کے کنارے پر ایک گول سیاہ تل ـــــ وہ مسکرائی اور اُسکے چہرے پر خفیف گول لہروں کے نشانات ابھر آئے!

"کیا مدد دوگے مجھے؟"

اور مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میں ایک غیر لڑکی کو دیوانوں کی طرح گھور رہا تھا۔

"ضرور" میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ میرے تمام جسم کو نیند سی آگئی تھی۔ میں نے جوار پر ہاتھ رکھا۔ بازوؤں کی طاقت کدھر گئی تھی؟ شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اس لڑکی کے سامنے! میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ گلا صاف کیا۔ اور پھر جھکا اور لڑکی بھی جھکی۔ اسکا چہرہ جوار کے پتوں میں ڈوب گیا۔ کتنی بے پرواہی لڑکی تھی! ـــــ اُسے اپنے ملائم اور گداز چہرے کی رعنائی کا احساس تک نہیں! اور اگر اُس کے عارض پہ کوئی خراش پڑجائے تو؟ قدرت کو شرمندہ ہونا پڑیگا۔!

میں نے ایک جھٹکے سے جوار اُس کے سر پر رکھدی اس کے قدم دو ایک دفعہ ڈگمگائے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"یہ درانتی بھی کہیں اٹکا دو" میں نے درانتی رسی کے ساتھ اٹکا دی۔ وہ دو قدم چلی "کہاں جاؤگے؟" اُس نے رُک کر پوچھا۔

"سامنے کو ٹانڈ میں"

"جوار کاٹ لی ہے کیا؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ یہ جھوٹ تھا۔ میری جوار ابھی میرے بیلوں کے لئے ناکافی تھی۔

"تو چلو مجھے بھی ادھر جانا ہے۔"

کتنا اچھا تھا خدا! اتنا اچھا! اتنا مہربان! اور اس کی یہ پیاری زمین جس پر یہ لڑکی کھڑی تھی۔ کتنی پیاری۔ کتنی رسیلی زمین! میں سرپٹ دوڑا۔ آن کی آن میں جوار اٹھا کر سر پر رکھی اور لڑکی کے ساتھ چلنے لگا۔ میرے جسم میں عجیب سی گرمی آگئی تھی۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ آنکھیں جل رہی تھیں ہونٹ جل رہے تھے۔ یہ آگ کیسی ہے؟ اور لڑکی کے تیزی

سے اُٹھتے ہوئے قدم —— انہیں چوم لینے کو جی کیوں چاہتا ہے۔ ہو رہا ہے؟ "خاص کوٹالہ کے رہنے والے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"خاص کوٹالہ کا" میں نے جواب دیا۔ باتونی لڑکی ہیں نے سوچا۔ لڑکیاں تو بہت کم گو ہوتی ہیں!

دس بارہ قدم ہم دونوں خاموش رہے۔ آخر میں نے پوچھا۔

"تمہارا گاؤں کونسا ہے؟"

"ہے تو کوٹالہ ہی۔ مگر والد گاؤں چھوڑ کر باہر آ بسا ہے زمینیں دور ہیں........ وہ سامنے دو مکان نظر آ رہے ہیں نا۔ وہ ہمارے ہی ہیں"

"اچھا۔ تو پھر یہ مکان تو شاید راستے ہی میں پڑتے ہیں"

"ہاں۔ تم صبح وہیں سے گزرے تھے؟"

"ہاں"

"میں نے تو نہیں دیکھا تھا تمہیں"

"اتفاق کی بات ہے"

پھر خاموشی چھا گئی۔

"کل بھی آؤ گے؟" اس نے پوچھا

"روزانہ آیا کرتا ہوں"

"ادھر ہی؟"

"ہاں ادھر ہی"

"تو میں تمہارا انتظار کیا کروں گی"

مسرت کے جوش میں بڑی مشکل سے میرے منہ سے "اچھا" نکلا۔ اور میں نے سمجھا میرے قدم زمین پر نہیں پڑتے ہوا میں تھرک رہے ہیں میں نے جانا یہ دنیا میرے لئے بنی ہے

یہ کائنات میری ہے۔ میرے لئے ہے۔ میرے اور اس لڑکی کے لئے۔

"بہت تھوڑی جوار کاٹی ہے تم نے" اُس نے پھر پوچھا

"ہاں"

"کتنے جانور ہیں؟"

"چار بیل ہیں"

"گائے وائے؟"

"کچھ نہیں"

"کیوں؟"

"ایک تھی۔ مرگئی بے چاری پچھلے مہینے"

"دودھ چھاچھ کی تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی؟"

"بہت"

پھر خاموشی چھا گئی۔ اور اُس کا مکان قریب آیا۔ تو اُس نے میری طرف مڑکر کہا۔ "صبح یہاں سے گزرتے وقت چھاچھ پی جایا کرو۔ سمجھے؟"

اور...... جلدی۔ میں نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا میں آگے بڑھنا نہ چاہتا تھا۔ میں وہیں بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ میری دُنیا سمٹ سمٹا کر اُس دالان میں جمع ہوگئی تھی۔ جہاں اُس نے اب جوار پھینک دی تھی۔ لیکن میرا چلے آنا تو ضروری تھا۔ گاؤں سامنے تھا۔ مگر ہر قدم پر ایک صحرائے لق و دق کا گمان ہوتا تھا۔ گاؤں سے نکلتے وقت جو خیالات تھے۔ وہ یک قلم نابود ہوگئے۔ کائنات میرے لئے وسیع ہوگئی۔ ہر شے میں حُسن جھلکنے لگا۔ اور غم؟ —— غم کی چبھن سے دل لذت سی محسوس ہو رہی تھی۔ طبع انسانی بھی رنگ بدلنے پر

کتنی تیزی سے کام لیتی ہے! اس لڑکی نے کیا قیامت ڈھائی ہے مجھ پر! میں حیران تھا! اُس لڑکی کی پہلی ملاقات میں مجھے حیرت کے سوا ملا ہی کیا تھا! حیرت اور استعجاب! بس! ———

آخر میں اپنے گاؤں میں پہنچا۔ جوار تھوڑی تھوڑی کر کے ہر ایک بیل کے آگے ڈالدی۔ وہ پیٹ بھر کر کھانے والے سر اٹھا کر میرا منہ دیکھنے لگے۔ مگر میں گھاٹ پر لیٹا ہوا اڑتی ہوئی چڑیوں کے سفید سینوں۔ بیری کے سبز پتوں اور سامنے دیوار میں چمکتے ہوئے مٹی کے ذرّوں میں ایک پیکرِ رعنا دیکھ رہا تھا جس کے سر پر جوار تھی جس کی آنکھوں میں نشے تھے۔ اور زبان پر مختصر میٹھی میٹھی باتیں!

ساری رات نیند نہ آئی۔ اور آتی کیسے جب تصورات اور خیالات کے طوفان نے دماغ کی بنیادیں ڈھیلی کر دی تھیں میری آنکھوں سے دو چار آنسو بھی گرے۔ اور جب وہ میرے رخساروں پر بہتے ہوئے میرے ہونٹوں کے کناروں پر آ کر رُکے اور پھر کانوں کی طرف لڑھک گئے تو میں مسرت و غم کے امتزاج سے مجبور ہو کر چیخ اُٹھا میں نے دعا مانگی۔ کہ الٰہی! یہ آنسو میرے رخسار پر ہمیشہ ہمیشہ بہتے رہیں۔ میری آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ اشکبار رہیں۔ میرا سینہ جلتا رہے۔ مجھے نیند نہ آئے۔ میں تا زیست جاگا کروں" اگر کوئی ذی عقل میری یہ باتیں سن لیتا تو یقیناً مجھے دیوانہ کہتا۔ لیکن میں تو خود اپنے خیالات سے باغی ہو گیا تھا! میں صبح کو کیا تھا۔ اور شام کو کیا ہو گیا تھا! بے چارے بیل سوتے سوتے چونک پڑے۔ اور میری طرف گردن اٹھا کر دیکھنے لگے وہ حیران تھے کہ اُن کے مالک کو آج کیا ہو گیا ہے۔ کہ نہ خود [illegible]

بھی کھڑا ہوا۔ کان سیدھے کر کے مجھے گھورنے لگا۔ اور زور زور سے سانس لینے لگا۔ بے چارا بے زبان دوست۔ وہ کیا جانے کہ محبت کیا بلا ہوتی ہے۔ محبت؟ کیا مجھے محبت ہو گئی تھی! اُس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی! یہ افسانہ بھی حقیقت بن چلا؟ اسکا ذکر تو جھوٹی داستانوں کے لئے ہی مخصوص تھا یہ تو قصوں کا ایک جزو تھی ——— بھٹکے ہوئے جوانوں کا ایک مشغلہ۔ مگر مجھے تو اس میں سچائیاں نظر آتی تھیں۔ سچائیاں۔ بے عیبیاں اور قدسیانہ پاکیزگیاں۔!

میں گجر دم اٹھا۔ ہاتھ منہ دھویا۔ درانتی ہاتھ میں لے بجلی کی سی تیزی سے باہر آیا۔ اور اُڑتا ہوا اُلڑکی کے مکان کے قریب پہنچا۔ وہ ایک کونے سے مجھے جھانک رہی تھی۔ وہی چہرہ! ——— میں اپنے آپ پر رشک کرنے لگا۔ جب میں دالان کے پاس سے گزرا۔ تو لڑکی ایلومونیم کا ایک بھرا سا پیالہ اٹھائے میری طرف آ رہی تھی۔

" آ گئے تم؟" اور پیچھے مڑ کر کہا: اماں یہ ہے وہ لڑکا!"

" اچھا" ایک بڑھیا دودھ بلو رہی تھی۔ " روزانہ چھاچھ پی جایا کرو بیٹا۔ تیرا اپنا گھر ہے۔ غریب تو آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔"

" اور امیر؟" میں نے دل میں کہا " امیر آپس میں دشمن ہوتے ہیں کیا! سچ کہا ہے بڑھیا نے۔ واقعی دشمن ہوتے ہیں۔"

" بہت اچھا بڑھی اماں" میں نے جواب دیا۔ اور لڑکی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔ پہلا گھونٹ پیا۔ ہیں! یہ تو میٹھا تھا! کہیں دھوکا تو نہیں ہوا! دوسرا گھونٹ پیا۔ واقعی میٹھا تھا۔ میں نے ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا۔ مگر حسین لڑکی کی سفید تتلی

انگلی اُس کے نازک ہونٹوں پر پیوست ہوگئی۔ اور آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ میں سارا پیالہ پی گیا۔ اس کے بعد اُس نے درانتی ہاتھ میں لی۔ رسی کاندھے پر ڈالی اور میرے ساتھ چل پڑی۔

——— اور اس طرح پانچ دن گذر گئے!

ہم راستے میں بہت کم باتیں کہتے تھے۔ بس میں جوار اُس کے سر پر رکھدیتا۔ وہ آگے آگے چلنے لگتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ پوچھ لیتی تھی۔

"ماں ہے؟"

"کتنے بھائی ہو؟"

"پانی تالاب کا پیتے ہو یا کوئیں کا؟"

"زمین کتنی ہے؟"

"کما سکتے ہو؟" ——— اور اس سوال نے تو مجھے تذبذب میں ڈالدیا۔ یہ سوال تو اُسے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اُسے حیا مانع نہیں ہوئی! اور ایک دن تو اُس نے مجھ سے یہ بھی پوچھ لیا۔

"جوار ختم ہوگئی تو اِدھر نہ آیا کرو گے؟"

"آیا کروں گا" میں نے کہا۔

"آیا کرنا" ——— اور کچھ قدم چل کر اُس نے یہ الفاظ یوں کہے۔ جیسے میں نہیں سن رہا "ضرور آیا کرنا!" ———

اور میرا دل دھک سے تڑپا اور حلق تک اچھل گیا۔

چھٹے دن میں نے جوار کاٹ کر پٹڑی کے اُس پار دیکھا تو وہی لڑکی ایک خوش پوش نوجوان سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر وہی نوجوان جوار اُٹھاکر اُس کے سر پر دھرنے لگا۔ اُس کے ہاتھوں نے لڑکی کے ہاتھوں کو ضرور چھوا ہوگا۔ یہ کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ——— لڑکی ایسا کیوں کرنے لگی؟ ——— یہ تو ہرجائی معلوم ہوتی ہے! ——— ہر ایک سے محبت؟ ——— ہر ایک سے پیار؟ ——— اتنی چنچل۔ اتنی شوخ۔ ہر راہگیر سے کھٹ کھٹ دو باتیں کرے؟ ——— مگر شاید وہ ہر ایک سے اسی طرح پیش آتی ہے۔ جس طرح مجھ سے! ——— شاید میں بھی اُس کے لئے ایک معمولی جان پہچان کا ہم پیشہ چھوکرا ہوں! میں غصے سے بیتاب ہوگیا۔ وہ میرے قریب آئی اور بولی۔

"چلو"

میں نے جوار سر پر رکھی۔ اور چل پڑا۔ کچھ دور جاکر وہ بولی "آج خاموش کیوں ہو؟"

"بس یونہی" میں نے دل کے شعلوں کو ایک لمبی آہ تلے دبائے ہوئے کہا۔

کچھ وقفے کے بعد وہ پھر بولی "یہ نوجوان دیکھا تھا تم نے؟ اس کا باپ میرے باپ کا بڑا دوست تھا۔ مرگیا ہے بیچارہ اب تو"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"اسی نے"

اور میرے شکوک اور بڑھ گئے۔ باپ دوست تھا۔ تو بیٹا بھی اُس کا دوست ہوتا۔ تیز ارادے سے کیوں ہونے لگا۔ مکان قریب آگیا۔

"اچھا خدا حافظ" اُس نے مڑکر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور میں نے غم و غصہ کے احساسات کو ضبط کرتے ہوئے

کہا "خدا حافظ" مگر اُس کی آنکھوں میں میں نے تفکرات
کی ایک لہر دوڑتی دیکھی۔ اُس نے جوار دالان میں پھینکی۔
میں نے اُسے دیکھا تو وہ مُنہ کھولے مجھے مظلوم ہرنی کی طرح
گھور رہی تھی۔ میں بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ ہرجائی
تو نے میری اوّلین محبت کا ستیاناس کر دیا!

دوسرے دن میں اُس کے مکان سے بہت پرے
چکر کاٹ کر پٹڑی پر پہنچا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کب آئی۔ اور
کب اُس نے جوار کاٹی۔ میں تیار ہو رہا تھا۔ کہ اُس کی آواز آئی۔

"اِدھر آنا ذرا!"

"اس نوجوان کو آج بھی بلا لے" میرے دل نے آواز
دی۔ مگر میں آگے بڑھا۔ جوار اس کے سر پر رکھ دی۔ پھر آکر
اپنا گٹھا اٹھایا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جاتے جاتے
وہ اچانک مڑ کر مجھے گھورنے لگی۔ اس کی مدھری آنکھوں کے
سرمگیں کناروں پر پانی کے دو موٹے موٹے قطرے کانپ
رہے تھے۔ اُس کے عارض پر سرخی سی چھا رہی تھی۔ اُس
کے ابرو اُس کی پلکوں کو چھو رہے تھے۔!

"تم نے آج چھاچھ نہیں پی؟" اُس کی آواز میں فریاد
تھی۔

"نہیں"

"کیوں؟"

"پانی پی لیا تھا گھر سے؟"

آنسو اس کے رخساروں پر بہ نکلے۔ ہرجائی۔ ہرجائی
میرے دماغ میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔ یہ آنسو جھوٹے ہیں
میرے دل نے پکارا۔ یہ ظاہرداری ہے ظاہرداری۔

"کل تو پیو گے نا؟" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا

"اگر پانی پی کر نہ آیا"

اس کے بعد وہ مڑی۔ اور اس قدر تیزی سے چلنے
لگی۔ کہ میرا اس کے ساتھ چلنا دشوار ہو گیا۔ اور جب وہ گھر
پہنچی تو جوار دور پھینک دوڑ کر مکان کے اندر گھس گئی میرا دل
قدرے کانپا۔ میرا قدم قدرے رُکا۔ میرا ماتھا قدرے ٹھنکا
مگر ــــ مگر وہ کل والا جوان۔ اُس سے اِسے کیا تعلق؟

میں گھر آیا۔ تمام رات وہ لڑکی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں
سے میرا تعاقب کرتی رہی۔ اور جب صبح میں اُٹھا۔ تو ماں میرے
سرہانے کھڑی تھی

"اُٹھو چھاچھ پی لو۔ اور جاؤ۔"

"کہاں سے آئی ہے چھاچھ؟" میں نے تعجب سے
پوچھا۔

"ایک لڑکی لے آئی ہے۔ ابھی ابھی۔ شاید تم نے ہی
کہا تھا اُسے"

میں نے چھاچھ پی لی۔ اور جب درانتی کاندھے پر رکھے
رسی ہاتھ میں لٹکائے اُس کے مکان کے قریب سے گزرا۔
تو وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ اور
آنکھیں جھکالیں۔

"چلوگی؟" میں نے پوچھا۔

"چھاچھ تو پی لو۔"

میں مسکرایا۔ اُس کے محزون چہرے پر مسرت کی گلابیاں
دوڑ گئیں۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی۔

"[illegible]"

"چھاچھ"

"چھاچھ؟" اُس نے میری طرف ایسی نظروں سے
دیکھا۔ جیسے وہ مجھے اپنے اندر ڈبولیں گی۔
اور جب ہم جوار اٹھائے واپس آرہے تھے۔ تو
اُس نے کہا۔

"تم ناراض ہو گئے تھے؟"

"ہاں۔ میں سمجھا۔ تم ہرجائی ہو" — مجھے اچانک
احساس ہؤا کہ یہ لفظ مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔
اُس نے غصے سے جوار دور پھینک دی۔ اور سینہ
تانے ہوئے میری طرف بڑھی۔

"مجھے پھر تو ایسا نہ کہو گے؟"

"نہیں۔ پھر نہیں کہوں گا" — اور واقعی میں
پھر اُسے ایسا نہ کہنا چاہتا تھا۔

ہم کتنی جلدی ناراض ہوتے تھے۔ اور کتنی جلدی من
گئے تھے۔ چھاچھ کے ایک پیالے سے میرا نصیبا جاگ اُٹھا۔

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں میرے ہاتھ
پر ہاتھ رکھا مسکرائی۔ اور جانے کتنی دیر تک مسکراتی رہی۔
اور آج — آج جبکہ ان واقعات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے
وہ میری راتوں اور دنوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ
بنکر چھائی ہوئی ہے۔ وہ میری ملکہ ہے۔ میرے گھر کی ملکہ میری
ساری کائنات کی ملکہ! — وہ حسین معصوم بھولی لڑکی
— وہ "ہرجائی" ساحرہ!

غزل

جناب گوپال متل بی۔ اے
مدیر معاون شاہکار

فراق و وصل کی حد سے گزر چکا ہوں میں
ترے خیال کی دنیا میں کھو گیا ہوں میں

زبان رقص میں ہے اور جھومتا ہوں میں
کہ داستانِ محبت سُنا رہا ہوں میں

نہ پوچھ مجھ سے مری بے خودی کا افسانہ
کسی کی مست نگاہی کا ماجرا ہوں میں

تمہارے عشق میں مٹ کر تمہیں دکھا دونگا
نگاہِ ناز کا ایما سمجھ گیا ہوں میں

کہاں کا جذب محبت کہاں کی تاثیر۔ بس
تسلیاں دلِ مضطر کو دے رہا ہوں میں

اب آ دبھی کہ نہیں تابِ انتظار مجھے
بہت فراق کے صدمے اُٹھا چکا ہوں میں

پھر ایک شعلہ پر پیچ و تاب بھڑکے گا
کہ چند تنکوں کو ترتیب دے رہا ہوں میں

فضائے ذوقِ نظر جلوہ زار ہے یکسر
نگاہِ عشق سے دنیا کو دیکھتا ہوں میں

جناب روشؔ صدیقی

جادۂ فرقت پر

ہے جن کی یاد میری زندگی کی زندگی یارب! — وہ مجھ کو، کاش! اپنی یاد سے غافل سمجھتے ہوں
نہ پہنچے اُن کے در تک ذکر میری شامِ غربت کا — ابھی تک وہ مجھے خوابیدۂ منزل سمجھتے ہوں
خداوندا! مری غمناک تنہائی نہ رسوا ہو — مجھے وہ آج بھی عشرت کشِ محفل سمجھتے ہوں
یہ کشتیٔ تمنا، نذرِ طوفاں ہی رہے لیکن — مجھے، اے کاش! وہ آسودۂ ساحل سمجھتے ہوں
نہ ہے بختِ محبت گر وہ تمکینِ تغافل سے — نقوشِ بیکسیٔ عشق کو باطل سمجھتے ہوں!
دلِ شکستہ کی قسمت سے اے ذوقِ وفا کوشی — مجھے اب بھی وہ ہر بیداد کے قابل سمجھتے ہوں

رہے روپوش شرحِ رازِ غم میرے گریباں میں
ابھر آئے نہ یہ داغِ محبت انکے داماں میں

مری آشفتگی کے راز، پنہاں ہی رہیں یارب — وہ گیسو دوشِ عشرت پر، پریشاں ہی رہیں یارب
جنہیں اُن کی نگاہیں زندگی بخشیں، وہ نظارے — گل افشاں ہی رہے ہیں اور گل افشاں ہی رہیں یارب
یہ احساسِ محبت ہی تو ہے آغازِ بے تابی — وہ احساسِ محبت سے گریزاں ہی رہیں یارب
شکستِ سازِ دل قربان جنکی دل نوازی پر — وہ نغمے، اُن کی محفل میں غزل خواں ہی رہیں یارب
یہاں ہر صبح ہو تاریک سے تاریک تر لیکن — وہاں تاریک راتیں بھی درخشاں ہی رہیں یارب
دلِ برباد و ارمانِ دلِ برباد سب قرباں — بنازِ دلبری وہ دامن افشاں ہی رہیں یارب

ہیں اُنکے نام پر محبوب غمہائے جہاں مجھ کو
وہ شاداں ہیں تو حاصل ہے نشاطِ جاوداں مجھکو

حضرت ساغر جعفری بی۔ اے ایل ایل بی

سبدِ گل

(مغربی شاعری کے چند عطر بیز پھول)

(۱)

کیوپڈ اور میری محبوبہ

(از جان لائیلی)

کیوپڈ اور میری محبوبہ نے تاش سے جوا کھیلا۔
ایک بوسہ کی خاطر ——— کیوپڈ نے بازی ہار دی۔
پھر اس نے اپنا ترکش داؤ پر لگایا ——— تیر اور کمان بھی
اپنی والدہ "وینس" کی فاختاؤں اور چڑیوں کو بھی۔
ان کو بھی ہار دیا ——— پھر اس نے اپنے لبوں کی سرخ
رنگت کو داؤ پر پھینکا۔ اور گلاب کے اس احمریں پھول کو بھی؛
جو کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے عارض پر کیوں شگفتہ ہے۔
اور اس کے ساتھ ہی اپنی پیشانی کی درخشانی کو بھی۔
یہ تمام اشیاء میری محبوبہ نے جیت لیں۔
آخر کار اس نے اپنی دونوں آنکھیں داؤ پر لگا دیں۔
میری محبوبہ نے انہیں بھی جیت لیا ——— اور کیوپڈ
بے بصارت اٹھا۔ اے دیوتائے عشق! جبکہ تیرے ساتھ ایسا
سلوک ہوا ہے۔ تو معلوم نہیں۔ افسوس! ——— میرا کیا
حشر ہوگا ——— ؟

(۲)

ایک گیت

(از ٹامس کاریو)

مجھ سے مت پوچھ کہ خزاں گذرنے پر دیوتا جو پژمردہ شدہ جھائے
ہوئے پھولوں کو کہاں چھپا رکھتا ہے۔ کیونکہ ——— یہ پھول تیرے
حسن کی انتہائی دلکشی میں جذب ہو جاتے ہیں ——— بالکل
اسی طرح جس طرح وہ غنچوں کی حالت میں خوابیدہ ہوتے ہیں۔
مجھے مت پوچھ کہ دن کی روشنی کے سنہری ذرات کس
کیلئے سرگرداں ہیں۔ کیونکہ ——— انہیں تو قدرت نے انتہائی محبت
سے تیرے بالوں کی زیبائش کا غازہ بنایا ہے۔
مجھ سے مت پوچھ کہ موسم بہار ختم ہونے پر بلبل کہاں چلی
جاتی ہے ——— کیونکہ وہ موسم سرما گذارتے ہوئے تیرے تنفس
سے اپنے نغموں کو گرماتی ہے۔
مجھ سے مت پوچھ کہ وہ درخشندہ ستارے جو آدھی رات
کو آسمان سے ٹوٹتے ہیں۔ نیچے اتر کر کہاں چلے جاتے ہیں ———
کیونکہ ——— وہ تیری آنکھوں میں داخل ہو کر اسی طرح پیوست
ہو جاتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے محوروں میں تھے۔

مجھ سے مت پوچھ کہ بقا کا پرندہ اپنا دلکش نشیمن مشرق میں
یا مغرب میں بناتا ہے۔ کیونکہ ـ وہ آخرکار تیری ہی جانب پرواز
کرتا ہے۔ اور تیرے ہی عطر بیز سینے میں جذب ہوکر فنا ہوجاتا
ہے۔

(۳)

تصوّر

(از ٹینی سن)

پھولوں کی سرخ و سفید پتیاں محوِ خواب ہیں
محل کے تختوں پر سرو کے درخت بالکل ساکن ہیں۔
سرخ سنگِ مرمر کے حوض میں سنہری مچھلیاں بھی خاموش
ہیں۔
صرف جگنو بیدار ہیں ——— تم بھی میرے ساتھ بیدار
ہو جاؤ ———
مبہم روشنی میں سنگِ مرمر کا سفید مور گردن جھکائے
ایک خوفناک سایہ کی مانند نظر آتا ہے ———
درخشندہ ستارے سطحِ زمین کا خاموش نظارہ کر رہے
ہیں۔ اور میں تیرے دل کا نظارہ کر رہا ہوں۔
آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ اور روشنی کی ایک کرن
باقی چھوڑ گیا ——— بالکل اسی طرح تیرا تصور میرے دل میں باقی
ہے ———
کنول کا پھول اپنی تمام دلکشی سمیٹ کر جھیل کے سینے
میں داخل ہوگیا۔ اسی طرح اے میری محبوبہ! تم بھی خود کو سمیٹ کر
میرے سینے میں داخل ہوجاؤ۔ اور میری ہستی میں فنا ہوجاؤ ———!

(۴)

حُسن

(از سیفیلڈ)

میں نے چٹانوں اور برفانی پہاڑوں پر طلوع و غروبِ
آفتاب کا نظارہ کیا ہے ——— جو انتہائی دلکشی سے ہسپانی نغمہ کی
طرح آہستہ آہستہ ظاہر ہوتا ہے۔
میں نے بہار کی دیوی کو نرگس اگاتے اور بارش کے گرم
و تازہ قطروں سے سبزہ پیدا کرتے دیکھا ہے۔
میں نے نوشگفتہ پھولوں کے دلکش نغمے سنے ہیں۔ اور
سمندر کی موجوں کا ترنم بھی سنا ہے ——— اور جہازوں کی
محرابوں سے ——— جو سفید بادبانوں نے بنائی ہوتی ہیں۔
اجنبی ممالک کا منظر بھی دیکھا ہے ——— لیکن دنیائے حُسن کی
انتہائی دلآویز اشیا، جو خدا نے مجھے دکھائی ہیں۔ وہ میری محبوبہ
کی آواز ——— اس کے ریشمیں بال ——— اسکی نیم باز آنکھیں
اور اس کے شیریں اور خمیدہ و سرخ لب ہیں

(۵)

مرجانہ

(از ورڈز ورتھ)

میں نے درختوں کے سایہ تلے مرجانہ سے ملاقات کی۔
اور اس دلربا دوشیزہ کے حُسن کا نظارہ کرنے کے بعد میں بلاخوف
کہونگا کہ وہ سمندری پریوں کی مانند تیز رو اور طاقتور ہے۔ اور
اور بہار میں بہتی ہوئی ندی کی طرح وہ چٹانوں پر بے خوف دوڑ رہی
ہے ———
اس کے لبوں پر ایسا تبسم ہے جو ، سے دنیا ناآشنا ہے

جو خود ہی متحرک ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اور فنا بھی ہو جاتا ہے۔
ایسا تبسم جو اس کے بے انتہا شاغل کے ساتھ ظاہر و گم ہوتا ہے
اور گم ہونے کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں میں جذب
ہو جاتا ہے ــــ

مگرچہ اسے اپنا جھونپڑا اور آگ بہت مرغوب ہے تاہم
سرد و ناخوشگوار موسم میں بھی وہ چٹانوں کی سیر کرتی ہے اور
جب وہ سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتی ہے تو کاش! اس وقت میں
بارش کے ان قطروں کا بوسہ لے سکوں۔ جو اس کے رخساروں
پر چمکتے ہیں ــــ

جب وہ ندی کے کنارے آبشاروں کی جستجو میں دوڑتی
پھرتی ہے۔ اگر اسوقت چند لمحات کے لئے کسی دیرینہ غار میں
یا کسی چٹان کے سایہ تلے میرے پاس بیٹھ سکے تو اس کے عوض
میں وہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں جو اس آسمان کے نیچے
میری ملکیت ہے۔

ــــ(۶)ــــ

نغمہ

(از شیکسپیئر)

موسیقی کے دیوتا نے اپنا ساز اٹھا کر نغمہ شروع کیا ــــ تو
درخت اور پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں اسکا نغمہ سننے کے لئے بیتابانہ
جھک گئیں ــــ

اس کے نغموں سے پودے اُگتے اور پھول کھلتے ہیں ــــ
سورج کی روشنی اور بارش کے قطروں کی شکل میں اس کے نغموں
نے ایک غیرفانی بہار قائم کر دی ہے ــــ

جس کسی نے بھی اسکا نغمہ سنا مسحور ہو گیا۔ یہاں تک
کہ سمندر کی موجوں نے بھی اپنا سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئیں۔
دلفریب نغمے میں ایسا جادو ہے جو فکر اور دلی رنج کھو دیتا
ہے۔ محو خواب ہو جاؤ۔ یا سنتے سنتے جان دیدو ــــ

ــــ(۷)ــــ

محبت کے پھول

(از بن جانسن)

مجھے صرف اپنی مخمور آنکھوں سے بادۂ ناب پلا ــــ
اور میں اسے اپنی آنکھوں سے نوش جاں کروں گا۔
ورنہ جام میں صرف ایک بوسہ چھوڑ دے۔
اور میں شراب کی خواہش نہ کرونگا ــــ
روح کی تشنگی کو صرف شراب جاودانی ہی بجھا سکتی
ہے ــــ
لیکن اگر مجھے آب حیات پینے کو ملے ــــ تو
تیری شراب کے عوض میں اسے بھی قبول نہ کروں
میں نے گذشتہ ایام تجھے پھولوں کا ہار بھیجا
تیری زیبائش کے لئے نہیں۔
بلکہ اس امید پر کہ یہ پھول تجھ سے ہم آغوش ہو کر غیرفانی
ہو جائیں ــــ
مگر تو نے صرف اسے سونگھ کر واپس کر دیا۔
اس وقت ہار سے جو لطیف خوشبو نکلتی
ہے ــــ
وہ پھولوں کی نہیں ــــ تیری خوشبو
ہے ــــ

(۸)

محبت کے لمحے

(از شیلے)

میں تیرے خواب دیکھ دیکھ کر بیدار ہوتا ہوں۔
ٹھنڈی ہوائیں آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔
آسمان پر ستارے چمکتے ہیں
اور میں رات کی پہلی آرام کی نیند سے تجھے خواب
میں دیکھ کر بیدار ہوتا ہوں ——
ایک فرشتے نے معلوم نہیں کس طرح مجھے تیری کھڑکی
کے پاس لاکر کھڑا کر دیا ——
بھٹکتی ہوئی ہوائیں تاریک اور ساکن ندی کے پاس
پہنچکر بے ہوش ہو جاتی ہیں — چمپا کے پھولوں کی خوشبو گم
ہو جاتی ہے۔
خواب میں شیریں خیالات کی طرح ——
بلبل کے نالے اسکے دل تک پہنچکر فنا ہو جاتے ہیں۔
کاش! اے میری محبوبہ کہ میں بھی اسی طرح تیرے دل
تک پہنچکر فنا ہو جاؤں ——
مجھے سبزے پر سے اٹھا ——
کیونکہ میں مر رہا ہوں —— بے ہوش ہوں
—— لاچار ہوں ——
اپنی محبت کو بوسوں کی شکل میں میرے لبوں اور میری
زرد پلکوں پر برسا دے ——
میرے رخسار سفید اور سرد ہیں —— افسوس!
میرا دل سرعت کے ساتھ دھڑک دھڑک کر شور
مچا رہا ہے ——
آہ! اسے اپنے سینے سے چمٹا لے۔ یہاں تک کہ وہ
آخر کار پھٹ جائے —!

غزل

آغا شبیر علی سرخوش خلف حضرت آغا شاعر

اب جاں وبالِ جاں ہے میری جاں ترے بغیر
گل ہو ملی ہے شمعِ فروزاں ترے بغیر

اب کائناتِ دل پہ اداسی ہے حکمراں
اللہ میرا حالِ پریشاں ترے بغیر

تو کیا پھرا کہ ایک زمانہ پلٹ گیا
ملتا نہیں ہے درد کا درماں ترے بغیر

مایوسیوں نے حسرت و ارماں مٹا دیئے
دل ہو گیا ہے گورِ غریباں ترے بغیر

ناکامِ آرزو کو نظر بھر کے دیکھ لے
پتھرا گئے ہیں دیدۂ حیراں ترے بغیر

تیری بہارِ رخ نہیں سرخوش کو کیف کیا
پھولوں بھرا یہ باغ ہے ویراں ترے بغیر

پروفیسر فراق گورکھپوری۔ ایم۔ اے

غزل

سلوک عشق سے کیا کیا نہ حسن یار کرے | کسے یقین ہو کون اس کا اعتبار کرے
عجب نہیں کہ ستم کشتگان غم کی رکشش | ہوائے کوچۂ قاتل کو سازگار کرے
جو تیرے سامنے آجاتے وہ ندامت ہے | نظر وہی ہے جسے تو گنہگار کرے
یہ عشق ہی کی ہوا میں ہے رنگ بربادی | چمن کو دور خزاں رشک صد بہار کرے
ہم اہل درد کو تسکین یاس بھی نہ رہی | جو عشق نے نہ کیا تھا وہ حسن یار کرے
نگاہ شوخ اس انداز سے اٹھی۔ گویا | نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے
وہی تو وقت ہے کتنا اسی کو آتا ہے | ترا فراق جسے شام انتظار کرے
فضائے عشق بسانا اسی کو آتا ہے | جو اپنے رنگ پریدہ کو بوئے یار کرے
نثار کشف وکرامات دل سے کھل کر بھی | جو آنکھ راز محبت نہ آشکار کرے
سکون جان چھپے کشتہ تغافل دوست | نصیب خفتہ کچھ اب انکو ہوشیار کرے
نگاہ مست نے کیا کیا نہ دل سے مگر | نہ ہوشیار کیا ہے نہ ہوشیار کرے
خبر نہ حسن ومحبت کو ہو۔ نگاہ تری | جب اہل درد کے دل کا کشود کار کرے
حجاب ساز چمن ہے وہی پیام نہاں | سکوت ناز جسے نغمۂ بہار کرے
تمام جوش جنوں ہے تمام زنداں ہے | کسے جبر کرے کس کو اختیار کرے

فراق ہوش میں آنا ہمیں بھی ہے لیکن
کسے یہ درد ہے کون اسکا انتظار کرے

لانے کو کہا ہوگا۔ اور بڑھیا نے جواب دیا ہوگا "تمہیں سارا دن پیاس لگی رہتی ہے۔ مجھے کم دکھائی دیتا ہے۔ کیسے لادوں۔ تم خود کیوں ہمت نہیں کرتے"! اس پر شاید ناراض ہو کر "اچھا" کہتے ہوئے اس نے منہ پھیر لیا ہے۔

شاید میرا قیاس درست ہے کیونکہ کنوئیں پر پانی بھرنے والے کو پکار کر بوڑھے نے پانی مانگا ہے۔ اور غٹ غٹ دو گلاس پی کر لیٹ گیا ہے۔ شاید اس نے ایک سرد آہ بھی بھری ہے۔

آج کل جب عام طور پر سب گھروں میں برف کے بغیر پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق کے نیچے نہیں اتارا جاتا۔ جب دن رات لسی اور شربت کا شور برپا رہتا ہے۔ جب کئی گھروں میں بادام کی شردائی بھی ہوتی ہے۔ جب گرمی کے مارے گلا سوکھا جاتا ہے۔ یہ بیچارا پیاس کا نام تک نہیں لے سکتا اور بیوی کے پانی نہ دینے پر کسی دوسرے کے ہاتھوں۔ برف کا نہیں۔ مٹی کی صراحی یا گھڑے کا نہیں صرف کنوئیں کا تازہ پانی پی کر چپ چاپ لیٹ گیا ہے۔

اور وہ بڑھیا۔ وہ اس کی بیوی۔ وہ کیا سکھی ہے۔ آنکھوں سے قریباً اندھی لٹھیا کے سہارے چلنے والی پتلی دبلی سی جھلجہری کی وجہ سے آدھے سفید اور آدھے سیاہ چہرے والی۔ اپنی کھاٹ پر غمزدہ بنی بیٹھی ہے۔ دولو سراپا غم ہے تو وہ سراپا یاس:

کیا اس دنیا میں انکا کوئی نہیں؟ کیا یہ خاوند اور بیوی اس بڑھاپے میں بالکل بیکس ہیں۔ ؟ نہیں! انکا ایک لڑکا [illegible]

کی چھت پر جسکے سامنے یہ چارپائیاں ڈالے پڑے ہیں۔ ٹھنڈے بستر پر جا لیٹا ہے۔ اس کی لڑکی اُسے پنکھا کر رہی ہے۔ اور اس کی بیوی اُسکے پاؤں دبانے لگی ہے۔

"پیاس لگی ہے"

دونوں ماں بیٹی بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹا لڑکا برف لینے کے لئے دوڑا ہے۔

"شربت لاؤں یا شردائی" بیوی نے دوسری منزل سے پوچھا ہے۔

"جو چاہے لاؤ۔ لیکن کرو جلدی"

شردائی رگڑی جانے لگی ہے۔ بوڑھے کو شاید پھر پیاس لگی ہے۔ اس نے زبان کو ہونٹوں پر پھیرا ہے۔ اور ایک لمبا سانس لیکر کروٹ لی ہے۔

(۲)

مجھ سے دولو کا تعارف پہلے پہل ایک ناچ کی محفل میں ہوا تھا اُس وقت میں نہ جانے کس جماعت میں پڑھتا تھا۔ شاید کسی میں بھی نہیں۔ چھوٹا تھا۔ بہت چھوٹا۔ شائد ابھی پڑھنے کی غرض سے مدرسے جانے کے لئے مجھے کچھ ماہ انتظار کرنا تھا۔ رات کے وقت گیس کی روشنی میں محلے کا کونا کونا چمک رہا تھا

درمیان میں ایک بڑی دری بچھی ہوئی تھی۔ اسپر سفید چادریں اور ان پر خوبصورت جاجم۔ محلّے کا کوئی ہی ایسا شخص ہوگا۔ جو "مجرا" (رقص) دیکھنے نہ آیا ہو۔ دو نازک سی رقاصائیں مزے سے بیٹھی پان چبا رہی تھیں۔ بات بات پر ہوا کی طرح بل کھا جانے والی کیف زا آنکھوں سے نگاہوں کے نہ چھوٹنے والی اور مسکراہٹوں سے دلوں میں دھڑکن پیدا

کر دینے والی خوبصورتی و رعنائی کی دو جاندار تصویریں۔ اور ان کے پیچھے استاد جی اور طبلچی۔ اور ہار مونیم ماسٹر بیٹھے تھے۔ بات بات پر جی حضور کہکر جھک جانے والے۔ بات بات پر مذاق کرنے والے۔ خوش وضع۔ خوش مزاج۔ حاضرین بت بنے ہوئے تھے سب ان پریوں کو جن کی شرم مصنوعی، جن کی مسکراہٹ بے باک اور جن کی آنکھیں بجلی کی طرح شوخ تھیں۔ دیکھنے میں محو تھے۔

گیس کے اردگرد بہت سے پروانے جمع ہو گئے تھے میں اپنے پرانے مکان کی منڈیر پر بیٹھا انہیں دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے کئی بار کوشش بھی کی کہ وہ حسینہ میری طرف دیکھے لیکن میری کوششیں ناکام رہیں۔ اس لئے مجھے اُس سے نفرت سی ہو گئی۔ اور میں پتنگوں کو دیکھنے لگا۔ جو گیس کے گرد جمع تھے۔ مجھے یاد ہے اس وقت بھی میرے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ ان پروانوں اور ان تماشائیوں میں کیا فرق ہے؟ دونوں ان "چیزوں" پر نثار ہو رہے تھے جنہیں ان کی قربانی کا کوئی احساس نہ تھا۔

چھن چھنا چھن چھنن

ایک خاص طرح کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا میں نے نظر اٹھائی۔ وہ مہ جبیں تتلی کی طرح دری پر تھرک رہی تھی —— آج بھی جب کہ اُس واقعہ کو بیتے ہوئے برسوں ہو گئے ہیں۔ میرے سامنے اس کی صورت اسی طرح پھر رہی ہے۔ اس طرح نگاہ ناز سے تماشائیوں کے دلوں کو گھائل کر رہی ہے۔

یہ بہت دیر تک ہوتا رہا۔ اس کی ملاحت بار آواز بھی کئی بار فضا میں گونجی۔ اس نے گایا بھی لیکن مجھے معلوم نہیں اس نے کیا گایا۔ کوئی اس زمانے کا ہر دلعزیز گانا ہوگا۔ "آن کل مورا" ہوتا تو "یا الٰہی مٹ نہ جائے درد دل" کی قسم کا کوئی گیت گایا جاتا۔ لیکن اس وقت یاد نہیں کونسی غزل مشہور تھی۔ اور کونسی گائی گئی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ اس کی آواز نہایت سُریلی تھی۔ نہایت دلکش۔ نیند سی لانے والی۔ مجھ پر کئی دفعہ غنودگی طاری ہوئی۔ لیکن جب آنکھ کھلی اُسے گاتے۔ ناچتے اور مسکراتے ہوئے پایا۔ اور استاد جی کو اس کے نازک ہاتھوں سے روپے لیکر ستار کے چھیدوں میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ پھر نہ جانے مجھے کب نیند آگئی۔ جب اٹھا تو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ سر کچھ چکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی کچھ پروا نہ کرتے ہوئے بھاگ کر منڈیر پر گیا۔ لیکن نہ وہ روشنی تھی اور نہ وہ محفل البتہ شامیانہ موجود تھا۔ اور جہاں گیس رکھے ہوئے تھے وہاں کچھ پروانوں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ اور اُسکے پر ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ رقاصائیں جا رہی تھیں۔ اور سازندے بھی جانیکی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے رات کا نظارہ پھر گیا۔ اور ایک بار اُس رقاصہ کی صورت بھی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ لیکن اسکے ساتھ ایک اور بھی صورت تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی صورت جس کے جسم پر نفیس لباس کا اچکن تھا۔ کمر میں ایک خوبصورت دھوتی تھی۔ کرتے پر قیمتی بالکٹ اور سر پر گول لکھنوی طرز کی ٹوپی تھی۔ اور جو رقاصہ کی ایک ایک ادا پر روپے اُتار رہا تھا۔

یہ دولہا تھا۔ اور یہ جلسہ اُس نے اپنے پوتے کے جنم دن کی مبارک تقریب پر کیا تھا۔

ہاں بھی تھا۔ ذات کا سنار تھا۔ روپیہ پیسہ اس کے پاس
خوب تھا۔ پوتے کی سالگرہ پر خوشی اس نے منائی تھی۔ اس کا
چرچا آج بھی گھر گھر ہے۔ اس نے اس قدر روپیہ خرچ شاید
زیادہ نہ کیا ہو۔ رقاصائیں اس کی "آسامیاں" ہونے کی وجہ
سے اس سے کاہے کا روپیہ لینا۔ لینے کی وجہ سے ایک
پوتے کی سالگرہ پر بدھائی دینے یونہی چلی آئی تھیں
لیکن پھر بھی اتنا لے گئی تھیں کہ سودا کرنے پر بھی نہ پاتیں
سنتے ہیں اس میں "عیب" بھی تھے۔ وہ کھانے پینے
والا آدمی تھا۔ کھانے پینے والا ——— یہ الفاظ کچھ برے
سے محسوس ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں کھا پی کر مرنے والا
شخص زندگی میں بنا کھائے پیئے مر جانے والے سے کہیں
[illegible]
تکلیف دہ ... ہے ... پرہیزگار شخص کو کسی قسم کی ات
تو نہیں ہوتی۔ کھانے پینے کی عادت تو نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ
کسی طرح ریٹائر کر اپنی زندگی کے دن کاٹ دیتا ہے۔ لیکن
عیاش آدمی ——— اس کی حسرتوں کی داستان ہی دوسری
ہے۔

پرسوں کی بات ہے۔ صبح کوئی ۹ بجے ہوں گے میں غسل
وغیرہ سے فارغ ہو کر ایک کتاب لے کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ میرے
کانوں میں کسی کی ہلکی سی اکھڑی سی آواز سنائی دی "بابو بابو"
میں نے نظر اٹھائی۔ سامنے ایک ہاتھ میں برتن اور
دوسرے ہاتھ میں لاٹھی پکڑے دولو کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے بابا جی"

"بابو ذرا لسی تو لا دو"

میں بھاگ کر اوپر گیا اور لسی کا ایک لوٹا بھر کر اس کے
گھڑے دیا۔ سارا دن میں کام نہ کر سکا۔ اس کے لڑکے کی
اس بے التفاتی پر میرا دل جل اٹھا۔ اس سے اتنا بھی نہیں
ہو سکا کہ اپنے والدین کو آنا سا سکھ پہنچا سکے۔ ہاں تو کیا آپ
ماں باپ کے لئے اس کے گھر میں دو گھونٹ پانی بھی نہیں؟
سامنے چارپائی پر بڑھیا بھی بیٹھی تھی۔ آہ! اس لڑکے کو
حاصل کرنے کے لئے اس نے کیا کیا نہ کیا۔ کونسا جادو نہ جگایا
کونسا منتر نہ پھونکا۔ مجھے یاد ہے میری پردادی اسے
اپنے گھر نہ آنے دیتی تھی۔ بچوں والی عورتیں اس کا سایہ تک
پاس نہ پھٹکنے دیتی تھیں۔ اس نے کنوئیں سکھا دئے تھے۔
ہمارے مکان کے سامنے السوڑے کا ایک درخت تھا۔
جس کی وجہ سے ہمارے [illegible] السوڑے والی کہلاتی تھی
[illegible] نیچے بیٹھی وہ درخت
سوکھ گیا۔ اس سے ہماری پردادی نے محلہ بھر کی عورتوں کو
اسکے خوفناک اثر سے آگاہ کر دیا۔ وہ کہتی "اس کی بات نہ
پوچھو۔ پرماتما اس سے بچائے۔ پیٹ بھر کے کنوئیں میں اتر کر
نہائی تھی۔ وہ کنواں سوکھ گیا۔ اب اس میں دیکھنے کو بوند بھر پانی
نہیں ملتا۔ میرا السوڑے کا درخت سکھا دیا۔ یہ بس گھر جائے گی
آگ لگائے گی۔"

محلے کی عورتیں ایک بڑھیا سے ایسی باتیں سن کر اپنے
بچوں کو گودی میں چھپائے گھروں کو بھاگ جاتیں۔ کہیں
پچھمی کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ پچھمی کے بچے نہیں ہوتے تھے
یہ بات نہ تھی۔ ہوتے تھے مگر مر جاتے تھے بچہ کوئی زندہ نہ تھا
کونسی ایسی جگہ ہے۔ جہاں کسی نے بتایا ہو اور یہ نہ گئی ہو۔

دو لوا نہی کو کھانا ۔ اور پرماتما کا شکر ادا کرتا۔

آہستہ آہستہ یہ رقم بھی گھٹ کر آٹھ پر آگئی لیکن امرکور کو تو یہ آٹھ بھی کھٹکتے تھے۔ ایک دن بہانہ بنا یا گیا۔ "لڑکے بچے کاریں ڈالتے ہیں۔ لیتے ہیں اس سے بڑے سانس سے کر روٹی تک نہیں کھلائی جاتی ہیں اب انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی" اور اسدن سے روپے بند کر دیئے گئے ۔امرکور خود کھانا بنانے لگی۔ گھر میں کیا بنا ہے کیا نہیں اس بات کا انہیں پتہ نہ لگ جائے۔اس لئے انہیں تیسری منزل کی بجائے درمیانی منزل میں جگہ دی گئی ۔رسوئی سب سے اوپر کی منزل میں تھی۔ وہاں سے گنے ہوئے پھلکے اور تلا ہوا سالن آنے لگا جس دن سالن ذرا مزیدار ہوتا اس دن پھر گھر میں لڑائی ہوتی۔ وہ روٹی اور مانگتے اور امرکور کہتی مجھ سے اب دوبارہ روٹیاں نہیں پکائی جاتیں ۔یہ تو چاہتے ہیں کہ سارا دن روٹیاں ہی بناتی رہوں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ انکا پیٹ ہے یا کنواں دس دس روٹیاں کھا جاتے ہیں۔ پھر بھی صبر نہیں ہوتا۔ اس روز کے ہنگامے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے گوراندتہ نے پھر روپے دینے شروع کر دیئے لیکن اب ان کی تعداد پانچ تھی۔ ایسے رہنے کے لئے جگہ بھی نچلی منزل کی دو اندھیری کوٹھڑیوں میں دی گئی ۔اور اب دونوں میاں بیوی گرمیوں میں باہر محلے میں سونے لگے۔

——(۴۷)——

میں اپنے بھائی کے لئے دوائی لینے گیا۔ حکیم نبی بخش کی دوکان کو جا رہا تھا کہ ساتھ کے محلہ میں کچھ شور سنائی دیا۔ کچھ عورتیں جھگڑ رہی تھیں۔ میرا راستہ ادھر سے ہو کر ہی جاتا تھا۔ دیکھا [illegible]

گھیرے ہوئے تھیں۔ زمین پر ایک کپڑا بچھا ہوا تھا جس پر کچھ آٹا پڑا ہوا تھا۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی ۔شاید بڑھاپے نے ان کو بالکل بے آسرا بنا دیا تھا۔ کل پھر جھگڑا ہوا تھا۔ دو تین دن سے بھوکے تھے۔ کھانے کو مٹھی بھر آٹا بھی نہ تھا ۔ امرکور نے کچھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ شرم پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ مگر بھوک بیتاب کئے دیتی تھی۔ آخر پیٹ کی آگ نے شرم کی زنجیروں کو پگھلا دیا۔ لچھمی لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے پاس کے محلہ میں اپنے برادری والوں کے پاس آئی۔ لیکن برادری ہو یا کوئی اور بے یار و مددگار کا کون سہارا بنتا ہے؟ انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ ایک نے کپڑا بچھا دیا۔ اور ایک باعزت کی عزت سے پردہ اٹھایا جانے لگا۔ آخر خود غرض دنیا! کسی کی عزت جائے اسے اُس میں بھی مزا آتا ہے۔

ایک مکان کی دیوار کے ساتھ لگی لچھمی کھڑی تھی۔ وہی جس کے پاؤں میں کبھی لکشمی کھیلا کرتی تھی۔ آج یوں اپنی برادری کے ہاتھوں بے عزت ہو رہی تھی۔ طنز کے تیروں سے اُسکا کلیجہ چھلنی ہو رہا تھا۔ اسے خواب میں بھی یہ منظر دیکھنے کی امید نہ تھی۔ خاموش اور ساکن کھڑے کھڑے وہ یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی ۔ دیکھ کہاں رہی تھی ۔اس کی آنکھیں تو بند تھیں۔ صرف دو بڑے بڑے آنسو اُسکے پچکے ہوئے گالوں پر ڈھلک آئے تھے۔

ایک دیوی جی نے جو رشتے میں لچھمی کی کچھ لگتی بھی تھیں۔ حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے ایک چھوٹی سی کٹوری میں آٹا لا کر بچھے ہوئے کپڑے پر ڈال دیا۔ اور ناک بھوں سکوڑ کر بولیں بے شرم کو شرم بھی نہیں آتی۔ گھاٹ کنارے آگئی ہے۔ یہ من

کالالچ نہ گیا۔ اس طرح اپنی اور اپنے گھر والوں کی مٹی پلید کرانے سے تو بہتر تھا کچھ کھا کر سو رہتی۔

لچھمی سے اور نہ سہا گیا۔ تین دن کا فاقہ ضعیف و ناتواں جسم۔ دھڑام سے زمین پہ آ رہی۔ میں بھاگ کر پہنچا۔ اُسے اٹھایا۔ کپڑے سے ہوا کی۔ اتفاق سے لالہ نہال چند بھی ادھر سے جا رہے تھے۔ وہ اسی محلے میں رہتے تھے۔ ان کی فراخ دلی کی دھاک شہر بھر میں جمی ہوئی ہے۔ انہیں سب کچھ سمجھتے دیر نہ لگی۔ اپنی امارت اور شخصیت کا انہوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا۔ میرے پاس آ بیٹھے۔ جب لچھمی کو ہوش آیا۔ اسکی لاٹھی پکڑ کر اُس کے گھر چھوڑ آئے۔ اور مجھے دوکاندار سے ایک آٹے کی بوری اور دال لے کر اُن کے ہاں پہنچا دینے کیلئے کہدیا۔

سینما کے مناظر کی طرح یہ سب واقعات میری نگاہ تصور کے سامنے پھر گئے۔ میری بیوی نے میرے کندھے کو چھوا۔ وہ گاؤں کرا اُپر جانے کو تیار تھی۔ بچہ رو رہا تھا۔ بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے دودھ کے برتن کو فرش پہ رکھ کر بچے کو میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اور غصہ سے بڑبڑانے لگی۔

وہ بچے کو چھاتی سے لگا رہی تھی۔ چوم رہی تھی۔ اور میں سوچتا تھا یہ پریم۔ یہ پیار کس لیے ؟؟

جناب اظہر امرتسری
چیف ایڈیٹر روزنامہ "زمیندار"

غزل

صبحِ حسرت دیکھ کر، شامِ تمنا دیکھ کر
بجھ گیا دل کلفتِ امروز و فردا دیکھ کر

دوستوں کا خوں بہا کر ہو رہے ہیں سرخرو
دم بخود ہوں حالتِ احبابِ دنیا دیکھ کر

گردشِ ایام پر مجھ کو یقیں کرنا پڑا
اس ستم اندیش کو لطفِ سراپا دیکھ کر

حسن کو لاؤ کہ شاید اسکو بھی آجائے شرم
عشق کی وجہِ پریشانی کو رسوا دیکھ کر

ذرہ ذرہ سے ہے وابستہ تمناؤں کا دام
دیکھ کر رستے رہِ صحرائے دنیا دیکھ کر

سُن کے پیمانِ وفا کا نام رو دیتا ہوں میں
وعدہ ہائے دوست کا اندازِ ایفا دیکھ کر

حسن کو ہے اختیار حسن پر کتنا غرور
عشقِ بیچارہ کو مجبورِ تمنا دیکھ کر

درد کی تصویر کا یہ دوسرا پہلو نہ ہو
کھلکھلا کر ہنس دیئے وہ مجھکو روتا دیکھ کر

ہنسکے رو دیتا ہوں روتے روتے ہنس دیتا ہوں میں
یہ مجھے کیا ہو گیا خونِ تمنا دیکھ کر

کچھ تو ہے اظہر جو وہ بھی منہ چھپا کر رو دیئے
میرے لب پر شکوۂ جورِ تمنا دیکھ کر

جناب حفیظ ہوشیاری۔ ایم۔ اے

غزل

حُسن کو دشمنِ اربابِ تمنا نہ کہو! وہ ستم گار سہی تم اُسے ایسا نہ کہو!

اس تغافل پہ بھی پھرتے ہیں نگاہوں میں سدا دیدۂ شوق کو محرومِ تماشا نہ کہو!

خود سمجھ جائیں گے میری نگہِ مضطر سے اُن سے حالِ دلِ ناشاد کہو یا نہ کہو!

یاد آ جائیں نہ پھر اُن کو جفائیں اپنی اُن کے آگے مجھے بربادِ تمنا نہ کہو!

ہم وہ مجبورِ محبت کہ کریں عرضِ وفا! تم وہ بے مہر کہ اسکو فقط افسا نہ کہو!

لطفِ امروز کا قائل ہی یہ جاں دادۂ وصل دلِ عاشق کو حریفِ غمِ فردا نہ کہو!

بزمِ ہستی میں جسے عشق سرافراز کرے کیا یہ لازم ہے اُسے عقل سے بیگا نہ کہو؟

ہائے اُس شوخِ دل آزار کا کہنا وہ حفیظ!
جاں کہو ہم کو مگر جانِ تمنا نہ کہو!

جناب عطاء اللہ پالوی

آغا شاعر کے سو شعر

ہے یہی رنگِ سخن تو شاعرِ شیریں بیاں!
تو کبھی اک دن طوطیٔ ہندوستاں ہو جائیگا

کون کہہ سکتا تھا کہ "نواب فصیح الملک" (یہ وہ خطاب ہے جو مہاراجہ سرکشن پرشاد سابق وزیر اعظم سلطنت آصفیہ نے حیدرآباد دکن کے دُوسرے سفر میں ایک سرکاری مشاعرے کی صدارت فرماتے ہوئے آغا صاحب کو عطا فرمایا تھا) یا "افسر الشعراء" (یہ وہ خطاب ہے جو آغا صاحب نے نواب نصیر الممالک مرزا شجاعت علی قزلباش قونصل جنرل ایران کی مصاحبت میں حاصل کیا تھا) یا "آتھر آف پیور اردو لٹریچر" (Author of Pure Urdu Literature) یہ وہ خطاب ہے جو آغا صاحب کی ٹکسالی زبان، فصاحتِ بیان اور ترجمہ قرآن دیکھ کر انہیں "اردو زبان" نے دیا ہے) حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کی یہ پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہو کر رہے گی؟ لیکن وقت گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ آخر وہ زمانہ آ ہی گیا۔ جب شاعر عدیم المثال شاعر تسلیم کئے گئے۔ اور عوام تو عوام خواص کو بھی یہ کہنا پڑا کہ

"آغا صاحب کی زبان میں وہ شیرینی ہے۔ جیسے لعلِ نگار، وہ لوچ ہے جیسے شاخِ گل، اور وہ [illegible]

"ہماری قدیم شاعری کا ایک ایسا دلکش مرقع ہے جس کی اس زمانے میں نظیر نہیں مل سکتی" (جوش)

"دہلی کی ٹکسالی زبان جسے کہتے ہیں وہ آغا صاحب کے کلام میں محفوظ ہے۔ پھر نظم و نثر دونوں میں ایک سی فصاحت اور ایک سی عذوبت پائی جاتی ہے۔" (سیماب)

وہ اپنے رنگ میں اس وقت وحید العصر شاعر ہیں۔ اُن کی استادانہ مشق، نکتہ رس دماغ اور جدت پسند طبیعت نے ان کی قدیم شاعری کو ایک ایسے قالب میں ڈھال دیا ہے جسے دیکھ کر ہمارے دماغ پریشان نہیں ہوتے۔ اور ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ قدیم چیز ہے۔ اسے نہایت خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہہ کر اُس کی رنگینیوں سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ کلام میں فصاحت، زبان میں سلاست اور خیال میں ندرت موجود ہے۔

بسلسلہ مطبوعات نگارستان ایجنسی کشمیری دروازہ دہلی، جناب آغا آفتاب علی مسرور قزلباش دہلوی نے حضرت آغا شاعر کے منتخب اشعار "شاعر کے سو شعر" کے عنوان سے شائع کئے ہیں۔ اس منتخب مجموعے کا مقدمہ شاعرِ انقلاب

حضرت جوش ملیح آبادی مدیر "کلیم" کے قلم کا رہین منت ہے۔ مقدمے میں حضرت جوش نے آغا صاحب کی صوری خوبیاں زیادہ اور معنوی کم دکھائی ہیں۔ اور اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ

"وہ جب باتیں کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سفید
بالوں کے پس پردہ کوئی بچہ بول رہا ہے" اس لئے
"وہ حضرات جو نادر و قدیم اشیاء و افراد سے دلچسپی
رکھتے ہیں کم از کم ایک بار آغا صاحب سے ضرور مل لیں
کیونکہ ع پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

شاعر انقلاب کی یہ "دعوت" یقیناً ولولہ انگیز ہے۔ خود آغا صاحب نے بھی شاید یہ شعر اپنے ہی متعلق کہا ہے ؎

ہزاروں سے سنے یہ لفظ لیکن لفظ تھے خالی
تمہاری بات کی شوخی تمہاری ہی زباں تک ہے

لیکن جوش صاحب شاید یہ بھول گئے ہیں کہ جو سہولت انہیں حاصل ہے۔ وہ ہر شخص کو میسر نہیں۔ خوش قسمتی سے انہیں آغا صاحب کی قربت حاصل ہے۔ اس لئے وہ آغا صاحب سے ملکر ان کی گفتگو سے جس قدر چاہیں۔ اکتساب حظ کر سکتے ہیں۔ ورنہ بہتیروں کے لئے "تو ہنوز دلی دور است" کی مثل اب تک اپنی جگہ اٹل ہے۔ ایسی صورت میں عوام آغا صاحب کی اس لسانی خصوصیت سے کس طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ جو صرف سننے ہی سے تعلق رکھتی ہے؛ رہا کلام کی رنگینی سے ان کی زبان کی عذوبت کا اندازہ تو اس کے لئے آغا شاعر کے کلام کی وجدانیت تشبیہات و استعارات کی رنگینی کافی ہے۔ جنہوں نے ان کے کلام کا بنظر امعان مطالعہ کیا ہے وہ اس لطیف احساس سے یقینی محظوظ ہوئے ہیں۔

یوں تو بیسیوں شعرا کے منتخب اشعار "سو شعر" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ مگر کم ہی انتخاب ایسا ہے۔ جو حقیقی معنوں میں منتخب اشعار کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ چونکہ اشعار کی پسند کا انحصار تمام تر اپنے اپنے "ذوق" پر ہے۔ اس لئے ان منتخبین نے بھی عام پسند کا لحاظ کئے بغیر اپنے اپنے پسندیدہ اشعار جمع کر دیئے۔ اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر اشعار ادنے درجے کے منتخب ہو گئے۔ ورنہ اگر عام پسند کا لحاظ کرکے انتخاب عمل میں لایا جاتا تو یہ عیب ہرگز نہ پیدا ہوتا۔ بہرکیف جن لوگوں کی نظر سے آغا شاعر قزلباش کا مجموعہ کلام نہیں گذرا ہے۔ ان کے لئے "آغا شاعر کے سو شعر" کی حیثیت ایک نعمت غیر مترقبہ کی ہے۔ اس انتخاب میں آغا شاعر کے اگر سب اچھے شعر نہیں آ گئے ہیں تو اتنا ضرور ہوا ہے کہ ان کی زیادہ تعداد اس مجموعے میں موجود ہے۔ اور ہر شعر صرف آغا صاحب کی خصوصیت کا حامل ہی نہیں۔ بلکہ ان کی جدت و بلندی تخیل کا مظہر بھی ہے اور چونکہ کسی چیز کی قیمت کا صحیح اندازہ یا کسی شے کا اصلی جوہر اس وقت تک نہیں ظاہر ہو سکتا جب تک اس جیسی دوسری چیز بھی اس کے مقابل نہ رکھی جائے۔ اس لئے آغا صاحب کی خصوصیت دکھانے کے لئے اس جگہ چند وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں شاعر کی عظمت صاف نمایاں ہے اور جن پر متقدمین بھی اظہار کمال کر چکے ہیں۔

انسانی "سایہ" ایک ایسی عام چیز ہے جس پر بہتیروں نے طبع آزمائی کی ہے۔

حضرت آتش فرماتے ہیں ؎

سائے کی طرح سے مرے پھرتا ہے ساتھ ساتھ
عشق اُس پری جمال کا ہمزاد ہو گیا

غالبؔ "سایہ" کو اور ہی چیز سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو بھی اپنے شبستاں سمجھا

استاد جلیلؔ "سایہ" کو عشق کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

عشق کامل سے نہ چھوٹیگی کبھی جان جلیلؔ
عمر بھر ساتھ رہے گا نہ سے سایہ بن کر

لیکن آغا صاحب کو دیکھئے کہ وہ پابند رنگ قدیم ہونے کے باوجود کتنا بلند شعر کہتے ہیں ؎

پہرہ بٹھا دیا ہے یہ تیرِ حیات نے
سایہ بھی ساتھ ساتھ ہے جاؤں جہاں کہیں

"دل کٹنا" ایک محاورہ ہے جو شرمندہ ہونے کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اسکا نبھانا آسان نہیں۔ ذوقؔ نے بھی اس محاورے کو استعمال کیا ہے لیکن معنی غلط پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

کٹنے لگے تبسم دنداں نما سے دل
ہیروں سے دانتوں کے در و گوہر بدل گئے

لیکن آغا شاعر نے اس محاورے کو اس خوبصورت سے باندھا ہے کہ جواب نہیں وہ کہتے ہیں کہ

شاعر نازک طبیعت ہوں مرا دل کٹ گیا
ساقیا لینا کہ شاید بال پیمانے میں تھا

آغا صاحب دل کٹنے کی ظاہری وجہ پیمانے میں "بال" کی موجودگی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاید میں بال پی گیا جس سے میرا دل کٹ گیا۔ برعلاف ان کے دیکھئے اسیرؔ نے اسی "بال" کو کس بُری طرح بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

درد اے قاتل گلے میں بسملوں کے ہے کمال
پی گئے کیا بال پانی میں تری تلوار کا

میں نے اپنے ایک مضمون "نقد بر نقد" میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے شعر ؎

یہ اتفاق تھا سویا تو نیند آ ہی گئی
مجھے تو قبر میں بھی اعتبارِ خواب نہ تھا

پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حضرت سرؔ یر کا بری کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا تھا اور سمجھتا تھا کہ نہایت نادر شعر ہے وہو ہذا ؎

پڑے ہیں چین سے پھیلائے پاؤں گھر کی طرح
زمین قبر سے بڑھ کر مقامِ خواب نہیں

لیکن "آغا شاعر کے سو شعر" میں یہ شعر دیکھکر میرا خیال غلط ہو گیا وہ کہتے ہیں ؎

مسکن ہی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا
آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا!

یہ شعر زیادہ صاف اور برجستہ ہے۔ مگر میں آغا شاعر سے زیادہ آغا مسرور کی نظر انتخاب کا مداح ہوں

"ہچکی" ایک معمولی چیز ہے۔ قریب قریب ہر شاعر نے اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی نہ کسی طرح اسے موزوں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

چلی آتی ہیں ہچکیاں دمبدم
مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم　(محسن)

بیانِ دردِ دل اُن سن کے ہاتھوں سے جگر تھاما
لگی ہچکی انہیں جب ذکر آیا مری رقت کا (شرف)

ہیں روانہ کوئے جاناں سے عدم کو قافلے
بسملوں کی ہچکیوں میں زنگ کی آواز ہے (ناسخ)

کس نگہ سے تم نے دیکھا تھا امیر
روتے روتے ان کو ہچکی لگ گئی (امیر)

جنت میں جو حوروں کو مری یاد نہ آتی
ہچکی بھی تہ خنجرِ بیداد نہ آتی (داغ)

لیکن اسی "ہچکی" کو آغا صاحب نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

زندگی اور موت میں اک عمر سے تھی کشمکش
وقت پر دو ہچکیوں نے پاک جھگڑا کر دیا

یہ ہے آغا صاحب کی خصوصیت اور یہ ہے افسر الشعراء کا کمال! اسی طرح کی خصوصیات سے سارا کلام بھرا پڑا ہے۔ اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ "شاعر کے سو شعر" کے انتخاب میں جناب آغا مسرور کو زبردست کامیابی ہوئی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس انتخاب میں نہ صرف اپنی پسند ملحوظ رکھی ہے بلکہ عام مذاق کا بھی خیال رکھا ہے اور اس صورت سے ہر مذاق اور ہر طرح کے اشعار انتخاب میں آگئے ہیں حضرت جوش نے مقدمے میں غلط نہیں لکھا ہے کہ

"شاعر کے سو شعر" کے نام سے آپکے سو شعر شائع کئے
جا رہے ہیں، جسکے ہر شعر پر سو سو بار سر دھننے کو جی چاہتا ہے"

لیکن آپ جس وقت اس ہدایت پر عمل کرینگے تو نو ہزار سر دھننے کے بعد آپکی گردن رک جائے گی۔ کیونکہ انتخاب میں صرف ننانوے اشعار ہیں۔

بہرحال یہ نظری چوک ہے۔ جسے انتخاب کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مگر اسکے علاوہ بھی چند مقامات ایسے ہیں، جہاں مجھے کھٹک پیدا ہو گئی ہے۔ اور چاہے اُسکی اہمیت کچھ بھی نہ ہو لیکن اسکا اظہار میرے لئے ضروری ہے۔ . . . . اس سے میرا مقصد حضرت آغا شاعر پر اعتراض کرنا یا انہیں اصلاح دینا نہیں بلکہ اپنے شبہ کو مٹانا ہے۔ آغا صاحب کا ایک شعر ہے ؎

وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی ٭ دو ہی دن گذرے تھے ہمکو قید سے چھوٹے ہوئے

میری دانست میں کتابت کے وقت مصرعے اُلٹ گئے ہیں۔ اصل شعر یوں تھا ؎

دو ہی دن گذرے تھے ہمکو قید سے چھوٹے ہوئے
وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی

ایک شعر ہے ؎ اے آبروئے جاناں تو اتنا تو بتا ہم کو
کس رُخ سے کریں سجدہ قبلہ میں ذرا کج ہے

مصرعہ ثانی میں "قبلہ میں ذرا کج ہے" عجیب قسم کا جملہ ہے بجائے اسکے "قبلہ میں بھی کچھ کج ہے" ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ عام طور پر لوگ "قبلہ کج ہے" یا "قبلہ میں کجی ہے" بولتے ہیں۔

آخر میں مجھے صرف اسی قدر کہنا ہے کہ "شاعر کے سو شعر" میں نہ صرف آغا شاعر کی خصوصیات باحسن الوجوہ جلوہ گر ہیں بلکہ آغا مسرور کے ذوقِ انتخاب کی بھی عظمت نمایاں ہے۔ اور اس مختصر مجموعے کے متعلق بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ (ع)

جو شعر ہے گندھا ہوا پھولوں کا ہار ہے

اس لئے اربابِ نظر اسے ضرور لیں، دیکھیں، پڑھیں اور جھومیں۔

جناب سیف اکبرآبادی۔ رکن ادارہ پرتاب لاہور

سوز و ساز

تا بکے بیٹھے ہوئے فکرِ گریباں کیجیے
ہو سکے تو اور وحشت کو نمایاں کیجیے

میں بھی تو دیکھوں بہاریں حسن کی بڑھتی ہوئی
زلف کو پھر دوش پر اپنے پریشاں کیجیے

عہدِ موسیٰ ہی میں سب نے کر لیا فخرِ جمال
برق کوہِ طور کو اب تو نمایاں کیجیے

کچھ نہ کچھ تو روشنی دیگا دلِ حرماں نصیب
شامِ غربت صبحِ محشر سی فروزاں کیجیے

ڈھونڈھیے افسانۂ جمعیتِ عشق و جمال
مصر کی تاریخ کے صفحے پریشاں کیجیے

جل رہے ہیں سوزشِ غم سے ہمارے داغِ دل
ایسے میں آ جائیے سیرِ چراغاں کیجیے

خود بخود معلوم ہو جائیگا رازِ زندگی
کچھ دنوں نظارۂ گورِ غریباں کیجیے

سیفؔ دیکھیں تا بکے ہوتا نہیں ہے انقلاب
اور کچھ دن اپنی آہوں کو پریشاں کیجیے

نوشتہ فریڈ ماریٹ مترجمہ جناب علی احمد

شتربان

(صحرائے عرب کی ایک داستان)

میرا باپ بیشمار اونٹوں کا مالک تھا جنہیں وہ سوداگروں کو کرایہ پر دیتا تھا۔ سال میں ایک مرتبہ کارواں کے ساتھ تجارت کے لئے دوسرے ممالک کو جایا کرتے۔ جب وہ مرگیا تو اس کی تمام دولت میرے قبضہ میں آئی۔ میں بھی اونٹوں کو کرایہ پر چلاتا اور اکثر سوداگروں کے ساتھ مکہ چلا جاتا۔ میری زندگی خوشی اور غم کا مجموعہ تھی۔ جب میں سفر سے واپس آتا تو اپنی بیوی اور بچوں کو اپنی آمد پر بہت مسرور پاتا۔ میں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں اور کچھ عرصہ میں مالدار ہوگیا۔

مارچ کا گرم مہینہ تھا اور میں تپتے ہوئے ریگستان سے گذرتا ہوا مکہ سے قاہرہ اپنے وطن واپس آرہا تھا کہ راستے میں ایک اونٹنی نے بچہ دیا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ اس بوجھ کو اب کہاں لے جاؤں۔ لیکن وہ بچہ اس قدر خوبصورت اور توانا تھا کہ اکثر قافلے والوں نے پشینگوئی کی کہ یہ بچہ بڑا ہونیکے بعد اس قابل ہوگا کہ حج کے زمانے میں کاروان کے ساتھ مکہ کی طرف قرآن شریف لے جانیوالے اونٹ کی حیثیت سے منتخب کیا جائے۔ چنانچہ میں اسے

اپنے ساتھ لیتا آیا ——— پانچ سال تک میں بدستور قافلوں کے ساتھ جاتا آتا رہا۔ اس وقت تک میرا اونٹ کافی بڑا ہوگیا اور جبکہ قافلہ حج کو جانے کی تیاری کر رہا تھا میں اسے شیخوں کے پاس لے گیا۔ اور ان کی خدمت میں اسے متبرک کام کے لئے پیش کیا۔ اگر ایک درویش نے مخالفت نہ کی ہوتی تو انہوں نے اُسے قبول کرلیا ہوتا۔ درویش نے کہا کہ اگر یہ اونٹ قرآن پاک مکہ لے جائیگا تو کاروان کے حق میں نتیجہ بہت بُرا ثابت ہوگا۔ چونکہ اس درویش کا شیخوں پر بڑا اثر تھا۔ اس لئے انہوں نے میرے اونٹ کو قبول کرنے میں پس و پیش کی۔ اس درویش کی بے جا دخل اندازی مجھے بڑی ناگوار معلوم ہوئی۔ میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی۔ اور میں نے اُسے سخت سست کہا۔ یہ سنتے ہی وہ غصہ سے کانپنے لگا۔ اور تھوڑی سی ریت اٹھا کر میرے اوپر پھینکی اور بددعا دی "خدا اس کارواں کو تباہ و غارت کرے۔ جس کے ساتھ یہ اونٹ متبرک قرآن کو لے جائے"۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرا اونٹ انتخاب کرلیا گیا۔ اور میں مایوس ہوگیا لیکن ... [illegible] ... اسلئے

میرا اونٹ جو تمام اونٹوں میں بہتر تھا انتخاب کر لیا گیا۔

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں دوڑتا ہوا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ سمجھتا تھا کہ اس مبارک کام کے صلے میں میرے خاندان پر خدا کی رحمت نازل ہو گی۔ الغرض کاروان جو زائرین کی بڑی تعداد پر مشتمل تھا۔ آٹھ سو اونٹوں کے ساتھ قاہرہ سے روانہ ہوا۔ میں اس خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا جب میں نے دیکھا کہ میرا اونٹ مزین اور جواہروں سے مزین شیخوں کے گروہ کے درمیان اپنی پیٹھ پر متبرک قرآن لئے گذر رہا ہے۔ کارواں کے روانہ ہونے سے کچھ قبل میں اپنی بیوی اور بچوں سے رخصت ہونے کے لئے گھر گیا۔ اور جب سب کو الوداع کہہ کر لوٹ رہا تھا۔ تو میری سب سے چھوٹی لڑکی جو دو تین سال کی تھی۔ دوڑی ہوئی آئی۔ اور آکر میری ہی گود میں بیٹھ گئی۔ اور حسب معمول میری جیبوں میں ہاتھ ڈال کر میووں کو تلاش کرنے لگی۔ جو میں ہمیشہ بازار سے گھر آتے وقت لے آتا تھا۔ لیکن چونکہ میری جیبوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس لئے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اسے اس کی ماں کو دیکر جلد روانہ ہو گیا۔ کیونکہ کاروان کے روانہ ہو جانیکا خوف تھا۔ شام کے وقت کاروان نے قاہرہ کو چھوڑا اور دو رات چلنے کے بعد اجیرود پہنچا۔ جہاں ہم نے تین دن قیام کیا اور نہر سویز کا پانی اپنی اپنی چھاگلوں میں بھر لیا اور اونٹوں کو بھی پلایا۔ روانگی سے کچھ قبل جبکہ میں بیٹھا ہوا تمباکو پی رہا تھا اور سارے اونٹ میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے میں نے دیکھا کہ قاہرہ کی سمت سے
[illegible]

سالار امیر حاجی کے خیمہ کے پاس ٹھہر گیا۔ تو میں نے پہچانا کہ وہی درویش ہے جس نے سال گذشتہ میرے اونٹ کے انتخاب کے بارے میں مخالفت کی تھی۔

مجھے تشویش سی ہو گئی۔ اور میں حقیقت دریافت کرنے کے لئے امیر کے خیمہ میں پہنچا۔ میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا "اگر اب بھی اُس اونٹ کو نہ مار ڈالا گیا اور دوسرا اونٹ اس متبرک کام کے لئے نہ تجویز کیا گیا تو سارے قافلے پر ایک بڑی مصیبت آئے گی۔ اور وہ تباہ ہو جائیگا۔ سارے کارواں میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ اس نے اونٹ کا رُخ مشرق کی جانب پھیرا اور دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا

امیر تردد میں پڑ گیا۔ اور تمام زائرین میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں میں گھبرایا کہ اگر درویش کی پیشنگوئی مان لی گئی۔ تو میری ساری امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے جھوٹ بولنے کی ٹھان لی۔

"اے امیر" میں نے کہا "اس شخص کی بات پر اعتبار نہ کرو وہ میرا دشمن ہے۔ ایک روز یہ میرے گھر آیا۔ میں نے اسے کھانا کھلایا۔ بجائے اس کے کہ یہ میرا شکر گذار ہوتا۔ اس نے میری بیوی کی تحقیر کی۔ میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ مجھ سے اسکا بدلہ لے رہا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میری بات کا یقین کر لیا گیا اور درویش کی پیشنگوئی کو قابل وثوق نہ سمجھا گیا۔ اسی رات ہم الطیہ کے ریگستان میں داخل ہو گئے۔ یہ ریگستان جس میں سے ہم گذر رہے تھے ریت کا خطۂ عظیم تھا۔ ایک بحر پایاں۔ پانی سے خالی۔ ایک ویران صحرا۔ اونٹوں کی طویل صف آہستہ خاموشی

کے ساتھ ریت پر رواں تھیں۔ گویا سائے حرکت کر رہے ہوں۔

کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور درویش کی پیشگوئی کے برخلاف ہم سات رات کے سفر کے بعد نہل پہنچے۔ جہاں ہم نے آرام کیا اور پانی بھر لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب ہم ریگستانی شفاف چشموں پر پانی لے رہے تھے تو اکثر قافلے والے میرے دشمن درویش کی غلط پیشینگوئی پر ہنس رہے تھے۔ قصراکاما پہنچنے کیلئے ہمیں تین رات اور سفر کرنا تھا۔ چنانچہ ہم پھر روانہ ہوگئے۔

ہمارے سفر کا دوسرا دن تھا خیمہ نصب کرنے کے ایک گھنٹہ بعد درویش کی خوفناک پیشینگوئی کے آثار نمودار ہوتے اور میں سمجھ گیا کہ میں نے جو جھوٹ بات کہی ہے خدا اسکا عذاب مجھ پر نازل کرنے والا ہے۔

ابر کا ایک سیاہ ٹکڑا دامن افق سے اٹھا۔ اور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ سارے آسمان پر چھا گیا۔ یکایک طوفان آگیا۔ آندھیاں چلنے لگیں ریت کے پہاڑ اٹھتے اور آکر ہمارے سروں سے ٹکراتے۔ امیر کا خیمہ جو سب میں بڑا اور مضبوط تھا اکھڑ گیا۔ اور تیز ہوا نے اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔ ہمارے خیموں کا تو پتہ بھی نہ تھا۔ ریت کی متحرک دیواریں ہمارے اوپر سے گذر رہی تھیں۔ اور سانس لینا دشوار ہوگیا تھا۔ اونٹوں نے اپنے منہ زمین میں دھنس دیئے تھے اور کھڑے تھے۔ ہم بھی خاموش اپنی موت کے منتظر تھے لیکن ابھی تک صحرا کی بادِ سموم نہ چلی تھی۔ چاروں طرف قبر کی سی تاریکی چھا گئی تھی۔ مرنے والے آدمیوں کی آوازوں [illegible]

عورتوں کی چیخوں اور اونٹوں کی پکار سے صحرا گونج رہا تھا

میں نے ایک اونٹ کے نیچے خود کو چھپا لیا۔ اور آنیوالی بلا کا انتظار کرنے لگا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ خدا کا یہ عذاب میری ہی وجہ سے نازل ہوا۔ اس حالت میں ایک گھنٹہ میں نے گذارا اور اس وقفہ میں جس تکلیف کا مجھ کو سامنا کرنا پڑا شاید دوزخ میں بھی اسکا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ گرم ریت میرے جسم کے مسامات کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ میں مشکل سے گرم ہوا میں سانس لے سکتا تھا۔ جو میری زندگی کا واحد سبب تھی۔ آخرکار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آسانی سے سانس لے سکتا ہوں۔ میں نے اپنا سر اٹھایا۔ لیکن میری آنکھیں اپنا نور ضائع کر چکی تھیں۔ اسلئے کہ میں کسی چیز میں امتیاز نہیں کر سکتا تھا جس طرف نظر اٹھتی ایک زرد فضا کے سوا اور کچھ سوجھائی نہ دیتا۔ میں سمجھ گیا کہ میں اندھا ہوگیا ہوں۔ اور ایک اندھے کو صحرائے الطیہ میں کس بات کی توقع اور امید ہو سکتی ہے؟ میں نے اپنی گردن جھکالی اور اپنی بیوی بچوں کا خیال کرنے لگا۔ میری آنکھیں بھر آئیں اور میں رونے لگا۔

جب رو چکا تو میری طبیعت کو کچھ سکون ہوا۔ میں نے پھر اپنا سر اٹھایا ــــ اب میں دیکھ سکتا تھا۔ میں خدا کی اس بڑی نعمت کا شکرگذار ہوا۔ ہاں میں دیکھ سکتا تھا۔ اچھی طرح لیکن میں نے کیا دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان دھلا ہوا ہے اور صحرا کا بسیط دامن بالکل خالی ہے۔

ہزاروں زائرین میں سے ایک بھی نہیں۔ امیر اور اس کے مصاحبوں [illegible] بسبت

شیخ سب غائب تھے۔ ریت کے ڈھیر جا بجا نظر آتے تھے۔ شاید وہ سب ان میں مدفون تھے تمام کے تمام نذرِ اجل ہو چکے تھے بجز ایک کے اور وہ میں تھا جسکو زندہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ شاید مرنے سے پہلے ابھی مجھے اور مصائب جھیلنے تھے۔ میں بالکل مایوس تھا لیکن بیوی اور بچوں کا خیال آتے ہی مجھ میں قوت پیدا ہو گئی۔ اور ان کی وجہ سے میرے دل میں جینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے اپنے شملہ سے کچھ کپڑا پھاڑا اور ناک سے ریت پونچھی۔ جس میں سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ اور لاشوں سے پٹی ہوئی ریت پر چلنے لگا۔

ریت کی پہاڑیوں کے درمیان مجھے بہت سے اونٹوں کی نعشیں ملیں۔ جو ریت میں ڈھپی ہوئی نہ تھیں پانی کی تلاش میں میں ہر طرف دوڑا کہ اپنی بڑھتی ہوئی پیاس بجھاؤں لیکن اونٹوں کا تمام پانی بہہ چکا تھا۔ اور ایک قطرہ بھی پینے کو نہ تھا۔ اس وقت میں نے قصد کیا کہ اونٹ کا پیٹ چاک کر کے پانی حاصل کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور اپنی تشنگی بجھائی۔ اگرچہ پانی کافی گرم تھا مگر مجھے شیریں تر معلوم ہو رہا تھا۔ جب پیاس بجھ گئی اور مجھ میں کچھ قوت آئی تو میں دوڑا ہوا دوسرے اونٹوں کے پاس گیا تاکہ بدبو پیدا ہونے سے پہلے ہی پانی حاصل کر لوں۔ اس طرح میں نے اپنی نصف چھاگل بھر لی۔ پھر میں اپنے اس اونٹ کے پاس گیا جس کے نیچے میں نے طوفان کے دوران میں پناہ لی تھی۔ اور اسکے مردہ جسم پر بیٹھ کر اپنے سفر کے مناسب طریقوں پر غور کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں سے قصر اگاباتک پہنچنے کے لئے ایک رات کا سفر درکار ہے۔ اور مجھے وہ سمت بھی معلوم تھی۔ جدھر مجھے جانا تھا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی توقع بہت کم تھی۔ دن تقریباً ختم ہو رہا تھا۔ اس لئے میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ سورج جب پردۂ شفق میں روپوش ہو گیا تو میں نے پانی کی چھاگل اپنے کاندھے پر ڈالی اور اپنا مایوسی آور سفر شروع کر دیا۔ تمام رات چلتا رہا۔ صبح ہو گئی اور میں نے سفر ختم کر دیا۔ کاروانی سفر کی نصف راہ میں طے کر چکا تھا یعنی ایک رات مجھے اور چلنا تھا۔ اور دن بھر ریگستان میں بغیر کسی پناہ یا سایہ کے سفر کرنا تھا۔ اگرچہ میرے پاس پانی کافی تھا۔ لیکن کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا جب سورج پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی گرم کرنیں صحرا میں پھیلانے لگا تو میں جلتی ہوئی ریت پر ایک ریتلے ٹیلے کے نیچے بیٹھ گیا۔ تاکہ دھوپ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ نصف دن تک میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ میرا دماغ گرمی سے معطل ہو گیا تھا اور میری نظریں مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ پانی کا شفاف چشمہ کچھ فاصلہ پر ابل رہا ہے۔ اسکے وجود کا مجھے اس قدر یقین ہوا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اور اس کی طرف دوڑا لیکن وہ محض سراب تھا۔ دوسری مرتبہ میں نے دیکھا کہ چند درخت مجھ سے چند قدم کی دوری پر لہلہا رہے ہیں۔ میں بے ساختہ وہاں پہنچا۔ مگر وہ خار دار جھاڑیاں تھیں ——— اس طرح تمام دن پریشان ہوتا رہا۔ آخر کار سورج چھپا۔ رات آئی۔ اور

جگمگ جگمگ کرتے ہوئے ستاروں نے مجھے سفر جاری کرنیکا پیغام دیا۔ میں نے اپنی چھاگل سے خوب سیر ہوکر پانی پیا اور اپنی ویران راہ پر گامزن ہوگیا۔ ان اونٹوں اور گھوڑوں کی ہڈیوں نے میری رہبری کی۔ جوگذرنے والے کاروانوں میں آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ اس راہ پر میں چلا گیا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور میں نے دیکھا کہ قصر الکابا اب تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے۔ خوشی کی لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ پانی کی چھاگل کو میں نے پھینک دیا۔ اور اپنی رفتار کو تیز کر دیا۔ شفاف پانی سے چھلکتے ہوئے چشمے کے کنارے بیٹھ کر میں نے سیر ہوکر پانی پیا۔ میری اسوقت کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں سایہ دار درختوں کے نیچے لیٹا ہوا خوشنوا طائروں کے نغموں سے مسرور ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ایک گھنٹے کے بعد میں اُٹھا۔ غسل کیا اور پھر پانی پی کر گہری نیند سو گیا۔

جب میں بیدار ہوا تو طبیعت ہلکی ہوچکی تھی لیکن ایک چیز مجھے تکلیف دے رہی تھی وہ بھوک تھی۔ میں نے تین دن سے کچھ کھایا نہ تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یک گونہ اطمینان تھا۔ شام کے وقت جب سورج کی واپسیں نگاہیں کرۂ ارض سے ہٹنے لگیں تو میں بطور تفریح دور تک نکل گیا اس امید پر کہ شاید کوئی کارواں آتا ہوا دکھائی دے۔ مگر بے سود۔ میں اپنے مقام پر واپس آگیا۔ دو دن اور گذر گئے اور میری طاقت جواب دینے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں مر رہا ہوں۔ لیکن ایسی جگہ مرنا جہاں چشمے ابل رہے ہوں چڑیاں گا رہی ہوں۔ اور سرد ہوا چل رہی ہو۔ اس زندگی سے بہت بہتر تھا۔ جو صحرا کی نذر ہو جاتی۔ میں چشمہ کے قریب مرنے کے لئے لیٹ گیا۔ اس لئے کہ اب میں زیادہ بیٹھ نہ سکتا تھا۔ جب میں نے کروٹ لی تو کوئی چیز میرے پہلو میں چبھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ خیال ہوا کہ کوئی پتھر ہے لیکن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی سخت چیز میرے کوٹ کے جیب میں ہے۔ اندر ہاتھ ڈال کر میں نے اسے نکالا اور قبل اس کے کہ اُسے پھینک دوں میں نے دیکھا کہ وہ خشک روٹی ہے۔ یہ ایک غیبی امداد تھی۔ اس لئے کہ جب میں گھر سے روانہ ہو رہا تھا تو میری چھوٹی بچی نے میوے وغیرہ کی تلاش کرتے ہوئے اس روٹی کو جو اُسے کھانے کیلئے دی گئی تھی میری جیب میں ڈالدیا تھا پانی میں تر کر کے شکر کے آنسوؤں کے ساتھ میں نے روٹی کھائی۔ اس طرح میری جان بچ گئی۔ دوسرے ہی دن ایک کارواں آگیا۔ جو قاہرہ جا رہا تھا۔ سوداگروں نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی کی اور مجھے میرے وطن لے آئے۔

اطلاع رنگون میں رسالہ "ادب لطیف" کے سول ایجنٹ منشی عبدالرزاق خاں نظامی فیض آبادی ایجنٹ اخبارات پوسٹ بکس ۳۳ مکان ۱۷۲ بارا سٹریٹ میں ہیں۔ وہاں سے ہر ماہ تازہ بتازہ رسالہ پانچ آنے میں ملے گا۔

منیجر رسالہ "ادب لطیف" لاہور

جناب شیخ محمد یوسف ظفر بی۔اے

غزل

نہ پوچھ مجھ سے شب انتظار کی باتیں
فریب خوردۂ دل بیقرار کی باتیں

بہار لائی ہے پیغام چاک دامانی
نہیں ہیں کچھ یہ مرے اختیار کی باتیں

وہ جلوہ کیا تھا وہ آخر جمال تھا کس کا
کلیم کچھ تو کہو کوہسار کی باتیں

تم اپنے جذب تغافل کا رُخ ادھر پھیرو!
رہیں گی یاد کسی جاں نثار کی باتیں

گھٹا اُٹھی ہے مے لالہ فام لا ساقی
سنا نگاہ سے ابر بہار کی باتیں

مری نگاہ میں پھرتی ہے یار کی صورت
مری زبان پہ جاری ہیں یار کی باتیں

کہاں ہے آہ کہاں ہے ظفر وہ عہد شباب
وہ چاندنی وہ لب جو وہ پیار کی باتیں

نوشتہ پی۔ این سکیور

مترجمہ جناب اثر چکوالی بی۔ اے

مسز سروجنی نائیڈو بحیثیت شاعرہ

وہ حضرات جنہوں نے مسز سروجنی نائیڈو کی طبیعت کا مطالعہ واقعاتِ حال سے کیا ہے یہ بات اُن کے لئے باعث افسوس ہوگی، کہ مسز موصوف کی پہلی آرزوئیں سیاسیات کی بجائے شاعری سے وابستہ تھیں۔ آپ کی والدہ نے آپ کے متعلق ایک دفعہ کہا تھا کہ "یہ لڑکی کتنے سکون پرور خیالات کی مالکہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ کتنی خود رائے ہے"۔ خود رائی کا اظہار آپ نے ستیہ گرہ نمک اور سول نافرمانی کے علاوہ، قید خانوں لیکچر گاہوں اور عوام پر تنقید کرنے میں کیا اور طبیعت کی "سکون پروری" آپ کی شاعری کی آئینہ ہو کر رہی۔

سروجنی نائیڈو کی شاعری بدمست و مخمور عمر خیام کی مانند منجمد اور سست خیالات کی حامل نہیں ہے۔ بلکہ آپکی شاعری کی دو خصوصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو پیٹر نے لیونارڈو ڈاونسی کے متعلق کہی تھیں یعنی "جدت نگاری" اور "پرستشِ حسن" ان ایام میں جب ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم قریباً قریباً ناپید تھی، مسز سروجنی نے مدراس یونیورسٹی سے صرف بارہ سال کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ آپ کے والد ڈاکٹر "اگھور ناتھ چٹوپادیہ" نے آپ کو پہلے "کنگ کالج" میں بھیجا اور ازاں بعد "گرٹن" میں جہاں آپ اڈمنڈ گوس اور آرتھر سائمنز کے ادبی ذوق سے متاثر ہوئیں۔

ان دو بزرگ ہستیوں کے پُرزور ایما پر ہی آپ نے پہلے پہل میدان شاعری میں قدم رکھا۔ اور یہ سچ ہے، کہ نومشقی کے ایام میں آپ انگریزی کلاسکز کی نقال کے سوا اور کچھ نہ تھیں لیکن بعد ازیں آپ دکن کی ایک اعلیٰ پایہ کی شاعرہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش ہوئیں۔

"اڈمنڈ گوس" کی نصیحت آپ کی شاعرانہ زندگی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ بجائے اس کے کہ آپ انگریزی شاعری کے "شائقین" کے ذوق کی ترجمانی کرتی ہوئی "ابن سکائی لارک" اور برف پوش میدانوں کے متعلق خیالی نظمیں لکھتیں۔ آپ نے اپنے "کمالِ زبان" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملک کے "نرگس بھرے باغات" اور "سرلیشہ سے ڈھنپی ہوئی وادیوں" کے گیت گائے۔ آپ نے بتایا، کہ "خوبصورت نیم کے پتوں سے جگنو ناچتا ہوا دکھائی دیتا ہے دلہن کے ماتھے پر تلک کے سرخ رنگ کی بہار ہونٹوں پر پان کی لالی کی کیفیت کس قدر دلآویز معلوم ہوتی ہے"۔

جو بات سروجنی نائیڈو کی شاعری کو سب سے زیادہ امتیاز بخشتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے مغربی زبان میں ٹھیٹھ اور خالص مشرقی تشبیہوں اور خیالات کو ڈھالا ہے جن کو کہ

نے "ہندوستان" کو دیکھا ہے، وہ آپ کے ہر شعر سے "ہندوستانی مناظر" کی حقیقت زا تصویر دیکھ سکتے ہیں آپ کس عجیب انداز میں فرماتی ہیں :-

"انار کے درخت کے غنچے اور سریشہ کے پھول" اور "چمکتے ہوئے غلہ کی زرد گھٹیاں" وہ جب پڑھیں گے، "میرے گرد ہوا سے ہلتی ہوتی چمپا کی ٹہنیاں جب پھولوں کو جنبش دیتی ہیں، تو وہ گرتے ہی بکھر جاتے ہیں" یا "میرے تنہا بستر کی دونوں طرف معطر بارش میں چکوروں کا دھیما دھیما گیت کیسا پُر لطف ہے۔ تو انہیں دکن کے عطر آگیں جنگلوں کی یاد کس قدر ستائے گی! لیکن آپ کی اس خصوصیت شاعری کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے، کہ ہم مئی کی صبح کو کسی ہندوستانی باغ میں گھنٹوں گھومے ہوں۔ پیاس، درد، تکان، اشجار کی دلآویز خاموشی گہرا سایہ، لطیف و رقیق نسیم، ان تمام کو پا کر انسان کے دل سے ایک پُر معنی آہ نکلجاتی ہے، جیسا کہ آپ کے ان شعروں سے ظاہر ہے !-

"دنیا کے مصائب کو نظر انداز کر کے نا ما رند- مولسری اور نیم کے درختوں کی الجھی ہوئی شاخوں میں تنہا لیٹ جائیں اور نور بھرے خواب دیکھیں۔"

دعا کا سماں آپ نے کس عجیب انداز سے باندھا ہے "میں جب غلے کے پودوں سے بنے ہوئے مسلسل چبوتروں سے تیری (خدا کی) صبح کے سنہری عکس کا نظارہ کرتی ہوں" مگر یہ منظر صرف اُن اہل نگاہ کے لئے کچھ حقیقت رکھتا ہے جنہوں نے کبھی نور کے تڑکے کسی پہاڑی کی ڈھلوان پر کھڑے ہو کر سامنے کے کھیتوں کی سیر کی ہو۔

ان تمام شعروں میں ایک ایسی لطافت پائی جاتی ہے جو کسی دوسرے ہندوستانی شاعر کے ہاں ناپید ہے۔ اور یہ حقیقت سے بعید نہیں۔ کہ ان شعروں میں نسوانی عمیق و فہیم نظر اور نسوانی فطرت کی خاموشی ایک نادر طریق سے آپس میں وابستہ ہیں۔

"نسترن" سے کیسی اچھوتے رنگ میں خطاب کرتی ہیں "تمہارے پتوں میں جو یہ خوشبو اور آگ مستور ہے۔ وہ ساوتری کے ملال، سیتا کی التجا۔ دروپدی کے جذبۂ شوق دمینتی کے خوف اور حسین شکنتلا کے جادو بھرے آنسوؤں کی نشانی ہے"۔ یہ صرف ایک ہندوستانی خاتون کو ہی حق حاصل ہے، کہ وہ "ستی" کی حقیقت کو اس انداز میں بیان کرے، "میری زندگی کے سرچشمے! موت کی بے پناہ تلوار نے ہم کو شکستہ الفاظ کی طرح جدا کر دیا ہے۔ ہم ایک تھے، مگر اُس نے دو حصے کر دیئے ہیں، کیا جسم روح کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟ "کیا پھول درخت کے خشک ہو جانے پر تر و تازہ رہ سکتے ہیں؟"

"ہندوستانی ناچ" کے مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں :

"کچھ خاموش کچھ گاتے ہوئے، پھول کی جو بادِ نسیم اور بارش کی پھوار سے جھک جاتا ہے" یا "چاند کے متعلق لکھتی ہیں" :-

آسمان کے نیلے ماتھے پر تفرقہ انگیز داغ

جن حضرات کو کبھی ہندوستانی راگ سننے کا موقع

موقعہ ملا ہے، وہ ذیل کی نظم "طائر وقت" سے لطف اندوز ہونگے فرماتی ہیں:۔

"نغمہ محو آہ و خواب ہے"۔

وہ ہیجان میں ہے ــــــ اب وہ سو گیا ہے؛
پھر آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہے، وہ رو رہا ہے، اب وہ بڑبڑا رہا ہے
عورت کے اندوہگیں دل کی طرح
اب وہ نہیں رہا ہے، وہ چلا رہا ہے، اب وہ بے اختیار ہو گیا ہے۔
رات کو ایک عاشق کی طرح
وہ پھر سانس ہے کسی اچانک جذبے کے باعث
وہ پھر کراہنے لگا ہے۔ رفتہ مسرتوں کی یاد آتے ہی۔

مسز سروجنی نیڈو کی شاعری محض ہندوستانی مناظر ہی کی آئینہ دار نہیں ہے، بلکہ آپ کی شاعری میں "روح مسرت" بھی نمایاں ہے۔ جو شیلے کی شاعری میں انکی نسبت بہت کم محسوس کی جاتی ہے۔ یہ "روح مسرت" آپ کی نظموں میں مسلسل جاری و ساری ہے جسکو آرتھر سائمنز نے "روح بیداری" سے مشابہت دی ہے، ذیل کے مصرعے ملاحظہ ہوں:

"برق کے پاؤں سے بھی زیادہ تیز رفتار ــــــ
یا ــــــ خمار آلود میدان، اور خواب آور کنوئیں ــــــ
اور تھکی ہوئی محنت کاتہ شدہ بازو ــــــ

آپ کی شاعری میں شیلے کی جذبات پروری ہی نہیں ہے، بلکہ خوبصورتی کا کمال" بھی عیاں ہے، جس کے باعث میتھو آرنلڈ کیٹس کو شکسپئر سے مشابہت دی تھی، سروجنی کی یہ خصوصیت نیچے ذیل کے شعروں میں ملاحظہ ہو۔

ازل کی "مبہم" دعیبی صدائیں"
یا "شہرت کی تہیں لپیٹتا ہوا
یا "میری نو بیدی قلب کا تند اور نا ہموار موسم ــــــ موسم بہار"

یا "لنڈن سے الوداع" میں فرماتی ہیں:"

"سمندر سے گھرا ہوا فتح مند شہر، جہاں نصرت اور مصیبت کی لہریں آ کر ٹکراتی ہیں۔ انسانیت کا قدیم شور و غوغا"
یا "جس طرح صدف کے ہونٹ سمندر کی نازک نواؤں کو چھپا لیتے ہیں۔"

سروجنی نایئڈو کی شاعری میں ایک اور چیز جو یقیناً قابل ذکر ہے، وہ الفاظ کی اچھوتی، چست، شاندار اور دلآویز بندشیں ہیں، مثلاً "صندل بیز فرصت" بادلوں کی آوارگی یا "گہرے گیتوں کے سحر کی مانند۔ محبت"

شاعر ہمیشہ اپنے اچھوتے خیالات کے باعث زندہ و جاوداں ہوتا ہے، اور یہ چیز ورڈز ورتھ کے کلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، لیکن یہی خصوصیت سروجنی نیڈو کی شاعری کا بھی طرۂ امتیاز ہے، فرماتی ہیں۔

بچو ــــــ تم محسوس کرتے ہو
کہ زندگی خوابوں کے حسین حبابوں کی مانند ہے۔
یا ــــــ ہم غم ہستی پر سوز و ساز نغمہ سے ختم پائیں گے:

آپ کی شاعری میں "شیلے" کی طرح محض جذبات پروری نہیں ہے۔ بلکہ ورڈز ورتھ کے نقطۂ نظر سے

"مشاہدات" کی ہی حامل ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں ایک اور چیز بھی کارفرما ہے، اور وہ تخیل ہے اور یہ بات حقیقت سے خالی نہیں ہے، کہ آپ کی بعض نظموں میں غیر پختگی کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود آپکی نظموں میں ایک عمق اور جدت ہے جو میتھو آرنلڈ کے نقطہ نظر سے کمال شاعری ہے:

آپ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے آپ کی پرواز تخیل تک پہنچنا آسان ہے۔ مگر یہ اس سے بھی آسان تر ہوگا، کہ ہم آپکی شاعری میں "ہم آہنگی" اور "سنجیدگی" کا مطالعہ کریں، اور آپکے طرز بیان کی خوبصورتی اور بولتے ہوئے الفاظ سے لطف اندوز ہوں۔

جناب قیسی رام پوری

جذباتِ قیسی

مجھے مغموم رہنا ہے۔ مجھے رنجور رہنا ہے
مقدر میں مرے تجھ سے ہمیشہ دور رہنا ہے

حدیث شوق اُنکے سامنے کہنے نہیں بنتی
یہ شیریں راز سینے میں یونہی مستور رہنا ہے

مجال استقامت! المدد رخصت نہو مجھ سے
خدا جانے ابھی کب تک مجھے مقہور رہنا ہے

محبت کا زمانہ جا چکا اب یاس ہے میں ہوں
اسی اندوہگیں عالم میں اب مسرور رہنا ہے

خراب سوز ہوں یہ سوز ہے ان کا عطا کردہ
مجھے اس بادۂ رنگیں سے ہر دم چور رہنا ہے

عبث ہے عشق کی ناکامیوں پر اسقدر ماتم
یہی دستور اسکا ہے یہی دستور رہنا ہے

جفا و لطف کا حل کر چکا ہوں مسئلہ قیسی
مجھے اسکی رضا کے سامنے مجبور رہنا ہے

میرزا ادیب　　افسانہ

ماہی گیر کی بیٹی

بوڑھا نادو، ہر روز علی الصبح مچھلی پکڑنے کا پرانا اور فرسودہ سامان لیکر دریا کے کنارے آجاتا، ایک میلی کچیلی چٹائی جو نہ معلوم کتنے عرصے سے اس کے پاس تھی۔ ریت پر بچھا دیتا۔ کانٹے میں آٹا لگاتا اور خدا کا نام لیکر "ڈوری کو پانی میں پھینک کر چٹائی پر بیٹھ جاتا۔ ریت میں ایک موٹی سی دو شاخہ لکڑی گاڑھ دیتا اور ڈوری اُس میں سے گذار دیتا۔ کبھی تو جلد چار پانچ مچھلیاں ہاتھ آجاتیں جنہیں وہ تھیلے میں ڈال کر خوشی خوشی گھر کو روانہ ہو جاتا اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ گیارہ بج گئے ہیں۔ اور ایک مچھلی بھی حاصل نہیں ہوئی، مگر اس مایوسانہ حالت میں بھی وہ بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ آفتاب نصف النہار پر پہنچ جاتا۔ اور حدتِ آفتاب کی شدت سے تنگ آکر، دریا پر مایوس نظریں ڈالتے ہوئے گھر کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔

دریا پر کئی شکاری آتے تھے بعض ڈوری کے ساتھ شکار کرتے تھے اور بعض جال کے ساتھ۔ مگر جس استقامتِ طبع ــ اور پابندی وقت کے ساتھ بوڑھا "نادو" اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ اس سے باقی تمام شکاری محروم تھے۔ وجہ یہ تھی کہ نادو کا ذریعۂ معاش صرف مچھلی پکڑنا تھا، اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی جسمیں اس کی زندگی کی تمام دلچسپیاں مرکوز ہوکر رہ گئی تھیں نیہتی اصغری اس کی زندگی کا سہارا تھی اور اس طرح وہ ہر روز اس سے ملتا تھا۔ اس کی پیاری پیاری باتیں سنکر دل بہلاتا تھا۔

اپنے ہم پیشہ لوگوں اور اپنے احباب و اقارب سے وہ بہت کم بولتا تھا۔ کوئی ضروری بات ہوئی تو کہدی۔ ورنہ اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف۔ اس کے جاننے والے اسکے متعلق بہت کم جانتے تھے لوگوں کو صرف اتنی خبر تھی کہ وہ نہایت غریب آدمی ہے جس کی گذر ان اوقات مچھلی کے شکار پر ہے۔ اور جو شہر کے نشیب حصے میں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے ــــ کچھ بھی نہیں جان سکتے تھے۔ کسے خبر تھی کہ یہ بوڑھا نحیف و نزار غریب مفلس انسان جو ہر روز نور کے تڑکے دریا کے کنارے مچھلیوں کا شکار کرتا ہے۔ خود قسمت کا شکار ہے۔ عالمِ جوانی میں وہ ذی حیثیت آدمی تھا۔ شہر میں تین چار مکان تھے۔ ان کے علاوہ کچھ زمین بھی تھی۔ مسرت و فارغ البالی کے سائے میں وہ زندگی بسر کر رہا تھا کہ قسمت نے پہلا تیر ستم اس کے سینے پر مارا۔ اسکا

بڑا لڑکا چند مہینے بیمار رہ کر مر گیا۔ نادو رو پیٹ کر صبر کر کے بیٹھ رہا۔ ایک سال بعد اسکا دوسرا لڑکا ــــــ اس کی آنکھوں کا تارا موت کی تاریکیوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ ان صدموں کی تاب نہ لا کر اس کی بیوی بھی دنیا سے چل بسی۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر رشتہ داروں نے بھی اُسے لوٹنا شروع کر دیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد دنیا میں وہ بے یار و مددگار رہ گیا۔ اس کی رفیقۂ حیات، اس کے جگر پارُں کو موت نے چھین لیا تھا۔ اور اس کی جائداد اس کے رشتہ داروں نے! یہی اس کی گذشتہ زندگی کی روداد جسے وہ کسی کو بھی سنانا نہیں چاہتا تھا۔ اور اب اس کی زندگی میں صرف دو دلچسپیاں باقی تھیں مچھلی پکڑنا اور ننھی اصغری سے باتیں کرنا۔

اصغری ایک ماہی گیر کی بیٹی تھی جو دریا کے قریب ہی رہتا تھا۔ اصغری اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور نہایت ذہین و ہوشیار! جب وہ طفلانہ معصومیت سے ننھے ننھے ہاتھ اسکی گردن میں ڈالکر میٹھی زبان میں میٹھی میٹھی باتیں کرتی تو بوڑھے کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا۔ مغموم دل کی کلی جس سے تلخ واقعات کے سموم انگیز جھونکوں نے زندگی کا ولولہ و جوش، تازگی و شادابی چھین لی تھی۔ کھل کر گل خنداں کی صورت اختیار کر لیتی اور وہ دفور مسرت سے اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا۔

نادو ہر روز دریا کے کنارے بیٹھ کر اسکا انتظار کرتا رہتا وہ چپکے سے آتی اور سب سے پہلے بوڑھے کے تھیلے میں ہاتھ ڈالتی اگر کوئی مچھلی ہوتی تو اُسے اٹھا کر بوڑھے کے ہاتھ کے پاس رکھدیتی۔ جب بوڑھے کا ہاتھ اس پر لگتا تو وہ زور سے قہقہے لگا کر دور جا کھڑی ہوتی۔ یا کوئی چھوٹی مچھلی اس کی قمیص میں ڈالدیتی۔ بوڑھا متبسم ہو کر قمیص میں ہاتھ ڈالکر مچھلی نکالنے لگتا۔ اور ساتھ ہی کہتا بڑی شریر ہے تو اچھی!

"میں نے کیا شرارت کی ہے بابا!"

"یہ کیا کیا! مچھلی میری قمیص میں ڈالدی"

"میں تو ابھی آئی ہوں"

"تو ابھی آکر ہی شرارت کی ہے نا!"

"بابا! ہر وقت تم میرا نام ہی لگاتے ہو۔ اور کسی کا نام کیوں نہیں لیتے۔ میں ہی شرارت کرنے والی رہ گئی ہوں۔"

"تمہارے سوا اور کون ہے؟"

"وہ دیکھو کتنے آدمی بیٹھے ہیں" ننھی اصغری دور، دریا کے کنارے شکاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی۔

"تو انہوں نے آکر میری قمیص میں مچھلی ڈالدی؟؟"

"ہاں بڑے شریر ہیں، ٹھیک ہے نا بابا؟" قہقہہ لگا کر وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ جاتی۔

"شریر اچھی!" یہ کہتے ہوئے نادو مسکراتا اور اپنے شغل میں مصروف ہو جاتا۔

"آج کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں بابا؟"

"تم تو آتے ہی تھیلے کو دیکھتی ہو اور اب مجھ سے پوچھ رہی ہو بابا! کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں؟"

"وہاں تو صرف دو ہیں!"

"تو سمجھ لو دو ہی پکڑی ہیں"

"بابا! کل تو اسوقت تک تم نے چار پکڑ لی تھیں؟

"کل کی بات کل کے ساتھ ہے"

"آج زیادہ پکڑو ـــــ" اور بابا! میرا دل چاہتا ہے ان بیچاریوں کو انکے گھر پہنچا دوں"

"کن کو؟"

"ان مچھلیوں کو۔ بیچاریوں کو پکڑ رکھا ہے۔ کیا فائدہ!"

"پہنچا دو اور میں تمہیں دریا میں پھینک دونگا"

"میں بھاگ جاؤں گی۔"

"تو میں نہیں بھاگ سکتا؟"

الغرض اس قسم کی باتیں ہوتی رہتیں۔ بڈھے نادو کو ننھی اصغری سے اتنا پیار اتنی محبت تھی جتنی ایک والد کو اپنی اولاد سے بھی نہیں ہوسکتی۔!

وقت گذرتا جارہا تھا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ نادو کی پدرانہ محبت بھی بڑھتی جارہی تھی۔ ننھی اصغری اسکے پاس بیٹھی رہتی۔ اور وہ جانے لگتا تو کہتی "بابا! آج تم دیر سے آئے تھو کل سویرے آنا" نادو دوسرے دن زیادہ سویرے آتا۔ اور ننھی اصغری فوراً اُس کے پاس پہنچ جاتی۔ باپ اُسے روکتا کہ "ابھی اتنی سویرے نہ جاگا کرو، بیمار ہو جاؤ گی" مگر وہ نادو کے پاس جانے سے نہ رُکتی۔

(۲)

اصغری ایک غریب مفلوک الحال اور دائم المرض ماہی گیر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں کو وفات پائے چار سال گذر چکے تھے۔ دنیا میں ماں کی دائمی جدائی سب سے زیادہ مصیبت ناک سب سے بڑھکر الم انگیز اور سب سے بڑا حسرت ناک واقعہ ہے مگر باپ کی محبت اور بوڑھے ماہیگیر کی پدرانہ شفقت نے بچی کے ننھے دل سے اس صدمہ و غم کے اثرات کو بہت حد تک زائل کر دیا۔ وہ گھر پر ہوتی تو باپ کی پدرانہ محبت کے راحت انگیز سائے میں مسرورانہ قہقہے لگاتی اور بوڑھے ماہیگیر کے پاس ہوتی تو خود کو باپ سے بھی بڑھکر محبت کرنے والی ہستی کے مسرت بخش آغوش میں پاتی۔ باپ دائم المرض ہونے کے باوجود ہر وقت اسکا خیال رکھتا تھا۔ بوڑھا ماہی گیر غریب ہوتے ہوئے بھی سب کچھ اس پر نثار کرنے کے لئے تیار رہتا۔ اور نثار کر رہا تھا۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ لیکن اسکی مسرت زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ وقت کے ہاتھوں نے غم کا زہراب اسکے تشنہ چشیدہ ہونٹوں سے لگا ہی دیا۔ اسکا باپ، ماں سے بڑھکر پیار کرنے والا باپ اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ ننھی اصغری کے دل میں کبھی بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اسکا پیارا باپ اسے دائمی جدائی کا زندگی کش صدمہ دے جائیگا۔ اُسکے ننھے دماغ میں ہرگز یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ دنیا میں اتنا بڑا صدمہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک ندی پہاڑ کے آجانے سے یک لخت رُک جاتی ہے۔ اسی طرح مسرتوں کی منزل کو طے کرتی ہوئی اس کی خوش نصیب زندگی اس صدمے کے احساس سے خاموش، مایوس اور گم سم ہوکر رہ گئی۔ اس وقت جبکہ صدمے کا تلخ ترین احساس اُسے موت کے قریب لا رہا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر کی بے پایاں محبت نے اسکی معصوم زندگی کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال لیا۔ باپ مرگیا مگر باپ سے زیادہ محبت و شفقت کرنے والے بوڑھے نے اُسے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اُسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ باپ کی موت کا حادثہ معمولی حادثہ نہیں تھا۔ لیکن بوڑھے کے

پدرانہ سلوک نے اسکا غم دور کر دیا۔ اب وہ پھر مسرور تھی، پہلے سے بھی بڑھ کر مسرور۔

نادو بے حد غریب تھا، مگر اصغری کی کوئی ضرورت ایسی نہ تھی، جسے وہ پوری نہ کرتا ہو بعض اوقات خود بھوکا رہتا لیکن بچی کو نفیس کھانا دیتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کہ اصغری نے کسی چیز کی آرزو لبوں سے نکالی ہو۔ اور بوڑھے نے اُسے پورا نہ کر دیا ہو۔

اب اصغری بارہ سال کی ہوگئی تھی۔ بوڑھا نوجوانانہ ہمت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے پیش نظر اصغری کا مستقبل تھا۔ جسے وہ زیادہ سے زیادہ شاندار بنانا چاہتا تھا معلوم نہیں اُسکے بوڑھے، کمزور اور ضعیف ہاتھوں میں کہاں سے قوت آگئی تھی، کہ وہ زیادہ وقت محنت و مشقت میں صرف کرتا تھا اور تکلیف کا ذرہ بھر احساس نہ کرتا تھا۔ لوگ اس کی ہمت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اصغری جوان ہو رہی تھی۔ اور اُس کے حسن و جمال میں برابر ترقی ہو رہی تھی۔ ماہی گیر کی انتہائی خواہش تھی کہ اصغری کی شادی امیرانہ شان و شوکت سے کرے، اور اس کے لئے روپے کا فراوانی کے ساتھ موجود ہونا اشد ضرور تھا۔ اس لئے ماہی گیری چھوڑ کر وہ مختلف کام کرنے لگا تھا۔

آج ایک مدت کے بعد اصغری کے اصرار پر وہ دریا پر آیا تھا۔ اصغری بھی اُسکے ساتھ تھی۔ دریا میں ڈوری پھینک کر ایک ٹیلے پر بیٹھا ہوا وہ مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اصغری اسکے قریب بیٹھی ہوئی دریا کی ساحل سے ٹکراتی ہوئی لہروں کا منظر دیکھ رہی تھی، یکایک وہ اٹھی اور کنارے پر ٹہلنے لگی۔

"کہیں دور نہ جانا"! بوڑھے نے کہا۔

"نہیں بابا! میں یہیں ہوں"

بوڑھا ماہی گیر اپنے خیالات کے ہجوم میں غرق ہوگیا اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے" کانٹے" کے ساتھ مچھلی لگی ہے یا نہیں۔ اصغری اس کے قریب ٹہل رہی ہے یا دور نکل گئی ہے۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف ایک چیز تھی اور وہ تھی اصغری کی شادی۔ بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی۔ یکایک اُسے اصغری کا خیال آیا اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، اصغری وہاں نہیں تھی ....

.... اس نے آواز دی مگر جواب ندارد۔ اس نے سمجھا کہیں دُور چلی گئی ہے، ابھی آجائے گی۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مچھلی پکڑنے کا سامان تھیلے میں ڈالا اور ایک اونچے سے تودے پر چڑھ کر اصغری کو دیکھنے لگا مگر اصغری کی صورت کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی ـــــ بوڑھے کے دل میں اضطراب پیدا ہوا، نیچے اتر کر وہ اس طرف چلنے لگا۔ جدھر اصغری کو اُسنے جاتے دیکھا تھا۔ کافی دور چلا گیا مگر اصغری کہاں؟ اس کا اضطراب بڑھنے لگا۔ اِدھر اُدھر اصغری کے متعلق پوچھا۔ مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ دو گھنٹے تک وہ اصغری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ ایک روح کش خیال اسکے دماغ میں آ رہا تھا۔ اور وہ تھا شاید اصغری دریا میں ڈوب گئی ہے۔ جب وقت یہ واہمہ ہولناک صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتی۔ تو اس پر بجلی ٹوٹ پڑتی۔ دنیا آنکھوں تلے تاریک

ہوجاتی اور کائنات اس کی نگاہوں کے سامنے خون کی لہروں پر لرزنے لگتی۔ مایوس ہوکر وہ دریا میں کودنے ہی لگا تھا کہ لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اور اُس کی ڈھارس بندھائی انہوں نے کہا ممکن ہے لڑکی گھر چلی گئی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو کچھ اطمینان ہؤا اور وہ امید وبیم کی کشمکش میں مبتلا وفورِ اضطراب سے دھڑکتے ہوئے دل کو سینے میں لئے گھر کی طرف بعجلت چلنے لگا۔ اصغری ؔ ہاں بھی نہیں تھی۔ اس کی درخشاں امیدیں جو مدت سے اس کے سینے کو منور کر رہی تھیں، مایوسی کی تاریکیوں کے سامنے میں دم توڑنے لگیں۔ دیواریں سانپ بنکر اُسے ڈسنے لگیں "اصغری کہاں گئی۔ اُسے کون لے گیا۔ دریا میں غرق ہوگئی۔" اس قسم کے خیالات نے اُسے نیم مجنوں بنا دیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کوئی سخت بھیانک خواب دیکھ رہا ہے بیچارے نے دریا کا، شہر کا چپہ چپہ چھان مارا۔ مگر اصغری کا نشان یا بھی نہ مل سکا۔ اس جانگداز صدمے نے بوڑھے کی کمر ہمت توڑ دی۔ اس کی جوانانہ سرگرمیاں ٹھنڈی پڑگئیں۔ یہ وہ صدمہ تھا جو اُسے مار دینے کے لئے کافی تھا تاہم ایک امید کہ اصغری ملجائیگی۔ اس کے دل میں موجود تھی اور اسی امید نے اُسکے اور موت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی۔ اسی امید نے قبر کی طرف جاتے ہوئے بوڑھے اور بدنصیب انسان کے قدم روک لئے۔ اس نے تمام محنت ومشقت چھوڑ دی۔ ہر روز علی الصبح ڈوری لے کر دریا پر اسی جگہ جا بیٹھتا۔ جہاں اس کی آرزوؤں نے اُسے دھوکا دیا تھا بعض اوقات تو سارا سارا دن وہ وہیں بیٹھا رہتا ـــــ اور مجنونانہ انداز میں اصغری کو آوازیں دیتا رہتا۔ یہ تھی اس کی زندگی ـــ یہ تھا اصغری کی جدائی کا صدمہ!!

وقت گذرتا جا رہا تھا سینکڑوں زخم جو وقت نے لوگوں کے سینوں پر لگائے تھے، امتدادِ وقت سے مندمل ہوگئے تھے۔ ہزاروں سینوں پر نئے زخم لگ رہے تھے۔ راحتیں مصیبتوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور مصیبتیں راحتوں میں زمانے کا ہمیشہ بہنے والا سمندر بدستور رواں تھا۔ کوئی اس کے کنارے سے حزف ریزے اٹھا رہا تھا۔ اور کوئی اس میں سے موتی حاصل کر رہا تھا۔ انسان ہزاروں دکھ بھول گئے مگر بوڑھا ماہیگیر اپنا صدمہ نہ بھلا سکا تھا روتے روتے اس کی کی بصارت بیحد کمزور ہوگئی تھی مگر دریا پر جانا۔ جاکر اسی جگہ بیٹھنا اُس نے نہ چھوڑا تھا۔

(۳)

ریاست فرحت نگر کے موجودہ حکمران کی چہیتی بیوی "مہرُخ" اپنی سہیلیوں اور خادماؤں کو ساتھ لئے کشتی کی سیر کر رہی تھی کشتی کے ایک حصے میں اس کی سہیلیاں اور خادمائیں بیٹھی تھیں اور دوسرے حصے میں ایک خوبصورت، قیمتی اور دلآویز کوچ پر وہ لیٹی تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا فضا میں نیم روشنی و نیم تاریک سائے گلے مل رہے تھے۔ اس وقت اس کی ہر سہیلی، ہر خادمہ مسرور تھی۔ مگر وہ جسے سب سے زیادہ مسرور سب سے بڑھکر خرم ہونا چاہیے تھا کسی حد تک مغموم تھی۔ اس کی سہیلیاں طرح طرح کے تفریحی مشاغل میں مصروف تھیں۔ مگر وہ ان سب سے بےخبر تھی اس کی نگاہیں دریا کی سطح پر کاغذ کے ایک حقیر ٹکڑے کو خشمگیں لہروں کی مسلسل ٹھوکریں

کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور اُسکا ذہن خیالات کی موجوں
کے تھپیڑے کھاتا ہوا کسی اور دنیا میں جا رہا تھا۔ اُس کی
نظروں کے سامنے ماضی کا پردہ چاک ہوا۔ اب وہ ایک اور دنیا
میں تھی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں آج سے کئی سال پہلے غریب
ہونے کے باوجود وہ مسرور تھی۔

وہ ماہی گیر کی بیٹی تھی۔ مگر بہت خوش۔ باپ کے مرنے
کے بعد ایک بوڑھے ماہی گیر کی بے پایاں محبت نے اُسے
زندگی کی تمام ضروریات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اُس کے لئے
بڈیوں کے اس ڈھانچے میں مادرانہ محبت بھی تھی اور پدرانہ
شفقت بھی! ایک دن دریا کے کنارے وہ ٹہل رہی تھی کہ
اچانک ایک سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی آہٹ اس کے
کان میں آئی۔ وہ ابھی دوسری طرف دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ اُسکی
نگاہوں نے قریب ہی ایک رعنا نوجوان کو دیکھا۔ لڑکی نے بھاگنے
کی کوشش کی مگر نوجوان نے اسکا ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر اُسے
گھوڑے پر بٹھا کر ہوا ہو گیا ——— اسکے بعد وہ ایک نہایت
شاندار محل میں تھی۔ ریاست ذرحت نگر کے ولیعہد نے اس
سے نام اور خاندان کا پتہ پوچھا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ مرعوبانہ
سکوت اس پر طاری رہا۔ چند دن کے بعد ریاست کی فضاؤں
میں یہ خبر گونج رہی تھی کہ ولیعہد ایک نہایت ممتاز خاندان
کی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ اور یہ نہایت ممتاز خاندان
کی لڑکی کون تھی؟ ماہی گیر کی چھوکری۔

یہ تمام واقعات اس کے ذہن میں پھر رہے تھے۔
آخری واقعہ کے ذہن میں آتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی بوڑھے بابا کی
یاد اُسکے دل میں آئی اور وہ اُسکے احسانات اس کی محبت اور
اس کی پدرانہ شفقت کو یاد کرنے لگی۔

کشتی پانی کے سینے پر بہے جا رہی تھی۔ اور اس میں سے
گیت اور نغمات کا ہجوم اُٹھ اُٹھ کر فضا میں رقص کرتا ہوا
مستیاں بکھیر رہا تھا۔ 'مہ رُخ' کا ذہن گذشتہ واقعات کے
جھولے میں جھول رہا تھا۔ محل میں پہنچتے ہی عزت و عظمت
نے اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے ایسی بلند سطح پر بٹھا دیا تھا جہاں
انسان خود کو دوسرے انسانوں سے ممتاز سمجھتا ہے ———
ممتاز سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مسرت و عشرت کی فراوانی نے
اُسکے دل سے گذشتہ واقعات کے بدنما نقوش کو مٹا دیا۔
وہ اب ایک جلیل القدر انسان کی جلیل القدر بیوی تھی عیش و
عشرت میں مدہوش عورت کو کیا معلوم تھا کہ اسکے محل سے بہت
دور دو ضعیف بے نور آنکھیں ہر وقت اُسے تلاش کرتی رہتی ہیں
زندگی کی یہ دردناک ٹریجڈی، روزِ ازل سے ہو رہی ہے۔ اور
ہمیشہ ہوتی رہے گی!

کشتی کافی دیر تک بہتی رہی۔ پھر کنارے پر آ لگی۔ کیونکہ
اب کنارے پر پروگرام تھا۔ ایک طرف ریشمیں خیمہ لگا ہوا تھا
وہ سہیلیوں اور خادماؤں کے جھرمٹ میں اُس کی طرف چلنے لگی
یکایک ایک منظر دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ کچھ دور کنارے پر
ایک بوڑھا ضعیف شخص بیٹھا تھا۔ 'مہ رُخ' کے دل کو ایک
دھچکا سا لگا۔

"حسنو! دیکھو وہ کون شخص ہے" اس نے بوڑھے
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خادمہ سے کہا۔

"ماہی گیر ہے شاید"

"اُسے بلا کر لاؤ نا" 'مہ رُخ' کے لبوں سے بے اختیار نکلا

"وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟" ایک سہیلی نے کہا۔

"تاہم میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ بیچارہ بوڑھا ہے"

ایک خادمہ دوڑی دوڑی وہاں گئی۔ اور بوڑھے کو ساتھ لیکر آنے لگی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا، ٹھوکریں کھاتا ہوا بوڑھا اس طرح دکھائی دیتا تھا گویا ہوا میں چراغ کا شعلہ لرز رہا ہے یا کسی بدنصیب کے سینے پر غم کا بوجھ گر رہا ہے۔ بوڑھا قریب آ گیا۔ مہ رُخ نے اس کی صورت دیکھی۔ جو کیفیت ابلتے ہوئے پانی کی ہوتی ہے وہی کیفیت اس کے دل کی تھی۔ بوڑھے کی بے نور آنکھیں اس کی روح کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھیں۔ مہ رُخ کے سامنے وہی بوڑھا کھڑا تھا جس نے اُسکے ساتھ پدرانہ شفقت کی تھی۔ مہ رُخ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بابا! تم مچھلیوں کا شکار کرنے ہو" ایک سہیلی نے کہا۔

"ہاں! مجھے آپ نے کیا کہنا ہے؟"

"بابا! تم بڑے غریب معلوم ہوتے ہو" مہ رُخ نے کہا۔ اندھے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے سر کو دائیں بائیں پھرایا

"آپ کون ہیں؟" بوڑھے نے ایک ایسے لہجے میں کہا جس میں اس کی روح کا جوش پوشیدہ تھا۔

"ریاست فرحت نگر کے حکمران کی بیگم" ایک سہیلی نے کہا۔

"مجھے آپ کی آواز سُنکر ـــــ" آگے بوڑھے سے بولا نہ گیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" مہ رُخ نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں کئی سال گذر گئے میری ایک بیٹی تھی۔ اصغری اس کا نام تھا۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی میری زندگی کا وہ سہارا تھی۔ اچانک ایک دن یہیں سے وہ غائب ہو گئی۔ خدا معلوم دریا میں ڈوب گئی یا اُسے کوئی لے گیا" اتنا کہتے ہوئے بوڑھے کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو گرنے لگے۔

آپ کی آواز بالکل میری اصغری کی آواز ہے ـــــ

آپ کہاں ہیں۔ مجھے اپنا ہاتھ دیجئے" یہ کہکر اس نے قدم آگے بڑھایا۔ آگے ایک پتھر تھا۔ جس سے وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ مہ رُخ نے جلدی سے اسے اٹھایا۔ "روز ٹھوکریں کھاتا ہوں مگر جو ٹھوکر اصغری نے لگائی ہے وہ کبھی نہیں بھولوں گا۔

مہ رُخ کے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ بے اختیار چاہتی تھی۔ کہ اس سے لپٹ جائے: لپٹ کر کہے "میں ہی اصغری ہوں بابا ـــ بابا!" مگر اُسکے ہاتھ رُک گئے۔ وہ ایک بڑی ریاست کے حکمران کی بیوی اور ایک مفلس و قلاش بوڑھے کی بیٹی۔ ؟؟؟ اس نے گلے سے ہار اتارا اور بوڑھے کے ہاتھ میں دیکر کہا

"لے بابا! تیرے کام آئیگا!"

"یہ کیا ہے" بوڑھے نے پوچھا۔

"قیمتی موتیوں کا ہار ہے چالیس ہزار کا ہے بابا! تیری اور تیرے خاندان کی قسمت جاگ اٹھی" ایک سہیلی نے کہا۔

"میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ میں اسے لیکر کیا کرونگا ـــــ لے لیجئے" یہ کہکر ہار اُس نے بڑھایا۔

"تو پھر ہم تمہاری کیا مدد کریں؟"

"میری اصغری اگر تمہیں مل جائے تو اُسے کہنا۔ تیرا بابا! روتے روتے اپنی آنکھوں کا نور بھی کھو چکا"

مہ رُخ کے دل پر چوٹ لگی۔ مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ بوڑھا چلنے لگا۔ اس [illegible] کا ہر قدم مہ [illegible] کے دل پر چوٹ

لگاتا تھا۔ ایک سائے کی طرح وہ چلتا گیا ــــ مہ رُخ اسے دیکھتی رہی ــ کچھ دیر کے بعد بوڑھا نظروں سے غائب ہوگیا۔
"آپ خاموش کیوں کھڑی ہیں ــــ بڑی رحمدل ہیں"۔ ایک سہیلی نے کہا۔
"اتنا قیمتی ہار دیا تھا اس کو ــــ مگر وہ تھا ہی بدنصیب" دوسری سہیلی نے کہا۔
"اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے"۔ تیسری بولی۔

اب کھانا تیار ہو چکا تھا۔ اس کی سہیلیاں بیٹھنے لگیں۔ مہ رُخ چپکے سے اُٹھی۔ اس کا دل بھر آیا تھا اپنی سہیلیوں کی نظروں سے دُور وہ ایک درخت سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ آہستہ آہستہ اسکے لبوں سے نکل رہا تھا۔ "بابا! میں ہی تیری اصغری ہوں ــ بابا!"
سورج ایک ابر پارے سے نکل کر انسانی کمزوری پر قہقہے لگا رہا تھا۔

محترمہ رضیہ خاتون رعنا

"تم ــــ اور میں"

حیات و موت نہیں ہے سے میری وابستہ ۔۔۔ کسی کے عشق و محبت کا آسرا ہو تم!
غریقِ سیلِ محبت مجھے کیا جس نے ۔۔۔ سفینۂ دلِ مضطر کے ناخدا ہو تم!
نگہ کو دعوتِ نظارہ دیکے چھپ جانا؟ ۔۔۔ شرر بر برق کی اک شرمگیں ادا ہو تم!

ــــ (۲) ــــ

مریضِ عشق کے صد چاک قلبِ بسمل کی ۔۔۔ اُمید و بیم میں ڈوبی ہوئی دُعا میں ہوں!
لٹا کے راہِ محبت میں کاروانِ حیات ۔۔۔ ہر ایک رہروِ منزل کی رہنما میں ہوں!
فضائے یاس کی تاریکیوں میں آوارہ
ستم رسیدہ کی اک آہِ نارسا میں ہوں!

جناب وشوا متر عادل بی۔ اے

واپسی!

مژدہ! اے ذوقِ تماشا لوٹ کر آیا ہے دوست
آرزوئیں لے رہی ہیں شوق سے انگڑائیاں
روح پھر کھانے لگی ہے زندگانی کا فریب
آج پھر گزری ہوئی راتوں کی باتیں آگئیں
حُسن کی دیوی نے چھیڑا ہے محبت کا ستار

عشرتوں کی دلنشیں رنگینیاں لایا ہے دوست
سسکیاں لیتی ہوئی جانے کو ہیں تنہائیاں
حُسن پھر دیتا ہے الفت کو جوانی کا فریب
آج پھر رومان سے معمور راتیں آگئیں
قہقہوں کو چومتی ہے بے خودی پھر بار بار

بادۂ الفت سے پُر ہے آرزوؤں کا سبو
تیز تر ہونے لگی رفتارِ نبضِ آرزو

پوچھتا ہوں میں مرے محبوب! میرے ہمنشیں
جب ترے قدموں پہ غلطاں تھا مرے اشکوں کا ہار
سچ بتا۔ کیا یاد ہے وہ نوجوانی کی سحر
سچ بتا۔ کیا یاد ہے وہ کانپتے سیالوں کی رات
جب کہا تھا تو نے مجھ سے "آہ! میرے ہمنشیں!
چاندنی راتوں کے وہ باہم اشارے یاد ہیں؟
یاد بھی ہیں وہ جواں راتیں بھری برسات کی؟
یاد کر کے پہلی رنگیں صحبتوں کی داستاں

آہ وہ بیتے ہوئے دن یاد بھی ہیں یا نہیں؟
جب تری زلفیں ہوا میں ہو رہی تھیں بے قرار
جب ہوئے تھے ہم محبت کی اگن سے باخبر
کانپتے، جلتے، لرزتے، ہانپتے سیالوں کی رات
بھول جاؤں میں تجھے ہرگز یہ ہو سکتا نہیں"
یاد ہیں؟ راوی کے وہ سیمیں کنارے یاد ہیں؟
بوندیاں پڑتی تھیں جب نوخیز احساسات کی
اور فرطِ غم سے ہو کر کشتۂ دردِ نہاں

آنسوؤں میں کشتیٔ امید کو کھیتا ہے دوست!
ڈال کر باہیں گلے میں ہچکیاں لیتا ہے دوست!!

———

جناب محمد ابراہیم فاروقی

(مزاحیہ)

ٹیچر

(ایک ٹیچر کی "دردانگیز" کہانی مزاحیہ انداز میں)

ٹیچر بروزن "گھبیر" آج کل ہندوستان کی سرزمین پر آ پڑے پھیلے ہوئے ہیں اور پھیلتے جارہے ہیں گویا یہ زمین کی پیداوار ہے۔ اور پیداوار بھی وہ جو خودرو ہو، اور ناکارہ۔

ٹیچر کے لئے سب سے بڑی تسلی، اور اشک شوئی اسی بات پر موقوف ہے، کہ وہ قوم کے بچوں کا خیرخواہ ہے، وہ تمام دوسرے اہلکاروں سے بہتر ہے "شائستہ اور مہذب ہے تعلیم سے آراستہ۔ بالائی آمدنی کو حرام سمجھتا ہے۔ مٹھی کو "سرد" ہی رکھنا چاہتا ہے۔ ٹیوشن ۲۰ روپے کی ملتی مگر صاحب! یہ بہت مستغنی ہے، آنکھ بھرکر ادھر دیکھتا بھی نہیں۔ انکار کرتا ہے۔ کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے، کہ یہ آمدنی اس کے مذہب میں "ناجائز" ہے۔ مگر حقیقت پس پردہ یہ ہے۔ کہ افسرانِ بالا کا بہت بھاری بھرکم ڈنڈا سر پر سوار ہے ذرا ٹیوشن کے میدان میں قدم پڑے۔ اور فوراً تحقیقات ہونی شروع ہوئیں۔ ہیڈ ماسٹر کی طرف سے بڑے بڑے معقول و معتبر جاسوس بے چارے ٹیچر کا ناک میں دم کردیتے ہیں وہ بے چارہ چھپتا پھرتا ہے۔ مگر ان حضرات کی جاسوسانہ نگاہوں سے بچ نہیں سکتا۔

ٹیچر کا خاصہ ہے کہ . . . . . آڑے وقت میں اسکے کان کو ضرور کھجلی ہوتی ہے۔ آزما لیجئے عین اس وقت جب کہ ٹیچر حاصل مصدر کی تعریف کر رہا ہوتا ہے۔ "حاصل مصدر وہ ہے، جو (وقفہ اور کھجلی) ہاں ہاں پڑھو نا بھئی خاموش کیوں ہو گئے تم لوگوں کی بدوضعیوں سے میں بہت تنگ آگیا ہوں۔ دیکھو تم بدچلن ہو، گدھے ہو، ایک لائن میں ڈرل کرنے نہیں جاتے ہیڈ ماسٹر صاحب آئیں تو کمبختو کھڑے ہو جایا کرو۔ سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو، اپنی غلطی کا اعتراف کرو"! یہ تقریر کیسی مفید ہے۔ اور کتنی مؤثر گھنٹی بھی گذر گئی، اور پہاڑ بھی ٹل گیا۔ شہر میں آواز بازگشت لگا رہی ہے۔ کہ ماسٹر ابراہیم تعلیم کے علاوہ اخلاقی تعلیم سے بھی ہمیں مستفیض فرماتے ہیں . . . . . صاحب یہ ٹیچر کے مشغلے ہیں، جنکے ذریعے طالب علموں کی باگ ہم جدھر چاہیں موڑ لیتے ہیں۔ علم و فضیلت تو خیر جن کی باندی تھی انہیں کے ساتھ دفن ہوگئی، اور ہم رہ گئے نرے کھرے کھلانے والے زٹیل۔

اگر خوش قسمتی سے موسم خوشگوار ہو، اور سبق تیار نہ ہو تو ہم لوگ نہایت شان سے "فائن ڈے" منا لیتے ہیں۔ دو

چار فقرات اس پر چست کر دائے' اور انشا پردازی کی ایک شق پوری ہوگئی۔ جہاں کہیں ذرا اپنا تیار کردہ سبق کمبخت راستے میں رُک جاتے۔ تو کہدیا کرتے ہیں۔ ڈپر و نیسروں کے لب ولہجہ میں "طالب علمو! اس پر ایک مستقل لیکچر' پھر کسی فرصت میں ہوگا۔ یہ مضمون طویل ہے' اور جداگانہ بحث و نظر کا محتاج"

دیکھئے! اس فقرے نے ہماری وجاہت کو چار چاند لگا دیئے ہم نہایت دیانتدار' محنتی' اور علّامہ مشہور ہو رہے ہیں۔ مگر ما آنیم کہ ما دانیم' یا بعض طلبا خوب' میدانند۔

اس قسم کے نازک اوقات میں جب ٹیچر لال کو اپنی کمزوری چھپانا موت اور زندگی کا سوال ہوتا ہے۔ یہ لوگ کھانستے بہت ہیں۔ اور کچھ عجیب انداز سے۔ مجھے جب کبھی ایسی کھانسی آتی ہے۔ تو میں کوئی سعادت مند طالب علم خواہ پوچھے' خواہ نہ پوچھے کہ دیا کرتا ہوں کہ موسم خراب ہے گلا بگڑا جا رہا ہے۔

خدا کی شان! ٹیچر جب کبھی گندے کپڑوں میں ہو' وہ ضرور ورکشاپ کا مستری ہی سمجھا جاتا ہے۔ غالباً یہ بھی ہمارے "خیر خواہ" شاگردوں کے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے' کہ ایک دفعہ میں میلے کپڑوں میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ راستے میں ایک فقیر نے کچھ زیادہ ہی "تعظیم سے" پکارا مستری جی کچھ اللہ کے نام کا بھی دیتے جاؤ۔ مستری کا نام سنکر جی ہی تو جل گیا۔ اور اس وقت عرقِ خجالت سے جس قدر شرابور ہوا۔ وہ میرا "جذبہ ٹیچری" ہی جانتا ہے۔ یا غیظ و غضب کا طوفان۔ غرض جھنجلایا' پیٹا' مگر سر بگریباں جو ہوا' اور ٹیچری کے "محاسن" پر جو ذرا غور کیا تو سمجھ میں آگیا' کہ مستری کہلانے سے اچھا۔ طبیعت کو شانتی ہوئی۔ اور آئندہ کے لئے عبرت ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فاعتبروا یا اولو الابصار۔

معلوم ہوتا ہے ہمارا سلسلۂ نسب برسات کے مینڈکوں سے ملتا ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں مینڈکوں سے زیادہ ہمیں ٹرانا پڑتا ہے۔ یا پھر ہمارا جدِ امجد "بلبل" تھا۔

ناظرین! انسان پہلے بندر تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا (دُم) غائب ہوتی گئی' ایسے ہی ٹیلر کا لفظ کثرتِ استعمال سے مسخ ہوگیا۔ اور ٹیچر بن گیا۔

کوئی صاحب شرافت ہمیں ماسٹر کی بڑی شین سے پکارتا ہے۔ اور کوئی صاحب ہمیں اپنی زبان سے ماسی جی' مائی جی۔ دیکھئے! یہ ہے ہماری ادلتی بدلتی کیفیت کا نقشہ۔ میری دلی آرزو یہ رہتی ہے۔ کہ لڑکے ہمیں اگر ماسٹر نہ کہیں' تو میں ان کا واقعی بے حد ممنون ہوں۔ مگر کون سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ چودھویں صدی کے کندۂ ناتراش "بُجّے" آدمی کب گوارہ کر سکتے ہیں' کہ ہماری مانیٹری فرمانبرداری کی عادت عظمیٰ حاصل کریں۔

اکثر ٹیچر منشی کہلانے کے بے حد مشتاق نظر آتے ہیں۔ ان کے اشارات اور کنایات چاہتے ہیں' کہ زید او ربکر خورد و کلاں' ہمیں منشی کے نام سے پکارا کریں۔ غالباً وہ مذکور خطابات عالیہ سے اس لفظ کو ممتاز تر سمجھتے ہیں' جب انہیں اس روح افزا خطاب سے پکارا جاتا ہے۔ تو یقیناً ان کا خون سیروں بڑھ جاتا ہے۔ طرّے میں اضافہ' مونچھوں میں تاؤ۔ اور گردن میں تناؤ کچھ عجیب اور مضحکہ خیز ہوکر رہ جاتا ہے۔ ناظرین! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے ذاتی تجربے اور ہم پیشہ اصحاب کے مشاہدے کی بنا پر جھوٹ نہیں کہتا

کہتا ہوں۔ آخر ٹیچر ہوں، اور دیرینہ ٹیچر، اور رجسٹرڈ ٹیچر۔
ٹیچر جھوٹ نہیں بولتا۔ ہاں البتہ وہ اگر اپنے خاص آڑے
وقتوں میں بول لے تو اسکا مجاز ہے۔ یہ دروغ مصلحت
آمیز ہے۔ جس سے ٹیچر کا نباہ ہے، اور اس سے وہ گریز
نہیں کرسکتا۔

لڑکوں کو سلام کہنے کی عادت ہمارے منشا کے خلاف
بہت ناموزوں طریق پر پڑی ہوتی ہے۔ اور ہم لوگ اس
سے بچنے کی بہت کوشش کرتے ہیں بعض اوقات کوچہ و بازار
سے گزرتے وقت ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم دبک
کر گذر جائیں، اور کسی رستے پر طالب علم کے کان میں ہمارے
قدموں کی آہٹ پہنچ نہ جائے۔ تاکہ سلام جو "شدید العقاب"
اور "قضائے مبرم" ہے۔ ٹل جائے۔ مگر صاحب! یہ لوگ بہت
چوکنے ہیں، فوراً کان کھڑے کر لیتے ہیں۔ اور خواہ ہم نزدیک
ہوں یا دور آلۂ جہیر الصوت، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آلۂ وحشت خیز
بنکر ..... ماسٹر جی ..... سلام کرکے وہ اپنے
فرضِ گراں سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ ہم چونک اُٹھتے
ہیں کہ شاید ہمارا عزیز از جان پیس آف چاک، یا دسترخوان
نما رومال یا قلمتراش جیب سے نکل گیا ہوگا جس سے ہمیں
آگاہی بخشکر شکر گذار ہونے کا موقعہ دیا جارہا ہے۔

ٹیچر کی شان ہے۔ کہ وہ اکثر کوٹ کے کالر زور سے جھٹکتا
ہے۔ مگر یہ اُس وقت جبکہ "شان نمائی" کا وقت آتا ہے۔
یا بورڈ کی دیدہ زیب املا "لکھتے لکھتے ٹھہر جاتا ہے۔ پگڑی
وہ گول باندھتا ہے۔ اور قدرے بیٹھی ہوئی عینک نہایت
شوق سے لگاتا ہے۔ مگر دیکھتا شیشوں کے اوپر سے ہے
اگر عینک لگاتا نہیں تو اس کی اُسے ہوس ضرور رہتی ہے۔
افسر کے آنے پر ہوش و حواس کو ایسا گم کرتا ہے۔ کہ کوئی
ہزار تھپکیاں دے، ہزار بہلائے مگر وہ روبراہ نہیں ہوتا۔
سمجھتا ہے، کہ میں حیوان ہوں، اور یہ عزرائیل جو جان لے کر
ہی ٹلے گا۔

ٹیچر کے جیب کا سرمایہ محض ایک چاقو ..... نہیں
نہیں قلمتراش (منشیانہ لب ولہجہ) ہے یا پیس آف چاک۔
(چاک کا ٹکڑا نہیں) ایک دفعہ ایک نہر کے کنارے ایک
لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہاں جتنے لوگ موجود تھے۔ دماغ لڑانے
لگے کہ آخر یہ کون بزرگوار ہوسکتے ہیں، جیبیں ٹٹولیں۔ تو
ایک پیس آف چاک، ایک نیلی ربڑ، اور ایک دسترخوان نما
رومال سبزی ڈالنے والا۔ ایک کونے سے پھٹا ہوا برآمد ہوا
سرد آہ بھر کر میں للکار اٹھا بھائیو میں سمجھ گیا۔ یہ ایک بدنصیب
ٹیچر ہے۔ اور یہ سامان اُس کی زندگی کا سرمایہ۔

ٹیچر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چھنگلیا کان کے
سوراخ میں ڈالتا ہے۔ اور زور سے گھماتا ہے، اور مست
ہوا جاتا ہے۔ اس شغل میں اُسے وہی کچھ لطف آتا ہے، جو ایک
خارش زدہ اونٹ کو بار بار کھجلانے میں، اللہ بچائے ہمارے
بے کاری کے شغل میں بھی کیا دیدہ افروز ہیں۔

ٹیچر کی زبان پر کئی کلمات فی سبیل اللہ ہی چڑھے
رہتے ہیں جو موقعہ بے موقعہ اُسکے منہ سے نکلتے رہتے ہیں،
مثلاً خاموش .... جماعت میں سنسنی چھارہی ہے ....
لائن میں چلو .... جماعت کمرے میں بیٹھی ہے ... اور
"میں نے کہا" "کیا نام" یہ ہر دو کلمات ہر فقرے کے تتمہ یا تخمیر

کا کام دیتے ہیں۔

ٹیچر گھڑی کی زنجیر سے کھیلتا رہتا ہے . . . مگر میں چابیوں کے گچھے سے (کیونکہ میرے پاس گھڑی نہیں ہے) ہاں سچ ہے، صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کوٹ کے بٹنوں کو بُری طرح مروڑتا ہے۔ بیوی بے چاری دق ہے کہ ادھر بٹن لگاتی ہے، اُدھر یہ توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

ٹیچر کا سائن بورڈ ایک یہ ہے۔ کہ سُرمہ نہیں، کاجل لگاتا ہے۔

اکثر قلم کان پر رکھ کر بھول جاتا ہے . . . غریب کیا کرے، کام بہت ہیں . . . تلاش و جستجو میں بے چارہ کھویا ہوا ہے۔ آخر تھک کر، ہار کر، کھجلاتے کھجلاتے ہاتھ کان پر لے جاتا ہے۔ اور اپنے آہوئے رمیدہ کو آخر پالیتا ہے۔ اور بچوں کی شرانگیز محفل میں خفیف ہو کر رہ جاتا ہے۔ لڑکا کل میں ڈھنڈورا شہر میں۔

جماعت میں شور و ہنگامہ کے وقت ہماری ہیئت کذائی کچھ عجیب سی ہوتی ہے۔ کبھی چیخ اُٹھتے ہیں۔ اور کبھی کوس رہے ہیں۔ دیدے پھٹے جاتے ہیں، اور بے طرح اچھل رہے ہیں۔ ایک جانب کے لڑکے خاموش ہیں۔ تو دوسری جانب کے ہماری حالت زار کا جائزہ لے رہے ہیں

اکثر طلبا کو ہم بڑے "جذبے" کے ساتھ منع کیا کرتے ہیں۔ کہ سینما نہ جایا کرو۔ مگر یہ لوگ انسان صورت، شیطان سیرت ہمیں یہیں بچا بچا کر سینما دیکھ لیتے ہیں (کارٹونسٹ اصحاب توجہ فرمائیں) اور سینما میں نہیں جاتے، گویا پوری سعادت مندی، اور تابعداری کی داد دے رہے ہیں

ٹیچر کا مدارِ زندگی ایک ہے۔ نہ اس میں اُمنگ، نہ ہمت اس میں ترقی کرنے کا خیال۔ وہ دیکھتا ہے۔ کہ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے۔ زندگی عمل اور سرگرمیوں کی ایک آماجگاہ ہے۔ اُسکے فارغ التحصیل بچے، بڑھتے بڑھتے، بڑھتے بڑھتے، پھلتے پھولتے، دنیا کی سرگرمیوں میں چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر ٹیچر آہ بیچارہ ٹیچر زندگی کا بہاؤ ہے جو ایک ہی رفتار سے ہمیشہ چلا جاتا ہے۔ دُنیا بدلتی ہے اُسمیں فنا و بقا کی کشمکش چلی جا رہی ہے۔ کوئی بگڑتا ہے کوئی سنورتا ہے، کوئی گرتا ہے۔ کوئی ابھرتا ہے۔ مگر وہ اپنی پُرانی مسند پر رونق افروز ہے مجھے، اور میرے ہم پیشہ اصحاب کو نہایت ادب سے وہ طلبا جو ہمارے ہاتھ سے علمی تربیت پا کر چلے جاتے ہیں۔ اکثر ملتے آتے ہیں، اسمیں شک نہیں کہ وہ خود سر نیاز جھکا لیتے ہیں، بات بات میں، لہجہ لہجہ میں دبی آئی تعظیم جھلک ہی ہوتی ہے، مگر ہم شرم سے ڈوب جاتے ہیں ــــ

رسالہ حریم لکھنو (مرتبہ بیگم سلیم انہونوی ۔ کتابت وطباعت بہتر ۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ حریم لکھنو)

ماہنامہ حریم لکھنو چھ سات سال سے جاری ہے ۔ اور اس کے اکثر مضامین سبق آموز ہوتے ہیں ۔ ابھی میں اسکا افسانہ نمبر شائع ہوا ہے ۔ افسانہ نمبر میں کئی افسانے قابل تعریف ہیں ۔

"بچے کی نیت" مشرقی عورت کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے ——— اور شریف کنواری لڑکیوں کے مطالعہ کے لائق ہے ۔ ہماری سادہ لوح عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ایسے ہی افسانے موزوں ہیں جسن و عشق کی لن ترانیاں شریف خاتون کے لئے محض بیکار ہیں ۔

اس میں شک نہیں ۔ تہذیب نو کی پرستش اور مغربی خواتین کی نقالی میں ہندوستانی عورتیں ضرورت سے "زیادہ" فراخدل ہو چکی ہیں "نو دیپے تیرہ آنے" اگرچہ فکاہی مضمون ہے ۔ مگر چشم بصیرت کے واسطے اس میں بہت بڑی عبرت موجود ہے ۔ نوجوان زدہ لڑکیوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے ۔

"بچہ کی سرگذشت" حریم کے لئے موزوں نہیں اس قسم کے واقعات دس بیس سال پہلے ناولوں کی زینت ہوا کرتے ۔ اس ترقی کے دور میں کسی پامال موضوع پر خامہ فرسائی کرنا کچھ مستحسن نہیں ۔

"حسین بیراگن" عیش پرست سرمایہ داروں کی نفس پروری کی مکمل تصویر اور افسانہ نمبر کی جان ہے "علم و عمل" ابھی کئی سال قبل عصمت دہلی میں اور "نہنی بیگم" تقریباً چھ سال قبل حریم میں چھپ چکے ہیں ۔ دونوں افسانے اچھے ہیں ۔ اگرچہ "نہنی بیگم" میں بہت غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے ۔ تاہم یہ دلچسپ ہونے کے علاوہ بھولڑ عورتوں کے واسطے عبرت آموز بھی ہے ۔

"خواب اور تعبیر" کو افسانہ نگاری سے دور کا بھی تعلق نہیں ۔ فرسودہ اور پامال پلاٹ ۔ عبارت میں جابجا تصنع ۔ واقعات گفتگو خاص طور پر خلاف مشاہدہ ہے ۔ بحیثیت مجموعی افسانہ نمبر کامیاب ہے ۔

محترمہ ا ۔ س ۔ م ۔ رخ ۔ شریک ادارہ صنف نازک

پستالوزی (مصنفہ ڈاکٹر عبد الحمید زبیری بی ۔ اے (جامعہ) ایم ۔ اے پی ایچ ڈی ۔ کتابت وطباعت بہت دلآویز ، معہ گرد پوش ، صفحات ۲۱۴ ۔ سائز ۲۰×۲۲ قیمت ڈیڑھ روپیہ ۔ ملنے کا پتہ ۔ مکتبہ پنجاب لاہور ۔)

پستالوزی ۔۔۔ ۔۔۔ موجودہ جرمنی کے سب سے

ماہر فلسفہ تعلیم پروفیسر اشپرانگر کے یہ مشہور و معروف الفاظ لکھدینے کافی ہیں۔ "کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں بڑی نہیں کہی جاسکتی۔ جب تک کہ اس میں ایک "پستالوزی" نہ پیدا ہو"۔ ان الفاظ سے قارئین "پستالوزی" کی شخصیت اور عظمت سے واقف ہوگئے ہونگے! اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالحمید زبیری نے تعلیمی دنیا کے ہیرو پستالوزی کی سیرت اس کے جذبات اور ذہنی تصورات کو روشنی میں لانے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے پستالوزی کے حالات زندگی لکھنے کی بجائے　　اس زمانے کی اہم تحریکات سیاسیہ و علمیہ کی روشنی میں اس کے دل و دماغ کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور پھر اپنے تاثرات کو اردو دان پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ کوئی صاحب قلم جب کسی شخص کے حالاتِ زندگی پر بحث کرنا چاہتا ہے تو اس کی زندگی کے تمام واقعات پیش کر دیتا ہے نہ یہ بتاتا ہے کہ وقت کی اہم تحریکات نے اُس کے دل و دماغ میں کونسے تاثرات پیدا کئے۔ اور نہ یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس کو سوسائٹی کیسی ملی۔ اور اس سوسائٹی نے اس کی ذہنی ارتقا میں کس حد تک حصہ لیا۔ مگر اس کتاب میں یہ نقص نہیں۔ مصنف نے کوئی موضوع تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا۔

شروع میں مقدمہ ہے "پستالوزی اور جدید مغربی تمدن"۔ اس میں جدید مغربی تمدن کے عناصر ثلاثہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے بعد چار ابواب ہیں اور ہر ایک باب مختلف موضوعات پر مشتمل! آخر میں سولہ صفحات کی فہرست اصطلاحاتِ علمیہ بھی ہے!

ماہنامہ ندیم } مرتبہ سید ریاست علی ندوی۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ صفحات ۷۲، سالانہ چندہ چار روپے۔ دفتر رسالہ ندیم گیا۔

رسالہ ندیم مدت سے صوبہ بہار میں اردو کی نشر و اشاعت کا فرض ادا کر رہا ہے۔ اور اہل بہار میں اردو خوانی کا شوق پیدا کرنے میں اس نے کافی حصہ لیا ہے۔ پہلے یہ پرچہ جناب انجم کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا مگر اب اس کے ادارتی فرائض جناب سید ریاست علی صاحب ندوی، سے متعلق ہوگئے ہیں۔ سید ریاست علی صاحب مولانا سلیمان ندوی کے شریک کار رہ چکے ہیں۔ اور ویسے بھی آپ کی عمر کا بیشتر حصہ علمی مشاغل میں گذر چکا ہے۔ توقع ہے کہ آپ کی ادارت میں ندیم بہت ترقی کریگا!

تاریخ فلسفہ اسلام } مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کتابت و طباعت بہت اچھی۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۲۰۰ مع خوبصورت جلد و گرد پوش کے قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ پنجاب لاہور

یہ ہالینڈ کے مشہور و معروف مستشرق ٹ۔ ج دے بوئر کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے محاسن کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی ہیں۔ جو علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور جنکے تراجم کو نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے!

اس کتاب میں اسلامی فلسفے کی تاریخ کو سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض مقامات ہر لحاظ سے قابل اعتراض ہیں مگر مصنف ہالینڈ کا باشندہ ہے۔ اس لئے اگر کہیں کہیں اپنے شعوری یا غیر شعوری طور پر قابل اعتراض باتیں لکھدی ہیں۔ تو جائے تعجب نہیں کسی قوم کے

فلسفے کی جانچ پڑتال کرنا اسکے مختلف شعبوں گوناگوں شاخوں پر بحث کرنا معمولی سا کام نہیں ہے۔ اور مصنف نے کئی مقام پر خوب داد تحقیق دی ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر ایک باب کے متعدد جزیات ہیں۔ پہلے باب میں فاضل مصنف فلسفہ اسلامی کی نمود بود کے میدان مشرقی حکمت اور یونانی علوم پر بحث کرتا ہے۔ اسی طرح دیگر ابواب کے بھی کئی کئی حصے ہیں مصنف نے فلسفیانہ مسائل کی توضیح و تشریح کے ساتھ آئمہ فلسفہ کے مختصر حالات زندگی کو بھی سپرد قلم کیا ہے۔

قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں (تحریر کردہ جناب عرش تیموری۔ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۴۷۔ سائز ۱۸ x ۲۲۔ ناشر مکتبہ جہاں نما اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ قیمت ۸ر)

جناب عرش تیموری ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے انشا پرداز ہیں۔ آپکے مضامین نظم و نثر ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں تعریفی کلمات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اور مقبول ہوئے ہیں "قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں" میں مغلیہ خاندان کے چند صحیح حالات و واقعات ہیں۔ یہ کتاب گویا ایک آئینہ ہے جسمیں آپ کو بادشاہ شہزادے اور شہزادیوں کی روزمرہ کی زندگی شاہی معاشرت طرز تمدن کے مختلف جلوے نظر آئینگے۔ عرش صاحب خود شاہی خاندان سے ہیں۔ اسلئے آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اسے پورے طور پر محسوس کر کے لکھا ہے۔ کتاب کی زبان بھی دلآویز ہے۔

جناب اثر چکوالی بی۔ اے

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

حسن نگاہ

ہیں زمین و آسماں کے امتحاں میرے لئے　　یہ جہاں میرے لئے ہے وہ جہاں میرے لئے

ہیں وہ رہرو ہوں کہ ہیں رندے ہوئے دو راستے　　وادئ مہتاب و جوئے کہکشاں میرے لئے

عشق میری ابتدا ہے عشق میری انتہا　　زندگی ہے عشرت سوز نہاں میرے لئے

اے فریب زندگی کیوں، اے فریب زندگی　　اس قدر لا انتہا وہم و گماں میرے لئے

گو عدم[۱] کے ذوق کا دھندلا سا پرتو ہوں اثر

شاعری رکھتی ہے عمر جاوداں میرے لئے

[۱] میرے مکرم و محترم دوست سید عبد الحمید صاحب عدم سے مراد ہے

Round Trip FARES to HILL STATIONS

Spend your holiday in the Hills this summer in brilliant northern sunshine. The trouble-free Rail-cum-Road trip will thrill you, and you will have ample time to enjoy the scenery during the journey to your destination

Northern India Hill Stations and Kashmir offer the holiday-maker [illegible] of diversion—Golf on [illegible] Trout fish-

Ask for planned [illegible] will gladly be sent without obligation. And remember, holiday and travelling costs have never been so low.

◆

KULU
MANDI
MURREE
KATRAIN
SRINAGAR
DALHOUSIE

Write to The Chief Commercial Manager or Telephone No. 3299, Lahore

[illegible]l-cum-Road Return Tickets, available [illegible] six months, are issued from most of [illegible]e important stations on the North